BROWN
BOOK ONLY

سیاست

سیاسی اور اجتماعی علوم کا سہ ماہی رسالہ

اڈیٹر

یوسف حسین خاں

شعبۂ تاریخ و سیاسیات، جامعہ عثمانیہ سرکارِ عالی

حیدرآباد (دکن)

سیاست

سیاسی اور اجتماعی علوم کا سہ ماہی رسالہ ہے

جو

جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے

اس کا مقصد یہ ہے کہ سیاسی اور اجتماعی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان کے ذریعہ اردو دان طبقہ میں مقبول بنایا جائے اور جدید تمدن کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں جو تحقیق ہو اُسے اُردو میں منتقل کیا جائے۔ یہ خالص علمی رسالہ ہے جس میں حیات اجتماعی کے مختلف مسائل پر غیر جانبداری کے ساتھ بے لاگ تحقیق کے نتائج شائع ہوتے ہیں اور کسی خاص جماعت یا مسلک کے خیالات کی نشر و اشاعت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ علی اور بعض اوقات مختلف فیہ مسائل پر بھی ہمارے صفحات میں جو بحث ہوگی وہ بھی علمی انداز میں ہوگی۔

مضامین کے متعلق ڈاکٹر یوسف حسین خاں، بی ۔اے، ڈی لٹ (پیرس) استاد شعبۂ تاریخ و سیاسیات، جامعہ عثمانیہ۔ حیدر آباد (دکن) سے خط و کتابت کی جائے۔ اور رسالہ کی خریداری، نرخ اجرت اشتہارات اور دوسرے انتظامی اور معاملے کے امور کے متعلق ناشر سید عبد القادر اینڈ سنس تاجران کتب چار مینار حیدر آباد (دکن) کو لکھنا چاہیے

چندہ مقامی قیمت (صہ/) روپیہ سالانہ

چندہ اضلاع و دیگر ممالک (صہ۸/) روپیہ سالانہ

فی پرچہ ایک روپیہ آٹھ آنے

سیاست

جلد ۳ | جنوری ۱۹۴۲ سنہ عیسوی | نمبر ۱

فہرست مضامین

سیاست

نمبر۲	اپریل ۱۹۴۲ عیسوی	جلد۳

فہرست مضامین

سیاست

نمبر ۳	جولائی ۱۹۴۲ء عیسوی	جلد ۳

فہرست مضامین

سیاست

جلد ۳ | اکتوبر ۱۹۴۲ عیسوی | نمبر ۴

فہرست مضامین

سیاست، جنوری ۱۹۴۲ء

اقبال کے یہاں معیشت و معاشرت
کے
تصورات

از

اڈیٹر

انسان کائنات اور زندگی کے متعلق جو مخصوص نقطۂ نظر رکھتا ہے اس کا اثر زندگی کے ہر پہلو پر پڑنا لازمی ہے۔ اقبال کے تصورّات معیشت کے متعلق وہی ہیں جو اس کے فلسفۂ حیات میں کھپتے ہیں۔ چونکہ اقبال اثبات خودی اور آزادی کا علمبردار ہے اس لئے ضروری تھا کہ ان اصول کی جھلک اس کے ان تصورات میں بھی موجود ہوتی جو اس نے معاشی زندگی کی نسبت جستہ جستہ طور پر پیش کئے ہیں۔ اثبات خودی کا اصول لازمی طور پر انفرادیت کی طرف لے جاتا ہے لیکن چونکہ اقبال مطلق انفرادیت پر مذہب و اخلاق کی تحدید ضروری سمجھتا ہے کہ اس سے تحقق ذات میں مدد ملتی ہے اس لئے وہ اپنے نظام معیشت میں اجتماعی حقوق اور ذمہ داریوں کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔

اس وقت دنیا میں تین نظام معیشت رائج ہیں۔ ایک خالص انفرادیت یا سرمایہ داری کا نظام دوسرے اشتراکیت یا اشتمالیت کا نظام اور تیسرا اسلامی نظام۔ اقبال کے تمدنی تصورات چونکہ بنیادی طور پر اسلامی تعلیم سے ماخوذ ہیں اس لئے محل تعجب نہیں کہ وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت پر تنقید کرتے ہوئے اسلامی نظام معیشت کو ان دونوں پر فضیلت دیتا ہے۔ اسلام نے تمدنی زندگی کے

متعلق جو حل پیش کئے ہیں وہ بیشتر امتزاجی نوعیت رکھتے ہیں۔ زندگی ایک بڑی پیچیدہ حقیقت ہے۔ اس کے مسائل کے حل امتزاجی نوعیت ہی کے ممکن ہیں جو مختلف پہلوؤں پر حاوی ہوسکیں سرمایہ داری اور اشتراکیت میں زندگی کی پیچیدہ حقیقت کو سادہ بنانے اور ایک طرفہ حل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ تجربہ نے بتایا کہ زندگی کی گتھی ان ہاتھوں قیامت تک نہیں سلجھ سکے گی۔ یہ تحریکیں جتنا بناتی اور سنوارتی ہیں اس سے کہیں زیادہ بگاڑتی ہیں۔

اسلام کا ایک بڑا کارنامہ تو یہ ہے کہ اس نے دین اور دنیا کی تفریق کو مٹا دیا۔ مسلمان جب دعا مانگتا ہے، ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وَّ فی الاٰخرۃ حسنۃ تو وہ دراصل انسان کے معاشی عمل کو بھی اس کے اخلاقی عمل کا ایک جزو قرار دیتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔ جعلت لی الارض مسجدا (میرے لئے تمام زمین مسجد ہے) یعنی تمام دنیاوی اعمال بھی اخلاقی نوعیت رکھتے ہیں۔ انسانی عمل کی کوئی شق بھی اخلاقی اور روحانی عنصر سے خالی نہیں ہوسکتی۔ معاشی مسائل کو حل کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ انھیں اخلاقی اعمال سے علٰحدہ تصور نہ کیا جائے۔ ایسا کرنے سے ہمارے معاشی اعمال کا معیار کس قدر بلند ہو جائے گا! یہ کہنا کہ معاشی اعمال ادنیٰ مقاصد کے حامل ہوتے ہیں صحیح نہیں ہے۔ کسی سیڑھی کا نیچے والا ڈنڈا اوپر والے ڈنڈے کے مقابلہ میں کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر زندگی کی وحدت کو تسلیم کیا جائے تو اعمال کا سرچشمہ ایک ماننا پڑے گا، چاہے وہ اعمال معیشت و سیاست سے تعلق رکھتے ہوں یا اخلاق سے۔ جو لوگ اپنے ارادہ اور سعی و جہد سے معاشی اقدار کی تخلیق کرتے ہیں وہ ضرور ہے کہ اعلیٰ اخلاقی اُصول پر عمل پیرا ہوں۔

تمدنی توازن اسی وقت ممکن ہے جبکہ خالص افادی معاشی اعمال بھی اخلاق کے تحت آجائیں۔ معاشی اور اخلاقی عمل میں اگر کچھ فرق ہے تو صرف اتنا کہ اول الذکر میں اکثر اوقات انفرادی عنصر غالب رہتا ہے اور ثانی الذکر میں انسانی عنصر۔ اخلاق کا مقصد یہ ہے کہ انفرادی عمل میں انسانی عنصر پیدا کرے۔ جدید سرمایہ داری آج دنیا کے لئے وبال اسی سبب سے بن گئی ہے کہ اس میں اخلاقی اور انسانی عنصر مفقود ہو گئے ہیں، وہ انسان کو محض ایک حیوان مانتی ہے۔

جس کی زندگی کا مقصد سوائے پیٹ کی فکر کے اور کچھ بھی نہیں۔ انسان اپنے اس مقصد کو مسابقت کے ذریعہ حاصل کرسکتا ہے۔ ان اصولوں پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ آج جدید انسان کی زندگی میں ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا ہے جسے پُر کرنے والی کوئی چیز نہیں۔ وہ سکون و امن سے محروم اور خود اپنے آپ سے نبرد آزما ہے۔ وہ تیز چلا جارہا ہے لیکن نہیں معلوم کہ اس کی منزل کدھر ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ جب تک اخلاقی اور معاشی مقاصد ہم آہنگ نہوں اس وقت تک زندگی میں ربط و وحدت نہیں پیدا ہوسکتی۔ انسانی خواہشات کی حقیقی تکمیل صرف اس وقت ممکن ہوگی جب کہ وقتی کے ساتھ ابدی مقاصد ہمارے عمل میں شامل ہوں کہ یہی مسرت کا حقیقی سرچشمہ ہیں۔ ہماری انفرادی زندگی عالمگیر نظام مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ نظام مقاصد منشاء الٰہی کا مظہر ہے جس کی وساطت سے کائنات اور زندگی میں ربط و معنیٰ پیدا ہوتے ہیں۔

زندگی کے معاشی پہلو کی اہمیت اس سے واضح ہوتی ہے کہ اس کے ذریعہ انسانی فطرت اپنے اصلی روپ میں بے نقاب ہوتی ہے۔ اپنی مادی ضروریات کی پابجائی کے لئے انسان خارجی فطرت کے مظاہر کے تصورات بناتا اور پھر اپنے ان تصورات کے جال میں انھیں پھانسنے کی کوشش کرتا ہے۔ تعقل کا سارا عمل اسی سے عبارت ہے۔ ذہن انسانی کی دوسری کوشش یہ ہوتی ہے کہ مادی اشیاء میں فرق کرے بعض کو مفید اور بعض کو غیر مفید قرار دے۔ ذہن کی یہ قدر آفرینی معاشی عمل کی جان ہے۔ فطرت میں تصرفات کرکے انسان اپنی جدوجہد کا ایک میدان تلاش کرتا ہے اور قدر آفرینی سے خود اپنے ذاتی تحقق اور اپنے اخلاقی وجود کے استحکام کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ فطرت کے دل کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ انسان اس کو اپنے فیض نظر سے باقدر بنائے کہ یہی اس کی علت غائی ہے۔ قدر آفرینی کے بغیر اشیائے فطرت بے معنی طوما سے زیادہ وقیع نہیں۔ اقبال نے ایک جگہ شاعرانہ انداز میں یہ نکتہ بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ انسان کے آگے عرض نیاز میں مشغول ہے۔ فطرت کی ہر شئے پر اس وقت وجود کا اطلاق ہوگا جبکہ کسی نظام مقاصد کے تحت اس کی قدر و قیمت متعین ہو جائے۔

حدیث ناظر و منظور راز ے است　　دل ہر ذرہ در عرض نیاز ے است
نوائے شاہد مرا مشہود گردان　　ز فیض یک نظر موجود گردان
کمال ذات شئے موجود بودن　　برائے شاہدے مشہود بودن
زوالش در حضور ما نبودن　　منور از شعور ما نبودن

پھر زندگی کی تعریف بھی اقبال کے نزدیک یہ ہے کہ وہ تصرف و تسخیر کی ایک مسلسل داستان ہے۔ اس ناٹک کے مختلف پردوں پر شوق ایجاد و تخلیق نے جو نقش و نگار بنائے ہیں ان میں خواہشات کی رنگ آمیزی سے کام لیا گیا ہے۔

زندہ؟ مشتاق شو خلاق شو　　ہمچو ما گیر ندۂ آفاق شو

انسان کی روحانی زندگی اس کی مادی اور جسمانی ضروریات کی تکمیل کے بغیر ادھوری رہتی ہے۔ روح اور ذہن جسم سے ایسے وابستہ ہوتے ہیں کہ انھیں اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ مادی وجود کے قیام و بقا کے لئے اسباب معیشت فراہم کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ انسان کے معاشی عمل کی ابتدا اس کی عقل کی ابتدا سے عبارت ہے عقل ہی کے ذریعہ سے انسان نے اپنی مادّی ضروریات کے لئے عالم خارجی میں تصرفات شروع کئے۔ مادہ پر جو عقل کی راہ میں رکاوٹ تھی، ذھن نے قابو پایا اور اپنے فائدہ کے لئے اس کی شکلیں بدلیں۔ معاشی عمل سوائے اس کے اور کیا ہے کہ مادہ کو نئی نئی شکلیں دی جائیں اور اس طرح اس کو بے قدری کی تاریکی سے نکال کر قدر آفرینی کی روشنی میں ظاہر کیا جائے اس طرح سارا عالم انسان کے معاشی عمل کی جولانگاہ بن گیا۔ ھو الّذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً (خدا ہی ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے) یہ دعویٰ غلط نہیں کہ معاشی تاریخ انسان کی عقلی تاریخ ہے تعقل کی ابتدا مادہ کی تسخیر ہی کے لئے ہوئی اور آج بھی اس کا اصلی مقصد و منتہا یہی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح انسان نے اشیاء فطرت کو جو پہلے پہل بے سود، بے قدر اور بے معنی تھیں، اپنے

استعمال کے لئے موزوں بنایا۔ معاشی مقاصد کے تحت صنعت و حرفت نے جنم لیا جن سے محفل تمدن کی رونق دوچند ہوگئی۔ ذہن کی فطرت پرکار فرمائی سے معاشی اقدار پیدا ہوئیں اور دولت و ثروت کا ظہور ہوا۔

من نہ گویم در گزر از کاخ و کوئے — دولت تست ایں جہان رنگ و بوئے
دانہ دانہ گوہر از خاکش بگیر — صید چوں شاہیں ز افلاکش بگیر

معاشی عمل کی ایک انفرادی نوعیت ہے اور دوسری اجتماعی۔ اصلی معاشی قدر اس میں ہے کہ فرد اپنے عمل سے اپنے اور اپنی جماعت کے افادہ و مسرت میں اضافہ کرے۔ معاشی عمل سے خودی کا اظہار ہوتا ہے اور اس کے استحکام میں مدد ملتی ہے۔ لیکن اگر اظہار خودی جائز حدود سے باہر ہو جائے تو وہ تمدن کے لئے بربادی کا موجب ہو سکتا ہے جیسا کہ جدید سرمایہ داری نے ثابت کر دیا ہے۔ حقیقی معاشی قدر وہ ہے جو شخصی اور اجتماعی جبلتوں کے تضاد کو رفع کر دے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ معیشت جس میں اظہار ذات کے مواقع موجود نہ ہوں فطرت انسانی کا ساتھ نہیں دے سکے گی۔ افراد ہی اقدار کے حامل ہوتے ہیں، چاہے وہ اقدار اخلاقی ہوں یا معاشی۔ یہ اقدار ایک مخصوص نظام مقاصد کے تحت ہوتی ہیں جو اس مخصوص گروہ کا مذہب کہلاتا ہے اور جس سے حیات و کائنات کا مجموعی نقطۂ نظر متعین ہوتا ہے۔ جب ہم کسی معاشی عمل کو برا کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم کسی اعلیٰ قدر کو ادنیٰ ضرورت یا خواہش پر ترجیح دے رہے ہیں۔ یہ عمل انتخاب اس نظام مقاصد کا جزء ہوتا ہے جس سے زندگی ایک خاص رنگ میں رنگ جاتی ہے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر افراد اور جماعتوں کے یقین و ایمان کا سرمایہ بھی اسی پر مبنی ہوتا ہے۔

سوسائٹی کے اندر زندگی بسر کر کے آدمی اسباب معاش مہیا کرتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ سوسائٹی کے حقوق کا ہر نظام معیشت میں پورا لحاظ رکھا جائے۔ انفرادیت پسندی کا رجحان یہ ہے کہ آدمی اپنی ملکیت سے جو چاہے کرے۔ اس میں کسی کو دخل دینے کی حاجت نہیں۔

دوسری طرف اشتراکی کہتے ہیں کہ ملکیت چوری ہے جو سوسائٹی کا حق مار کر حاصل کی گئی ہے۔ وسائل و دولت پر مملکت کا قبضہ ہونا چاہئے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اسلامی اصول معیشت ہے جو ملکیت و سرمایہ کے وجود کو جائز تصور کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ اس پر ایسی حدود قائم کر دیتا ہے کہ بجائے مضر ہونے کے وہ ہیئت اجتماعی کے لئے مفید ہو جائے۔ عمل کی آزادی جس میں دولت آفرینی کی آزادی بھی شامل ہے، تمدنی فلاح کی اعلیٰ ترین قدر ہے لیکن منظم معاشرہ میں تعاون عمل کی مناسب صورتیں پیدا کرنا بھی اس سے کم نہیں کہ بغیر اس کے خود افراد کی صلاحیتیں بروئے کار نہیں آسکتیں۔

یہ عام مشاہدہ ہے کہ دو افراد بالکل ایک ہی طرح کی صلاحیتیں لے کر نہیں پیدا ہوتے۔ اگر ان میں قابلیتوں کا کوئی فرق نہیں تو وہ ایک دوسرے کے مثنیٰ ہوئے اور اگر وہ ایک دوسرے کے مثنیٰ ہیں تو ان کے الگ الگ وجود کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے۔ فطرت افراد کے درمیان جو فرق و اختلاف رکھتی ہے وہ بے مقصد نہیں ہوتا۔ سپاٹ یکسانیت تخلیق و ایجاد کے جوہر سے محروم رہے گی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ فطرت کو تکرار پسند نہیں۔ اس کا ہر نقش اپنے اندر ایک قسم کا انوکھا پن رکھتا ہے۔

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں — کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں — مگر عین محفل میں خلوت نشیں

جلوت و انجمن میں بھی فرد کا ذوق یکتائی باقی رہتا ہے تاکہ وہ سب کے ساتھ رہنے کے باوجود اپنی خودی کا الگ تحقق و اثبات کر سکے۔ اسی بنا پر اسباب معاش میں فرق مراتب پیدا ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔ نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیٰوۃ الدنیا ورفعنا بعضھم فوق بعضٍ درجاتٍ لیتخذ بعضھم بعضاً سخریا (ہم نے دنیا کی زندگی میں ان کی روزی تقسیم کر دی ہے اور بعض کے درجے بعض پر بلند کر دئیے ہیں کہ اس طرح ایک دوسرے کو خدمتگار ٹھہراتے ہیں)، و اللہ فضل بعضکم علیٰ بعضٍ

فی الرزق (اللہ نے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی)۔ اس فرق مراتب سے ملکیت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ انسان اشیاء کو اپنی خودی سے وابستہ کر لینے کا خوگر ہے۔ بچپن میں ہی بعض چیزوں کو مخصوص طور پر اپنا سمجھا جاتا ہے اور بعض دوسری چیزوں کو دوسروں کا۔ آہستہ آہستہ یہ اشیاء خودی کا جزء بن جاتی ہیں۔ لیکن اگر کسی نظام معیشت میں اسباب دولت اور معیشت کے فرق مراتب کے باعث کسی خاص گروہ کو دوسرے گروہ پر دائمی تفوق واقتدار حاصل ہو جائے تو وہ تمدن کے لئے لعنت بن جاتا ہے۔ مدارج معیشت کے فرق کے باوجود انسانیت کا یہ حق ہے کہ وہ دائمی اقتدار صرف احکم الحاکمین ہی کا تسلیم کرے۔ اگر اسباب معیشت سے کسی طبقہ کو دائمی اقتدار حاصل ہو تو ایسی حالت میں معیشت کی تلاش انسانی خودی کو ذلیل ورسوا کرنے کا موجب بن جائے گی جو اقبال کے اساسی فلسفۂ تمدن کے خلاف ہے۔ انسانی زندگی کے لئے یقینا رزق ضروری ہے لیکن روح انسانی اسباب معیشت سے بلند ہے۔ معیشت اس کا مقصود نہیں بلکہ ذریعہ ہے۔ اصل مقصود تو خودی کی نگہبانی ہے۔

خودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب　　　وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند　　　رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

دوسری جگہ اس مطلب کو یوں بیان کیا ہے۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی　　　جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

معاشی عمل میں انسان اپنا فیصلہ وارادہ استعمال کرتا اور ایک معین مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اپنی مساعی کو وقف کر دیتا ہے۔ انفرادی انتخاب کے اصول سے کسی گروہ کی معیشت کو تقویت پہونچنی چاہیئے نہ کہ ضعف۔ افراد ہی اپنے اوصاف اور اپنے عمل پیہم سے اجتماعی ترقی کا سرچشمہ مہیا کرتے ہیں۔ ہاں، اس کی پابندی کرانا معاشرہ کا فرض ہے کہ افراد کے ایسے اوصاف کی مطلق قدر افزائی نہ کی جائے جن سے ابتری پیدا ہوتی ہے۔ اس قسم کے اوصاف موجودہ سرمایہ داری کے نظام میں ظہور پذیر ہو رہے ہیں اور ان کے باعث

اس نظام سے عام بیزاری پیدا ہوگئی ہے۔

اس قسم کے معاشی نظام کا تصوّر ممکن ہے جس میں ملکیت کے جذبہ کی تشفی کے ساتھ ملکیت کو دوسروں کے فائدے کے لئے استعمال کرنے کے ضوابط وضع کئے جاسکیں۔ یہ ضوابط اخلاقی اور قانونی صورت اختیار کریں گے جن کی پابندی پر معاشرہ کو اصرار ہوگا۔ سرمایہ داری کا سب سے بڑا نقص یہی ہے کہ اس میں ملکیت کے جذبہ کی تشفی صرف چند اشخاص کے لئے ممکن ہوتی ہے۔ دوسروں کو غیر حقیقی نفع کی امید میں کام میں لگایا جاتا ہے لیکن ان کی شخصیت کی تکمیل کا کوئی سامان نہیں مہیّا کیا جاتا۔ اس نظام میں اکثریت کی ساعی منتشر، غیر مربوط اور میکانکی حیثیت رکھتی ہیں اور ایک قسم کے عام احساسِ نامرادی کی شکل اختیار کرلیتی ہیں۔ معاشی بندگی اور آقائی اس نظام کی خصوصیت ہے۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں ۔۔۔ تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے

اسلام نے ایک خاص قسم کی سرمایہ داری کو جائز ٹھہرایا ہے۔ یہ ایسی سرمایہ داری ہے جس میں اشیا، قدر و قیمت رکھتی ہیں اور اشخاص میں صلاحیتوں کے فرق کے باعث دولت کا فرق ہونا لازمی ہے۔ قرآن کریم میں بصراحت مذکور ہے ویوت ذی فضل فضلہ (ہر فضیلت والے کو فضیلت دی جائے گی)، و لکل درجٰتٌ مما عملوا (اور ہر ایک کے مرتبے ان کے اعمال کے مطابق ہیں)۔ فرقِ مراتب کو تسلیم کرنا اس واسطے ضروری ہے کہ تمدن کی ترقی مسدود نہ ہوجائے اور افراد کی حوصلہ مندیوں کے اظہار کے لئے مواقع باقی رہیں تاکہ پوری جماعت ترقی کرتی رہے۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ تجارتیں کرتے تھے، دولت جمع کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ اجتماعی مقاصد کے لئے اس دولت کو بے دریغ صرف بھی کرتے تھے۔ تجارت و حرفت میں اسلام نے ہمیشہ انفرادی آزادی کے اصول کو تسلیم کیا۔ اجیر و متاجر کے تعلق کو عرف و رواج پر چھوڑ دیا گیا تاکہ مختلف احوال سے مطابقت میں سہولت ہو۔ حکومت کی مداخلت صرف ان شاذ صورتوں میں روا رکھی گئی جب کہ کسی خاص طبقہ پر ظلم ہو رہا ہو۔ پھر اس کا انتظام کیا گیا کہ اسلامی نظام معیشت میں مستقل طور پر

ایسے اسباب نہیں موجود ہونے چاہیں جو دائمی طور پر معاشرہ کو دولت مندوں اور مفلسوں میں تقسیم کر دیں۔ حقِ معیشت کی مساوات اس نوعیت سے ہونی چاہئیے کہ بغیر محنت کے کوئی شخص معاشی خوشحالی کی منزل تک نہ پہونچ سکے۔ اور اگر اس منزل تک پہونچ جائے تو معاشرہ میں اس کو کوئی غیر معمولی حقوق نہ حاصل ہونے چاہئیں۔ اصول وراثت، زکوٰۃ اور سود کی ممانعت سے ایسا انتظام کیا گیا کہ سرمایہ معاشرہ کے مختلف طبقوں میں چلتا پھرتا رہے اور زیادہ عرصہ تک کسی ایک خاندان کے ہاتھ میں نہ رہ سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشی ترقی صرف انھیں کے لئے ممکن ہوگی جو اس باب میں خاص اہلیت رکھتے ہیں۔ معاشی عدل قائم رکھنے کا اس سے بہتر طریقہ تصور میں نہیں آسکتا۔ اس نظام میں دولت کا فرق فضیلت و برتری کی ضمانت نہیں ہو سکتا جیسا کہ اسلامی تاریخ شاہد ہے فضائل کا منبع روحانی زندگی ہی رہے گی نہ کہ خارجی مادی زندگی۔

یہ ہر شخص کا حق ہے کہ وہ استحکام خودی کا سامان بہم پہونچائے اس لئے کہ دائمی طور پر کسی دوسرے کا دست نگر ہونا خودی کے ضعف کا باعث ہوگا۔ حدیث شریف میں ہے۔ الید العلیا خیرٌ من ید السفلیٰ (اونچا ہاتھ (دینے والے کا) نیچے ہاتھ (لینے والے کے ہاتھ سے) بہتر ہے)۔ انسان کے دولتمند ہونے میں مضائقہ نہیں بشرطیکہ دولت کے استعمال پر تحدید عاید کر دی گئی ہو لیکن دست سوال دراز کرنا اجزائے خودی کے انتشار کا باعث ہے۔

از سوال آشفتہ اجزائے خودی　　بے تجلی نخل سینائے خودی
از سوال افلاس گردد خوار تر　　از گدائی گدیہ گر نادار تر

اسی مضمون کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

تا توانی کیمیا شو گِل مشو　　در جہاں منعم شو و سائل مشو

اقبال کا فقر کا تصور رائج الوقت تصور سے بالکل مختلف ہے۔ اصول فقر پر عمل کرنے والا سائل نہیں ہو سکتا۔ اس کا دل بے نیاز ہر دو جہاں سے غنی ہوتا ہے۔

میں ایسے فقر سے اے اہل حلقہ باز آیا　　تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

اشتراکی معیشت ذاتی ملکیت اور مبادلہ دونوں کو ختم کرنا چاہتی ہے اور یہی دونوں معاشی دنیا میں قدر کو معین کرنے والے عناصر ہیں۔ یہ بغیر زر کی معیشت ہے۔ اشتراکیت کے نزدیک اشیاء کی قدر افزینی انفرادی فرق مراتب کو حق بجانب ثابت کرنے کا ذریعہ ہے۔ مارکس نے مزدور پیشوں کی ہمہ گیر مملکت کے ذریعہ معاشی مساوات کا خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر اشتراکی روس میں نظر آرہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سرمایہ داری کے نظام میں سے انسانی اور اخلاقی عناصر ایک ایک کر کے اس طرح خارج ہو گئے تھے کہ اس کے خلاف اشتراکی ردعمل کا ہونا فطری امر تھا۔ لیکن یہ اصل مرض کا علاج نہیں۔ یہ معاشی مسئلہ کو حل کرنے کے بجائے دوسرے اور زیادہ پیچیدہ مسائل کو پیدا کرنے کا موجب ہوگا۔ مکمل اور مطلق مساوات اس امر کی مقتضی ہے کہ انتفاع اشیا میں اباحت مطلقہ موجود ہو۔ ایسی صورت میں کوئی معاشری نظم برقرار نہیں رہ سکتا اور تمدن کے مصالح کُلّی کی نگہداشت نہیں ہو سکتی۔ اقبال کہتا ہے کہ اگر مزدور کو اشتراکی اُصول کے موافق تمدنی زندگی کی باگ ڈور حاصل ہو گئی تو طریق کوہکن میں کچھ دنوں بعد پرویزی حیلے پیدا ہو جائیں گے اور اسی قسم کی یا اُن سے بدتر خرابیاں رونما ہو جائیں گی جن پر آج اشتراکی ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں ہو پھر کیا۔ طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اشتراکیت کی تعلیم مادی اور اقتصادی مساوات چاہتی ہے۔ لیکن وہ صرف لوگوں کے خارجی احوال میں تبدیلی سے اپنا یہ مقصد حاصل کرنے کی مدعی ہے۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ جب تک کوئی تعلیم انسانوں کے دلوں اور نیتوں میں تغیر نہ پیدا کرے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ تمدن کے مظاہر اور لوگوں کی زندگی میں اسی وقت صحیح تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے جب کہ دل بدلیں۔ جو انقلاب "مساوات شکم" کے اصول پر مبنی ہوگا وہ کوئی مستقل تمدنی اقدار نہیں پیدا کر سکے گا۔ یہ بھی انسانیت کا ہزاروں سال کا تجربہ ہے کہ اندرونی تبدیلی مذہب و اخلاق کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔

غربیان گم کردہ اند افلاک را — در شکم جویند جان پاک را

دین آں پیغمبر حق ناشناس[1] — بر مساوات شکم دارد اساس

تا اخوت را مقام اندر دل است — بیخ او در دل نہ در آب و گل است

جب تک معاشی عمل پر اخلاق و مذہب کی روک نہ ہو اس وقت تک وہ بے لگام رہے گا، چاہے وہ معاشی عمل نظام سرمایہ داری کے تحت ہو یا نظام اشتراکیت کے تحت اخلاق ہی کی بدولت نیت کی پاکیزگی پیدا ہوتی ہے اور آدمی حیوانیت کی پستی سے نکل کر انسانیت کے بلند مقام تک پہونچتا ہے (جب تک اخلاقی اور معاشی اعمال ایک دوسرے پر روک کا کام نہ دیں صحیح تمدنی توازن نہیں قائم ہو سکتا۔)

اسلام میں سرمایہ اور ملکیت خدا کی امانت ہے۔ وسائل دولت آفرینی پر نہ فرد کو تصرف کا حق حاصل ہے اور نہ جماعت کو بلکہ خدا کو۔ انسان جوں جوں ترقی کرتا جائے گا ذات واجب تعالیٰ کو اپنا مقصود و منتہا بنا کر اپنے معاشی اداروں میں بھی تبدیلی کرتا رہے گا۔ ہر زمانہ میں انسانی صفات عالیہ اس کا تعین کریں گی کہ کونسا طریق کار تمدنی ضروریات کے لئے مناسب ہے۔ اسلام میں سیاست و معیشت کے باب میں کوئی قطعیت نہیں۔ بنیادی اصول کو حتمی طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ اداروں کی شکلیں بدلتی رہیں گی اور ان میں احوال سے مطابقت ہوتی رہے گی۔ جس طرح سیاست میں حقیقی حاکمیت ذات واجب کی ہے اسی طرح وسائل معیشت خدا کے ہیں جن سے انسان استفادہ کر سکتا ہے۔ جس طرح دنیاوی حاکمیت کا معیار انسانی صفات عالیہ ہیں اسی طرح اسباب معیشت کی فراہمی بھی اخلاق کے تحت ہونی چاہیئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسباب معیشت کو مہیا کرنے میں انسانی سعی و جہد اور ارادہ کو بڑا دخل حاصل ہے لیکن اگر خالق فطرت نے فطری وسائل اور سہولتیں نہ بہم پہونچائی ہوتیں تو انسان کی ساری مساعی دھری کی دھری رہ جاتیں۔ الارض للّٰہ کا فلسفہ

---

[1] کارل مارکس۔

یہی ہے جس کی صراحت ان اشعار میں کی گئی ہے۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب

کون لایا کھینچ کر پچھم سے باد سازگار
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نور آفتاب

کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں!
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں!

دوسری جگہ اسی مطلب کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

رزق خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاع بندہ و ملک خداست

بندۂ مومن امیں، حق مالک است
غیر حق ہر شئے کہ بینی ہالک است

باطن الارض للہ ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

زمین اور سرمایہ پر انفرادی تصرف امانت کے طور پر حق بجانب ہے بشرطیکہ ان کا استعمال ایسے نظام معیشت کے تحت ہو جو کسی شخص کو بھی رزق سے محروم نہ ہونے دے۔ کائنات اور اس کے وسائل اتنے وسیع ہیں کہ اگر انسان عقل و فہم سے کام لیکر اپنی تمدنی زندگی کو صحیح بنیادوں پر قائم کرے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ انسانیت کا بڑا حصہ ناداری اور تنگدستی میں گزر بسر کرے۔ جب ذات واجب رزق کی مالک ہے تو طلب رزق میں غیر اللہ کی غلامی شرف انسانیت کو بٹا لگاتا ہے۔ آیات شریفہ وجعلنا لکم فیہا معایش (اور ہم نے زمین میں تمہارے لئے معاش پیدا کی) اور ان اللہ ھو الرزق ذوالقوۃ المتین (بیشک اللہ ہی روزی دینے والا بڑی زبردست قوت والا ہے) میں اس حقیقت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ رزق اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ جب نظام کائنات پر اُسی کی ذات قادر و مختار ہے تو دو روٹیوں کے لئے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا کیسا؟ یہ شرک کی ایک غیر محسوس لیکن خطرناک شکل ہے۔ اقبال کے نزدیک معیشت کا معیار و مقصود یہ ہونا چاہئے کہ کوئی شخص کسی کا محتاج نہ رہے تاکہ وہ اپنے ممکنات حیات کو آزادی سے ظاہر کر سکے۔

کس نماند در جہاں محتاج کس نکتۂ شرع مبیں این است وبس

مال و دولت فی نفسہ نہ برے ہیں اور نہ اچھے۔ ان کی اچھائی اور برائی کا دارومدار ان کے استعمال پر ہے۔ دولت ایک وجہ سے خیر اور ایک وجہ سے شر بن جاسکتی ہے۔ امام غزالیؒ نے خوب کہا ہے کہ دولت کی مثال سانپ کی سی ہے کہ منتر جاننے والا تو اس کو اس طرح پکڑتا ہے کہ اس میں سے زہر مہرہ نکالے اور غافل اس کو پکڑ کر ہلاک ہو جاتا ہے[1]۔ پھر علم و دولت کے ذریعہ انسان غلبہ و استیلا چاہتا ہے۔ دل کو کمال قدرت طبعاً محبوب ہے اور دولت اسباب قدرت میں سے ہے[2]۔ لیکن اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ انسان، حدود الٰہی کے اندر رہکر اپنی قوتوں اور تصرفات کو استعمال میں لائے تاکہ ان سے اخلاقی مقاصد کی خدمت ہو سکے۔ اجتماعی زندگی میں یہی سب سے بڑھ کر تقویٰ ہے۔

نظام معاشری

باوجود مختلف افراد میں معیشت کا فرق تسلیم کرنے کے اسلام نے معاشری مساوات کے اصول کو تسلیم کیا اور اپنی ساڑھے تیرہ سو سال کی زندگی میں اس ضمن میں ایسی مثالیں پیش کیں جن کی نظیر دنیا کا کوئی دوسرا تمدن نہیں پیش کر سکتا۔ آج بھی دن میں پانچ وقت محتاج و غنی ایک ہی صف میں بلا فرق مراتب کھڑے ہو کر مالک حقیقی کے آگے عرض نیاز کرتے ہیں۔ دولت و ثروت کا فرق اخوت اسلامی کی راہ میں کبھی بھی سنگ گراں نہ بن سکا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اسلام میں مغربی تمدن کے خلاف اخوت و مساوات کا دارومدار خارجی مادی احوال پر نہیں ہے بلکہ انسان کی اندرونی اخلاقی کیفیت پر مبنی ٹھیرایا گیا۔

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

یہ اخوت و محبت تمام انسانوں میں قدر مشترک ہونی چاہیے۔ نوع انسان کو ہوس نے

---

[1] احیاء العلوم الدین۔ جلد ۳۔ صفحہ ۲۱۴ (ترجمہ اردو)

[2] " " " ۲۴۴

ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے ورنہ حقیقت میں انسانیت ایک عضوی کُل ہے۔

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو   اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

آنحضرت صلعم سے ابوجہل کو سب سے بڑی شکایت یہی تھی کہ آپ کی تعلیم سے مساوات و اخوت کے اصول مستحکم ہو گئے اور نسلی شرافت و فضیلت کا تصور ملیا میٹ ہو گیا۔

مذہب او قاطع ملک و نسب   از قریش و منکر از فضل عرب
در نگاہ او یکے بالا و پست   با غلام خویش بر یک خوان نشست
احمراں با اسوداں آمیختند   آبروئے دودمانے ریختند

اقتصادی فرق و امتیاز اور معاشری مساوات باہم نقیض نہیں ہیں۔ دولت و ثروت نہ تو کسی شخص کو لازماً نیکی اور تقویٰ سے محروم کرنے والی ہیں اور نہ فضیلت کا حقیقی معیار ہیں۔ صحابۂ کبار میں حضرت عثمانؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ جیسے دولتمند بھی تھے اور اصحاب صفہ جیسے مفلس و نادار بھی۔ لیکن چونکہ ان سبھوں کی اندرونی زندگی میں تغیر پیدا ہو چکا تھا اس واسطے خارجی احوال کے فرق سے مساوات و اخوت میں کسی قسم کا رخنہ نہ پڑا۔ بعد میں بھی یہی روایات کسی نہ کسی شکل میں تاریخ اسلام میں موجود رہیں جو اسلام کے ابتدائی عہد میں قائم ہو چکی تھیں اور آج بھی ان کی ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے۔

ہمیشہ سے یہ ایک معرکتہ الآرا مسئلہ رہا ہے کہ معاشری زندگی میں نظام عائلی کی کیا حیثیت ہے۔ چونکہ اقبال کے تصورات تمدن اسلامی تعلیم پر مبنی ہیں اس لئے اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ صنف نازک کے متعلق اس کے خیالات وہی ہیں جو اس کے نزدیک اسلامی تہذیب کے اصلی رنگ کو برقرار رکھنے والے ہیں۔ اسلام تمدنی زندگی میں عورت کے خاص مقام کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ حسن معاشرت کی تاکید کرتا ہے۔ اس کی عظمت اس سے زیادہ کیا ہو گی کہ جنت کو ماؤں کے پاؤں تلے بتایا گیا۔ اس سے ایک طرف تو عورت کی عظمت کا اظہار مقصود تھا اور دوسرے اس کے فرائض امومت کی اہمیت

واضح کرنا تھا جنت اسی وقت اس کے پاؤں تلے ہو گی جب کہ وہ ماں بنے گی۔

آنکہ ناز و بر وجودش کائنات ذکر او فرمود با طیب وصلواۃ
گفت آن مقصود حرف کن فکاں زیر پائے امہات آمد جناں

تہذیب مغرب کے اثر سے مسلمانوں میں بھی آزادی نسواں کا غلغلہ بلند ہوا۔ اقبال اس آزادی کے دعوے پر اپنے مخصوص انداز میں تنقید کرتا ہے۔ وہ عورت کو اجتماعی خودی کا ضامن ٹھیراتا ہے۔ اس کے نزدیک عورت کی زندگی کا مقصود و منتہا نسل انسانی کو برقرار رکھنا ہے۔ اس کے سارے قوائے فطرت نے اس مقصد کو پورا کرنے کی غرض سے بنائے ہیں۔ یہ اتنا عظیم الشان مقصد ہے کہ دوسرے مقاصد اس کے آگے ہیچ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ عورت کو بھی وہی انسانی حقوق حاصل ہیں جو مرد کو لیکن دونوں کا دائرۂ عمل الگ الگ ہے۔ دونوں اپنی اپنی استعداد کے مطابق ایک دوسرے کے ساتھ تعاون عمل کرکے تمدن کی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ وہ مرد اور عورت کی مکمل مساوات کا قائل نہ تھا۔ اپنے ایک لکچر میں اس نے اس ضمن میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے:۔

"میں مرد اور عورت کی مساوات مطلق کا حامی نہیں ہوں۔ قدرت نے ان دونوں کے تفویض جدا جدا خدمتیں کی ہیں اور ان فرائض جداگانہ کی صحیح اور باقاعدہ انجام دہی خانوادۂ انسانی کی صحت اور فلاح کے لئے لازمی ہے۔ مغربی دنیا میں جہاں نفسی نفسی کا ہنگامہ گرم ہے اور غیر معتدل مسابقت نے ایک خاص قسم کی اقتصادی حالت پیدا کر دی ہے، عورتوں کا آزاد کر دیا جانا ایک ایسا تجربہ ہے جو میری دانست میں بجائے کامیاب ہونے کے الٹا نقصان رساں ثابت ہوگا اور نظام معاشرت میں اس سے بے حد

پیچیدگیاں واقع ہو جائیں گی اور عورتوں کی اعلیٰ تعلیم سے
بھی جس حد تک کہ افرادِ قوم کی شرحِ ولادت کا تعلق ہے جو
نتائج مترتب ہوں گے وہ بھی غالباً پسندیدہ نہ ہوں گے۔ خاندانی
وحدت کے رشتہ کو جو بنی نوعِ انسان کی روحانی زندگی کا
جزرِ اعظم ہے یہ حریت توڑ دیتی ہے۔" (ملتِ بیضا پر عمرانی نظر ص ۳۸)

آزادیٔ نسواں کی تحریک جدید مغربی تہذیب کا ایک شاخسانہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ عورت کو ہر معاملہ میں مردوں کے دوش بدوش کر دیا جائے۔ وہ سیاست اور معیشت میں ہر اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے تیار رہے جس سے مرد عہدہ برا ہوتے ہیں۔ اقبال کا خیال ہے کہ اگر عورت کی فطرت سیاست و معیشت کی آلودگیوں میں پھنسے گی تو وہ اپنا نسوانی جوہر کھو دیگی جو اس کا منشاء وجود ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عورت کا نصب العین یہ نہ ہونا چاہیئے کہ وہ افلاطون کے سے مکالمات لکھے اور اپنے علم و فضل کا سکہ بٹھائے بلکہ یہ کہ وہ ایک ایسے شخص کی ماں بنے جو افلاطون کے سے مکالمات لکھ سکے۔ اس کا اصلی منصب امومت ہے۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ	اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ درون
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی	کہ ہر شرف ہے اسی درج کا دُرِ مکنون
مکالماتِ فلاطون نہ لکھ سکی لیکن	اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرارِ افلاطون

عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کا اگر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ امومت کی ذمہ داریوں سے کترانے لگیں اور انفرادی عیش و آسائش میں مشغول ہو جائیں تو نسلِ انسانی کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی خطرہ تصور میں نہیں آسکتا۔ اقبال کہتا ہے کہ ایسا گُل ہمارے بستانِ تمدن میں اگر کبھی نہ کھلے تو اچھا ہے۔

علم او بارِ امومت بر نتافت	بر سرِ شاخش یکے اختر نتافت

ایں گل از بستان ما نارستہ بہ | داغش از دامان ملت شستہ بہ
دوسری جگہ حکیم یورپ سے اس طرح استفسار کیا گیا ہے۔

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے | ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال | مرد بیکار و زن تہی آغوش

اقبال نے "جاوید نامہ" میں تجدد پسند عورت کا خاکہ کھینچا ہے۔ عالم علوی کی سیر کے دوران میں دوشیزۂ مریخ سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ ایک وسیع میدان میں مردوں اور عورتوں کا ہجوم تھا اس ہجوم میں ایک بلند و بالا اور روشن جبیں عورت نظر آئی۔ لیکن اس کے چہرہ کی رونق میں نور جاں کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ اس کی باتیں بے سوز اور آنکھیں بے نم تھیں۔ وہ سر در آرزو سے یکسر محروم تھی۔ اس کا سینہ جوش شباب سے عاری اور عشق و شوق کی لذتوں سے بے خبر تھا حکیم مریخی نے اقبال کو بتایا کہ یہ عورت فرنگستان کی رہنے والی ہے اور نبوت کی مدعی ہے۔ اس کا پیغام صنف نازک کو مرد کی غلامی سے آزاد کرانا ہے۔ مختصر طور پر اس کی تعلیم یہ ہے۔

اے زناں، اے مادراں، اے خواہراں | زیستن تا کے مثال دلبراں
دلبری اندر جہاں مظلومی است | دلبری محکومی و محرومی است
در دو گیسو شانہ گردانیم ما | مرد را نخچیر خود دانیم ما
مرد صیادی بہ نخچیری کند | گرد تو گردد کہ زنجیری کند
ہم بر او بودن از ارحیات | وصل او زہر و فراق او نبات
مار پیچاں از خم پیچش گریز | زہر ہائش را بخون خود مریز
از اموحت زرو روئے مادراں | اے خوشا آزادیٔ بے شوہراں

پھر آگے چل کر وہ اپنی ہم صنفوں کو سمجھاتی ہے کہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ سائنس نے تمام اقدار حیات کو الٹ پلٹ دیا ہے۔ اب نسل انسانی بغیر عورتوں کے بھی دنیا میں جاری رہ سکے گی۔ سائنس والوں کے معملوں میں جتنی آبادی کی ضرورت ہوگی اتنے بچے پیدا کر لئے جائیں گے

ضرورت کے مطابق لڑکے ہوں گے اور ضرورت کے مطابق لڑکیاں ہوں گی۔ انسانی عقل اب اسرارِ حیات کو اس طرح جدید طور پر ظاہر کرے گی اور تارِ زیست بے مضراب کے اپنے نغمے پیدا کر سکے گا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم بھی مردوں کی طرح آزاد نہ ہوں۔

حاصلے برداری از کشتِ حیات - ہر چہ خواہی از بنین و از بنات
پرورش گردد چنیں نوعِ دگر - بے شب ارحام دریا بد سحر
خود بخود بیروں فتد اسرارِ زیست - نغمہ بے مضراب بخشد تارِ زیست
خیز و با فطرت بیا اندر ستیز - تا زپیکار تو حُر گردد کنیز

مسئلہ نسوان کے متعلق اقبال کی قطعی طور پر یہ رائے ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرتے اور اس طرح تعمیرِ تمدن کے فرائض کی انجام دہی کرتے ہیں۔ ان دونوں کے قویٰ میں فطرت نے جو فرق رکھا ہے اس کا مقصد اسرارِ حیات کو کائنات میں محفوظ رکھنا ہے۔ نسوانی جوہر خاک کو آدم بناتا اور اپنے سوز دروں سے ثباتِ زندگی کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔

مرد و زن وابستۂ یک دیگر اند - کائنات شوق را صورت گر اند
زن نگہ دارندۂ نارِ حیات - فطرت او لوحِ اسرارِ حیات
آتش ما را بجان خود زند - جوہر او خاک را آدم کند
در ضمیرش ممکنات زندگی - از تب و تابش ثباتِ زندگی
ارج ما از ارجمندیہائے او - ما ہمہ از نقش بندیہائے او

اس کو کیا کیجئے کہ جوہر مرد کو فطرت بے منتِ غیر عیاں کرتی ہے اور جوہر نسوانی کو غیر کا مرہونِ منت رکھا گیا ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ میں بھی اس مجبوری سے غمناک ہوں لیکن اس مسئلہ کا کوئی حل موجود نہیں سوائے اس حل کے جو خود فطرت نے تجویز کیا ہے۔

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر - غیر کے ہاتھوں میں ہے جوہرِ عورت کی نمود
راز ہے اس کے تپِ غم کا یہی نکتۂ شوق - آتشیں لذتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود

کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرارِ حیات		گرم اسی آگ سے ہے معرکۂ بود و نبود
میں بھی مظلومیِ نسواں سے ہوں غمناک بہت		نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

اقبال نے حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی سیرت کو عورتوں کے لئے بطور نصب العین پیش کیا ہے۔ بیٹی کی حیثیت سے، بیوی کی حیثیت سے اور ماں کی حیثیت سے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی زندگی تمام دنیا کی عورتوں کے لئے نمونہ ہے۔

مزرعِ تسلیم را حاصل بتول رضی اللہ عنہا		مادراں را اسوۂ کامل بتول رضی اللہ عنہا
آں ادب پروردۂ صبر و رضا		آسیا گرداں و لب قرآں سرا

اگر کسی عورت کے بطن سے ایک سچا شخص پیدا ہو جائے جو حق کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصودِ منتہا بنائے تو گویا اس نے اپنے منشاءِ وجود کو پورا کر دیا۔

فطرت تو جذبہ ہا دارد بلند		چشم ہوش از اسوۂ زہرا مبند
تا حسینے شاخ تو بار آورد		موسمِ پیشیں بہ گلزار آورد

بعض لوگوں کو یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ اقبال مردوں کے لئے اثبات خودی کی تعلیم دیتا ہے اور عورتوں کو اس کا موقع نہیں دینا چاہتا کہ وہ آزادی حاصل کرکے اپنی خودی کا تحقق و اثبات کریں لیکن حقیقت میں اقبال کا نقطۂ نظر اس باب میں یہ نہیں کہ وہ عورتوں کی ترقی کے خلاف ہے۔ ہاں، وہ ان طریقوں کے خلاف ہے جو آزادیِ نسواں کی تحریک نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اختیار کئے ہیں۔ اس کے نزدیک خودی کی ترقی کا ذریعہ یہ ہے کہ ہر فرد اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں آزاد ہو۔ عورت کی صلاحیتیں مرد کی صلاحیتوں سے مختلف ہیں۔ ان صلاحیتوں کو ایک بتانا اور ان کے فرق سے انکار کرنا فطرت کو منہ چڑانا ہے۔ عورت کی خودی کا اثبات اس میں مضمر ہے کہ فرائض امومت کی انجام دہی کے لئے اس کو پورے مواقع بہم پہونچائے جائیں۔ تہذیب و تمدن کی اس سے بڑھ کر کوئی خدمت نہیں کہ عورت اپنی عزت نفس کو

برقرار رکھتے ہوئے نسل انسانی کی بقا کی ذمہ داری اپنے اوپر لے۔ امومت رحمت ہے اور بقول اقبال اس کو نبوت سے نسبت خاص ہے۔

نیک اگر بینی امومت رحمت است　　زانکہ او را با نبوت نسبت است
شفقت او شفقت پیغمبر است　　سیرت اقوام را صورت گر است
از امومت پختہ تر تعمیر ما　　در خط سیمائے او تقدیر ما

عورت لذت تخلیق کا پیکر مجسم ہے۔ اس کی خودی امومت کے فرائض انجام دیکر ہی اپنا استحکام کرسکتی ہے۔ ورنہ اگر وہ اس شاہراہ کو چھوڑ کر جو فطرت کی مقرر کی ہوئی ہے دوسرا راستہ اختیار کرے گی تو نامرادی کی گھاٹیوں میں بھٹک جائے گی۔ فطرت کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے سوز دروں سے اسرار حیات کی حفاظت کرے اور اس طرح اپنے ذاتی جوہر بھی نمایاں کرے۔

راز ہے اس کے تپ غم کا یہی نکتۂ شوق　　آتشیں لذت تخلیق سے ہے اس کا وجود
کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرار حیات　　گرم اسی آگ سے ہے معرکۂ بود و نبود

ارتقائی اخلاقیات اور سیاسیات

از

جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب ایم۔اے۔پی ایچ ڈی
پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)

تاریخ میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ کسی ایک دور میں ایک نظریۂ حیات کسی قوم یا مجموعۂ اقوام پر چھا جاتا ہے اور زندگی کی رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ کسی پوری قوم کی نفسیات پر یاس و قنوط نے قبضہ جما لیا جیسا کہ قدیم ہندوستان میں ہوا۔ سوچنے والے مفکر اور محسوس کرنے والے صوفی اس خیال پر آکر ٹھیر گئے کہ سنسار میں دُکھ ہی دُکھ ہے۔ قیدِ حیات اور بندِ غم اصل میں ایک ہی ہیں۔ اس خیال کے طاری ہوتے ہی تمام فلسفہ اور مذہب اس رنگ میں رنگا گیا۔ بدھ مت نے فطری اور نفسی زندگی دونوں کو بے اصل قرار دیا اور اس نتیجے پر پہونچا کہ زندگی قابل اصلاح نہیں ہے اس لئے اصلاحی کوششیں سعی لاحاصل ہیں۔ یہ دردِ سر کسی صندل سے رفع نہیں ہو سکتا۔ بس سر جائے تو درد سے بھی نجات ہو۔ محض موت سے بھی اس بلائے بے درماں سے مکتی حاصل نہیں ہو سکتی۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

زندگی دیوانے کا ایک وحشتناک خواب ہے اس سے چھٹکارا تب ہو سکتا ہے کہ ایک طرف دیوانگی رفع ہو اور دوسری طرف خواب سے بیداری حاصل ہو۔ لیکن جب تک دماغ اور شعور موجود ہیں اس دکھ سے چھوٹ نہیں سکتے۔ تکوین اور آفرینش کی جڑیں خواہش

اور ارادے میں ہیں جب تک تمام خواہش اور تمام ارادے سوخت نہ ہو جائیں اور فریب حواس اور فریب عقل کا پوری طرح سے اندازہ نہ ہو جائے موت وحیات کی کشمکش باقی رہے گی۔ زندگی نگاہِ غلط کی سزا ہے۔ لیکن یہ نگاہ غلط کاہے کی پاداش ہے اس سے آگے تخیل اور تعقل چکر میں آجاتے ہیں لیکن دنیا کی اصل حقیقت بے حقیقتی ہے۔

صورتِ وہمی بہ ہستی متہم داریم ما
چوں حباب آئینہ برطاقِ عدم داریم ما (بیدل)

غرض یہ کہ خلقت عبث اور باطل ہے۔ اس میں نہ کوئی غرض ہے نہ مقصد، نہ اس کی کوئی قابل فہم ابتدا ہے نہ انتہا۔ زندگی کے تمام اقدار باطل، اس کے نصب العین سراب وحباب، اس کی تمنائیں نقش برآب۔ جب زندگی کا کوئی مقصد نہیں تو اس کے تغیرات محض تغیرات ہیں۔ تاریخ کے مطالعہ سے کوئی نفع حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسکندر و دارا کے قصے کنہ حیات پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتے۔ کسی خدائے خالق و ناظم کا عقیدہ اس قسم کے نظریہ حیات کے ساتھ وابستہ نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی ترقی یا ارتقا کا کوئی تصور قائم ہو سکتا ہے۔ یہی کیفیت یونان اور روما کی تہذیبوں کے ایک دور میں پیدا ہوئی اسی لئے رواقی حکما، خودکشی کو ایک مستحسن فعل قرار دیتے تھے اور بڑے بڑے سربرآوردہ لوگ احباب کو دعوت دے کر برسرِ محفل کسی سجے سجائے تخت پر لیٹ کر اپنی کلائی جراح کی طرف کر دیتے تھے جو رگِ نبض کو کاٹ دیتا تھا۔ جیسے جیسے خون بہتا جاتا موت کی غنودگی طاری ہوتی جاتی تھی یہاں تک کہ جسم بے خون ہو کر سرد ہو جائے۔

جب زندگی کا حاضر بے معنیٰ اور لاطائل ہے تو اس کا ماضی اور بھی زیادہ حقیقت سے دور ہے اور اس کے ماضی اور حال سے اس کے مستقبل پر کوئی روشنی نہیں پڑ سکتی اسی لئے جن قوموں پر یہ فلسفہ طاری ہو جائے وہ تاریخ کی طرف سے بہت بے اعتنائی برتتی ہیں اور دوسری طرف اصلاحِ تمدن یا ترقی تہذیب کی طرف راغب نہیں ہوتیں۔

یہ تو یاس اور زندگی کو بے اساس سمجھنے کی انتہائی مثالیں ہیں لیکن قدیم تہذیبوں میں کہیں کہیں یہ نظریہ ذرا کم بھیانک صورتوں میں بھی ملتا ہے۔ قدیم عیسائیت کا نظریہ حیات بھی ایک لحاظ سے قنوطی تھا۔ ارتقائے حیات کا کوئی تصور اس کے ساتھ وابستہ نہیں ہو سکتا تھا۔ انسانی زندگی آدمؑ اور حواؑ کے شجر ممنوعہ کے سیب کا درخت تھا یا خیر و شر کا درخت یا گندم یا جنسی عمل تھا جو کچھ بھی تھا خدائے قہار اس کو معاف نہیں کر سکتا تھا اور قدیم مطلق العنان بادشاہوں کی طرح کسی بڑے جرم کی سزا محض جرم ذات تک محدود نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک مجرم کے جرم سے پورا خاندان اور آئندہ پیدا ہونے والی نسلیں بھی زیر عتاب آجاتی تھیں۔ قدیم عیسوی عقائد کے مطابق خود تناسل کا سلسلہ سزا کے طور پر شروع ہوا اور چونکہ زن مرد کے مقابلے میں زیادہ مجرم اور ظالم قرار دی گئی تھی "البادی اظلم" کے اصول کے مطابق وہ زیادہ شدید عذاب کی سزاوار قرار دی گئی۔ حمل اور وضع حمل کی جانکاہ سزا اس کے لئے تجویز کی گئی۔

زندگی کا تمام ڈرامہ یہی دو تین ایکٹ کا ڈراما ہے۔ آفرینش آدم، جرم آدم، سزائے مسلسل، دوزخ ابدی اور بہترین انسان پسرِ خدا کی قربانی بطور کفارہ یا ادائے جرمانہ اور اس ڈرامے پر عقیدہ واحد ذریعہ نجات۔ ایسے عقائد سے قدیم ہندوستانی عقائد کی طرح بہت بھیانک نتائج اخذ ہو سکتے تھے اور حقیقتاً اخذ کئے بھی گئے لیکن ایک خدائے رحیم و کریم کے تصور اور فرد کے لئے امید نجات اور خدا کی بادشاہت کے قیام کی توقع نے اس نظریہ حیات کی تلخی کو بہت کچھ گوارا بنا دیا۔ اس ظلمت کدے میں امید کی چند کرنیں پڑتی رہیں لیکن یہ تمام امید یا باطنی زندگی کے تغیر یا حیاتِ بعد الموت کے ساتھ وابستہ تھیں۔ تہذیب و تمدن کی اصلاح یا ترقی کا سوال اس میں پیدا نہیں ہوتا تھا۔ خدا کی بادشاہت خارج میں قائم نہیں ہو سکتی قیصر و کسریٰ جو کچھ طلب کریں بے چون و چرا ان کے حوالے کر دو ظلم کو خوشی سے سہو تاکہ تمہاری روحانی ترقی ہو اور آخرت درست ہو۔ تمدنی اصلاح کی طرف توجہ نہ کرو کیونکہ یہ دنیا بہت جلد ختم ہونے والی ہے اور قیامت آنے والی ہے

جب کہ ہر چیز کا تختہ الٹ جائے گا ظالم کیفر کردار کو پہونچیں گے۔ امیروں کے لئے جنت میں داخل ہونا اونٹ کے سوئی کے ناکے میں داخل ہونے کی طرح ناممکن ہوگا غریب کو حلۂ ریشمیں ملیگا اور امیر کو لباس آتشیں۔ دنیا ہبوطِ آدم یعنی زوال حیات سے شروع ہوئی سزا سے جاری رہی اور عذاب ابدی میں ختم ہوئی سوائے چند مبارک روحوں کے جو خاص عقائد کی بدولت نجات پا گئیں۔

اس کے بعد ایک اور نظریہ حیات ملتا ہے جو بہت سی اقوام پر طاری ہوا۔ اس کے مطابق زندگی عبث اور باطل نہیں ہے نہ زوال آدم کمال آدم کا ذریعہ بن گیا اس نے کہا کہ انسان فطرتِ الٰہی یا فطرت صیحہ پر پیدا ہوتے ہیں زندگی کا ماحول اور ان کا ذاتی اخلاقی اختیار ان کو نیک یا بد بنا دیتا ہے۔ بدی زندگی کا جوہر اصلی نہیں ہے اور زندگی میں نتائج کا مدار نیکی اور بدی کے توازن پر ہے نیکیاں بدیوں کو ملیا میٹ کرتی رہتی ہیں۔ نجات کے لئے خالص اور بے لوث نیکی لازمی نہیں ضروری امر صرف یہ ہے کہ نیکیوں کا پلڑا بھاری رہے۔ فرد کی زندگی کے اس محاسبہ کے ساتھ اقوام کی زندگی کے متعلق کچھ اہم نظریات اس تعلیم میں داخل تھے۔ ایک تو یہ کہ کوئی امت یا ملّت ازلی اور ابدی نہیں امتیں بھی اسی طرح پیدا ہوتی اور مرتی ہیں جس طرح کہ افراد کوئی ملت اس قانون کی گرفت سے باہر نہیں۔ اخلاق حسنہ سے قوموں کو عروج ہوتا ہے اور اخلاق سیئہ سے ان کو زوال آجاتا ہے۔ جب کوئی قوم اپنے اخلاق بدل لے تو اس کے ماحول اور تہذیب و تمدن میں عظیم تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔

لیکن فرد کے عروج و زوال اور اقوام کے عروج و زوال میں کسی لازمی ارتقائے مسلسل کا تصور اس نظریہ میں بھی نمایاں طور پر نظر نہیں آتا۔ افراد گرتے بھی ہیں اور ابھرتے بھی اور اسی طرح قومیں گرتی بھی ہیں اور ابھرتی بھی۔ عذاب و ثواب اور جزا و سزا کا قانون سب کی زندگیوں پر حاوی ہے۔ لیکن یہ تصور کرنا ضروری نہیں کہ نوع انسان بحیثیت مجموعی بحیثیت نوع اپنے ممکنات کو کمالات اور واقعات میں تبدیل کر رہی ہے۔ کائنات کے عام ارتقا اور نوعی ترقی کا تخیل حیات و کائنات کے اس صحت مندانہ تصور کے ساتھ ترقی نہ کر سکا۔ فرد اور جماعت کا

گہرا تعلق اور اخلاق اور تہذیب و تمدن کے لئے جماعتی زندگی کا لزوم اس نظریۂ حیات کی اساس تھے لیکن اصل مقصد فرد کی اخلاقی ترقی اور اس کی انفرادی نجات تھا۔ اس کے اندر یہ خیال نہیں تھا کہ نوع انسان ترقی کر رہی ہے یا اس کا ارتقا لازمی ہے۔ ترقی کا تصور فرد سے آخرت کی طرف منتقل ہو جاتا تھا اور آخرت کوئی میدان ارتقا نہیں وہ دار العمل نہیں بلکہ دار الجزا ہے وہاں گردش ایام نہیں بلکہ سرورِ ابدی یا سزائے ابدی ہے۔ اسلامی حکما اور صوفیا میں کہیں کہیں ارتقا کا تصور پایا جاتا ہے لیکن وہ عام طور پر فرد کا روحانی ارتقا ہے اگرچہ مولانا روم کے مشہور اشعار کی طرح طرز بیان ایسا ہوتا ہے کہ اس کو فرد سے اٹھا کر نوع یا عالم پر بھی پھیلا سکتے ہیں۔

از جمادی مردم و نامی شدم — وز نما مردم بحیواں سر زدم
مردم از حیوانی و آدم شدم — پس چہ ترسم کے ز مردن کم شوم
حملۂ دیگر بمیرم از بشر — پس برآرم از ملائک بال و پر
بار دیگر از ملک پراں شدم — ہر چہ اندر وہم ناید آں شوم
پس عدم گردم عدم چوں ارغنوں — گویدم کہ انّا الیہ راجعون

اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس تصور میں نوع انسان یا کائنات کے مسلسل ارتقا کا سوال نہیں ہے ایک انفرادی روح جمادات سے نباتات اور نباتات سے حیوانات اور حیوان سے انسان اور فرشتہ بنتی ہوئی اپنے مبدءِ ازلی کی طرف واپس جا رہی ہے۔ اگر یہ تصور تمام ذرات تمام مخلوقات اور تمام ارواح پر پھیلا دیا جائے تو اس میں سے ارتقا کا ایک ہمہ گیر نظریہ پیدا ہو سکتا ہے جو نوع انسان کے ارتقا پر بھی حاوی ہو۔ لیکن یہ ایک صوفی حکیم کا تصور ہے کسی قوم یا کسی دور تہذیب یا کسی مذہب کا تصور نہیں اگرچہ زور تفکر کسی خاص مذہب سے اس کو اخذ کرنے میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو سکتا ہے۔

اس سے کوئی ایک صدی قبل تک نوع انسان کے کمال و زوال کے متعلق جو خیال طبائع میں جاگزیں تھا وہ یہ تھا کہ زمانہ روز بروز سال بسال اور صدی بصدی خراب سے خراب تر ہوتا جاتا

ہے۔ ہر دور کے لوگ یہی کہتے تھے کہ ہم سے پہلے لوگ ہم سے اچھے تھے اور ان سے پہلے ان سے اچھے یہاں تک کہ حضرت آدم تک پہنچ جائیں جو باوجود ایک لغزش کے نبی اول تھے۔ ہر قوم کا عہد زریں اس کے ماضی میں تھا۔ مذہبی قومیں اپنے مذہب کے آغاز کا زمانہ بہترین زمانہ تصور کرتی تھیں جب انسان خدا سے اور زمین آسمان سے بہت قریب تھی تابعین ان سے برے اور تبع تابعین ان سے بدتر یہاں تک کہ نوبت بمارسید جو ارذل الخلایق ہیں اور جن کی نجات اپنے اعمال کی بہ دولت نہیں بلکہ فقط خدائے رحیم وکریم کے کرم بے پایاں کی بدولت ہوسکتی ہے۔ قدیم زمانوں میں لوگ نہ صرف اخلاقی طور پر بہتر تھے بلکہ جسمانی طور پر بھی ہم سے اچھے تھے۔ ان کی عمریں بھی ہزار سال تک پہنچ جاتی تھیں۔ یہ خیال قدامت پرستی کی جڑ ہے ہر چیز میں ماضی سے سند حاصل کی جاتی ہے۔ قانون میں، مذہب میں، اخلاق میں، حکمت میں، سیاست میں، غرض یہ کہ زندگی کے ہر شعبے میں تقلید کا پہلو اس خیال سے استوار ہو جاتا ہے۔ مصلحین قوم اسی خیال کی بدولت انسانوں کو روبہ قفا کر دیتے ہیں۔ ان کی گردنیں پیچھے کی طرف مڑ جاتی ہیں۔ اس انداز کا ہر مصلح اس امر کا خواہشمند ہوتا ہے کہ گردش ایام کا پہیہ الٹا پھر جائے اور دعا کرتا رہتا ہے کہ ؎

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

ہر شاعر اپنی صحت بیان کے ثبوت میں متقدمین کی سند ڈھونڈتا ہے۔ یہاں تک کہ مرزا غالب کی قسم کا کوئی جدت پسند اور انقلاب دوست شاعر غصے میں پکار اٹھتا ہے کہ بھائی کیا اگلے وقتوں میں گدھے نہیں ہوتے تھے یہی حال مذہب کا ہے ہر مروجہ مذہب ماضی کے کسی دور میں ظہور میں آیا جو کچھ اس نے کہا یا کیا یا جو کچھ اس کی طرف منسوب ہو گیا وہ سند ہو گیا۔ ایسی صورت میں ایک دیندار راسخ العقیدہ شخص ماضی سے سند حاصل نہ کرے تو کیا کرے حال بدحال ہے اور مستقبل ابھی پیدا نہیں ہوا۔ انسان اس مستقبل کی طرف کیسے دیکھے جو ابھی بطن ایام میں ہے۔ حال سے بیزاری عام فطرت انسانی کا بھی تقاضا ہے۔ انسان کو کہیں نہ کہیں زندگی کے تلخ حقائق سے بیزار ہو کر تسکین آرزو کے لئے جنت تعمیر کرنی ہے۔ ہزارہا برس تک انسان کا یہی شیوہ رہا کہ یا وہ حیات زریں

کہیں ماضی میں رکھ دیتا تھا یا حیات بعد الموت میں۔ نوع انسان کے مستقبل کو وہ کیا کرے، کیونکہ اول تو زندگی کی اصلاح ناممکن ہے اور اگر آئندہ کبھی اچھے حالات پیدا بھی ہو جائیں تو ہمیں ان سے کیا حاصل، زمانہ ہو گا لیکن ہم تو نہ ہوں گے، اس سے فیض یاب اور لطف اٹھانے والے دوسرے ہوں گے۔ ان کے لطفِ حیات اور عروج کمال سے خوش ہونا دور کی بات معلوم ہوتی ہے۔

انیسویں صدی میں طبیعی سائنس کو بہت عروج حاصل ہوا جس سے زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب پیدا ہوا۔ علم فطرت تسخیر فطرت کا ذریعہ بن گیا۔ انسان نے فطرت کی قوتوں کو سمجھ کر ان سے کام لینا شروع کیا۔ فطرت کے قوانین کی یکسانی کا عقیدہ ان مذہبی عقائد پر حملہ آور ہوا جن کی بنا معجزاتی اور تاریخی تھی۔ سائنس کو انسان کی تاریخ کے ساتھ کوئی خاص وابستگی نہ تھی کوئی ایسا واقعہ جو کبھی ایک مرتبہ ہوا سائنس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ قوموں کے عروج و زوال کی داستاں طبیعات اور کیمیا اور ریاضی اور ہیئت سے کوئی براہ راست تعلق نہیں رکھتی عام طور پر سائنس داں تاریخ کو ایک غیر سائنٹفک چیز سمجھتے ہیں لیکن سائنس کی بدولت علم اور تحقیق کو آزادی حاصل ہو گئی۔ قومی اور مذہبی تعصبات کے تنگ دائروں سے انسان باہر آنے لگے۔ صنعتی ترقی کی بدولت دور دور دوسری قوموں سے تجارتی اور معاشی میل جول بڑھ گیا جس کی بدولت اپنی قوم سے باہر دوسری اقوام کی تاریخ اور اپنے مذہب و تہذیب سے باہر دوسرے مذاہب اور تہذیبوں کے مطالعہ کا موقع حاصل ہوا اور اس کے لئے تشویق پیدا ہوئی لیکن یہ سب کچھ سائنس کی ترقی کا ایک بالواسطہ نتیجہ تھا۔ سائنس کی براہ راست تحقیقات سے اس کا کچھ تعلق نہ تھا۔ مگر انسان کی صلح و جنگ کی تاریخ سے سائنس خواہ بیگانگی برتے لیکن وہ خود فطرت کی تاریخ سے روگردانی نہیں کر سکتی۔ ہائڈروجن یا آکسیجن کی نسبت کوئی تاریخی سوال پیدا نہیں ہو سکتا کہ وہ کن کن مراحل اور حوادث میں سے گزر چکی ہیں لیکن زمین کے طبقات اور اجرام فلکیہ کی نسبت خود سائنس میں اس سوال کا پیدا ہونا لازمی ہے کہ آیا یہ جوں کے توں ہمیشہ سے ایسے ہی تھے یا مختلف حوادث سے گزر کر ایسے بنے ہیں۔ نباتات اور حیوانات کی نسبت عام عقیدہ تھا کہ ان کی انواع فطرت نے یا خدائے خالق نے

دائمی طور پر معین اور مشخص کر رکھی ہیں جو نوع جیسی ہے وہ ہمیشہ سے ایسی ہی ہے اور آخر تک ایسی ہی رہیگی، جب تک کہ عالم مادی حوادث سے فنا نہ ہو جائے یا جب تک قیامت نہ آئے۔ بعض مذاہب میں یہ عقیدہ تھا کہ خدا نے ابتدائے تکوین میں جانداروں کا ایک ایک جوڑا پیدا کر دیا تھا اس کے بعد طوفان نوح میں جب سب دنیا غرقاب ہو گئی تو ہر جاندار کا ایک ایک جوڑا بچا کر کشتی نوح میں رکھ دیا گیا تاکہ آئندہ ان کی نسل منقطع نہ ہو جائے۔ سائنس کی ترقی نے ان عقائد کو متزلزل کر دیا اور یہ خیال ترقی کرتا گیا کہ تمام فطری مظاہر مادے کے مظاہر اور اسی کی متغیر صورتیں ہیں۔ مادے کے اصل عناصر و جواہر میں کوئی تغیر نہیں ہوتا لیکن ان کی ترکیب و تحلیل کے اختلافات سے چیزوں کی صورتیں اور ان کے صفات متنوع ہو جاتے ہیں۔

مادہ ازلی اور ابدی ہے لیکن یہ صورتیں ازلی اور ابدی نہیں ہر صورت تغیر سے پیدا ہوتی، بدلتی اور فنا ہوتی ہے۔ کائنات میں تنوع بھی ہے اور تدریج بھی سائنس نے اپنے ذمہ یہ کام لیا کہ یہ تنوع اور تدریج معینہ قوانین کے ماتحت سمجھ میں آنی چاہیئے۔ حال میں سائنس نے انسان کی تاریخ پر بھی طبع آزمائی شروع کی ہے اور یہ کوشش جاری ہے کہ اس کو بھی سائنس کے عام اصولوں کے ماتحت قابل فہم بنایا جائے لیکن سائنس نے تاریخ کا مطالعہ تاریخ فطرت سے شروع کیا حال سے قوانین کو اخذ کر کے اس کا اطلاق ماضی پر کرنا شروع کیا حال سے ماضی کی توجیہہ کی اور ماضی سے حال پر روشنی ڈالی اور ماضی و حال دونوں سے قوانین اخذ کر کے مستقبل کے متعلق پیشینگوئیوں کا دفتر کھول دیا۔

کانٹ اور لاپلاس نے آسمانوں کی طرف توجہ کی اور مادہ و قوت کے میکانکی قوانین کو ریاضی کے ذریعے سے اجرام فلکی پر عائد کیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کائنات پہلے ایک بخاری ہیولےٰ تھی۔ قوت اور حرارت کے انتشار سے اس میں سے اجرام اور ان کے نظام پیدا ہوتے گئے ہیں۔ بخار آتشیں سے لے کر نظام شمسی اور کرہ ارض تک ایک تسلسل اور ارتقا ہے جو طبیعیات اور ریاضیات سے اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔ اس کے لئے کسی خالق اور مدبر کی ضرورت نہیں

سوائے اس کے کہ خدا کو مادہ اور اس کے اٹل قوانین کا خالق قرار دیا جائے جس نے ان کے پیدا کرنے کے بعد ان کے اعمال میں کبھی مداخلت نہیں کی۔ لاپلاس نے اجرام فلکی پر اپنی کتاب نپولین کے سامنے پیش کی۔ اس نے پوچھا کہ اس کتاب کا موضوع کیا ہے۔ لاپلاس نے کہا کہ اس میں میں نے بتایا ہے کہ ستارے اور سیارے کس طرح بنتے اور بگڑتے ہیں۔ نپولین نے اس کتاب کی سرسری ورق گردانی کی اور کہا کہ اس میں کہیں خدا کا نام نظر نہیں آتا۔ لاپلاس نے جواب دیا کہ حضور اس کی ضرورت پیش نہیں آئی اس کے بغیر ہی کام چل گیا ہے۔

ارتقا کے یہ نظریات کبھی سائینس کے مخصوص حلقہ ہائے تحقیق سے باہر نہ نکلتے اگر خود انسان کی ذات معرض بحث میں نہ آجاتی۔ یہ بات ایک عجیب رستے سے پیدا ہوئی۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ سائینس انسان اور اس کی تاریخ سے اپنے آپ کو بے تعلق رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ بے تعلقی دیر تک قائم نہ رہ سکی آخر انسان بھی فطرت کا ایک جزو ہے۔ قوانین فطرت کا مطالعہ تاریخ فطرت کی طرف لے گیا اور پودوں اور جانوروں کے مطالعہ کی لپیٹ میں حضرت انسان خود بھی آگئے۔ عام طور پر نظریہ ارتقا ڈارون سے منسوب کیا جاتا ہے جو فلسفی نہ تھا۔ وہ نباتیات اور حیوانیات کا محقق تھا۔ اور اس نے کبھی اس دائرہ تحقیق سے باہر قدم نہیں رکھا۔ اس نے دور دراز بحر و بر کا سفر کیا اور پودوں اور جانداروں کے مطالعہ کے لئے بیش بہا مواد مہیا کیا۔

اس نے دیکھا کہ فطرت کی انواع میں ایک تسلسل اور تدریج پائی جاتی ہے۔ ایک نوع دوسری سے تھوڑی تھوڑی مختلف ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ انسان جانوروں کی نسلوں میں تھوڑا بہت تغیر و تبدل کر دیتا ہے۔ کبوتر باز مختلف نسلوں کی آمیزش اور اختلاط سے نئے رنگوں اور نئے پروں کے کبوتر پیدا کر لیتے ہیں۔ اسپ پروری میں بھی جدید صفات کے گھوڑے پیدا کئے جاتے ہیں جو کچھ انسان ذرا سے جوڑ توڑ سے کر لیتے ہیں کیا فطرت اس انقلاب سے قاصر ہے۔ ہر پودا اور ہر جانور اپنی ساخت اور عادات میں اپنے ماحول کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے کیا تبدیل ماحول سے ساخت پر اثر نہیں پڑے گا کیا نئے حالات نئے آلات پیدا نہیں کر سکتے۔

اگر ضرورت ایجاد کی ماں ہے تو کیا زندگی کی بدلی ہوئی ضرورتیں بدلی ہوئی شکلیں ایجاد نہیں کرسکتیں۔ ایک ربع صدی کی مسلسل تحقیق، مشاہدے اور اختیار نے اس کو اس قابل کر دیا کہ وہ ہزارہا مثالوں کو ثبوت میں پیش کر کے اپنے اس نظریہ کو مستحکم کر سکے کہ نباتات اور جمادات کی انواع دائمی طور پر معین نہیں ہیں بلکہ ماحول کے ساتھ زندگی کی کشمکش کا نتیجہ ہیں۔ پیکار حیات اور بقائے اصلح اس نظریہ کے دو بڑے رکن ہیں۔ جاندار اپنی ضروریات زندگی حاصل کرنے کے لئے ایک طرف دوسری انواع سے اور دوسری طرف اپنے طبعی ماحول سے برسر پیکار رہتے ہیں جو نوع اپنے ماحول کے زیادہ مطابق ہوتی ہے وہ قوی ہو جاتی ہے اور کمزور کو فنا کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ ؎

گھڑیال اور مگرمچھ ان کو ہیں نگلے جاتے
دریا میں مچھلیاں جو کمزور و ناتواں ہیں

انواع کی صورتوں میں تغیر اس طرح ہوتا ہے کہ اتفاق سے کسی نوع کے بعض افراد کے اعضا میں کوئی ہلکی سی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ کسی ایک نوع کے افراد بھی ہر لحاظ سے ایک جیسے تو نہیں ہوتے۔ کسی کی ٹانگیں دوسروں سے کسی قدر لمبی ہیں کسی کی آنکھیں زیادہ موٹی ہیں کسی کا معدہ زیادہ قوی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان اتفاقی فرقوں میں سے جو فرق ماحول کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتا ہے وہ اس فرد کو زیادہ قوی بنا دیتا ہے توارث کے قانون سے یہ فرق اگلی نسل میں منتقل ہو جاتا ہے۔ جن افراد میں یہ بات پیدا نہیں ہوئی وہ گھاٹے میں رہ جاتے ہیں۔ زندگی کمزور کی حامی نہیں۔ وہ قوی کو قوی تر بناتی ہے اور کمزور کو کمزور تر، اور حضرت مسیحؑ کا بیان کردہ روحانی اور اخلاقی قانون کہ "جس کے پاس ہے اس کو اور دیا جائے گا اور جس کے پاس نہیں ہے اس سے وہ کچھ بھی لے لیا جائے گا جو اس کے پاس ہے" نباتات اور حیوانات سب کی زندگیوں کے متعلق صحیح ہے۔ جبلتوں کی خوبیاں۔ جانوروں کی عقلیں اور دور اندیشیاں، ان کے عضوی نظامات کی ساخت، ان کے رنگ کی خوبصورتیاں سب پیکار حیات کی رہین منت ہیں۔ فطرت کے اندر یہ خوبیاں کسی خالق کی عقل یا محنت سے پیدا نہیں ہوئیں بلکہ نفسا نفسی کا

نتیجہ ہیں۔ فطرت کے اندر رحم یا عدل کا کوئی سوال نہیں۔ فطرت کے اندر عدل ہمیشہ قوی کی طرف رہتا ہے۔ راستی قوت نہیں بلکہ قوت راستی ہے۔ جہاں قوت ہے وہاں اس میں سے باقی سب کچھ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جہاں قوت نہیں ہے وہاں کچھ باقی نہیں رہتا ؎

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

بلبل کی منقار اور کبک کی رفتار، ان سب کی اساس پیکار۔ فرشتوں نے آفرینش آدم سے خالق کو روکنا چاہا تھا کہ ایسے کو کیوں پیدا کرتے ہو جو خون ریزی کرے گا لیکن صرف اشرف المخلوقات ہی خوں ریز نہیں بلکہ ارزل المخلوقات بھی خوں ریز ہے۔ اور یہ کوئی گھبرانے اور چیں بجبیں ہونے کی بات نہیں۔ زندگی کو جہاں کہیں جو کمال حاصل ہوا ہے وہ عشق و محبت سے نہیں بلکہ اپنی خودی کی استواری سے حاصل ہوا ہے۔

حیاتیات کے لحاظ سے انسان بھی ایک حیوان ہے اور مذکورہ صدر قواعد سے مستثنیٰ نہیں۔ اس کی نوع نے بھی پہلی ادنےٰ انواع میں سے بتدریج ظہور کیا ہے۔ قانون تسلسل کے مطابق وحشی انسان سے بہت تھوڑا درجہ نیچے ایسے بندر ملتے ہیں جن کی وضع قطع پر ایک ناتراشیدہ انسان کا شبہ ہوتا ہے۔ کوئی ایک ایسی نوع ہو گی جس کی ایک کم ترقی یافتہ شاخ بندر بن کر رہ گئی ہے اور کوئی ایک یا ایک سے زیادہ خاندان اپنے اعضا میں تھوڑی سی اتفاقی تبدیلی کی بدولت اگلے دو پاؤں کو دو ہاتھ بنا کر سیدھے کھڑے ہو گئے اور سیدھا ہونے نے آفرینش کا تختہ الٹ دیا ؎

قیامت مے دمد از پردۂ خاکے کہ انساں شد

ڈارون نے انسان کے اخلاق اور مذہب کے بارے میں اپنے نظریہ کی بنا پر کوئی تعمیر قائم نہ کی۔ اس نے اپنی تحقیقات کو محدود رکھا اور انسان کے متعلق دور کے نتائج اخذ کرنے سے گریز کیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں یہ انداز تحقیق روح عصر میں موجود تھا۔ اس کے معاصر ہربرٹ اسپنسر نے اس کو حیات و کائنات کے ہر شعبے پر پھیلا دیا۔ فلکیات۔ طبیعیات

کیمیا۔ نباتیات۔ حیوانیات، عمرانیات۔ لسانیات۔ نفسیات۔ غرض یہ کہ زندگی اور وجود کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس کی اسپنسر نے شرح و بسط کے ساتھ اس نظریہ کے مطابق تحقیق نہ کی ہو اور ایک مستقل تصنیف اس پر نہ چھوڑی ہو۔ رفتہ رفتہ یہ خیال تمام علمی دنیا پر قابض ہو گیا اور یہ قبضہ اب تک بدستور جاری ہے۔ ارتقا کے اسلوب عمل اس کے مبدأ اور اس کے منتہا کی نسبت درجنوں مختلف نظریات پیدا ہو گئے ہیں جو ایک دوسرے سے بعد المشرقین رکھتے ہیں لیکن اس وقت علمی دنیا کے کسی شعبے میں شاید ہی کوئی محقق ملے جو کسی نہ کسی رنگ میں ارتقا کا قائل نہ ہو۔

شروع میں سائنس نے تاریخ کو حقیر جان کر ٹھکرا دیا تھا۔ تاریخ نے اس سے ایسا انتقام لیا کہ اب اس کی ہر تحقیق میں ارتقا داخل ہے جو ایک تاریخی تصور ہے۔ ہم نے یہ مضمون اس دعویٰ سے شروع کیا تھا کہ تاریخ فکر و عمل کے ہر دور میں کوئی ایک خیال غالب ہوتا ہے اور کوئی ایک نظریہ حیات ہوتا ہے جو ہر خیال کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ ہم اب جس دور سے گزر رہے ہیں اس پر ارتقا کا نظریہ غالب ہے۔ ہر شعبہ کا مطالعہ حوادث کی ابتدا سے کیا جاتا ہے اور تا دمِ حال تمام شئون و تغیرات کے وجوہ کو ٹٹولا جاتا ہے۔

مذہب، اخلاق اور سیاست سب کے سب اس نظریہ سے متاثر ہیں۔ اس کی تاویلیں مختلف ہیں لیکن اس کا منکر کوئی نہیں۔ اس کا اثر مختلف مفکرین اور مختلف طبائع پر مختلف ہوا ہے۔ شروع میں مذہب نے اس کی جان توڑ مخالفت کی لیکن بعض مذہبی مفکرین نے جب یہ دیکھا کہ اس کو سرے سے نہ ماننا ایک ہارنے والی لڑائی لڑنا ہے تو انھوں نے اس کے واقعات کو قبول کر کے اس کی مذہبی تاویل شروع کر دی اور کہا کہ ارتقا اور تدریج ایک قانون الٰہی ہے اور زندگی میں ترقی کا میلان مشیتِ ایزدی ہے۔ ارتقا کو قبول کرتے ہوئے حضرتِ اقبال فرماتے ہیں۔

بلبل از ذوقِ نوا منقار یافت ۔۔۔ کبک پا از شوخیٔ رفتار یافت
شعلۂ عشقش صد ابراہیمؑ سوخت ۔۔۔ تا چراغِ یک محمدؐ بر فروخت

وہ اب فطرت کے طریقوں سے متنفر ہوگیا ہے۔ وہ اب اس سیڑھی کو گرا دینا چاہتا ہے جس سے وہ اس بام عروج پر چڑھا ہے۔ آدم خوں ریزی سے آدم بنا ہے لیکن اب وہ اس کو بد اخلاقی سمجھتا ہے اور اگر خاص حالتوں میں ضرورت پڑ جائے تو اس کے جواز میں تسلی بخش ثبوت مانگتا ہے۔ کہیں مکر سے کہیں قوت سے کہیں ظلم سے اس نے کامیابی حاصل کی ہے۔ تہذیب جوں جوں ترقی کرتی ہے حیوانیت کے معیارات باطل ہوتے جاتے ہیں اور اعلیٰ درجے کا روحانی انسان فطرت کا شیر نہیں بلکہ خدا کا برہ ہوتا ہے اس درجے تک پہنچنے سے قبل تک یہ قانون تھا کہ فقط قوی انسان زمین کے وارث ہوں گے۔ اب اقدار حیات نے ایسا پلٹا کھایا اور یہ کہا گیا کہ

"مبارک ہیں حلیم اور خاکسار کیونکہ وہی زمین کے وارث ہوں گے۔"

مذہب اور تہذیب نے انتخاب طبعی کے عمل کو باطل کر دیا ہے۔ جب تک انسان فطرتِ حیوانی سے بلند نہ ہو جائے وہ تہذیب اخلاق کے دائرے میں قدم نہیں رکھ سکتا اس لئے انسانی معاملات اور اس کے نصب العین کا ذکر کرتے ہوئے فطرت حیوانی سے مثالیں پیش کرنا نہایت گمراہ کن ہوتا ہے۔ تہذیب اثبات خودی کی بجائے ضبطِ خودی کی طالب ہے۔ یہاں اپنے وجود کی بقا کا سوال کہاں۔ بقائے ذات سے فنائے خودی کا مقام بلند تر ہے۔ یہاں تک کہ تصوف میں یہ تصور قائم ہوگیا کہ وجودک ذنبٌ یعنی خود تیرا انفرادی وجود ہی سب سے بڑا گناہ ہے۔ جو زندگی کا طالب ہوگا وہ اس کو کھو دے گا اور جو اسے کھو دے گا وہ اُسے پائے گا۔ عروج دوسروں کے سامانِ حیات چھین لینے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ فقر یا بے سروسامانی سے حاصل ہوتا ہے قوت اور امارت کے مقابلے میں فقر زیادہ قابل فخر ہے۔ دشمن کو جسمانی قوت سے فنا نہیں کرنا بلکہ محبت سے رام کرنا ہے۔ حیوانی زندگی کی کشمکش میں دشمن سے محبت کرنے کی کہاں گنجائش ہے۔ انسان کی اخلاقی زندگی میں بقائے اصلح کے قانون کو بدل دیا گیا ہے۔ اب یہ نہیں ہے کہ جو قوی اور صالح ہو وہی باقی رہے اور دوسروں کو فنا کر کے ان کی قوت سے اپنی قوت میں اضافہ کرے بلکہ یہ کہ زیادہ سے زیادہ افراد میں صلاحیتِ حیات پیدا کی جائے اور مظلوم کے

حق کو ظالم کی قوت پر غالب کیا جائے۔ جماعتی زندگی نے انسان کو انسان بنایا ہے۔ اس لئے ہر فرد کا فریضہ ہے کہ وہ جماعت کا قرض ادا کرے اور اس قرض کی ادائیگی ہر فرد پر فرض ہے۔ حیات جماعت میں جو کچھ فرض ہے وہ جماعت کا فرد پر قرض ہے۔ جماعت کے افراد میں انتخاب طبیعی کا قانون منسوخ ہو گیا ہے۔

مذکورہ صدر تصورات میں تہذیب و اخلاق کا مقابلہ نباتی اور حیوانی فطرت سے کیا گیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان دونوں کے اسلوب اور ان کے اقدار میں تضاد ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کی مہذب زندگی کے اقدار حیوانی زندگی سے بہت کچھ مختلف ہو گئے ہیں لیکن یہ تضاد اتنا مکمل نہیں جتنا کہ ہکسلے کی قسم کے مفکرین نے خیال کیا ہے۔ ادنیٰ نباتی اور حیوانی زندگی بھی ماحول کے مقابلے میں محض عاجز نہیں ہوتی۔ ادنےٰ مدارجِ حیات میں بھی زندگی ماحول کو کچھ نہ کچھ اپنے مطابق بنانے میں کوشاں رہتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی غلط ہے کہ حیوانی زندگی میں ہر جگہ پیکار ہی پیکار ہے۔ محبت اور اتحاد، تنظیم اور ایثار کا ثبوت ادنےٰ جانوروں کی زندگی میں بھی ملتا ہے۔ اکثر جاندار اپنی اولاد کی پرورش کس محبت اور بے لوثی سے کرتے ہیں۔ ہر چیونٹی کس قدر جماعتی زندگی کے ماتحت کام کرتی ہے اور کبھی اپنی اغراض کو جماعت کے اغراض سے الگ نہیں کرتی اور یہی اعلیٰ اخلاق اور اعلیٰ سیاست کی بنیاد ہے۔ ہم آگے چل کر اس کو ذرا شرح و بسط کے ساتھ بیان کریں گے کہ ڈارون کے نظریہ نے زندگی کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بالکل یک رُخی ہے۔ ارتقا کا دوسرا رُخ اور ہمارے نزدیک زیادہ صحیح رُخ اتحاد اور تنظیم سے زندگی کا عروج ہے۔

ہکسلے نے ڈارون کی تصویر حیات کو صحیح سمجھا لیکن انسانی زندگی کو اس سے مستثنیٰ کر دیا اور وہ اس عقیدے پر پہنچا کہ انسان پر پہنچ کر فطرت حیوانی کی کایا پلٹ ہو گئی ہے اور حیوانی فطرت میں اساسی انقلاب کے بغیر اخلاق اور تہذیب کے وجود نہیں ہو سکتا۔ اگر انسانی تہذیب مصنوعی ہے تو یہ صنعت خوں ریز فطرت سے بلند تر ہے۔ کشاکش حیات کے تلاطم میں یہ ایک جزیرہ ہے جس کو

محفوظ رکھنے کی کوشش انسان کا فریضہ اور اس کا نصب العین ہے۔ بہرحال ہکسلے حیوانی اور انسانی زندگی میں فطرت کے تضاد کا قائل تھا اور انسانی تہذیب کو فطرت حیوانی سے بلند تر سمجھتا تھا۔

ہکسلے کے برعکس ایک دوسرا مفکر نطشے ہے جو دوسرے رنگ میں حیوانی فطرت اور انسانی تہذیب کے تضاد کو تسلیم کرتا ہے لیکن کہتا ہے کہ زندگی کے اعلیٰ اقدار حیوانی جبلتوں نے خون ریزی اور خون آشامی سے پیدا کئے تھے۔ وحشی انسان بھی اپنی جبلتوں پر زندگی بسر کرتے تھے۔ اس لئے فطرت کے اندر ارتقائے مسلسل جاری تھا۔ حیات کی اصل قوت ہے۔ باقی تمام اقدار ثانوی مشتقات ہیں۔ زندگی صرف اپنی بقا کے لئے کوشاں نہیں بلکہ حصول قوت کے لئے کوشاں ہے۔ انسانی تہذیب چند ہزار سالوں سے غلط راہ پر پڑ گئی ہے۔ کمزوروں نے اپنی حفاظت کے لئے رحم و کرم کو ظلم سے افضل قرار دیا۔ رفتہ رفتہ بدھ مت اور عیسائیت جیسے حیات کش مذاہب اور نظاماتِ اخلاق پیدا ہو گئے جنہوں نے نفئ حیات کی تعلیم دینا شروع کی اور ہر قسم کی کمزوری کو سراہ کر کمزوروں کو تسلی دی اور قوی انسانوں کو ڈرایا، دبایا اور دھمکایا۔ وہ خاص طور پر عیسائیت کا دشمن ہے اور کہتا ہے کہ زیتون کی پہاڑی کے وعظ نے سقراطی اور افلاطونی فلسفۂ اخلاق کے ساتھ مل کر انسان کی قوت طلبی کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ اب اس کی ضرورت ہے کہ اخلاق اور تہذیب میں سے تمام انفعالی پہلو مثلاً رحم محبت اور عبرت وغیرہ یک قلم خارج کر دئے جائیں اور موجودہ سست عناصر انسان سے قوی تر ایک نوع پیدا کی جائے جو فوق الانسان ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کا مجوزہ انسان فوق الانسان ہے یا تحت الانسان ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اب تمام اقدار کی ایک جدید تقدیر ہونی چاہئے کیونکہ غلط عدل اور غلط رحم کے تصورات انسان کو بلند کرنے کی بجائے اس کے تنزل اور انحطاط کا باعث بن گئے ہیں۔

نطشے کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے نظریۂ حیات میں ڈاروِن کا پیرو ہے اور اس نے ڈاروِن ہی کی تعلیم سے اپنے فلسفے کو اخذ کیا ہے۔ لیکن اس خیال کا

صرف آدھا حصہ سچ ہے۔ نطشے کا نقطۂ آغاز ڈارونی ہے لیکن وہ تھوڑی دور اس کے ساتھ چل کر دوسری راہ پر پڑ گیا ہے۔ ڈارون کے ہاں ارتقا ایک میکانکی چیز تھی اس کے ہاں مادے کی طرح زندگی کی اصل میں ایک قسم کا جمود ہے وہ محض اپنی بقا چاہتی ہے اور جس قسم کا بھی ماحول ہو اس کے ساتھ تطابق کی کوشش زندگی کا مبدء و منتہیٰ ہے۔ نطشے ڈارون کے ساتھ اس امر میں متفق ہے کہ زندگی ادنےٰ مدارج سے عروج کرتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہے لیکن یہ عروج محض سعیٔ تطابق کی بدولت حاصل نہیں ہوا۔ زندگی کی اصل سعیٔ بقا نہیں بلکہ جہد اضافۂ قوت ہے۔ اس اضافۂ قوت کے میلان سے وہ نئے نئے اجسام اعضاء اور آلات پیدا کرتی ہے۔ نئے اعضاء اور نئے قویٰ کی آفرینش ڈارون کے ہاں ایک اتفاقی امر تھا۔ ڈارون اس کی کوئی توجیہہ نہ کر سکا تھا کہ کسی نوع کے بعض افراد میں نئے آلات اور مفید حیات تغیرات کس طرح واقع ہوتے ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ اتفاقی طور پر ظہور میں آتے ہیں لیکن بقائے حیات کے لئے مفید ہونے کی وجہ سے باقی رہ جاتے اور بذریعۂ توارث آئندہ نسلوں میں منتقل ہوتے ہیں۔ ڈارون اور نطشے یہاں تک متفق ہیں کہ ان نو آفریدہ آلات کی بدولت زندگی اپنی قوت میں اضافہ کرتی اور آگے بڑھتی ہے۔ لیکن نطشے کہتا ہے کہ محض ماحول سے تطابق زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ ادنیٰ درجے کے کیڑے مکوڑے اعلیٰ حیوانات اور انسان کے مقابلے میں اپنے ماحول سے زیادہ مطابقت رکھتے ہیں زندگی کا جوہر ذوق عروج ہے اور عروج عروج قوت ہے۔ نطشے کا خیال ڈارون کے مقابلے میں لیمارک سے زیادہ قریب ہے کہ کسی عضویہ کی جسمانی ضروریات نئے اعضاء اور آلات پیدا کرتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نطشے کے افکار کی تمام تعمیر کی بنیاد حیاتیاتی ارتقا ہے۔ اس کے فوق الانسان کے نظریہ سے یہ دھوکا لگتا ہے کہ وہ انسان سے بالاتر ایک مخلوق کی طرف نظر جمائے ہوئے ہے۔ یہی دھوکہ اس کے غیر معمولی اثر کا راز ہے۔ اس کی زبان اکثر اوقات تصوری فلاسفہ اور صوفیا کی زبان سے ملتی جلتی معلوم ہوتی ہے۔ انسان کامل کا تخیل اکثر

مذاہب میں ملتا ہے۔ ہر مذہب اپنے بانی یا پیشوا کو عام نوع انسان سے بلند تر مقام پر بٹھاتا ہے اور اس کو زندگی کی لامتناہی قوتوں کا حامل سمجھتا ہے۔ بعض مذاہب نے اپنے پیشواؤں کو خدا قرار دیا جس نے کسی زمانے میں اپنی مرضی سے انسانی جسم اختیار کر لیا۔ مشرق اور مغرب میں اوتار اور پسر خدا کے نظریات بہت مستند اور مقبول ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اور قدرت کاملہ میں کوئی جوہری تفاوت نہیں، اگر خدا تجسم سے انسان بن سکتا ہے تو الوہیت نے بہرہ اندوز ہو کر خدا بن سکتا ہے۔ عروج آدم اور انسان کی تسخیر کائنات کے نظریات اسلام میں موجود ہیں۔ عیسائیت نے فقط ایک انسان کو خدا کا ہم سنگ قرار دیا اور باقی انسانوں کو بہت پستی میں دھکیل دیا لیکن اسلام اور اسلامی تصوف اور نیز ہندی ویدانت نے روح انسان اور روح الہٰی کے ہم ذات ہونے پر زور دیا اور کہا کہ انسان کے تمام ممکنات اگر بیدار ہو جائیں تو وہ خدا کے بھی مماثل ہو سکتا ہے جیسا کہ آگ میں پڑا ہوا لوہا آگ کے مماثل ہو جاتا ہے۔ لیکن ذرا سے غور کرنے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ مشابہت محض فریب الفاظ تک محدود ہے کیونکہ مذہب کے انسان کامل اور نطشے کے انسان کامل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ مشابہت ایسی ہی ہے جیسی کہ فرعون کے دعوۂ 'انا الحق' اور منصور کے دعویٰ 'انا الحق' میں پائی جاتی ہے لیکن "ازیں انا الحق تا ازاں انا الحق فرق حق و باطل است"۔ مذہب خدا کا قائل ہے۔ نطشے خدا کا منکر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا انسان کے عجز و انحطاط کی پیداوار تھا۔ شعور قوت اور شعور عروج نے اس موہوم ہستی کو قتل کر دیا ہے۔ فوق الانسان نبی یہ دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے کہ ابھی تک انسانوں کے کانوں تک یہ خبر نہیں پہنچی کہ خدا مر گیا ہے۔ اگر خدا مر گیا ہے تو اس کی جگہ خالی ہے۔ وہ اس جگہ کو فوق الانسان کے تخیل سے پُر کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کو وہ جس ہستی سے پُر کرتا ہے وہ فقط قوت کے دیو ہے۔ یہیں پر وہ مثل صادق آتی ہے کہ جائے خالی را دیو مے گیرد۔ مذہب بھی کہتا ہے کہ انسان انسان نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ اپنے پہلے نظریہ حیات کو بدل کر ایک نئی مخلوق نہ بن جائے، وہ بھی یہی کہتا ہے کہ انسان حیات ادنیٰ سے

مرکز حیاتِ اعلیٰ میں پیدا ہو۔ وین بھی موجودہ انسان سے بیزار ہے اور نطشے کا کفر بھی اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ عروج انسان کے نظریہ کی بابت کہہ سکتے ہیں کہ کفر و دین است دَرہت پویاں، مولانا روم کے ان اشعار کو دیکھئے کہ کس قدر نطشے کی زبان معلوم ہوتی ہے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر — کز دام و دَد ملولم و انسانم آرزوست
از ہمرہاں سُست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستم یزدانم آرزوست
گفتم کہ یافت مے نشود جستہ ایم ما — گفت آں کہ یافت مے نشود آنم آرزوست

ایک اور غزل میں فرماتے ہیں۔

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند — فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

نطشے بھی خدا اور پیغمبروں کا شکار کرتا ہے لیکن ان کو قتل کر دیتا ہے لیکن صوفی ان کا شکار کر کے ان کی روح کو اپنے اندر جذب کرتا ہے۔

نطشے کے ارتقائی فلسفہ کی قلعی اس وقت کھلتی ہے۔ جب اس سے یہ سوال کیا جائے کہ تمہارے نزدیک زندگی کے اقدار کیا ہیں، اس موجودہ انسان سے تم کس لئے بیزار ہو اور فوق الانسان کے صفاتِ حسنہ تمہارے نزدیک کیا ہوں گے۔ اسی کے جواب سے وہ فرق کھل جاتا ہے جس کو حضرتِ اکبرؔ نے ظرافت آمیز حکمت کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے۔

"کہا منصور نے خدا ہوں میں — ڈارون بولے بوزنہ ہوں میں"

نطشے کے مطابق انسان جب بوزنہ تھا تو بہت اچھا تھا۔ فطرت کے بہت قریب تھا۔ مذہب اور تہذیب سے رفتہ رفتہ اس کا انحطاط واقع ہوا ہے۔ قوت وہ ہے جو بے عنان ہو اور بے پناہ ہو۔ تمام اخلاقی جکڑ بندیاں زبونی ہمت کا باعث ہوتی ہیں اور بظاہر مرزا غالب بھی ایک پہلو سے اس کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں جب وہ کہتے ہیں کہ رحم اور عبرت اور قناعت وغیرہ انفعالی جذبات یعنی پستی آفریں میلانات ہیں۔ ان سے ہمت میں زبونی واقع ہوتی ہے اس لئے ان سے بچنا چاہیئے۔ ؎

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال حاصل نہ کیجئے دہر سے' عبرت ہی کیوں نہ ہو

نطشے کی کتاب 'ارادۂ قوت' میں سے مفصلہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو۔

"وظائفِ حیوانی لاکھ مرتبہ زیادہ اہم ہیں بہ نسبت روح کی تمام حسین وجمیل کیفیات کے اور بہ نسبت شعور کی بلندیوں کے' اگر وہ وظائفِ حیوانی کی خدمت میں صرف نہ ہوسکیں تو بالکل بے کار ہیں۔ شعور کا مقصد حیاتِ حیوانی کی امداد کے سوا اور کیا ہے۔ اس کا کام حیاتِ حیوانی کی خدمت ہے۔ اس کے سپرد فقط یہ کام ہے کہ وہ ذرائع حیات یعنی تغذیہ اور تناسل وغیرہ کو ممکن کمال کا رستہ بتائے اور اساسی بہیمی اعمال میں معاون ہو۔"

"زندگی کا کوئی نصب العین نہیں، وہ آپ ہی اپنا نصب العین ہے۔ زندگی قوت کا دیوتا ہے جس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انجام۔"

غلامانہ اخلاق نے مذہب اور تہذیب کو انفعالی اخلاق کی طرف راغب کردیا ہے عدل اور رحم اور مساوات سب غلاموں کے حربے ہیں۔ قوت کا امتحان کمزور پر غلبہ حاصل کرنے سے ہوتا ہے۔ زندگی کی شمشیر کو بیکار کے سنگِ فساں پر تیز کرتے رہنا چاہیئے۔ صلح سے وہ زنگ آلود ہوجائے گی۔ زندگی مجاہدانہ ہونی چاہیئے لیکن کسی نصب العین کے لئے نہیں کیونکہ کوئی نصب العین موجود نہیں خطرات کو خوش آمدید کہنا چاہیئے کیونکہ ان سے زندگی کے ممکنات اخفا سے ظہور میں آتے ہیں۔ قوی انسان کے دل میں نہ کوئی رحم کا شائبہ ہونا چاہیئے اور نہ عدل و مساوات حقوق کا' اس قسم کے تاملات سے اس کی قوتیں پوری طرح کارفرما نہیں ہوسکیں گی۔ کمزوروں کا زندگی میں یہی وظیفہ ہے کہ قوی اس پر قوت آزمائی کرسکے۔

ہزارہا سال سے انسان اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ زندگی کے اقدار صداقت' جمال اور نیکی کی تحقیق کرے غرضکہ تمام سعیٔ حیات انھیں اقدار کی طرف بڑھنے کا نام ہے۔ نوع انسان کی مشکلات اس سے پیدا ہوتی ہیں کہ وہ ان اقدار کا تحقق اچھی طرح سے نہیں کرسکتی لیکن

بطور نصب العین کے ان کو ہمیشہ نظر کے سامنے رکھتی ہے لیکن نطشے کو یہ شکایت نہیں ہے کہ انسان ان اقدار کی طرف کامیابی کے ساتھ بڑھ نہیں سکا وہ یہ کہتا ہے کہ یہ اقدار ہی غلط ہیں اور جب تک یہ اقدار بطور نصب العین بھی موجود ہیں انسان اپنے موجودہ انحطاط کے دائرہ سے نکل نہیں سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ مذہب اور اس سے حاصل کردہ اخلاق نفیٔ خودی سکھاتے ہیں حالانکہ زندگی استحکام خودی کا نام ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اقدار حیات کو تقدیرِ نو کی ضرورت ہے۔

مختلف گروہوں کی اخلاقیات میں تھوڑا بہت فرق ضرور ہوتا ہے۔ عملی زندگی میں بعض گروہ کسی ایک فضیلت پر زیادہ زور دیتے ہیں اور بعض کسی دوسری فضیلت پر۔ لیکن تمام مہذب نوع انسان کا یہ عقیدہ ہے کہ ان تمام متنوع انسانی اخلاقوں کی اساس ایک عام اور مشترک اخلاق ہے۔ نطشے کے نزدیک مختلف اخلاقوں کا موازنہ اس معیار سے ہونا چاہئے کہ کس اخلاق سے کس قسم کی سیرت پیدا ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بنیادی طور پر مذہب اور اخلاق کی فقط دو قسمیں ہیں۔ آقایانہ اخلاق اور غلامانہ اخلاق۔ اسی کے مطابق مذہب بھی دو قسم کے ہیں۔ اثبات حیات کے مذاہب اور نفیٔ حیات کے مذاہب، یا نطشے کے الفاظ ہیں، زندگی کو 'ہاں' کہنے والے مذاہب اور زندگی کو 'نہ' کہنے والے مذاہب۔ ایک میں زندگی کا ایجابی احساس ہے اور دوسرے میں سلبی احساس۔ ایک بقا پسند ہے اور دوسرا فنا پسند۔ ایک خودی کو مضبوط کرنا چاہتا ہے اور دوسرا اس کو کمزور کرنے کی طرف مائل ہے۔ ایک میں صحت مندانہ تحکم اور خود اعتمادی ہے اور دوسرے میں عجز و انکسار، ایک سنگِ کہسار ہے اور دوسرا خاک خاکسار۔ ایک میں بزدلی ہے اور دوسرے میں جرات و ہمت۔ آقایانہ اخلاق کے لوگ فائق و حکمراں ہوتے ہیں اور غلامانہ اخلاق کے لوگ مغلوب اور حکم بردار۔ ایک فطرتاً فرماں روا ہیں دوسرے فطرتاً فرماں پذیر۔ انسان کو بلند کرنے کے لئے اسے آقایانہ اخلاق کی تعلیم دینی چاہئے۔ اعلیٰ انسانوں کو زاہدوں کے اخلاق کی ضرورت نہیں سپہ سالاروں کے دل گُردے کی ضرورت ہے۔

کم از کم جہاں تک وعظ و تلقین اور عقائد کا تعلق ہے مغرب کے اخلاق کے دو ماخذ

ہیں ایک سقراطی افلاطونی اخلاقیات اور دوسرے عیسوی تعلیم ۔نطشے ان دونوں پر شدید حملہ کرتا ہے ۔عیسائیت کے کسی دشمن نے آج تک عیسائیت پر ایسی ضرب کاری نہیں لگائی ۔وہ کہتا ہے کہ عیسائیت فقط غلاموں کا مذہب ہو سکتا ہے ۔عیسائیت نے رذیلوں کے اخلاق کو مذہب بنا کر منظم کر دیا ہے ۔اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ شیروں کو بکرے بنا دے یہ بھیڑوں کے گلے کی اخلاقیات ہے ۔ہر کمزور مخلوق یہ محسوس کرتی ہے کہ وہ تنہا پیکار حیات میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتی اس لئے ادنیٰ درجے کے انسان وہ اخلاقیات ایجاد کرتے ہیں جس کی بدولت قوی انسانوں کی قوت پر باگیں کسی جائیں ہر انسان اپنی قوت کو ایثار کر کے دوسرے کی مدد کرے ۔حریص کو قناعت کی اور جابر کو عجز کی تعلیم دی جاتی ہے امیری گناہگاری ہے ۔امیر کا جنت میں داخل ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جیسا کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزرنا ۔حلیم اور عاجز دنیا کے مالک اور وارث بن جائینگے اور آخرت کی نعمتیں بھی انھیں کے لئے ہیں ۔رحم اور فیاضی اور سخاوت پر زور دیا جاتا ہے تاکہ غریب اور کمزور اور نادار کو زندگی کا سہارا ملتا رہے ۔غنی کی دولت اور قوت بے شمار ناکاروں پر پھیل کر ہموار اور بے کار ہو جائے ۔کمال درجے کی نیکی یہ ہے کہ اپنے پاس کچھ نہ رہے اور انسان میں عجز کا احساس پیدا ہو ۔کمزوروں نے اپنی عاجزی کے لئے بڑے بڑے خوش آئند نام رکھ لئے ہیں روحانیت کے جتنے حسنات ہیں وہ محتاج کی حاجات کے لئے زرین اصطلاحیں ہیں ۔سادگی، حلم، نرم دلی، ایثار، عفو، قناعت توکل، فقر سب غلاموں کے سجائے ہوئے تصورات ہیں ۔انھوں نے اپنی ضروریات اور خصوصیات کو مذہب بنا لیا ہے اور بڑی لطیف اور کامیاب کوششیں کی ہیں کہ آقا بھی اسی مذہب کے زیر آجائیں ۔ظالم کو تعلیم عجز سے زیر کیا جائے ۔اس کامیابی نے انسان کو بدترین مخلوق بنا دیا ہے جو اپنے عیوب کی پرستش کرتی ہے ۔غلاموں نے اپنی خواہشات کو خدا بنا لیا ہے ۔یہ مضحکہ انگیز مذہب اور اخلاق نوع انسان کی خودکشی ہے ۔ہم نطشے کی کتاب 'اخلاق کا نسب نامہ' میں سے ایک اقتباس آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں

"یہ ذلیل و خوار لوگ روحانی سرگوشیاں کرنے والے اور جھوٹے اخلاقی سکے چلانے والے

حقیقت میں شقی ہیں۔ بھیڑوں کی طرح سردی سے بچنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔ ان کا حال پوچھو تو کہتے ہیں کہ یہ مصیبت خدا کی خاص عنایت اور رحمت ہے یہ سلوک خدا نے فقط اپنے خاص بندوں کے لئے مخصوص کیا ہے جس طرح مالک فقط اپنے عزیز کتوں کو مارتا ہے اور دوسرے کتوں کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ یہ مصیبت جنت کے لئے ایک تیاری اور مشق ہے۔ اس کا ان کو آخرت میں بے انتہا اجر ملے گا۔ اس تجارت میں بڑا منافع ہے مٹی کے عوض میں سونا ملے گا۔ اس مصیبت کے عوض سعادت ازلی حاصل ہوگی۔ بس بس ہٹاؤ اس بکو اس کو، اب یہ ناقابل برداشت ہوگئی ہے۔ بدبو بدبو، تعفن تعفن ہٹو یہاں سے، یہ نصب العینوں کی دنیا دروغ بافوں کی کارگاہ ہے۔"

عیسائیت کا خدا عوام کا خدا ہے۔ نطشے کو یہ شکایت نہیں کہ لوگ ایک موہوم خدا کو معبود قرار دیتے رہے ہیں بلکہ یہ کہ ان کے خدا کا تصور ایک نہایت مکروہ اور ذلیل ہستی کا تصور ہے۔ سب سے زیادہ ضرر رساں تصور خدائے رحیم و کریم کا تصور ہے۔ یہ تصور زندگی کے خلاف جرم عظیم اور گناہ کبیرہ ہے۔ اگر ایسے خدا کی ہستی کا ثبوت بھی مل جائے تو بھی وہ پرستش کے لائق نہیں۔ عیسائیت نے خدا کے تصور میں سے قوت، جرأت، نخوت اور غلبہ کے فضائل کو خارج کر دیا اور خدا ذلیل ہوتے ہوتے آخر میں غم کی دوا، مرض کی شفا، بھوکے کی غذا، بڈھے کا عصا، طوفان کا کنارا اور ڈوبتے کا سہارا رہ گیا اور نجات دہندہ کا لقب اس کے تمام اسماء و صفات پر غالب آگیا۔ اس قسم کا ذلیل معبود پرستار کو کیا زندگی بخشے گا۔ یہ عوام کی زبونیٔ ہمت کا خود تراشیدہ دیوتا ہے۔ ذلیل و خوار انسانوں نے اس کو اپنی صورت پر بنایا ہے

مرا بر صورت خویش آفریدی برون از خویشتن آخر چہ دیدی

یہ پیکار حواس سے بھاگے ہوئے روپوش کمزوروں اور بزدلوں کا خدا ہے، ایسے لوگوں کا

جو زندگی کی کشمکش کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ خدا کے تصور کو اثبات حیات کا ذرہ کمال ہونا چاہئے تھا لیکن عیسائیت کے ہاتھوں وہ نفئ حیات کا فقیر فنا بن گیا۔ زندگی کا دشمن فطرت کا دشمن ارادۂ حیات کا دشمن، اس دنیا اور اس دنیا کے تمام دروغوں کے تار و پود۔ ناتوانوں نے فنا کو خدا بنا دیا۔ جرأت، حوصلہ مندی اور زندگی کا ذوقِ عروج اس عقیدے نے فنا کر دیا۔ انسان کی ترقی کے راستے میں ایک سدِ سکندری حائل کر دی۔

ڈارون کے خلاف نطشے کا یہ عقیدہ تھا کہ ارتقا کا عمل اتفاقی اور میکانکی نہیں ہے۔ ارادۂ قوت سے زندگی آگے قدم اٹھا سکتی ہے۔ زندگی بقائے جامد نہیں بلکہ توسیع چاہتی ہے۔ تصرف، تسخیر اور تفوق کی طالب ہے۔ زندگی مسلسل تسخیر کا نام ہے۔ وہ خارجی ماحول پر غلبہ پانا چاہتی ہے۔ ماحول ناساز ہو تو وہ زمانہ سازی نہیں بلکہ زمانہ ستیزی کرتی ہے۔ ہر مرکز قوت فقط اپنے آپ کو باقی رکھنا نہیں چاہتا بلکہ قوی تر ہونا چاہتا ہے۔ زندگی کا ہر مرکز گرد و پیش کی زندگی کو اپنے اندر جذب کر کے اضافۂ حیات کا طالب رہتا ہے۔ رحم اور انصاف اور حق و باطل کے جھوٹے تقاضوں سے اس کی راہ میں روڑے اٹکانا بڑا جرم ہے۔ مذہب انسان کے دل کو نرم کرنا چاہتا تھا لیکن نطشے کے کفر کا پہلا حکم یہ ہے کہ اے انسان سخت دل ہو جا۔ دوسروں کے جذبات کا احترام کر کے زندگی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس سے ارادے میں کمزوری واقع ہوتی ہے۔ پرانی تعمیروں کو گرا کر نئی تعمیریں بنتی ہیں۔ چیونٹیاں اور کیڑے مکوڑے اس میں تباہ ہو جاتے ہیں لیکن ان کا کون لحاظ کرتا ہے۔ اپنے سے ادنیٰ حیوانوں کے ساتھ انسان کہاں عدل و رحم برتتا ہے۔ کسی کو کھا جاتا ہے کسی پر سواری کرتا ہے کسی سے گاڑی کھچواتا ہے اور کسی کو محض ذوقِ شکار یعنی ورزشِ حیات میں موت کے گھاٹ اتارتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو آج اس مرتبے پر نہ ہوتا جہاں وہ ہے۔ بڑے بڑے رحم اور عدل کا دعویٰ کرنے والے حیاتِ ادنیٰ کی نسبت اپنی اخلاقیات بدل لیتے ہیں۔ اپنی آرائش اور ذوق کے لئے پھول توڑنے میں کس کو رحم آتا ہے، مذہبی آدمی بھی

جانوروں کے بچوں کو محروم کر کے فطرت کا عطا کردہ دودھ پی جاتا ہے۔ اپنی آسائش اور زیبائش کے لئے ان کی کھالیں اتارتا ہے۔

اب دوسری طرف دیکھئے کہ ترقی تمدن میں انسان نے انسان کے ساتھ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ پہلی قومیں غیر اخلاقی، غیر روحانی اور ظالم تھیں۔ ان کا عدل و رحم کا معیار بہت پست تھا۔ لیکن انسانی تہذیب کا کوئی دور بھی لیجئے کیا کوئی تہذیب بھی کبھی عدل و رحم پر قائم ہوئی ہے۔ بڑی بڑی سلطنتیں اقوام پر غلبہ حاصل کر کے اور ان کو غلام بنا کر قائم ہوئیں علم و فن کا کمال بھی کبھی ظلم کے بغیر نہ ہو سکتا۔ یونان کی تہذیب کا بہت کچھ مدار غلامی پر تھا۔ اشینیا کی نام نہاد جمہوریت میں تین چوتھائی تعداد غلاموں کی تھی جن کو جانوروں سے زیادہ حقوق حاصل نہ تھے۔ اہرام مصر یہودی غلاموں کی پیٹھوں پر تازیانے مار مار کر اور انھیں محض قوت لایموت دے کر بنائے گئے۔ دنیا کی عظیم الشان تعمیریں تمام بھوکے غلاموں کے خون اور پسینے سے بنی ہوئی ہیں۔ غرضکہ اس حالت پر افسوس کرنا محض حماقت اور ریاکاری اور اسرار ارتقا سے ناواقفیت کی دلیل ہوگی۔

نطشے جمہوریت اور مساوات انسانی کا بڑا دشمن ہے اس کا خیال یہ ہے کہ یہ غلاموں کا اپنی حفاظت کے لئے پیدا کردہ عقیدہ ہے اس پر عمل کرنے سے نیچے والے کچھ اوپر ابھر جائیں تو اس سے کیا حاصل، لیکن ایک بڑا نقصان یقینی ہوگا اور وہ یہ کہ اس نظام سے آقایانہ اخلاق کے انسان پیدا نہیں ہو سکیں گے۔ ہر چیز کا معیار عوام کی طرف سے قائم ہوگا اور عوام کا معیار ان کی اپنی ذہنیت سے کبھی بلند تر نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں جو اعلیٰ درجے کے چند انسان پیدا ہوئے ہیں وہ آقایانہ صفات کے انسان تھے انھوں نے کہیں ملکی حدود کو منہدم کر کے وسیع کیا کہیں روایات اور قوانین مروجہ اور مذاہب متداولہ کو برطرف کر کے نئے طریقوں کی داغ بیل ڈالی کوئی بڑا انسان مقلد نہیں ہوتا اور نہ کوئی مقلد بڑا انسان بن سکتا ہے۔

ازآنکہ پیروی خلق گمرہی آرد
نمی رویم براہے کہ کارواں رفت است

بڑا انسان اپنے ارتقا کا قانون اپنے اندر سے نکالتا ہے۔ اس کی طریقت ہر شریعت سے بالاتر ہوتی ہے اور اس کی معرفت کے مقابلے میں ہر شریعت منسوخ ہو جاتی ہے۔ اس کو حق تنسیخ ہوتا ہے اس لئے کہ منسوخ شدہ چیز سے وہ کچھ بہتر لاتا ہے۔ کوئی پہلی چیز اس کے لئے سند نہیں کوئی رحم یا عدل اس کو قابل تنسیخ زندگی کو منسوخ کرنے سے باز نہیں رکھتا۔ وہ خود آپ ہی اپنا دین ہوتا ہے اس لئے عام معنوں میں اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اس کے جذبہ قوت اور جذبۂ ارتقا کے راستے میں جو چیز حائل ہوتی ہے وہ اس کو نہایت بے دردی سے ٹھکرا دیتا ہے۔ اگر اس میں ہمت اور جرأت کی کمی ہو تو ادنیٰ قوتیں اس کو پامال کر دینگی۔ وہ پامال شدہ زندگی پر آنسو نہیں بہاتا اُس کی چشم بے نم ہوتی ہے۔ ؎

کون کہتا ہے تجھے دیدۂ تر پیدا کر بارش تیرِ حوادث میں جگر پیدا کر
قطرہ آغوش تلاطم میں گہر بنتا ہے آبرو چاہے تو طوفان میں گھر بنتا ہے
ورزش جاں ہے ہر اک پست و بلندِ ہستی راہ ایمن ہے تو خود اس میں خطر پیدا کر

زندگی کا مقصد آگے بڑھنے اور اوپر چڑھنے کے سوا کچھ نہیں۔ عمل توسیع میں اس کا ضمیر اس کو ملامت نہیں کرتا۔ ہمسائے کے حقوق کا تحفظ اور اس کے ساتھ محبت کی تعلیم زندگی کے ہارے ہوئے ناتوانوں کی ایجاد ہے۔ قوی اور کامیاب انسان ہاتھ پاؤں پھیلاتے ہوئے یہ نہیں دیکھتا کہ اس نے گردوپیش کس کس کو دھکیل دیا ہے۔ دانہ اپنے نشوونما میں زمین کو پھاڑ دیتا ہے۔ اگر وہ اس پر رحم برتے تو کوئی دانہ بارور شجر نہ بن سکے۔ مغلوبوں کے سامنے عدل و رحم کی ریاکارانہ صورتیں پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ باغباں اس کی مرضی اور تجویز کے بغیر اُگنے والی نباتات کا کیا حشر کرتا ہے۔ طلوع آفتاب درخشندگیٔ انجم کی موت ہے۔ زندگی اگر مخالف کی موت سے لرزاں ہو تو وہ خود موت کے گھاٹ اتر جائے گی۔ زندگی کا عروج بے جگری سے ہے۔ جس کے دل میں سارے جہاں کا درد ہو وہ کوئی عظیم الشان کام نہیں کرسکتا۔ وہ فقط ادنیٰ درجے کی مساواتی زندگی بسر کرسکتا ہے جو موت کے مرادف ہے۔

کسی بڑے درخت کے سائے میں گھاس نہیں اُگتی اور نہ کوئی چھوٹا پودا پنپ سکتا ہے۔ قوی کو جتنی جگہ گھیرنے کا حق ہے وہ اس کو حاصل کرتا ہے اور یہ حق فقط حقِ قوت اور حقِ حیات ہے وہ کسی اور الٰہی یا انسانی قانون کا پابند نہیں۔ اگر بیماروں اور کمزوروں سے دنیا خالی ہو جائے تو قوی نسلوں کے لئے زندگی کے بہتر مواقع فراہم ہو جائیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نطشے ان خاص انسانوں کی خاطر عوام کو ناپید کر دینا چاہتا ہے۔ نہیں وہ یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ عوام ناپید ہو جائیں۔ وہ خوشی سے رہیں لیکن اپنے مقام پر رہیں۔ وہ غلام رہیں اور غلامانہ اخلاق پر زندگی بسر کریں۔ یہ خود ان کے لئے بھی مفید ہے اور چوٹی کے انسانوں کے لئے بھی اچھا ہے۔ گنبد اور کلس کے لئے نیچے بنیادوں اور دیواروں کی بھی ضرورت ہے۔ ادنیٰ عوام دنیا میں اسی طرح ہیں جس طرح ادنیٰ حیوانات رہتے ہیں اور مختلف طریقوں سے انسانوں کی خدمت کرتے ہیں۔ ان کو مساوات کی تعلیم دے کر آقاؤں سے برسرِ پیکار کرانا حماقت ہے نہ ہی ان کو یہ اجازت ہونی چاہئے کہ وہ اپنے لئے موزوں اخلاق کی تلقین آقاؤں کو بھی کرنے لگیں۔ اس سے دونوں کو نقصان پہنچے گا۔ اس کے مقابلے میں یہ بہتر ہوگا کہ وہ کبھی کبھی بغاوت کرتے رہیں تاکہ آقاؤں کو قوت آزمائی کا موقع ملتا رہے۔ ورنہ امن چین سے آقاؤں بھی انحطاط پیدا ہونے کا اندیشہ ہے ؎

ساحلِ امن پہ ہے مزرعۂ عصیاں حاصل
زندگانی کے تلاطم سے کوئی پار نہ ہو

نطشے کا خیال تھا کہ موجودہ سوسائٹی میں بھی سپاہیانہ زندگی تاجرانہ زندگی سے بدرجہا افضل ہوتی ہے۔ تجارت اور جمہوریت دونوں کے اخلاق افادیتی اخلاق ہوتے ہیں۔ تاجرانہ جمہوریت، عسکری مملکت کے مقابلے میں ادنیٰ درجے کی چیز ہے۔ اسپارٹا والے اثینیا کے فلاسفہ اور تجار سے بدرجہا افضل تھے۔ سوسائٹی کے مختلف طبقوں اور مختلف اقوام میں اگر دشمنی اور کشمکش قائم رہے اور ہر قوم اپنی حفاظت کے لئے اگر روحِ عسکریت کو مضبوط

کرتی رہے تو یہ ایک مفید چیز ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نطشے محب قوم اور محب وطن تھا اور وہ جرمن قوم کا غلبہ چاہتا تھا۔ یہ خیال باطل غلط ہے۔ اس کے ہاں وطن اور قومی تعصب کا نام نشان تک نہیں۔ اس کی مخاطب اور اس کے موضوع تمام نوع انسان ہے۔ وہ ایک جگہ کہتا ہے کہ ایک اعلیٰ درجے کا یورپین وطن پرست یا قوم پرست نہیں ہوسکتا، قومیت اور وطنیت کے حدود بالکل مہمل ہیں۔ لیکن یہ دوسری بات ہے کہ اس کشمکش سے ضمنی طور پر کچھ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہو۔

ایک اور بات جو نطشے کو اکثر دیگر ارتقائین سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ افادیت، لذت طلبی یا مسرت کوشی کا قائل نہیں۔ اکثر قائلین ارتقا جن میں ہربرٹ اسپنسر کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے اخلاقیات کے اندر فرقہ لذتیہ میں داخل ہیں۔ اسپنسر زندگی کو اس لئے خیر سمجھتا ہے کہ وہ لذت آفریں ہے اور اس کا خیال تھا کہ زندگی جیسے جیسے بہتر اور بلند ہوتی جائے گی اس کی لذت میں اضافہ ہوتا جائے گا لیکن نطشے اس تعلیم کو نظر حقارت سے دیکھتا ہے زندگی کی شراب تلخ تر ہو جائے تو اس کو اور گوارا معلوم ہوتی ہے۔ اعلیٰ درجے کا انسان زندگی کے ہر پہلو کے لئے تیار رہتا ہے وہ تقدیر کا عاشق ہوتا ہے۔ اسے جو کچھ ملے وہ قبول کرتا ہے نہ غصہ کھاتا ہے اور نہ ناک بھوں چڑھاتا ہے اور نہ لذت کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے اور نہ ہی اپنے اعمال کی کامیابی یا ناکامی کو لذت کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ کہیں کہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خطرے کی الم انگیزی سے لطف اٹھاتا ہے اور زندگی کا اس بنا پر مداح ہے جس بنا پر کہ عرفی خدا کی تعریف کرتا ہے۔

اے متاعِ درد در بازارِ جاں انداختہ گوہر سود در جیبِ زیاں انداختہ

وہ زندگی کے جہنم کو بھی ھل من مزید کہتا ہے۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ اس کو اکثر شدید دانت کا درد ہوتا تھا اور وہ قوت ارادی سے اس پر غالب آنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسی ذاتی تجربے کو پھیلا کر اس نے لذت والم کا فلسفہ بنا دیا ہے۔

ہم شروع میں بیان کر چکے ہیں کہ زمانۂ حال میں ہر مفکر اور ہر مدبر اس پر مجبور معلوم ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی قسم کے نظریۂ ارتقا کا قائل ہو اسی وجہ سے نظریہ سے ارتقا نے اتنی صورتیں اختیار کر لی ہیں کہ ان میں فقط ترقی کا تصور قدرِ مشترک رہ گیا ہے اور ان میں سے اکثر کی اساس بھی باہم مختلف ہے اور نتائج بھی مختلف اور متضاد اخذ ہوتے ہیں۔ ارتقا کے قائل دہریہ بھی ہیں اور خدا پرست بھی کافر بھی اور صوفی بھی مادہ پرست بھی اور روح پرست بھی، وحی سے سند لینے والے بھی اور آزاد خیال بھی۔ فطرت کے نظام کو میکانکی سمجھنے والے بھی اور اس کے اندر روحانی اور عقلی قوتوں کے قائل بھی۔ ہر ایک یہی کہتا ہے کہ ہستی میں ہر چیز بتدریج تغیر سے اپنی موجودہ حالت تک پہنچی ہے اور مزید تغیر سے کسی دوسری حالت تک پہنچ سکتی ہے۔ مغربی عیسوی اہل دینیات میں سب سے پہلے سینٹ آگسٹائین نے وحی اور نبوت پر اس کا اطلاق کیا اور بنی اسرائیل کے انبیا اور ان کی تعلیم کو اس نظر سے دیکھا کہ کس طرح اس کی تاریخ میں مشیت الٰہی بتدریج انسان کی روحانی تربیت کرتی آئی ہے یہاں تک کہ حضرت مسیح میں اس ارتقا کی معراج ہو گئی اور انسانیت اور الوہیت کے ڈانڈے مل گئے۔ لیکن آگسٹائن کو کیا معلوم تھا کہ عیسائیت کے چھ سو سال بعد ایک اور عالمگیر مذہب اسرائیلی نبوتوں کے ارتقا کے سلسلے میں پیدا ہوگا جو عیسائیت سے بڑھکر جامعیت کا دعویٰ کریگا اور اس کے ساتھ ہی وہ اس دعویٰ کو کسی حد تک انسانی تاریخ کے ارتقا میں متحقق بھی کرے گا۔ اب اس خیال کو اقبال نے اسلام پر عائد کیا ہے۔

شعلۂ عشقش صد ابراہیم سوخت
تا چراغ یک محمدؐ بر فروخت

اہل سیاست کا بھی یہی حال ہے۔ ہٹلر اور مسولینی بھی ارتقا کے قائل ہیں اور چرچل اور روزولٹ بھی اور ارتقا کی جو نوعیت وہ سمجھتے ہیں اس میں ان کے اساسی تصورات میں بعد المشرقین ہے۔ انگریزی فلسفی اور سیاست دان کہتے ہیں کہ ارتقا استبداد سے جمہوریت کی طرف

ہو رہا ہے اور اسی طرف ہونا چاہئے۔ زندگی کے لامتناہی ممکنات کے تحقق کا راستہ یہ ہے کہ اقوام کے اندر قوی اور کمزور کا امتیاز ایک کو ظالم اور دوسرے کو مظلوم نہ بنا سکے اور ہر قوم اپنی مخصوص روح کو مخصوص شعار کا جامہ پہنانے کے لئے آزاد ہو۔ اسی طرح ہر قوم کے اندر ہر فرد آزادی کے ساتھ اپنے عمل اور فکر کا مالک ہو تمام اقوام کو نوع انسان کے عضویہ کے اعضا قرار دیا جائے اور ہر قوم کے اندر ہر فرد زیادہ سے زیادہ آزادی کا مالک اور خود صاحب مقصد اور صاحب ارادہ ہستی ہو۔ انسانوں کی تقسیم حکمرانوں اور حکم برداروں، آقاؤں اور غلاموں میں نہ کی جائے۔ نسل اور مذہب اور رنگ کے امتیازات کو رفتہ رفتہ مٹا دیا جائے۔ رفتار سست ہو یا تیز اس نصب العین کی طرف قدم اٹھتے رہیں اس مقصود کو باطل نہ سمجھا جائے۔ نطشے اور ٹرائشکے کے پیرو یہ کہتے ہیں کہ بیشک ارتقا ہستی کا قانون ہے لیکن یہ قانون حق کا قانون نہیں بلکہ غلبہ کا قانون ہے۔ قوم کے اندر فرد کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے سمندر کے اندر موج و حباب کی فرد کا اختیار قوم کے اختیار کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور قوم کا مقصد مساوات نہیں بلکہ حصول قوت ہے۔ اگر مذہبوں کے تلقین کردہ اخلاقی اصول قوت کے راستے میں حائل ہوں تو ان کو ٹھکرا دینا چاہئے۔ جیسے زر پرست زر کو ستار عیوب اور قاضی الحاجات قرار دیتے ہیں اور زندگی کے باقی تمام اقدار کو اس کے مقابلے میں ثانوی سمجھتے ہیں اور اپنا اصول یہ بیان کرتے ہیں کہ ؎

خوک باش و خرس باش و کرگس مردار باش
ہر چہ خواہی باش لیکن اندکے زردار باش

اسی طرح قوت کو مصدرِ حیات اور مقصدِ حیات سمجھنے والے حصول قوت کے مقابلے میں باقی تمام فضائل کو ادنیٰ اور ثانوی قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ارتقاء ہونا چاہئے لیکن اس کا راستہ یہ ہے کہ قوی کمزوروں پر غالب آجائیں اور ان کی گردنوں پر پاؤں رکھ کر اوپر اٹھیں۔ سست عناصر انسانوں سے نطشے بھی بیزاری ظاہر کرتا ہے اور جلال الدین رومیؒ بھی

دونو موجودہ انسان کو اوپر اٹھانا چاہتے ہیں۔ دونوں کہتے ہیں کہ مادی ذرات سے لیکر انسان تک بتدریج ارتقا ہوا ہے اور آگے لامتناہی ارتقا کی گنجائش ہے دونو کے مقولے بہت دور تک مشترک معلوم ہوتے ہیں لیکن اس ارتقا کے آغاز اور انجام کی نسبت پوچھو تو جواب میں بعد المشرقین معلوم ہوتا ہے۔ ایک عجز اور انکسار اور ایثار کا راستہ بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ حیوانی خودی کی قربانی کے بغیر الٰہی خودی انسان کے اندر پیدا نہیں ہوسکتی فرد اور قوم کے انائے حیوانی کے مزید ارتقا سے زندگی اب اور آگے نہیں بڑھ سکتی۔ دوسروں کے ذرائع حیات کو چھین کر انسان اس قوت کو حاصل نہیں کرسکتا جس سے اس کا مزید ارتقا ہوسکے۔ کمزور انسانوں کی تسخیر نہیں بلکہ انسانی کمزوریوں کی تسخیر درکار ہے۔ دونو کہتے ہیں کہ جہاں میدان کارزار ہے ہر چیز دوسری چیز سے دست وگریباں ہے۔ ہر چیز آکل بھی ہے اور ماکول بھی وہ کسی کو کھا رہی ہے اور کوئی دوسری چیز اس کو کھا رہی ہے۔ ادنےٰ کی تسخیر کے بغیر اعلیٰ کا حصول ممکن نہیں لیکن ارتقا اس طرح ہوتا ہے کہ مدارج حیات میں ادنیٰ ہستی اعلیٰ کے صفات اپنے اوپر طاری کرلیتی ہے اعلےٰ ادنیٰ میں سرایت کرکے خود بھی بلند ہوتا ہے اور ادنیٰ کو بھی اوپر ابھارتا ہے۔ دانہ اپنی قربانی سے آب وگل کو شگوفہ وثمر بنا دیتا ہے اس کا عروج آب وگل کا عروج ہے اور ایک کی ترقی کا مدار دوسرے کے تنزل یا اس کی تنسیخ پر نہیں ادنیٰ کی تسخیر کے معنی اس کو فنا کرنا نہیں بلکہ اس کی ہیئت کو تبدیل کرنا ہے۔ اسی وجہ سے روحانیت مساوات اور جمہوریت ہی کی حامی ہوسکتی ہے جس کے اندر تسخیر کے معنی حیوانی اور مادی تسخیر سے بالکل الگ ہیں۔ تمام مذاہب نے غریبوں اور ناداروں میں پرورش پائی اور تمام مذہبی پیشواؤں نے ذات پات نسل اور قوم امیر اور غریب کی تمیز کو مہمل قرار دیا اور کہا انسانوں میں ادنیٰ اور اعلیٰ اخلاقی اور روحانی حیثیت سے ہوسکتے ہیں کوئی اور حیثیت بلندی اور پستی کا معیار نہیں بن سکتی انسان تب تک بلند نہیں ہوسکتا جب تک کہ جسمانی قوت اور کمزوری کی بجائے روحانی قوت

اور کمزوری کے معیار کو اختیار نہ کرے۔

ان ارتقائی حکما میں سے جن کا نقطہ آغاز مادہ اور میکانکی قوت ہے ہربرٹ اسپنسر اپنی مخصوص راہ پر چلتا ہوا اس خیال پر پہنچا کہ زندگی کے ارتقا میں تنوع اور وحدت دونوں کی ضرورت ہے۔ جیسے جیسے ہستی آگے کی طرف بڑھتی ہے اس کے اندر وسیع سے وسیع تر وحدتیں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن کوئی وحدت مجرد وحدت نہیں بلکہ کسی کثرت کی وحدت ہے گوناگونی اور یکسانی دونو قدم بقدم اور دوش بدوش بڑھتی ہیں۔ اس لحاظ سے ہر فرد اور ہر قوم کو پوری آزادی ہونی چاہیئے کہ وہ جس طرح چاہے اپنے ماحول کے ساتھ تطابق پیدا کرے۔ کامل آزادی پر فقط یہی پابندی عائد ہو سکتی ہے کہ ہر فرد اور ہر قوم اپنی آزادی کو اس طرح برتے کہ دوسرے کی آزادی میں مخل نہ ہو۔ اس تعلیم کے مطابق ہر ایسا مذہب اور ایسی سیاست غلط ہے جو کسی قوم یا فرد کی زندگی میں غیر ضروری طور پر مخل ہو۔ ایسے قوانین ارتقا کے منافی ہیں جو کسی فرد یا قوم کے آزادانہ طرز عمل میں تفصیلات کے اندر دست درازی کریں۔ ہر قوم اپنی راہ پر چل کر اپنے تجربہ حیات سے نوع انسان کو فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ اسی طرح ہر فرد کو اگر اپنے مخصوص میلانات کو عمل کا جامہ پہنانے کا اختیار ہو تو اس کے عمل میں اگر کوئی خرابی ہے تو وہ فطرت کی طرف سے سزا بھگتیگا اور اگر کوئی خوبی ہے تو اس کا ثمرہ خود اس کو بھی ملے گا اور جماعت کو بھی۔ لہذا اقوام اور افراد کے مابین کامل جمہوریت اور مساوات کا ہونا لازمی ہے تاکہ زندگی میں زیادہ سے زیادہ تنوع اور اس کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہو سکے۔ حیات انسانی صحیح راستوں پر جب چلتی ہے تو فرد اور جماعت کے مفاد میں تضاد کم ہوتا جاتا ہے اور انفرادی آزادی وحدت کی منافی نہیں رہتی۔

ابھی تک جمہوریت اور مساوات بہت حد تک دور کے نصب العین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو قومیں اس کا پرچار کر رہی ہیں اور اس کو نظریہ حیات کے طور پر اختیار کرنے کی تلقین کر رہی ہیں خود ان کا عمل اس سے بہت کوتاہ ہے۔ نسل اور رنگ کا تفوق اور قومی تعصب

ابھی تک اس انداز کا باقی ہے کہ ان کی زبان سے یہ وعظ و تلقین ریاکاری معلوم ہوتی ہے۔ لیکن نصب العین کو قبول کر کے عمل میں کوتاہی برتنے والا آدمی اس شخص سے بدرجہا افضل ہوتا ہے جو اس نصب العین ہی کو باطل سمجھے۔ جو اس کو صحیح سمجھتا ہے وہ اس میلان کو ترقی دینے کا خواہش مند ہوتا ہے لیکن رسم اور عادات کی بنا پر راسخ شدہ قدیم خود غرضیاں راستے میں روڑے اٹکاتی رہتی ہیں وہ منزل کی طرف خرِ لنگ کی طرح لنگڑاتا ہوا چلتا ہے لیکن کچھ نہ کچھ راستہ طے ہوتا جاتا ہے۔ وہ شخص جو اس منزل کو منزل ہی نہیں سمجھتا اور پشت بہ منزل ہو کر دوسری [illegible] چلتا یا دوڑتا ہے اس کی سعی گمراہی میں اضافہ کرتی ہے۔ اس وقت نوعِ انسان ایک عالمگیر اضطراب میں مبتلا ہے۔ ہر جگہ قدیم اور جدید کی شدید ٹکر ہو رہی ہے۔ اگر قومیں محض جوع الارض میں مبتلا ہو کر برسرِ پیکار ہوتیں اور اس میں بے شمار انسانوں کے گلے بھی کٹ جاتے تو اس سے اس نوع کے ارتقا میں کوئی بڑی رکاوٹ پیدا نہ ہوتی کیونکہ انسان کی اخلاقی اور ذہنی ساخت جوں کی توں جیسی کی ویسی رہتی۔

دنیا میں اکثر جنگیں محض مادی اغراض کی بنا پر ہوئیں لیکن ان سے نتائج محض مادی نہ نکلے۔ اسلام کی ابتدائی جنگوں میں مالِ غنیمت کا چسکا بھی شاملِ حال تھا اور ان جہادوں میں بہت سے زن زر زمین کے طالب شریک تھے۔ ان کے غلبے سے اسلام کو غلبہ حاصل ہوا اور زندگی میں ایسی قوتوں کا فتح باب ہوا جو اکثر لڑنے والوں کے خیال میں نہیں تھیں۔ اسکندر اور چنگیز خاں کی فتوحات کے محرکات عقلی تہذیبی یا روحانی نہیں تھے لیکن ان سے بڑے بڑے عقلی اور تہذیبی نتائج پیدا ہوئے ممالک متحدہ امریکہ کی قومی جنگ جو شمالی اور جنوبی ریاستوں کے مابین ہوئی محرکات کے لحاظ سے ایک معاشی جنگ تھی۔ جنوبی ریاست کا مدار زراعت پر تھا جہاں غلام کی سستی مزدوری سے کام چل سکتا تھا۔ شمالی ریاستیں صنعت و حرفت میں ترقی کر گئی تھیں جہاں غلاموں سے کام نہیں چل سکتا۔ یہ مسئلہ جو اصل میں معاشی تھا اخلاقی اور روحانی مسئلہ بن گیا اور اسی سلسلے میں غلام آزاد ہو گئے۔ کالے گورے کا امتیاز پوری طرح تو نہ مٹ سکا۔

لیکن غلاموں کو ایسی سیاسی اور قانونی حیثیت حاصل ہوگئی جو ابتدائے تاریخ سے ان کو کبھی حاصل نہ ہوئی تھی۔

اس حرب حاضرہ اور اس کے نتائج کی بھی یہی کیفیت ہوگی۔ یہ جنگ محض فلسفہ حیات کے تضاد سے شروع نہیں ہوئی۔ اگر محض ظاہری اسباب کو دیکھا جائے تو فقط یہی معلوم ہوتا ہے کہ بعض قوموں کے پاس دنیا کا زیادہ حصہ ہے اور بعض کے پاس کم۔ جس کے پاس وافر ہے وہ امن کے طالب ہیں کیونکہ وہ امن و امان ہی سے اس سے مستفید ہو سکتے ہیں جن کے پاس کم ہے یا جو قومیں محسوس کرتی ہیں کہ ہم میں قوت اور استعداد زیادہ ہے اور اس کے مطابق ہمیں دنیا سے حصہ ملنا چاہیئے وہ جنگ کی فضیلت کی تبلیغ کرتی ہیں دونو کے محرکات میں جوع الارض کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن طالب امن پیٹ بھری قومیں فلسفۂ امن کی تبلیغ کر رہی ہیں جس کے ضمن میں وہ یہ پرچار کرتی ہیں کہ تمام ادنیٰ اور اعلیٰ اقوام کو اپنی اپنی جگہ آزادی اطمینان اور اختیار حاصل ہو۔ اسی طرح جماعت کے اندر فرد کی آزادی بھی مالدار اور مطمئن قوموں میں زیادہ ہوتی ہے۔ اس وقت دنیا میں اقوام کے دو گروہ ہو گئے ہیں جو اپنی اپنی ضرورتوں کی بنا پر دو مختلف فلسفوں کی تلقین کر رہے ہیں۔ فقط یہ کہہ کر ہم دونوں کو برابر نہیں کر سکتے کہ دونو خود غرضی کی بنا پر الگ الگ فلسفہ تراش رہے ہیں۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ کس طرح ادنیٰ معاشی محرکات سے اعلیٰ اخلاقی نتائج بغیر ارادے کے پیدا ہو جاتے ہیں۔ دونو گروہ ارتقا کے طالب ہیں لیکن ایک ڈارون اور نطشے کی پیروی میں تنازع للبقا کو اس کا ذریعہ قرار دیتا ہے اور اس کے ہاں قوت اور حیوانیت خیر برترین ہے۔ دوسرا گروہ کسی معاشی مجبوری کی وجہ سے ہی سہی ایسا نظریہ حیات پیش کر رہا ہے جس میں تمام بنی آدم اعضائے یکدیگر بن کر آگے کی طرف بڑھیں۔ جمہوریت اور مساوات تاحال انگریزوں کے ہاں بھی ناقص ہے اور امریکہ والوں کے ہاں بھی اور خود روس کی اشتراکی مساوات میں بڑی خامیاں ہیں۔ لیکن ان سب کا نظریہ ارتقا کچھ تو پہلے ہی سے ملتا جلتا تھا۔ کچھ جنگی ضرورتوں میں اتحاد عمل سے اور زیادہ مماثل ہوتا جائے گا اور اگر ان کو کامیابی ہوگئی تو اس کا نتیجہ امریکہ کی خانگی جنگ کی طرح ہوگا جس میں غلام آزاد ہو گئے تھے۔ یہاں یہ ہوگا کہ غلام اور کمزور قومیں

پہلے سے زیادہ آزاد ہو جائیں گی۔ خود ان اقوام کے اندر بھی جمہوریت اور مساوات کی صورتیں بہت کچھ بدل جائیں گی۔ انگریزوں کی سرمایہ واری جمہوریت اپنی پہلی حالت پر پھر واپس نہیں آسکتی۔ چنانچہ اس بارے میں انگریزوں کا نظریہ حیات جو پہلے کسی قدر مبہم تھا ذرا واضح ہو جائیگا۔ اور وہ اس کو بہت زیادہ عمل کا جامہ پہنانے پر مجبور ہونگے۔ لیکن اگر ان قوموں کو غلبہ حاصل ہو گیا جو نسلی تفوق کا پرچار کر رہی ہیں اور قوت کو حق پر مرجح سمجھتی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بعض قومیں غالب اور بعض مغلوب ہو جائیں گی اور انسانی تہذیب کسی نئی منزل کی طرف قدم نہیں بڑھا سکے گی۔ انسانی اقدار، مذہب، اخلاق اور روحانیت کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف وہی نظریۂ ارتقا قابل قبول ہو سکتا ہے جو ہر فرد اور ہر قوم کی مستقل قیمت کا قائل ہو اور انسانی اقدار میں کمال چاہے نہ کہ حیوانی قوت میں۔ حیوانی انا قومی انا بن کر کچھ اپنی حیثیت بدل نہیں لیتا لیکن اصل انسانی ترقی اس کو کہنا چاہیے جس میں حیوانی انا انسانی انا بن جائے۔ ابھی یہ منزل دور ہے لیکن آگے بڑھنے والے انسان کی منزل یہی ہے۔

گفتم کہ یافت مے نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت مے نشود آنم آرزوست

(رومی)

مصر آل طولون کے عہد میں

از

جناب محمد جمیل الرحمن صاحب ایم اے۔ پروفیسر تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی۔
حیدرآباد۔ دکن

گذشتہ مضمون[1] میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ خلافت عباسیہ کے آغاز میں جو تبدیلی مصری سیاسیات میں شروع ہوئی تھی اس کی تکمیل خلیفہ معتصم نے اس طرح کی کہ خلیفہ ہوتے ہی حکم دیا کہ مصر میں عربوں کے ارزاق مسدود کر دئے جائیں۔ اس حکم سے عربوں کے سیاسی تفوق کا یک لخت خاتمہ ہو گیا، اور انھیں دوسرے اہل مصر کی طرح عام آبادی کا ایک حصہ بننا پڑا۔ معتصم کا عہد مصر میں صرف اسی سیاسی تبدیلی کا باعث نہیں ہوا، بلکہ اسی کے زمانے میں یہ ملک بطور جاگیر ایک ترک امیر اشناس کو دے دیا گیا۔ ترکوں کو سب سے پہلے خلیفہ ہارون الرشید نے ملازم رکھنا شروع کیا تھا، لیکن ان کا عروج معتصم ہی کے زمانے کا واقعہ ہے۔ اسی خلیفہ نے گرد و پیش کے حالات دیکھ کر اندازہ کیا تھا کہ عجمیوں پر اتنا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا جتنا کہ اس کے پیشرؤں نے کیا تھا۔ ان ترکوں میں جنھیں اس کے زمانے میں اقتدار حاصل ہوا، ایک اشناس بھی تھا، اور اس کے اقتدار کی حد یہ تھی کہ ملک مصر اسے بطور جاگیر دیا گیا تھا۔

یہ ضروری نہیں سمجھا گیا کہ خود اشناس مصر جائے، بلکہ اس نے اپنی طرف سے بطور نائب کسی دوسرے شخص کو وہاں بھیج دیا۔ باوجود اس کے کہ عربوں کے ارزاق بند ہو چکے تھے، غالباً زیادہ مناسب یہ سمجھا گیا تھا کہ ان کا اقتدار ایک بارگی ختم نہ کیا جائے۔ چنانچہ ۲۱۸ھ سے ۲۴۲ھ تک برابر عرب امراء

---

[1] "عرب مصر میں"۔ رسالہ سیاست (حیدرآباد۔ دکن) جولائی ۱۹۴۲ء

مصر پر مقرر ہوتے رہے۔ لیکن اس چوبیس برس کے عرصہ میں کم وبیش بارہ مرتبہ مصر کے حاکم بدلے گئے۔ ابتداءً ان کا تقرر اشناس کی طرف سے ہوتا تھا۔ ۲۳۰ھ میں اشناس کا انتقال ہوا تو خلیفہ واثق باللہ (۲۲۷ھ سے ۲۳۲ھ) نے ایتاخ کو اس کا جانشین بنایا، اور امرا مصر ایتاخ کی طرف سے مقرر ہونے لگے۔ ۲۳۵ھ تک یہ حالات باقی رہے۔ اس سال خلیفہ متوکل نے ایتاخ کو معزول کیا، اور خلافت کے تمام ممالک اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دئے۔ اب امرا مصر المنتصر بن المتوکل کی طرف سے مقرر ہونے لگے، اور جس طرح مصر کے منبروں پر سے خلیفہ کے بعد اشناس اور ایتاخ کے لئے دعا کی جاتی تھی، اسی طرح اب منتصر کے لئے دعا ہونے لگی۔ آخری عرب امیر عنبسہ بن اسحاق الضبی منتصری کی طرف سے ۲۳۸ھ میں مقرر ہوا تھا[۲]۔ منتصر کا مقرر کردہ آخری امیر یزید بن عبداللہ الترکی تھا، جو خلیفہ منتصر کی وفات یعنی ۲۴۸ھ تک مصر کا والی رہا۔ اس وقت تک ترک امرا خلفائے عباسیہ پر اس درجہ حاوی ہو گئے تھے کہ انھیں کے مشورے سے المستعین احمد بن المعتصم کو خلیفہ منتخب کیا گیا اور پھر ۲۵۱ھ میں اسے انھیں امرا نے خلع پر مجبور کیا۔ متوکل کا دوسرا بیٹا معتز (۲۵۱ھ سے ۲۵۵ھ) اب خلیفہ ہوا۔ نیا خلیفہ بغا الترکی سے ناراض تھا، اور اس کے زمانے میں ایک اور ترک امیر بایکباک[۳] امور خلافت پر حاوی تھا۔ حسن بن مخلد اور ابو نوح عیسیٰ بن ابراہیم بن نوح اس کے معاون و مددگار تھے۔ خلیفہ معتز ہی نے بایکباک کو مصر کے اعمال المعاون کا حاکم مقرر کیا اور بایکباک نے بطور نائب احمد بن طولون کو منتخب کیا۔ اس طرح رمضان ۲۵۴ھ میں احمد بن طولون مصر کا حاکم مقرر ہو کر فسطاط پہنچا[۴]۔

(۱)

طولون ترکوں کے قبیلہ طغزغز[۵] یا طغازغان سے تھا۔ ۲۰۰ھ میں بخاری و خراسان کے عامل

---

[۲] الکندی ص ۲۰۰، ۲۰۲ +

[۳] ترکی ناموں کے املا میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ ہر ایک نام طرح طرح سے لکھا جاتا ہے۔ بایکباک کے املا میں طبری کی پیروی کی گئی ہے۔ باقی ترکی ناموں میں بھی یہ خیال رکھا گیا ہے کہ زیادہ معروف املا کو اختیار کیا جائے +

[۴] یعقوبی ج ۲۔ ص ۶۱۵، ۶۱۶ + طبری۔ ج ۱۱۔ ص ۷ ۱۵ + [۵] لین پول ص ۶ + [۶] مقریزی ج ۱۔ ص ۳۱۳ +

نوح سامانی نے اُس مال و اسباب، غلاموں اور ماوراالنہر کے مویشی کے ساتھ، جو وہ سالانہ دربار خلافت میں بھیجا کرتا تھا، اسے خلیفہ مامون کی خدمت میں پیش کیا۔ مامون نے طولون کو آزاد کر دیا، اور وہ رفتہ رفتہ ترقی کر کے امرا و دولت کے زمرے میں شریک ہو گیا۔ ابوالعباس احمد بن طولون ۲۲۰ھ یا بروایتے ۲۱۴ھ میں بغداد یا سامرا میں پیدا ہوا۔ زیادہ قابل اعتبار روایت یہ ہے کہ اس کی جائے پیدائش سامرا ہی ہے۔ ماں ہاشم یا قاسم نام ایک لونڈی تھی۔ بعض لوگ جن میں کچھ مصری بھی شامل ہیں، کہتے ہیں کہ احمد درحقیقت طولون کا بیٹا نہیں تھا، بلکہ اس کے باپ کا نام ملیح الترکی تھا[۱] اور چونکہ اس کی ماں قاسم طولون کی لونڈی تھی اس لئے اُسے طولون سے منسوب کر دیا گیا۔ لیکن ابوالعباس خاقان نے یہ روایت اس وجہ سے غلط قرار دی ہے کہ الموفق نے جب احمد پر لعنت بھیجنے کا حکم دیا ہے تو اُسے طولون کی طرف ہی منسوب کیا تھا، نہ کہ ملیح کی طرف۔ طولون کا انتقال ۲۳۰ھ یا ۲۴۰ھ میں ہوا، اور اس کے مرنے پر خلیفہ متوکل نے اس کا تمام اثاثہ اور مال احمد کے سپرد کر دیا۔

اولادِ عجم کے برعکس، جن کی بڑی تعداد اس وقت بغداد اور سامرا میں موجود تھی احمد بن طولون کی تعلیم و تربیت نہایت عمدہ طریقہ پر ہوئی تھی، اور چال چلن کے لحاظ سے بھی وہ تمام عیوب سے مبرّا تھا، اُس میں وہ خرابیاں کبھی نہیں پائی جاتی تھیں جو عام طور پر اس طبقے سے منسوب کی جاتی ہیں۔ اُس نے سامرا یا بغداد میں علم قرآن حاصل کیا، حافظ قرآن ہوا، اور خوش الحانی اُسے خدا کی طرف سے ملی تھی۔ اس کے بعد اُس نے حنفی فقہ حاصل کی۔ جوان ہوا تو اپنی چچا زاد بہن خاتون سے، یا مقریزی[۲] کے مطابق اماجور کی بیٹی سے نکاح کیا جس کے بطن سے ۲۴۲ھ میں اس کا سب سے بڑا بیٹا عباس پیدا ہوا۔ اسی بیوی کے

---

[۱] ابن خلدون (ج ۴۔ ص ۲۹۸) نے اس شخص کا نام الیغ لکھا ہے۔ اس مورخ نے یہ روایت صدرالدین بن عبدالظاہر سے بیان کی ہے، اور ابن عبدالظاہر نے اخشید کی ایک سوانح عمری کا حوالہ دیا ہے۔ اس کے مطابق طولون دراصل الیغ کے مرنے پر احمد کا کفیل ہوا تھا۔ اسی وجہ سے وہ احمد بن طولون مشہور ہو گیا تھا۔ لیکن ابن عبدالظاہر خود لکھتے ہیں کہ "لم اُمرّ ذلک لغیرہ من المورخین"

[۲] خطط ج ۱۔ ص ۳۱۴ +

بطن سے اس کی ایک بیٹی فاطمہ بھی تھی۔

جوانی ہی میں علم وفضل کی وجہ سے احمد بن طولون کو شہرت حاصل ہوگئی تھی۔ ترکوں اور ان کی اولاد کو وہ برا سمجھتا تھا، ان کی عقل وفہم کو حقیر جانتا تھا، یہ لوگ خلیفہ کے ساتھ جس قسم کا سلوک کرتے تھے اس سے بیزار تھا، اور کہا کرتا تھا کہ ان لوگوں کی وجہ سے حرمت اسلام ہتوک ہے۔ اسی بیزاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آخر دار الخلافہ کو خیر باد کہنے پر آمادہ ہوگیا۔ احمد بن طولون کا خاص دوست خاقانی بیان کرتا ہے کہ

"ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ ان موالی یعنی ترکوں کے جرموں میں کب تک شریک رہو گے؟ ان کے خطاء وجرم کے ہم بھی ملزم قرار دئے جاتے ہیں۔ بہتر ہے کہ وزیر سے استدعا کریں کہ ہمارا رزق ثغر الشام پر لکھ دے۔ وزیر عبید اللہ بن یحیٰی نے یہ درخواست منظور کرلی، اور یہ دونوں دوست طرطوس روانہ ہوئے۔ طرطوس اس وقت شامی سرحد پر نہایت ہی اہم فوجی مقام تھا، جس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کوئی اسلامی ملک ایسا تھا جہاں سے اس کی حفاظت کے لئے فوجیں نہ بھیجی جاتی ہوں۔ یہ لوگ پیشے کے لحاظ سے سپاہی تھے، لیکن جب جنگی مہمات میں شریک نہ ہوں تو یہی سپاہی عابد وزاہد بن جاتے تھے اور اپنا وقت ذکر الٰہی میں گزارتے تھے۔[۱] اس طرح یہ مقام فوجی مرکز ہونے کے علاوہ علم اور خصوصاً علوم دین کا مرکز بھی تھا۔ احمد بن طولون کے وہاں آنے کے بعد بہت جلد اہل طرطوس اس کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دیکھ کر اس کے گرویدہ ہوگئے۔ اس نے بھی اس عارضی قیام سے پورا فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ طرطوس میں اس نے علم حدیث کی تکمیل کی، اور زھاد و اہل الورع کی صحبت سے فیض یاب ہوا۔ اس اثناء میں خاقانی طرطوس سے سامرا واپس آگیا۔ اس کی واپسی کی خبر سن کر احمد بن طولون کی والدہ روتی ہوئی آئی اور کہا کہ یقیناً میرا بیٹا مر گیا ہے۔

---

[۱] یاقوت۔ معجم البلدان۔ تحت طرطوس۔

جہاد جو سے تم اکیلے ماں میں آگئے ہو۔ خاقانی کہتا ہے کہ میں نے قسمیں کھا کر اُسے یقین دلایا کہ میں نے تمہاری والدہ کو بخیر و عافیت طرطوس میں چھوڑا ہے۔ جب میں طرطوس واپس آیا تو احمد کو اُس کی والدہ کی حالت سے مطلع کیا، اور کہا کہ اگر تم اپنی والدہ کو اس حالت میں چھوڑ کر اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے خواہشمند ہو تو غلطی کر رہے ہو۔ احمد نے طرسوس سے واپس جانے کا وعدہ کیا۔ پانچ سو آدمیوں کا ایک قافلہ جس میں یہ دونوں دوست بھی شریک تھے طرسوس سے روانہ ہوا۔ اُدھر خلیفہ مستعین کا ایک خادم خلیفہ کے لئے قسطنطنیہ سے قیمتی کپڑے لئے ہوئے واپس آ رہا تھا۔ وہ بھی اس قافلے میں شریک ہو گیا۔ اب قافلہ رُہا کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن راستے میں اطلاع ملی کہ "رہزن اعراب کی جماعت تمہارے انتظار میں ہے، اور بہتر ہے کہ تم رُہا کے قلعے میں پناہ گزیں ہو جاؤ۔" مگر احمد بن طولون نے کہا کہ میں تو جہاد ہی کی غرض سے نکلا ہوں۔ چنانچہ اسی کی سرکردگی میں یہ لوگ رہزنوں کی جماعت پر حملہ آور ہوئے؛ ان میں بعض کو قتل کیا اور باقی ماندہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس واقعہ سے لوگوں کے دلوں میں احمد طولون کی مہابت اور عزت اور بھی بڑھ گئی۔[10]

مستعین نے وہ رومی کپڑے جو اُس کا خادم قسطنطنیہ سے لایا تھا بہت پسند کئے۔ خادم نے اطلاع دی کہ اگر احمد بن طولون نہ ہوتا تو نہ یہ کپڑے بچتے اور نہ وہ خود اور پھر رہزنوں سے مقابلے کا واقعہ بیان کیا۔ خلیفہ مستعین پر ترک جس حد تک حاوی تھے اُس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ وہ احمد بن طولون کو علانیہ صلہ بھی نہ دے سکا؛ بلکہ خفیہ طور پر ایک ہزار دینار اُس کے پاس بھجوائے، اور کہلایا کہ "اگر مجھے (ترکوں کا) خوف نہ ہوتا تو میں تجھ کو اپنا مقرب بنا لیتا۔" اس پر بھی دوسرے ترکوں کے ساتھ جب کبھی احمد بن طولون خلیفہ کی خدمت میں حاضر

---

[10] مقریزی (ج ۱۔ ص ۳۱۴) نے احمد بن طولون کا متعدد مرتبہ طرسوس جانا بیان کیا ہے، لیکن ابن تغری بردی (ج ۳۔ ص ۴) سے معلوم ہوتا ہے کہ ثغور الشام کا والی ہونے سے قبل وہ صرف ایک مرتبہ وہاں گیا تھا۔

ہوتا تو خلیفہ اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیتا۔ دیگر احسانات کے علاوہ مستعین نے اُسے متاس یا مباس نام ایک کنیز عطا کی، جس کے بطن سے نصف محرم ۲۵۰ھ کو اُس کا بیٹا خمارویہ پیدا ہوا۔ ۲۵۲ھ میں مستعین اور ترک امراء کی ان بن ہوئی اور اسے خلافت سے دست بردار اور واسط جلاوطن ہونا پڑا۔ خود مستعین کے کہنے سے اس سفر میں احمد بن طولون کو اس کے ساتھ کیا گیا۔ احمد نے بھی مستعین سے نیک سلوک کیا، اور سیر و شکار کے لئے اُسے آزاد چھوڑ دیا۔ اس خیال سے کہ اُس پر اچانک حملہ نہ ہو، اُس نے اپنے کاتب احمد بن محمد الواسطی کو اس کے ساتھ متعین کیا۔ اُدھر معتز کے خلیفہ ہونے پر اُس کی ماں قبیحہ نے احمد بن طولون کو لکھا کہ اگر وہ مستعین کو قتل کر دے تو اُسے واسط کا حاکم مقرر کر دیا جائے گا[11]۔ مگر اُس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا، اور دار الخلافے کے ترکوں کو لکھا کہ وہ ایسے شخص کو قتل نہیں کر سکتا جس کے ہاتھ پر ایک وقت بیعت کر چکا ہے۔ اس دیانت داری کی وجہ سے احمد بن طولون ترکوں کی نظروں میں اور بھی معزز ہو گیا۔ ان لوگوں نے مستعین کے قتل کے لئے سعید الحاجب کو مقرر کیا، اور احمد بن طولون کو حکم دیا کہ مخلوع خلیفہ کو اس کے حوالے کر دے۔ سعید نے اُسے قتل کیا، اور احمد بن طولون اُسے دفن کر کے سامرا واپس آ گیا[12]۔

معتز کے خلیفہ ہونے کے وقت ترکوں کا زعیم احمد بن طولون کا ماموں بایکباک تھا۔ اسی کو خلیفہ نے مصر کا حاکم مقرر کیا۔ بایکباک کو ایسے شخص کی تلاش ہوئی جسے وہ بطور نائب مصر بھیجے۔ احمد بن طولون کی دیانت داری اور دین داری پہلے ہی مشہور ہو چکی تھی۔ لوگوں کی سفارش پر بایکباک نے اسی کو مصر کا والی مقرر کر دیا۔ اسحاق بن یوسف اور احمد بن محمد الواسطی اور ایک جیش کے ساتھ وہ ۲۳ رمضان ۲۵۴ھ کو فسطاط پہنچا۔ اگر لین پول[13] کا بیان صحیح ہے تو احمد بن طولون اُس وقت

---

[11] مقریزی (ج ۱۔ ص ۳۱۴) نے قبیحہ کا اور ابن تغری بردی (ج ۲۔ ص ۱۷۷) نے خود معتز کا نام لکھا ہے۔ مقریزی میں قبیحہ کے بجائے فتیحہ طباعت کی غلطی ہے۔

[12] ابن خلدون ج ۴۔ ص ۲۹۵، ۲۹۸۔

[13] تاریخ مصر بہ عہد وسطیٰ (انگریزی) ص ۶۱۔

خوش حال نہ تھا، اور سفر خرچ کے لئے ایک ہمدرد نے دس ہزار دینار اُسے دئے تھے[۱۴]۔ اس وقت احمد بن طولون صرف قصبہ پر حاکم مقرر ہوا تھا، اور اس کے باہر کے اعمال، مثلاً اسکندریہ وغیرہ اُس کی حکومت سے خارج تھے[۱۵]۔

ہم گذشتہ مضمون[۱۶] میں دیکھ چکے ہیں کہ مصر کی حکومت بالعموم دو حصوں میں منقسم تھی، معونہ یا صلاۃ اور خراج۔ دونوں عہدوں پر الگ الگ افسر مقرر ہوتے تھے، اور یہ دونوں براہ راست خلیفہ کو جواب دہ تھے۔ شاذ ہی ایسا ہوتا تھا کہ معونہ اور خراج پر ایک شخص مقرر کر دیا جائے۔ چنانچہ جب اُشناس کو مصر کا والی مقرر کیا گیا ہے تو بھی معونہ یا صلاۃ کا حاکم تھا۔ صاحب الخراج کا نصب وعزل اس کے بعد بھی خلیفہ ہی کے ہاتھ میں رہا، وہ جو چاہتا تھا مقرر کرتا تھا[۱۷]۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں اشتراک عمل جب ہی ہوسکتا تھا کہ دونوں افسر ہم خیال ہوں۔ ورنہ کشمکش یقینی امر تھا۔ برائے نام والی علی الصلوۃ کا درجہ بلند تھا۔ لیکن اگر صاحب الخراج بلند ہمت ہوا اور اپنے تمام اختیارات کو کام میں لانا جانتا ہو تو ظاہر ہے کہ والی کے مقابلے میں اُس کا رسوخ اور اثر کہیں زیادہ ہوگا۔ اس کی بہترین مثال عہد اموی میں عبید اللہ بن الحبحاب اور والیان مصر کی ہے۔ جب احمد بن طولون اعمال المعاون کا والی مقرر ہو کر فسطاط آیا ہے تو یہاں کا صاحب الخراج احمد بن المدبر تھا۔ یہ شخص چالاک اور ذہین کاتب تھا، اور ناممکن تھا کہ اُس میں اور احمد بن طولون جیسے بلند ہمت

---

[۱۴] احمد بن طولون کے یہ ابتدائی حالات مقریزی (ج ۱۔ ص ۳۱۳، ۳۱۴) ابن خلدون (ج ۴۔ ص ۲۹۵، ۲۹۸) اور ابن تغری بردی (ج ۳۔ ص ۲۔ ۷) سے ماخوذ ہیں۔ اس کے علاوہ دیکھو ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۶۱ +

[۱۵] مقریزی ج ۱۔ ص ۳۱۴ + "قصبہ" سے بالعموم صدر مقام مراد لیا جاتا ہے لیکن جیسا کہ بیکر (ص ۱۶۰) نے لکھا ہے، یہاں قصبہ سے مراد ساحل اور سرحدی علاقے چھوڑ کر اصل سرزمین مصر سمجھنا چاہیئے +

[۱۶] "عرب مصر میں" رسالہ سیاست (حیدر آباد دکن) جولائی ۱۹۴۱ء +

[۱۷] ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۶۶۰، ۶۶۱ +

بالغ نظر والی میں اشتراکِ عمل ہو سکے۔ چنانچہ ان دونوں میں فوراً ہی سخت کش مکش شروع ہو گئی، اور در حقیقت اُس وقت تک ختم نہ ہوئی جب تک کہ ۲۷۰ھ میں دونوں کا انتقال نہیں ہو گیا۔ لیکن چونکہ اس کشمکش کے حالات ہم مفصل طور پر ایک علٰحدہ مضمون[۱۸] میں بیان کر چکے ہیں، اس لئے یہاں ان کا اعادہ غیر ضروری ہے۔

مصر آنے کے بعد احمد بن طولون کو اول تو احمد بن المدبر سے عہدہ برا ہونا پڑا، اور دوسرے جب وہ وہاں پہنچا ہے تو ملک میں پوری طرح امن و امان کا دور دورہ نہ تھا۔ ۲۵۲ھ میں جابر بن الولید المُدلجی نے ایک خطرناک بغاوت کی ابتدا کی تھی، جس میں بنو مُدلج کے علاوہ موالی بھی شریک ہو گئے تھے۔ اس باغی کے خلاف والئ مصر نے جتنی فوجیں بھیجی تھیں سب کو شکست ہوئی تھی، اور مدلجی کو برابر قوت حاصل ہوتی جا رہی تھی۔ اس شورش میں ایک علوی عبد اللہ بن احمد بن محمد المعروف با بن الارقط کے شریک ہو جانے سے اور بھی شدت پیدا ہو گئی تھی۔ شر و فساد کا سلسلہ ماہ رجب ۲۵۴ھ تک جاری رہا، اور احمد بن طولون کے مصر آنے سے صرف دو مہینے قبل امن قائم ہوا تھا[۱۹]۔

لیکن یہ امن بھی محض ظاہری تھا۔ شورش کی چنگاریاں ابھی باقی تھیں۔ ۲۵۴ھ میں بغاوت کی آگ پھر بھڑک اٹھی۔ باغی ایک علوی احمد بن ابراہیم بن عبد اللہ المعروف بہ بغا الاکبر تھا۔ احمد بن طولون کے آنے سے قبل اس کا پیشرو ارجُور اس شورش کو فرو کر چکا تھا، اور بغا الاکبر کا بھی انتقال ہو گیا تھا[۲۰]۔ یہ فتنہ ابھی پوری طرح فرو ہوا ہی تھا کہ جمادی الاولیٰ ۲۵۵ھ میں احمد بن محمد بن عبد اللہ بن طباطبا المعروف بہ بغا الاصغر نے اسکندریہ اور برقہ کے درمیان کنائس کے مقام پر علم بغاوت بلند کیا، اور جابر بن الولید المُدلجی کا چچازاد بھائی بھی اس سے مل گیا۔ وہ مصر صعید کی طرف چلا، جہاں اس نے احمد بن طولون کی فوجوں کے مقابلے میں شکست کھائی اور قتل ہوا۔

---

۱۸ "احمد بن المدبر"۔ رسالہ سیاست (حیدر آباد دکن) اکتوبر ۱۹۴۱ء +

۱۹ الکندی ص ۲۰۵ - ۲۱۰ + مقریزی ج ۲ - ص ۳۳۹ +   ۲۰ الکندی ص ۲۱۲ + مقریزی ج ۲ - ص ۳۳۹ +

شعبان ۲۵۵ھ میں اُس کا سر فسطاط لایا گیا۔[21] ابھی یہ بد امنی ختم ہی ہوئی تھی کہ ایک اور خطرناک فتنہ اٹھا۔ اس کا سرغنہ بھی ایک علوی ابراہیم بن محمد بن یحییٰ المعروف با بن صوفی تھا۔ اس فساد کا آغاز ۲۵۳ھ میں ہوا تھا۔ ذی القعدہ ۲۵۵ھ میں صورت حال اس قدر نازک ہوگئی تھی کہ ابن الصوفی نے اِسنا پر قبضہ کرکے شہر کو لوٹا اور باشندوں کو قتل کیا۔ ابتدا میں احمد بن طولون کی فوجوں کو کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن انجام کار ۳ ربیع الاول ۲۵۶ھ میں اخمیم کے مقام پر ابن الصوفی نے شکست کھائی، مگر گرفتار نہ ہو سکا اور تنیس میں پناہ گزیں ہوا۔ محرم ۲۵۹ھ میں اُس نے اشمونین میں دوبارہ سر اٹھایا۔ اس دوران میں اس وجہ سے معاملات اور بھی پیچیدہ ہو گئے کہ حضرت عمرؓ کی اولاد میں سے ایک شخص ابو عبداللہ (یا ابو عبدالرحمٰن) العمری نے اسوان[22] میں فوجیں جمع کیں۔ ابن الصوفی اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اسوان چلا گیا، مگر العمری کے مقابلے میں شکست کھائی اور بھاگ کر اسوان میں پناہ لی۔ یہاں پھر اس نے فساد برپا کیا، اور اہل اسوان کے تین لاکھ کھجور کے درخت کاٹ ڈالے۔ اب احمد بن طولون نے ایک تازہ دم فوج اُس کے خلاف بھیجی۔ ابن الصوفی جا بجا بھاگا پھرا، اور بالآخر عیذاب کے بندرگاہ سے مکّہ چلا گیا۔ لیکن حاکم مکّہ نے اُسے گرفتار کرکے احمد بن طولون کے پاس بھیج دیا۔ پہلے تو احمد نے اُسے قید میں رکھا اور پھر آزاد کر دیا۔ اس کے بعد ابن الصوفی مدینہ چلا گیا، اور آخر وہیں اس کا انتقال ہو گیا۔[23]

غالباً انھیں شورشوں اور بغاوتوں سے متاثر ہو کر جمادی الآخر ۲۵۸ھ میں احمد بن طولون نے

---

[21] الکندی ص ۲۱۲ + مقریزی ج ۲ ص ۳۳۹ + ابن الاثیر ج ۷ ص ۱۷ - حوادث ۲۵۵ھ +

[22] اسوان جنوبی سرحد پر نوبہ کی سرزمین کے قریب مسلمانوں کا آخری شہر تھا۔ یہاں کی کھجوریں مشہور تھیں، بلکہ یہی کھجوریں اہل اسوان کا سب سے بڑا ذریعہ معاش تھیں۔ مقریزی ج ۱ ص ۱۹۸ الخ + یاقوت۔ معجم البلدان تحت اسوان +

[23] الکندی ص ۲۱۳، ۲۱۴ + ابن الاثیر ج ۷ ص ۸۶، ۸۷ + ابن تغری بردی ج ۳ ص ۷ + مقریزی ج ۱ ص ۳۱۹ ابن خلدون ج ۴ ص ۳۰۲ +

تمام طالبیین کو مصر سے خارج کرکے مدینہ بھیج دیا تھا۔ اتفاق سے عباس بن علی کی اولاد میں سے ایک شخص رہ گیا تھا، اور اس کوشش میں تھا کہ مغرب چلا جائے، جہاں اُس وقت ادارسہ حکمراں تھے، لیکن ماخوذ ہوا۔ احمد بن طولون نے اُسے ایک سو پچاس چابکوں کی سزا دی اور فسطاط میں تشہیر کرایا[٢٤]۔ غالباً اس کے بعد وہ بھی مدینہ بھیج دیا گیا تھا۔ مصر میں یہ طرزِ عمل نیا نہیں تھا۔ شروع ہی سے بنو عباس یہ چاہتے تھے کہ مصر میں بنو علی کے قدم جمنے نہ پائیں۔ چنانچہ مقریزی[٢٥] نے یہ تمام واقعات یک جا جمع کر دیے ہیں، اور الکندی[٢٦] نے حسبِ موقع انھیں بیان کیا ہے۔ لازمی طور پر اس عمل میں شدت اُس وقت پیدا ہوئی تھی جب ہارون الرشید کے زمانے میں ادارسہ کی حکومت مغرب میں قائم ہوگئی۔ ابن طولون سے ذرا ہی قبل خلیفہ منتصر کے حکم سے اُن پر سختیاں کی گئی تھیں، اور پھر ٢٥٠ھ میں اُن کا اخراج عمل میں آیا تھا۔

یہ تھیں احمد بن طولون کے ابتدائی عہد کی شورشیں جن کی وجہ سے وہ شروع میں پریشان رہا۔ ان کے نتائج و عواقب پر غور کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم دربارِ خلافت کے حالات پر توجہ کریں۔ ٢٥٥ھ میں خلیفہ معتز کو خلع پر مجبور کیا گیا، اور مہتدی خلیفہ ہوا۔ ایک سال بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ ٢٥٦ھ میں مہتدی اور ترک امرا میں جھگڑے شروع ہوگئے۔ اس شر و فساد میں بایکباک پیش پیش تھا۔ بعد خلع سے قبل مہتدی کے حکم سے اُسے گرفتار کیا گیا، اور اُسے قتل کرکے اُس کا سر اس کے ساتھیوں کے سامنے پھینک دیا گیا[٢٧]۔ اب معتمد خلیفہ ہوا، جس نے احمد بن طولون کے خسر یارجوخ کو مصر کا اور محمد بن ہرثمہ بن اعین کو برقہ کا والی مقرر کیا۔ یہ ٢٥٦ھ کا واقعہ ہے۔ یارجوخ نے نہ صرف احمد بن طولون کو مصر پر بحال رکھا، بلکہ آزادیٔ عمل کی عام اجازت دے دی[٢٨]۔ مصر کے خطبوں میں بھی خلیفہ کے بعد اب یارجوخ کا نام لیا جانے لگا، اور اس کے لئے دعا بھی ہونے لگی۔ رمضان ٢٥٦ھ میں

---

[٢٤] یعقوبی۔ ج ٢۔ ص ٦٢٣
[٢٥] خطط ج ٢۔ ص ٣٣٨، ٣٣٩
[٢٦] کتاب الولاة ص ١٩٨، ٢٠٣، ٢٠٤ +
[٢٧] طبری ج ١١۔ ص ٢٦٠ + ابن الاثیر ج ٧۔ ص ٧٥ +
[٢٨] یعقوبی ج ٢۔ ص ٦٢١ + ابن الاثیر ج ٧۔ ص ٨٢ + مقریزی ج ١۔ ص ٣١٤ + مقریزی میں ماجور کے بجائے یارجوخ ہونا چاہیے +

یارجوخ کا انتقال ہوگیا[29] لیکن مرنے سے قبل وہ احمد بن طولون کو قصبہ کے علاوہ مصر صعید اور اسکندریہ کا حاکم بھی مقرر کر چکا تھا۔ اسی بنا پر طغلغ کو بطور نائب فسطاط میں چھوڑ کر ۸ رمضان ۲۵۸ھ کو احمد بن طولون اسکندریہ گیا، اور اسحاق بن دینار سے وہاں کا جائزہ لیا۔ دوسرے مرتبہ شعبان ۲۵۹ھ میں وہ پھر اسکندریہ گیا، اور اپنے بیٹے عباس کو فسطاط میں چھوڑ گیا۔ ڈیڑھ مہینے بعد وہ فسطاط واپس آگیا۔[30] یارجوخ کے مصر پر والی مقرر ہونے سے احمد بن طولون کو یہ فائدہ پہنچا تھا کہ مصر صعید اور اسکندریہ بھی اس کے زیر اقتدار آگئے تھے، اور اس کی موت سے اُسے یہ فائدہ ہوا کہ اس سے باز پرس کرنے والا کوئی باقی نہیں رہا۔ اس طرح ۲۵۸ھ میں وہ مصر کا مستقل والی ہوگیا۔[31]

اس دوران میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس کا اثر احمد بن طولون کے عروج پر بہت گہرا پڑا۔ جب معتز خلیفہ ہوا ہے تو بعض عمال ایسے تھے جنھوں نے اُس کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ انھیں میں ایک عیسیٰ بن شیخ بن السلیل الشیبانی عامل فلسطین و اردن بھی تھا لیکن بہت جلد خلیفہ کی فرستادہ فوجوں سے شکست کھا کر ابن الشیخ فلسطین سے مصر جانے پر مجبور ہوا تھا اور وہاں پہونچ کر اس نے اور یزید بن عبد اللہ عامل مصر نے معتز کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔[32] چنانچہ ہمیں معلوم ہے کہ ۲۵۳ھ میں ابن الشیخ مصر کا مال کثیر لے کر خلیفہ معتز کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، اور حضرت علی، جعفر اور عقیل کی اولاد میں سے چھبیس آدمی بھی اس کے ساتھ تھے، جنھوں نے حکومت کی بلا اجازت حجاز سے بھاگ کر مصر میں پناہ لی تھی۔ حجاز سے بھاگنے کی وجہ یہ تھی کہ علویوں نے وہاں فتنہ و فساد پھیلا رکھا تھا۔ خلیفہ نے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے تکفیل کے بعد ان لوگوں کو چھوڑ دیا تھا کہ وہ حجاز واپس چلے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی ابن الشیخ کو دوبارہ فلسطین کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔[33] والی ہوتے ہی

---

[29] ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۸۵ +

[30] ابن خلدون ج ۴۔ ص ۲۹۸ + الکندی ۲۱۶ +

[31] ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۸۵ +

[32] یعقوبی ج ۲۔ ص ۶۱۱

[33] مروج الذہب ج ۲۔ ص ۳۰۴ +

ابن الشیخ پھر مخاصمت پر آمادہ ہوا۔ یہ ۲۵۴ھ کا واقعہ ہے۔ اُسے مزید مدد اس طرح ملی کہ مصر کے صاحب الخراج احمد بن المدبر نے سات لاکھ پچاس ہزار دینار دارالخلافہ بھیجے تھے۔ اس رقم پر ابن الشیخ نے راستہ میں قبضہ کر لیا۔ عربوں کی فوج جمع کی، قبیلۂ کلب سے مصاہرت کے تعلقات پیدا کر کے اپنی جمعیت کو اور قوی کیا، اور دملہ کے باہر ایک قلعہ تعمیر کرایا، جس کا نام الحامی رکھا[۱۳۴] معتز کا زمانہ اس طرح گذر گیا، اور حکومت ابن الشیخ کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ مہتدی نے خلیفہ ہوتے ہی ۲۵۶ھ میں تمام متحرکین و متغلبین کو ایک عام امان دی، اور ابن الشیخ کو بھی لکھا کہ مصر وغیرہ کا جو مال اُس نے بالجبر حاصل کیا ہے اُسے واپس کر دے۔ مگر ابن الشیخ مانع ہوا، اور بالآخر مہتدی نے مجبور ہو کر احمد بن طولون کو اُس کی سرکوبی کے لئے فوج میں اضافے کا حکم دیا، اور ابن الشیخ کے اعمال بھی اُس کے سپرد کر دئیے۔[۱۳۵]

احمد بن طولون نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر سرخ و سفید غلاموں اور حبشیوں (سودان) کی ایک بہت بڑی فوج جمع کر لی[۱۳۶]۔ قلقشندی[۱۳۷] لکھتا ہے کہ احمد بن طولون پہلا شخص تھا جس نے ترک مملوکوں کو مصر میں بلایا، اور انھیں فوج میں شریک کیا۔ صفر ۲۵۶ھ میں احمد بن طولون نے فلسطین جانے کا ارادہ کیا، لیکن پھر سوچا کہ چلنے سے پہلے ابن الشیخ سے خط و کتابت کر کے اُسے راہ راست پر لانے کی کوشش کی جائے۔ اُس نے ایک خط ابن الشیخ کو لکھا اور ایک وفد کے ہاتھ، جس میں مصر کے مشہور قاضی ابو بکرہ بکّار بن قتیبہ بھی شریک تھے، اُس کے پاس بھیجا۔ مگر یہ سعی نامشکور رہی، اور انجام کار

---

[۱۳۴] یعقوبی ج ۲ ص ۶۱۳، ۶۱۴ +

[۱۳۵] یعقوبی ج ۲ ص ۶۱۷، ۶۲۰ + ابن خلدون ج ۴ ص ۲۹۸ + الکندی ص ۲۱۴، ۲۱۵ + مقریزی ج ۱ ص ۳۱۵ +

[۱۳۶] محمد کرد علی (خطط الشام ج ۱ ص ۲۰۱) نے احمد بن طولون کی اس فوجی تیاری کا ذکر کیا ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ غالباً یہ باغی جس کے خلاف یہ مہم تیار کی گئی تھی سیما الطویل تھا۔ حالانکہ سیما الطویل کا واقعہ بہت بعد کا ہے۔ تعجب ہے کہ مصنف شام کی تاریخ لکھ رہے ہیں اور ابن الشیخ کے واقعات سے نہ صرف بے خبر ہیں بلکہ اُسے سیماؔ الطویل سے خلط ملط کر رہے ہیں۔ اس قسم کے غیر ذمہ دارانہ بیانات کی وجہ سے اس قابل قدر کتاب کی قدر و قیمت لازماً گھٹ جاتی ہے، اور مصنف کا ہر بیان مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ [۱۳۷] صبح الاعشٰے۔ ج ۳۔ ص ۴۲۸۔

وہ جمعرات کے دن ۱۰ جمادی الآخر ۲۵۶ھ کو اپنے بھائی موسیٰ کو بطور نائب مصر میں چھوڑ کر فلسطین روانہ ہوا۔ مگر عریش پہونچا تھا کہ عراق سے خلیفہ کا ایک فرمان (کتاب) اُسے ملا کہ وہ واپس چلا جائے اور اماجور (یا ماجور) کو اُس کی جگہ ابن الشیخ کی سرکوبی کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے۔ شعبان ۲۵۶ھ میں احمد بن طولون، فسطاط واپس پہونچا۔ اعمال شام بجائے اُس کے اماجور کے حوالے کر دئے گئے۔[۳۸] ابن الشیخ کا انجام یہ ہوا کہ معتمد نے خلیفہ ہونے کے بعد حسین المعروف بعرق الموت کے ہاتھ ایک امان نامہ اُس کے پاس بھیجا، جس میں اور اُس کی اولاد کو امان دی گئی تھی۔ مال کے بابت کوئی اعتراض نہ کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا، اور اُس کے تمام قصور معاف کر کے اُسے ارمینیہ کا والی مقرر کیا گیا تھا۔ ابن الشیخ نے اب اطاعت قبول کر لی، اور اپنے اعمال اماجور الترکی کے حوالے کر کے جمادی الآخر ۲۵۶ھ میں ارمینیہ چلا گیا، مگر مال کا ایک حبہ بھی واپس نہیں کیا۔[۳۹]

ابن الشیخ کے خلاف اس مہم کے بعد احمد بن طولون اور اس کے بھائی موسیٰ میں اس وجہ سے منافرت پیدا ہوئی کہ موسیٰ سمجھتا تھا کہ اُسے پورا حق نہیں ملا۔ احمد بن طولون نے بالآخر موسیٰ کو خارج البلد کر دیا، اور اُس کے کاتب اسحاق بن یوسف کو اس جرم میں گرفتار کرایا کہ اُس نے موسیٰ کو اُس کے اسرار سے واقف کر دیا تھا۔ موسیٰ حج کے ارادے سے روانہ ہوا، اور وہاں سے عراق چلا گیا، جہاں اُس نے اپنے بھائی کی اتنی تعریفیں کیں کہ الموفق چوکنا ہو گیا۔[۴۰] غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ

---

۳۸ الکندی ص ۲۱۴، ۲۱۵ + ابن الدایہ (بیکر ص ۱۶۰) نے اس مہم کی تاریخ ۲۵۷ھ بتائی ہے، اور بیکر ہی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ گو مہم ۲۵۶ھ میں شروع ہوئی تھی، لیکن ممکن ہے کہ فوج کی تیاری میں وقت صرف ہوا ہو، اور احمد بن طولون ۲۵۷ھ میں شام کی طرف روانہ ہو سکا ہو۔ لیکن الکندی کا بیان اس قدر واضح ہے کہ اس میں شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ مہم کا آغاز اور انجام دونوں ۲۵۶ھ کے واقعات ہیں۔ اماجور کا اس مہم پر روانہ ہونا ضرور ۲۵۷ھ کا واقعہ ہے۔ دیکھو ابن خلدون ج ۴۔ ص ۲۹۸ +

۳۹ یعقوبی ج ۲۔ ص ۶۲۱

۴۰ ابن خلدون ج ۴۔ ص ۲۹۹ + یاد ہوگا کہ یوسف بن اسحاق اور محمد بن احمد الواسطی دونوں کاتب احمد بن طولون کے ساتھ عراق سے مصر آئے تھے۔

مرکز خلافت میں احمد بن طولون کی طرف سے حقیقی اندیشہ کا احساس ہوا۔

احمد بن طولون اس وقت تک رفتہ رفتہ فسطاط اور قصبہ کے علاوہ مصر صعید، اسکندریہ اور برقہ کا حاکم مقرر ہو چکا تھا، اور شام کی سرحد تک اُس کا دور دورہ تھا۔ یہ محض اتفاقی امر تھا کہ اس وقت شام اُس کے ہاتھ نہ آیا۔ لیکن بڑی بات یہ ہوئی کہ ایک باقاعدہ تربیت یافتہ فوج اُس کے ہاتھ آ گئی، جس کی تیاری کے لئے، حالات کی نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے، خلیفہ معتمد نے اپنے صاحب الخراج کو حکم دیا تھا کہ تمام اخراجات محاصل سے ادا کئے جائیں[۱]۔ اس طرح یہ فوج اب صاحب الخراج کے دست نگر ہونے کے بجائے مکمل طور پر اُس کے زیر نگرانی تھی۔ احمد بن طولون نے اپنی عظمت و سطوت کے مظاہرے میں بھی دیر نہیں کی۔ ۲۵۶ھ ہی میں اُس نے ایک ترک قائد ماطعان کے ماتحت ہزار سواروں کا ایک دستہ مصری حاجیوں کے ساتھ حجاز بھیجا، اور حکم دیا کہ وہ مسلح ہو کر فوجی ترتیب کے ساتھ مدینہ اور مکہ میں داخل ہوں، اور عرفات میں بھی اسی طرح جائیں۔ ماطعان نے ان ہدایات پر عمل کیا، اور عرفات میں اسلحہ، فوجی باجے (طبول) اور فوجی جھنڈوں کے ساتھ آیا[۲]۔

اب احمد بن طولون کی ترقی میں دو شخص حائل تھے: احمد بن المدبر صاحب الخراج مصر اور اماجور والئی شام و فلسطین: اور ہمیں معلوم ہے کہ یہ دونوں ہر طرح اُسے نقصان پہونچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ احمد بن المدبر نے اُس کے خلاف جو طرز عمل اختیار کیا وہ ہم پہلے ہی ایک مضمون میں بیان کر چکے ہیں۔ مگر اماجور بھی اُس کی طرف سے غافل نہ تھا۔ گو وہ گزشتہ واقعات میں کامیاب ہوا تھا، اور اب شام و فلسطین پر قابض و متصرف تھا، لیکن احمد بن طولون کا مصر میں رہنا ہی اس کے لئے خطرے کا باعث تھا۔ اس لئے اماجور نے دربار خلافت کو اطلاع دی کہ احمد بن طولون کے پاس ابن الشیخ سے بھی زیادہ زبردست فوج موجود ہے، اور وہ کسی وقت شام پر حملہ کر سکتا ہے۔ اس خبر سے دربار خلافت میں گھبراہٹ پھیل گئی، اور ابو احمد الموفق نے فوراً حکم دیا کہ مصر میں

---

[۱] مقریزی ج ۱۔ ص ۳۱۵ + [۲] یعقوبی ج ۲۔ ص ۶۲۲ +

کسی کو بطور نائب چھوڑ کر احمد بن طولون بذات خود امور خلافت پر غور کرنے کے لئے عراق آئے۔ احمد بن طولون کو اس میں مکر و فریب کا خوف ہوا، کیوں کہ اُس کے جاسوس ہر طرف پھیلے ہوئے تھے، اور ہر طرح کی خبریں اُسے ملتی رہتی تھیں۔ اُس کے اصحاب الاخبار نے وزیر سے ملاطفت و مدارات کا طرز عمل اختیار کیا تھا اور احمد بن المدبر اور شُقَیر سے جو شکایتی خطوط دار الخلافہ بھیجے جاتے تھے وہ سب احمد بن طولون کو مل جاتے تھے۔ ان تمام باتوں سے باخبر ہو کر احمد بن طولون خود تو اطمینان سے فسطاط میں بیٹھا رہا اور اپنے کاتب احمد بن محمد الواسطی کو بڑے قیمتی تحائف دے کر وزیر اور یارجوخ کے پاس بھیجا۔ احمد بن محمد الواسطی نے دار الخلافہ میں ایسے جوڑ توڑ کئے کہ نہ صرف احمد بن طولون کی سامرا میں حاضری معاف کر دی گئی، بلکہ اُس کے بیوی بچوں کو بھی مصر جانے کی اجازت دیگئی۔[۴۳] چنانچہ ۲۵۷ھ میں احمد بن طولون کے دونوں بیٹے اپنے چچا موسیٰ کے ساتھ عراق سے مکّہ ہوتے ہوئے مصر پہونچ گئے۔[۴۴] یہ درحقیقت احمد بن طولون کے مقابلے میں الموفق کی پہلی شکست تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ احمد بن المدبر بھی اماجور کے ساتھ احمد بن طولون کے خلاف اس سازش میں شریک تھا۔ کیونکہ جوں ہی اُسے دار الخلافہ کے اس فیصلے کی خبر ملی اُس نے کوشش کر کے اپنا تبادلہ شام کرا لیا۔ اب وہ فلسطین، اردن اور دمشق کا صاحب الخراج مقرر ہوا، اور مصر میں اُس کی جگہ ابو ایوب احمد بن محمد بن اخت الوزیر نے لی۔ یہ ۲۵۸ھ کا واقعہ ہے۔ نئے صاحب الخراج نے یہ تجویز کی کہ حسب دستور سابق تمام محاصل دربار خلافت میں بھیجے جائیں لیکن ادھر یہ حالت تھی کہ خلیفہ معتمد کو عیش و عشرت کی ضروریات کے لئے ہر دم رقم کی ضرورت رہتی تھی، اور وہ احمد بن طولون سے مطالبہ کرتا رہتا تھا کہ یہ ضروریات پوری کی جائیں۔ آخر اسی زمانے میں جب خلیفہ نے رقم طلب کی تو احمد بن طولون نے لکھا کہ جب تک خراج کے معاملات کسی دوسرے

---

[۴۳] ابن خلدون ج ۴۔ ص ۲۹۹ + مقریزی ج ۱۔ ص ۳۱۶ +

[۴۴] مقریزی ج ۱۔ ص ۳۱۹ + الکندی ص ۲۱۵ + الکندی کے مطابق یہ ۲۵۶ھ کا واقعہ ہے۔

شخص کے ہاتھ میں ہیں وہ خلیفہ کی مدد کرنے سے بالکل قاصر ہے۔ اس پر خلیفہ نے اپنا خادم نفیس[۴۵] مصر بھیجا، اور مصر کا خراج اور ثغور الشام کی ولایت احمد بن طولون کے سپرد کر دی۔ اب احمد بن طولون نے ابو ایوب احمد بن محمد اخت الوزیر ہی کو اپنی طرف سے مصر کا صاحب الخراج مقرر کیا، اور طخشی بن تامرد کو ثغور الشام کا حاکم بنایا۔ طخشی جمادی الاول ۲۶۴ھ میں ثغور گیا۔[۴۶] اس کے علاوہ احمد بن طولون کو ایک اور حکم ملا کہ فوج کے اخراجات وضع کرنے کے بعد واجب الادا رقم کی پابجائی کی جائے اور حسب سابق رقم اور فروش خلیفہ کے پاس بھیجے جائیں۔ ۲۵۸ھ میں احمد بن طولون کا خسر یارجوخ الترکی سامرا میں قتل کیا گیا۔[۴۷] اب احمد بالکل آزاد تھا نہ صرف یہ کہ کوئی بازپرس کرنے والا باقی نہیں رہا تھا، بلکہ ایک فوج کا مالک مطلق ہونے کے علاوہ وہ ملک کے مالیات کا بھی بلا شرکت غیرے مالک و مختار تھا۔ یہ سب ۲۵۸ھ کے واقعات ہیں۔ اس لئے یہ سال احمد بن طولون کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے ایک سال قبل ۲۵۷ھ میں ہی وہ تمام جند، شاکریہ، موالی اور عوام سے اپنے لئے بیعت لے چکا تھا کہ وہ سب اس کے دشمن کے دشمن اور دوست کے

---

[۴۵] یا "نسیم"۔ دیکھو ابن خلدون ج ۴ ص ۲۹۹ + ابن تغری بردی ج ۳۔ ص ۷ + مقریزی ج ۱۔ ص ۳۱۹ +

[۴۶] ابن تغری بردی ج ۳۔ ص ۷ + الکندی (ص ۲۱۷) نے ابو ایوب احمد بن محمد بن شجاع لکھا ہے اور طخشی کے باپ کا نام بجائے تامرد کے بلبرد لکھا ہے، اور تفصیل یوں بیان کی ہے کہ احمد بن طولون کے تقرر کے بعد جب اہل الثغور نے اپنے والیوں سے بیزاری ظاہر کی تو اس نے پہلے اپنے بھائی موسیٰ کو جو طرسوس میں مقیم تھا وہاں کا والی مقرر کیا۔ اس کے انکار کرنے پر ابراہیم بن عبدالوہاب کو مقرر کرنا چاہا۔ جب اس نے بھی انکار کیا تو آخر طخشی کو وہاں بھیجا، طخشی کا ۲۶۴ھ میں ثغور الشام کی حکومت کا جائزہ لینا یہ ثابت کرتا ہے کہ ۲۵۸ھ سے ۲۶۴ھ تک یہ تمام تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ جن کی تفصیل ابن تغری بردی نے نہیں کی، اور بالآخر طخشی کو وہاں کا مستقل حاکم مقرر کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ طخشی ۲۵۸ھ کے بجائے ۲۶۴ھ میں ثغور الشام آیا تھا۔

[۴۷] یعقوبی ج ۲۔ ص ۶۲۴ +

دوست ہوں گے، اور جس کے خلاف وہ لڑے گا وہ بھی اُسی کے ساتھ ہو کر لڑینگے[48]۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ احمد بن طولون کے تمام تعلقات خلافت سے منقطع ہو چکے ہیں، اور وہ خود خلافت کا دعویدار ہے، جیسا کہ بعض مصنفوں نے غلطی سے سمجھ لیا ہے[49]۔ کیونکہ اول تو کسی مستند مورخ نے اس کا ذکر نہیں کیا، اور دوسرے اُس کی موت تک خود اس کے افعال و کردار سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اُس نے کبھی ایسا ارادہ بھی کیا تھا۔

(۲)

لیکن اسی دوران میں مرکز خلافت میں ایسے واقعات پیش آرہے تھے کہ جن کا بڑا گہرا اثر احمد بن طولون کی زندگی پر پڑنے والا تھا۔ الموفق کا ذکر ہم اس سے قبل کر چکے ہیں۔ خلافت کے معاملات میں اُس کا دخیل ہونا احمد بن طولون کے لئے بڑی پیچیدگیوں کا باعث ہوا۔ ۲۵۶ھ میں خلیفہ ہونے کے بعد ہی معتمد نے بھی مہتدی کی طرح امن عامہ کا اعلان کیا تھا، اور اپنے تمام اہل خاندان کو جنھیں مہتدی نے مکہ جلاوطن کر دیا تھا، سامرا واپس بلا لیا تھا۔ ان لوگوں میں جو اس طرح دارالخلافہ

---

[48] یعقوبی ج ۲۔ ص ۶۲۴ +

[49] مثلاً محمد کرد علی: خطط الشام ج ۱۔ ص ۲۰۲: "ادعی الخلافۃ لنفسہ بمصر والفرد بخراجھا۔ فحاربہ الخلیفۃ المعتضد باللہ اشد محاربۃ فلم یقدر علیہ"۔ انفرد بخراجھا کی کیفیت اوپر گزر چکی۔ احمد بن طولون کی تاریخ وفات خود محمد کرد علی کے مطابق بھی ۲۷۰ھ ہے، اور خلیفہ معتضد کا عہد ۲۷۹ھ ہے۔ پھر ان دونوں میں یہ جنگ نہ معلوم کیسے ہوئی؟ واقعہ یہ ہے کہ اس مصنف نے احمد بن طولون کی تاریخ لکھنے میں سخت بے پروائی برتی ہے، اور اُسے اور اُس کے بیٹے خمارویہ کو بری طرح خلط ملط کیا ہے۔ چنانچہ اسی صفحہ پر وہ لکھتے ہیں کہ: طلب الخلیفۃ الی ابن طولون ان یزوجہ ابنۃ ابنہ خمارویہ واسمھا قطر الندی۔ یہاں بھی خلیفہ سے مراد معتضد ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام بیان محض لغو ہے۔ اسی قسم کے اور غلطیوں کے لئے دیکھو خطط الشام ج ۱ ص ۲۰۳ +

واپس آئے معتمد کا بھائی ابو احمد طلحہ الموفق بھی تھا۔ جو چہارشنبہ کے دن ۱۰ ذی الحجہ ۲۵۶ھ کو سامرا پہنچا[150]۔ معتمد بذات خود ناکارہ محض شخص تھا۔ اُس کی زندگی کا مقصد صرف لہو ولعب اور شراب وکباب تھا، اور دنیا اور مافیہا سے بے خبر وہ ہمہ تن اس مقصد کو پورا کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ دوسری طرف خلافت کی حالت روز بہ روز مخدوش ہوتی جارہی تھی۔ اول تو خود دربار خلافت سازشوں کا اکھاڑا بنا ہوا تھا اور ترکوں کا زور برابر بڑھتا جارہا تھا۔ ہر ترک امیر یا سپہ سالار اس کوشش میں تھا کہ جس قدر ہوسکے اقتدار حاصل کرلے اور دار الخلافہ میں بلاتردد حکومت کرے۔ فارس میں یعقوب بن لیث الصفار کا فتنہ جاری تھا، اور دار الخلافہ کے قریب ہی صاحب الزنج بصرہ اور اہواز پر قابض تھا، اور دار الخلافہ کے راستے مسدود کر رکھے تھے۔ خلافت باوجود ہر طرح کی کوشش کے اب تک صاحب الزنج کو زیر نہیں کرسکتی تھی۔ مرکز خلافت سے دور، احمد بن طولون کے عروج میں کمی آنے کے بجائے برابر ترقی ہورہی تھی۔ اندیشہ تھا کہ اگر یہی لیل ونہار رہے تو ایک طرف تو یعقوب بن لیث بڑھتے بڑھتے دار الخلافہ پہنچ جائے گا، اور دوسری طرف صاحب الزنج کی وجہ سے اہل بغداد کی زندگی محال ہوجائے گی۔ مختصر یہ کہ ایسی زبردست افراتفری پھیلی ہوئی تھی کہ صاف ظاہر ہورہا تھا کہ خلفاء کا اب دوبارہ صاحب اقتدار ہونا ناممکن ہے۔ ابن[151] الاثیر نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ صاحب الزنج کے فتنے کی شدت کی وجہ سے ہی معتمد نے اپنے بھائی الموفق کو مکہ سے سامرا بلایا تھا۔

بنو عباس کی خوش قسمتی تھی کہ اسی وقت ایک ردعمل شروع ہوا، اور الموفق جیسا شخص انھیں میسر آگیا، جس نے خلافت کو ان حادثوں سے محفوظ کردیا۔ الموفق ۱۰ ذی الحجہ ۲۵۶ھ کو سامرا پہنچا، اور معلوم ہوتا ہے کہ آتے ہی اُس نے معتمد کو بے دست وپا کرنا شروع کردیا تھا کیونکہ ۱۲ صفر ۲۵۷ھ کو معتمد نے اُسے مکہ کے راستے، حرمین اور یمن پر حاکم مقرر کیا، اور پھر اسی سال ماہ رمضان میں اُسے بغداد، سواد،

---

[150] مروج الذہب۔ ج ۲۔ ص ۳۰۳ +
[151] تاریخ الکامل۔ ج ۷۔ ص ۷۹ +

گورِ دجلہ، بصرہ، اہواز اور فارس کی حکومت پر نامزد کیا، اور حکم دیا کہ وہ اپنے عمال خود مقرر کرے۔ یارجوخ کو بصرہ، کورِ یمامہ، اور بحرین پر سعید بن صالح کی جگہ مقرر کیا جائے۔[۵۲] اس کے چند ماہ بعد اتوار کے دن ۲۰ ربیع الاول ۲۵۶ھ کو الموفق دیارِ مضر، قنسرین، اور عواصم کا حاکم مقرر ہوا، اور یکم ربیع الآخر کو اسے اور مفلح کو خلعت عطا کرکے صاحب الزنج کے خلاف فوج لے جانے کا حکم دیا گیا۔[۵۳] لیکن الموفق ابھی تک ولی عہد مقرر نہیں ہوا تھا۔ اس کی تکمیل ۲۶۱ھ میں ہوئی۔ اس سال ۱۲ شوال کو خلیفہ معتمد نے دار العامہ میں اعلان عام کرکے اپنے بیٹے جعفر کو المفوض الی اللہ کا خطاب دے کر ولی عہد مقرر کیا، اور موسیٰ بن بغا کو اس کا مددگار اور مشیر بنایا، اور افریقہ، مصر، شام، جزیرہ، موصل اور ارمینیہ پر حاکم مقرر کیا۔ اپنے بھائی ابو احمد الموفق کو الناصر لدین اللہ الموفق کا خطاب دے کر مشرق کے علاقے اس کے سپرد کئے، اور المفوض کے بعد اسے ولی عہد مقرر کیا۔ بہ شرط کی کہ اگر المفوض کے بالغ ہونے سے پہلے معتمد کا انتقال ہو جائے تو الموفق ہی اس کا جانشین ہوگا، اور المفوض کو الموفق کا ولی عہد قرار دیا جائے گا۔ اس عہد نامے میں ایک اور شرط یہ بھی تھی کہ اگر مفوضہ علاقوں میں کوئی حادثہ یا شر و فساد واقع ہو تو اپنے اپنے تقسیم شدہ علاقوں کے

---

[۵۲] طبری ج ۱۱۔ ص ۲۱۵ +

[۵۳] طبری ج ۱۱ ص ۲۲۳ + مسعودی۔ مروج الذھب ج ۲۔ ص ۳۱۳ + ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۸۳ + ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۲۹ + ابن تغری بردی (ج ۲۔ ص ۲۵) نے لکھا ہے کہ ۲۵۶ھ میں ہی معتمد نے اپنے بیٹے المفوض کو ولیعہد مقرر کر دیا تھا؛ مگر طبری نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ آگے چل کر ابن تغری بردی (ج ۲۔ ص ۳۵) نے جعفر المفوض کی ولی عہدی کی تاریخ ۲۶۱ھ بیان کی ہے، اور طبری اس سے متفق ہے۔ اس کے علاوہ یعقوبی (ج ۲۔ ص ۴۲۶) نے لکھا ہے کہ ۲۵۸ھ میں المفوض کے بعد احمد بن الموفق الملقب بالمعتضد ولی عہد مقرر ہوا تھا۔ یہاں یعقوبی نے صرف بیس برس کی غلطی ہے کہ۔ کیوں کہ معتضد کی ولی عہدی کا واقعہ درحقیقت ۲۷۸ھ کا ہے، اور طبری نے بھی یہی روایت کی ہے۔ دیکھو طبری ج ۱۱۔ ص ۳۲۷ +

خراج سے اس کا سدباب کیا جائے[۵۴]۔ تکمیل کے بعد یہ عہد نامہ مزید توثیق کی غرض سے قاضی حسن بن محمد بن ابی شوارب کے ہاتھ مکہ بھیجا گیا، تاکہ کعبہ میں آویزاں کیا جائے[۵۵]۔ خلافت کے اس طرح دو حصوں میں تقسیم ہونے سے ظاہر ہوتا ہے کہ احمد بن طولون کا افسر اعلیٰ المفوض تھا، کہ الموفق اس کے باوجود بعض مورخوں نے غلطی سے صرف الموفق کو خلیفہ معتمد کا قائم مقام یا وکیل سمجھ لیا ہے، اور جب احمد بن طولون نے خطبے میں الموفق کا نام نہیں لیا، یا اپنے سکوں پر مسکوک نہیں کرایا تو اسے مورد الزام بنا کر خلافت کا باغی قرار دے دیا ہے۔ یہی غلطی ویوستن فیلد نے کی ہے، اور لین پول[۵۶] نے آل طولون کی تاریخ لکھتے ہوئے ویوستن فیلد کی پیروی میں بارہا اس غلطی کا اعادہ کیا ہے۔

بظاہر احمد بن طولون اور الموفق میں مخاصمت پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی، کیونکہ دونوں کا دائرہ عمل الگ الگ تھا، اور الموفق اُس کا افسر اعلیٰ بھی نہیں تھا کہ اسی وجہ سے کوئی نہ کوئی وجہ مخالفت نمودار ہوتی۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس سے قبل ہی الموفق اُس کی طرف سے چوکنا تھا، اور ایک مرتبہ خلیفہ معتمد کے حکم سے اُسے مصر سے عراق بلانے کی کوشش بھی کر چکا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے درپے تھا کہ احمد بن طولون کی قوت جہاں تک ہو سکے توڑ دے۔ جیسا کہ بیکر نے اشارہ کیا ہے، یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ الموفق کے متعلق ہمارے اور احمد بن طولون کے نقطہائے نظر میں بڑا فرق ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ الموفق خلاف عباسیہ کا آخری سہارا تھا، اور اسی پر اس امر کا دارومدار تھا کہ آیا یہ خلافت باقی رہتی ہے یا اُسی وقت ختم ہو جاتی ہے اس نے جو کچھ کیا یا کرنا چاہتا تھا اس میں خلافت کی فلاح و بہبود اُس کے مدنظر تھی، اور اگر وہ ایسے نازک موقع پر معتمد کو عضو معطل بنا کر امور خلافت اپنے ہاتھ میں نہ لے لیتا تو خلافت کو

---

[۵۴] مقریزی ج ۲۔ ص ۱۷۸ +

[۵۵] ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۹۱ + ابن تغری بردی ج ۳۔ ص ۳۴، ۳۵ + طبری ج ۱۱۔ ص ۲۳۶ +

[۵۶] تاریخ مصر بعہد وسطیٰ (انگریزی) ص ۶۷، ۶۸ وغیرہ۔

ناقابل تلافی نقصان پہونچتا۔ اس کے برعکس احمد بن طولون کی نظر میں الموفق کی حیثیت ایک غاصب سے زیادہ نہ تھی، جس نے ایسے خلیفہ پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر دی تھیں، جس کے ہاتھ پر احمد بن طولون نے بیعت کی تھی۔ ہمارے نزدیک احمد بن طولون کا طرزِ عمل اور الموفق کی مخالفت بغاوت کے مترادف ہے، اور خود احمد بن طولون یہ سمجھتا تھا کہ وہ خلیفہ کے اقتدارت و اختیارات کو باقی رکھنے میں بالکل حق بجانب ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ خود خلیفہ اپنے بھائی کے روز افزوں اثر و نفوذ سے بیزار تھا، کیونکہ اس سے اُس کی عیش و عشرت میں فرق پڑتا تھا، اور اس کا دست نگر ہوتا جارہا تھا۔ معتمد ہر ممکنہ کوشش کر رہا تھا کہ احمد بن طولون پر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ مظلوم ہے، اور الموفق اُس کے اختیارات غصب کر رہا ہے[۵۵]۔ خلیفہ کے اپنے بھائی کے خلاف اس معاندانہ طرزِ عمل سے احمد بن طولون یہ نتیجہ نکالنے میں بالکل حق بجانب تھا کہ الموفق کے خلاف کارروائی کرے اور خلیفہ کو اُس کے پنجے سے نجات دلائے۔

احمد بن طولون اور الموفق میں مخاصمت کا آغاز صاحب الزنج کے شر و فساد سے ہوا۔ جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے الموفق کو صاحب الزنج کے خلاف فوجی مہم کا افسر مقرر کیا گیا تھا، اور ۲۶۱ھ کی تقسیم خلافت بموجب اب یہ علاقہ اُس کے زیرِ نگیں بھی تھا۔ لیکن اس دوران صاحب الزنج کے خلاف جنگ برابر جاری تھی، اور ساتھ ہی ساتھ مشرق کے حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ وہاں نہ صرف اضطراب ہی پھیلا ہوا تھا، بلکہ والیان صوبہ جات نے دار الخلافہ کو رقمیں بھی بھیجنا بند کر دی تھیں۔ بالآخر الموفق کو جنگ جاری رکھنے کے لئے رقم کی ضرورت ہوئی۔ وہ مشرق کا نگران تھا، اور عہد نامے کے مطابق اُسے چاہیئے تھا کہ اپنے والیوں سے رقوم کا مطالبہ کرتا، لیکن اول تو مشرق کی مضطرب حالت مانع تھی، اور پھر وہ صاحب الزنج کے خلاف جنگ میں اس طرح مصروف تھا کہ دوسرے کاموں کی طرف توجہ نہیں

---

[۵۵] ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۳ + مقریزی ج ۲۔ ص ۱۷۸ +

کرسکتا تھا۔ اس کے برعکس معتمد کو عیش و عشرت میں لٹانے کے لئے ہر وقت رقم کی ضرورت پڑتی تھی، اور یہ ضروریات احمد بن طولون پوری کرتا رہتا تھا۔ اس وجہ سے الموفق نے بھی اپنے باپ متوکل کے خادم تحریر کو اُس کے پاس بھیجا، اور رقم بھیجنے کی فرمائش کی۔ ساتھ ہی تحریر کو یہ بھی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ احمد بن طولون کے حالات سے باخبر رہے[۵۸]۔ اس طرح تحریر پیام بر بھی تھا، اور مخبر و جاسوس بھی۔ تحریر مصر پہنچا ہی تھا کہ خلیفہ معتمد کا ایک خط احمد بن طولون کو ملا کہ حسب دستور سابق مصر کا سالانہ مال اُس کے پاس بھیجا جائے، اور اُس کے علاوہ حسب معمول خلیفہ کے لئے "طراز والرقیق، والخیل والشمع وغیر ذلك" بھی روانہ کئے جائیں[۵۹]۔ معتمد نے خفیہ طور پر احمد بن طولون کو یہ بھی اطلاع دی تھی کہ الموفق نے تحریر کو جاسوس بنا کر بھیجا ہے اور بعض قائدوں کے ساتھ خفیہ خط و کتابت بھی کی ہے۔ "اس لئے ہوشیار رہو، اور جس قدر جلد ممکن ہو مال ہمارے پاس بھیج دو[۶۰]"۔ اس طرح تمام حالات و معاملات سے باخبر ہونے کے بعد احمد بن طولون نے تحریر کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور بڑی تعظیم و تکریم سے اپنے پاس میدان میں ٹھیرایا، مگر وہیں اسے نظر بند بھی کر دیا، جب تک وہ مصر میں رہا اُسے باہر نکلنے کی ممانعت کر دی، اور اس کے تمام کاغذات ضبط کر لئے۔ اس نے الموفق کے نام خطوں میں بھی تلطف و مدارات کا لہجہ اختیار کیا، اور بالآخر تحریر کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار دینار الموفق کے پاس بھیج دئے، اور اس کے علاوہ حسب معمول

۵۸۔ ابن خلدون ج ۴۔ ص ۲۹۹ +

۵۹۔ مقریزی ج ۲۔ ص ۱۷۸ + ابن خلدون (ج ۴۔ ص ۲۹۹) نے لکھا ہے کہ اموال کے علاوہ الموفق نے طراز وغیرہ کا مطالبہ بھی احمد بن طولون سے کیا تھا۔ لیکن یہ زیادہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ کیوں کہ فوجی مہمات کی فوری ضروریات کے لئے یہ چیزیں الموفق کے لئے بے کار تھیں۔ مزید برآں الموفق کے مطالبے کے جواب میں احمد بن طولون نے صرف رقم مہیا کی ہے۔

۶۰۔ خطط ج ۲۔ ص ۱۷۸:۔ فاحترس واحمل الینا المال وعجّل انفاذہ +

مصر سے جو چیزیں بھیجی جاتی تھیں وہ بھی ساتھ کر دیں۔ وہ خود تحریر کے ساتھ مصر کے سرحدی شہر عریش تک گیا، اور پھر تمام مال و اسباب اُس کے حوالے کر کے اُس سے رسیدیں لے لیں فسطاط واپس آ کر احمد نے ان خطوں کو پڑھا جو تحریر سے ضبط کئے گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ خط اس کے قائدوں کی ایک جماعت کے نام تھے، اور انھیں الموفق کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ احمد نے ان لوگوں کو گرفتار کرایا اور طرح طرح کے عذاب دے کر قتل کرا دیا۔

الموفق کا خط احمد کے پاس آیا جس میں مال کی رسید دی گئی تھی، اور شکایت کی گئی تھی کہ حساب کے مطابق اس سے دگنی رقم آنی چاہئے تھی۔ اس خط میں الموفق نے بدکلامی سے بھی دریغ نہیں کیا۔ صرف اسی پر اکتفا نہ کر کے، الموفق کو ایسے آدمی کی تلاش ہوئی جو مصر میں احمد بن طولون کا جانشین بن سکے۔ لیکن کسی نے یہ عہدہ قبول نہ کیا، کیونکہ تمام عمائد خلافت اُس کے زیر بار احسان ہونے کی وجہ سے اُس کے ہمدرد تھے۔[۶۱] اُدھر احمد بن طولون کو جب الموفق کا خط ملا تو اُس نے کہا کہ

"مجھ سے حساب طلب کرنے یا اس قسم کے الفاظ سے مجھے مخاطب کرنے کا اُسے کیا حق حاصل ہے۔"

پھر الموفق کے خط کا جواب لکھا۔ یہ جواب المقریزی[۶۲] نے بہ تمام و کمال نقل کیا ہے۔ احمد بن طولون نے الموفق کو یاد دلایا کہ سرکاری طور پر اس میں اور الموفق میں کوئی تعلق نہیں، مصر کا والی المفوض ہے، اور صرف وہی حسابات طلب کر سکتا ہے، اس معاملے میں الموفق نے مداخلت کر کے اس عہد نامے کی خلاف ورزی کی ہے، جس پر عمل کرنے کی اُس نے قسم کھائی تھی، اور

---

[۶۱] لان احمد کانت خدمه وهدایاه متصلة الی القواد بالعراق وارباب المناصب۔ فلهذا لم یجد من یتولاه + ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۰۰ + مقریزی ج ۲۔ ص ۱۷۹ +

[۶۲] خطط ج ۲۔ ص ۱۷۹ +

اس لئے وہ اس کا مستوجب ہے کہ اُسے ولی عہدی سے الگ کر دیا جائے، اور اس کے خلاف جنگ کا اعلان کیا جائے۔ احمد بن طولون نے اُسے یہ بھی دھمکی دی کہ اس کے خلاف باقاعدہ تربیت یافتہ فوجیں بھیجی جاسکتی ہیں، جن کے مقابلے میں وہ خود بصرہ کے "عوام کالانعام" کے سوا کوئی فوج میدان میں نہیں لاسکتا۔

الموفق دو مرتبہ خلاف قانون کام کر چکا تھا۔ اُسے احمد بن طولون سے رقم طلب کرنے اور حساب مانگنے کا کوئی حق نہیں تھا، اور نہ اُسے یہ حق تھا کہ احمد بن طولون کو معزول کر کے کسی دوسرے شخص کو مقرر کر دے۔ اُسے جب مذکورۂ بالا خط میں ان باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی تو اُس نے اب قانونی طریقے سے اپنا کام نکالنا چاہا، اور المفوض کے مشیر موسیٰ بن بُغا کو اس پر آمادہ کیا کہ احمد بن طولون کو معزول کر کے اماجور والیٔ شام کو مصر پر مقرر کر دے۔ موسیٰ بن بُغا اس زمانے میں دربار خلافت کا رکن رکین[۶۳] اور سب سے زیادہ بارسوخ امیر تھا۔ اور چونکہ وہ ۲۶۱ھ کے عہد نامے کے مطابق یہی ترک امیر المفوض کا مشیر اور منتظم ہوا تھا، اس لئے اُس کا حکم المفوض کے حکم کے برابر تھا۔ اس کے ساتھ ہی موسیٰ بن بغا کو مجبور کیا گیا کہ وہ اعمال المفوض سے رقم جمع کر کے الموفق کے پاس بھیجے۔ اس طریقے سے الموفق نے اپنے دونوں مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اماجور کے پاس جب موسیٰ بن بُغا کا حکم پہنچا تو اُس نے معذرت چاہی کہ وہ احمد بن طولون کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔

اب مجبوراً موسیٰ بن بغا نے خود مصر جانے کا ارادہ کیا کہ احمد بن طولون کو برطرف کر کے اماجور کو مقرر کر دے۔ احمد بن طولون کو جب اس کے اس ارادے کا علم ہوا، تو اسے سخت رنج ہوا، اس وجہ سے نہیں کہ وہ موسیٰ بن بغا کا مقابلہ نہیں کرسکتا بلکہ اس لئے کہ خلافت کی شکست وریخت پر اُسے مجبور ہونا پڑے گا[۶۴]۔ بہر حال اب سوائے اس کے چارہ نہیں تھا کہ جنگ کی تیاری کی جائے۔

---

[۶۳] مقریزی ج ۲۔ ص ۱۷۹ + وکان عون الدولۃ واشد اھلھا بأساً و اقدامًا +

[۶۴] مقریزی ج ۲۔ ص ۱۸۰ +

فسطاط پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ دریائے نیل کی سمت میں شہر غیر محفوظ ہے۔ اس کے نتائج پر غور کر کے اُس نے فسطاط اور جیزہ کے درمیان جو جزیرہ ہے، اور جسے بعد میں الروضہ کہنے لگے تھے، وہاں اپنا مال اور حرم محفوظ کرنے کے لئے اور فسطاط کی حفاظت کی غرض سے ایک قلعہ بنانے کا ارادہ کیا[65] اور حصن الروضہ کی تعمیر پر اسی ہزار طلائی دینار خرچ کر دئے[66]۔ الکندی اور قضاعی کی روایت کے بموجب[67] ۵۴ھ میں یہاں ایک دارالصناعت قائم کیا گیا تھا، جہاں جنگی جہاز بنتے تھے۔ احمد بن طولون نے ۲۶۳ھ میں قلعہ بنانے کے علاوہ دارالصناعت کو دوبارہ ترقی دی، جنگی جہاز تیار کرائے اور انھیں الروضہ کے گرد مقرر کیا تاکہ ان سے فسطاط کی حفاظت ہو سکے، اور طرسوس سے آنے والے جنگی جہازوں کو بھی روکا جا سکے۔ لیکن موسیٰ بن بُغا کی یہ مہم ناکام رہی۔ رقم نہ ہونے کی وجہ سے یا اس سبب سے کہ وہ احمد بن طولون سے ڈرتا تھا، رقہ پہنچ کر موسیٰ بن بُغا رُک گیا، اور دس مہینے وہاں بے کار پڑا رہا۔ بالآخر اُس کے سپاہیوں میں شورش ہوئی، انھوں نے ارزاق کا مطالبہ کیا اور یہ بھی مطالبہ کیا کہ یا تو آگے بڑھو اور یا عراق واپس چلو۔ آخر صورت حال اس قدر نازک ہوگئی کہ موسیٰ بن بُغا کا کاتب موسیٰ بن عبداللہ بن وھب روپوش ہوگیا۔ موسیٰ بن بغا بھی رقہ میں بیمار ہوا، اور وہیں رقہ میں یا وہاں سے عراق واپس آنے کے بعد صفر ۲۶۴ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ اس آفت ناگہانی سے نجات پاکر احمد بن طولون نے اطمینان کا سانس لیا، اور بہت سا مال اللہ کی راہ میں خیرات کیا۔ الموفق اب پھر بھی اپنے ارادے سے باز نہیں آیا۔ اُس نے معتمد سے کہہ کر محمد بن ہارون التغلبی والئ موصل کو مصر کا عامل مقرر کرایا۔ وہ دریا کے راستے سے روانہ ہوا، لیکن طوفان سے اُس کی کشتیاں دریائے دجلہ

---

[65]۔ مقریزی ج ۱۔ ص ۳۱۹ + ج ۲۔ ص ۱۷۸ +

[66]۔ مقریزی ج ۲۔ ص ۱۸۰ + ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۱۱ +

[67]۔ مقریزی ج ۲۔ ص ۱۷۸ +

کے کنارے پاش پاش ہوگئیں۔ اور خارجی سردار مساور الساری نے اُسے قتل کر دیا[۶۸]۔ اس طرح الموفق کی تمام کوششیں بے نتیجہ رہیں اور وہ احمد بن طولون کا بال بیکا نہ کر سکا۔ الموفق اس وقت صاحب الزنج کا فتنہ فرو کرنے میں مصروف تھا، اور احمد بن طولون کے خلاف کوئی نیا اقدام نہیں کر سکتا تھا لیکن احمد بن طولون بجائے خود بہر حال خطرے سے غافل نہیں تھا، اور مصر کو محفوظ کرنے میں برابر منہمک رہا۔ اس نے یہ کوشش کی کہ بے جنگ و جدل جو فتح اسے حاصل ہوگئی ہے اُسے اپنی قوت مجتمع کر کے بالکل محفوظ کر لے۔

احمد بن طولون کے زمانے کے حالات کا اندازہ ان حکایات سے کیا جا سکتا ہے جو جاسوسوں کی گرفتاری کے متعلق بیان کی گئی ہیں۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ دار الخلافہ سے اس کے سپہ سالاروں اور افسروں کو توڑنے کی کوشش ہو رہی تھی، اور احمد بھی ان کا ترکی بہ ترکی جواب دے رہا تھا۔ یہ نہایت مکمل سلسلۂ جاسوسی اس زمانے کی خاص چیز ہے۔ احمد نے ہر اُس شخص کے پیچھے مخبر لگا رکھے تھے جو اُس کے لئے ذرا سی بھی اہمیت رکھتا تھا۔ مصر میں بھی اس کے جاسوسوں کا ایک جال پھیلا ہوا تھا، اور سرحدوں کی خاص طور پر نگرانی کی جا رہی تھی۔ خود احمد بن طولون کا حرم بھی جاسوسوں سے خالی نہیں تھا۔ دار الخلافہ میں اس کا ایک نائب (خلیفته بالحضرة) طیفور نام رہتا تھا، اور ذرا ذرا سی باتوں کی خبر اُسے ملتی رہتی تھی[۶۹]۔

قبل اس کے کہ بیرون مصر احمد بن طولون کی توسیع حکومت کے واقعات بیان کئے جائیں، بہتر ہے کہ ان حوادث کا ذکر کر دیا جائے جو اس دوران میں خود مصر میں پیش آرہے تھے۔ العمری کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔ یہ شخص حضرت عمر بن الخطاب کی اولاد سے تھا، اور اس کا نام ابو عبد اللہ (یا ابو عبد الرحمٰن) عبد الحمید بن عبد اللہ بن عبد العزیز بن عبد اللہ بن عمر تھا۔ وہ

۶۸؎ تفصیل کے لئے دیکھو مقریزی ج ۲۔ ص ۱۷۷۔ ۱۷۹ + ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۰۰۔ ۱۰۱ + الکندی ص ۲۱۸، ۲۱۹ +

۶۹؎ بیکر (بحوالۂ ابن سعید) ص ۱۶۸ +

مصر کی جنوبی سرحد پر ارض بجاۃ کے قریب رہتا تھا۔ ارض بجاۃ کے حالات مقریزی[۳] نے تفصیل سے لکھے ہیں۔ اس کا بیان ہے کہ یہاں کے رہنے والے اس قدر فتنہ پرداز تھے کہ سرحد کے رہنے والے مسلمان ایک لمحہ بھی اپنے آپ کو ان سے محفوظ نہیں سمجھتے تھے۔ جارودی کے قریب عیدگاہ میں جب نماز ہوتی تھی تو نمازیوں کی حفاظت کے لئے برکۃ الحبش کے نواح میں پائیں کوہ ایک مسلح فوج متعین رہتی تھی، تاکہ اگر اہل بجاۃ اچانک حملہ کریں تو اس کا تدارک کیا جاسکے، اور جب تک سب لوگ عیدگاہ سے رخصت نہیں ہوجاتے تھے یہ فوج وہاں رہتی تھی، کیونکہ اکثر اہل بجاۃ نے اس طرح مسلمانوں پر اچانک حملہ کیا تھا، اور قتل و غارت کے بعد ایسے ہی اچانک غائب ہوگئے تھے۔ سنہ ۲۵۶ھ میں بھی، احمد بن طولون کے عہد امارت میں، ایسا ہی ایک حادثہ پیش آیا تھا، مسلمانوں کو عیدگاہ میں لوٹا اور قتل کیا گیا تھا اور اہل بجاۃ سالم و غانم واپس ہوگئے تھے۔ ان متواتر اور تکلیف دہ ترک تازیوں کے باوجود فسطاط سے کوئی مدد سرحد کے لوگوں کو حاصل نہیں ہوئی، اور ۲۵۹ھ میں اہل بجاۃ نے حسب معمول عید کے دن مصر کی سرحد پر چھاپا مارا، لوگوں کو قتل کیا، اور بلا مزاحمت واپس ہوئے۔ جب اس قسم کے قتل و غارت میں برابر اضافہ ہی ہوتا گیا تو آخر العمری نے ان کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا: "غضباً لله وللمسلمین"۔ اس نے کمین گاہیں مقرر کیں، اور جب اہل بجاۃ پھر اچانک حملہ آور ہوئے۔ تو اس نے ان کے مقدمۃ الجیش کو تہ تیغ کیا، ان کے رئیس کو قتل کر ڈالا۔ خود ان کے ملک میں داخل ہوکر وہاں قتل و غارت کا بازار گرم کیا، اور ان پر متواتر چھاپے مارنے شروع کئے۔ انجام کار انھوں نے جزیہ دینا قبول کیا، حالانکہ اس سے قبل اُن سے کبھی جزیہ دینا وصول نہیں کیا گیا تھا[۴]۔ اس سے العمری کی قوت میں اضافہ ہوا، اور اُس نے بھی مسلمانوں اور ذمیوں سے

---

[۳] خطط ج ۲ ص ۴۵۵ +

[۴] گزشتہ مضمون (عرب مصر میں) میں ہم نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ ابتدائی عہد اسلام میں اور خراج (باج) ایک ہی چیز تھے۔ اہل بجاۃ سے اس طرح جزیہ وصول کرنے کی مثال سے یہ امر اور بھی واضح ہوجاتا ہے یہاں مردم شماری کا ذکر نہیں، اور غالباً ایک معین رقم بطور باج ان سے وصول کی گئی تھی۔

حسن سیرت کا اظہار کیا۔ اہل نوبہ سے اُس نے صلح کرلی، اور جب دوبارہ انھوں نے نقض امن کیا، اور مریس کے مقام پر چھاپے مارنے لگے تو العمری نے انھیں پھر زک دی، ان کی بستیوں کو لوٹ لیا اور بے شمار اہل نوبہ کو قید کرلیا۔ یہ لوگ اب احمد بن طولون کی خدمت میں حاضر ہوئے اور غالباً غلط واقعات بیان کرکے العمری کی شکایت کی۔ اس پر احمد بن طولون نے العمری کے خلاف ایک لشکر بھیجا، مگر وہ مقدمۃ الجیش کے قائد سے ملا اور کہا کہ اس کا ارادہ شر و فساد پیدا کرنے کا نہیں ہے، اور نہ وہ کسی مسلمان یا ذمی کو ایذا دیتا ہے۔ اگر احمد بن طولون کو ان باتوں کی اطلاع کردی جائے تو وہ فوج کو واپس بلالے گا۔ مگر قائد نے اس کی باتوں پر توجہ نہ کی۔ جنگ ہوئی اور احمد بن طولون کی فوج نے شکست کھائی۔ بقیۃ السیف لوگ فسطاط پہنچے، اور واقعات اور حالات کی اطلاع احمد بن طولون کو دی۔ اُس نے کہا کہ تم نے اس کی نہ سنی اور بجا طور پر شکست کھائی۔ اب العمری کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا، کیونکہ اس سرحد کی حفاظت کا کام وہ باحسن وجوہ انجام دے رہا تھا۔ مگر بالآخر اُس کے دو غلاموں نے اُسے قتل کر دیا، اور انعام کی امید میں اس کا سر لے کر احمد بن طولون کے پاس پہنچے۔ احمد نے قصاص لیا اور دونوں قاتلوں کو قتل کی سزا دی۔ العمری کا سر غسل و کفن کے بعد دفن کر دیا گیا۔[۴۲]

ابھی تک علویوں کی طرف سے خطرے کا پورا ازالہ نہیں ہوا تھا۔ ابن الصوفی کی بغاوت کا ایک نیا شاخسانہ ۲۶۰ھ میں ظاہر ہوا۔ مصر میں ایک شخص سکن ابو روح نے خروج کیا۔ یہ ابن الصوفی کے آدمیوں میں سے تھا اور بنو علی کا ہمدرد تھا۔ احمد بن طولون کی پہلی فوج نے اس کے مقابلے میں شکست کھائی، مگر دوسری فوج نے اُسے گھیر لیا۔ انجام کار اس نے امان طلب کی اور امان دی گئی۔ غالباً سکن ابو روح عوام میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا، اور اسی لئے اُسے بے ضرر سمجھ کر اُس زمانے کے

۴۲؎ مقریزی ج ۲۔ ص ۵۵۴ + ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۸۷ + ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۲ + یعقوبی (ج۔ ص ۲۲۲) نے العمری کے واقعے کو ۲۵۵ھ کا واقعہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اُس نے حکومت کے خلاف سر اٹھایا تھا (المحاربیۃ جزیہ لسلطان) مگر کسی دوسرے مورخ سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ اسی طرح یعقوبی کے سوا باقی سب مورخ اسے بجا ۔ ۔ ۔ نا ہے ۔ ۔ ۔ ۲ ہی کا واقعہ بتاتے ہیں۔

قاعدے کے مطابق قتل کی سزا دینے کے بجائے، امان دی گئی۔ اس کے بعد بنو علی یا اُن کے ہمدردوں کی طرف سے کوئی فساد نہیں اٹھا۔

۲۶۱ھ میں اہل برقہ نے احمد بن طولون کی اطاعت سے انحراف کیا، اور اپنے حاکم محمد بن الفرج الفرغانی کو شہر سے نکال دیا۔ احمد بن طولون نے اپنے مولا لؤلؤ کی ماتحتی میں ایک فوج برقہ بھیجی، اور ہدایت کی کہ اگر وہ لوگ صلح و آشتی سے مطیع ہو جائیں تو ان کے ساتھ نیک سلوک کیا جائے، ورنہ تلوار سے کام لیا جائے۔ لؤلؤ نے ان احکام پر عمل کیا۔ مگر اس ملاطفت سے اہل شہر کی ہمتیں اور بھی بڑھ گئیں۔ انھوں نے شہر سے نکل کر عسکر پر، جو شہر کے دروازے پر مقیم تھا، حملہ کیا اور سپاہیوں کو قتل کر ڈالا۔ لؤلؤ نے احمد کو اس کی اطلاع دی، اور حکم ملنے پر منجنیقیں لگا دیں۔ آخر اہل برقہ امان کے طالب ہوئے۔ انھیں امان دی گئی۔ اب شہر کے دروازے کھول دیے گئے۔ لؤلؤ اندر داخل ہوا۔ شورش کے سرغنہ گرفتار کیے گئے۔ بعض کو چابکوں کی سزا دی گئی، اور بعض کے ہاتھ کٹوائے گئے۔ باقی ماندہ لوگوں کو لؤلؤ پابہ زنجیر اپنے ساتھ فسطاط لے گیا، اور برقہ پر نیا حاکم مقرر کر دیا۔ فسطاط میں قیدیوں کو تشہیر کرایا گیا اس فتح کے صلے میں احمد بن طولون نے لؤلؤ کو خلعت سے سرفراز کیا، جس میں دو طلائی طوق بھی شامل تھے، جو اُس کی گلے میں پہنائے گئے[۱]۔ اہل برقہ کے اطاعت سے انحراف کی وجہ معلوم نہیں لیکن برقہ مصر اور افریقہ کی سرحد پر واقع تھا، اور اس لئے یہاں کی معمولی سی شورش بھی تشویشناک ہو سکتی تھی۔

(۳)

۲۶۴ھ میں احمد بن طولون کی حکومت بیرون مصر تک وسیع ہو گئی۔ یاد ہو گا کہ ۲۵۷ھ میں اماجور الترکی کو خلیفہ معتمد نے شام کا حاکم اس وقت مقرر کیا تھا جب احمد بن طولون کو ابن الشیخ کے خلاف فلسطین جانے کا حکم ہوا ہے، اور پھر یہ حکم منسوخ کیا گیا ہے۔ اس اماجور کا انتقال ۲۶۴ھ میں ہوا، اور اس کا

---

[۱] ابن الاثیر ج ۷، ص ۹۳ + ابن خلدون ج ۴، ص ۳۰۳ +

بیٹا علی اُس کا جانشین بنا۔ مگر علی کے امور کی نگرانی احمد بن بُغا اور عبیداللہ بن یحییٰ ابن وھب کرتے تھے۔ اماجور کی وفات کے بعد احمد بن طولون ثغور کی دیکھ بھال کے لئے شام روانہ ہوا۔ مصر میں اس نے اپنے بیٹے عباس کو بطور نائب مقرر کیا، اور احمد بن الوسطیٰ کو اُس کا مشیر اور نگرانی کار بنایا۔ منیة الاصبغ پہونچ کر اُس نے علی بن اماجور کو لکھا کہ فوج کی رسد کا انتظام کرے۔ اس سے بیشتر خود اماجور ہی احمد بن طولون کے مقابلے میں عجز و ضعف کا اعتراف کر چکا تھا۔ اب علی بن اماجور کے لئے اس کے سوا چارہ ہی نہیں تھا کہ حکم کی تعمیل کرے۔ احمد بن طولون رَملہ پہنچا، جہاں علی کا نائب محمد بن رافع موجود تھا۔ اس نے احمد بن طولون کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور اُسے ہر طرح کی مدد دی۔ رُملہ سے احمد بن طولون دِمشق گیا۔ یہاں علی کی کم سنی کی وجہ سے احمد بن ید غباش (یا دُو غباش) شہر کی نگرانی اور حکومت پر مقرر تھا۔ ابن ید غباش نے شہر اُس کے حوالے کر دیا، اور احمد بن طولون نے اس کو وہاں کا حاکم مقرر کر دیا۔ دمشق سے وہ حمص آیا، اور اُسے بھی اماجور کے مقرر کردہ حاکم عیسیٰ بن الکرخی نے اُس کے حوالے کر دیا۔ احمد بن طولون نے عیسیٰ بن الکرخی ہی کو حمص کی حکومت پر بحال رکھا۔

غالباً حمص کے قیام کے دوران میں اُس نے انطاکیہ کے حاکم سیما الطویل کو اطاعت قبول کرنے کے لئے لکھا۔ مگر وہاں سے مفید مطلب جواب وصول نہ ہونے پر احمد بن طولون ایک عظیم الشان فوج لے کر انطاکیہ روانہ ہوا۔ اُس زمانے میں ثغور کے اہم مقامات انطاکیہ، طرسُوس، مصیصہ اور ملطیہ تھے[۷۵]، اور ثغور کی حالت یہ تھی کہ ۲۶۳ھ میں عبداللہ بن رشید بن کاؤس حاکم ثغور نے چار ہزار فوج لے کر بلاد الروم پر حملہ کیا تھا، اور شروع میں بڑی کامیابی حاصل کی تھی۔ یہ فوج سالم و غانم بدندون سے واپس آرہی تھی کہ دو بطریقوں نے اُس پر حملہ کیا، اور سوائے پانچ آدمیوں کے تمام فوج کو کاٹ ڈالا۔ خود عبداللہ بن رشید بھی زخمی ہو کر یونانیوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوا[۷۶]۔ ان بطریقوں نے لُولُؤ پر، جو طرسوس کا نہایت اہم قلعہ تھا، قبضہ کر لیا[۷۷]۔ ایک طرف تو ثغور کی یہ مخدوش حالت تھی، اور

---

[۷۵] ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۰ +

[۷۶] ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۰۲، ۱۰۳

[۷۷] ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۰۔

دوسری طرف سیما الطویل وہاں فساد اور کمزوری کا باعث ہو رہا تھا۔ ابھی کچھ مدت قبل ثغور کا انتظام اس منہج پر تھا کہ انطاکیہ کا حاکم محمدؐ بن علی بن یحییٰ الارمنی اور طرسوس کا حاکم سیما الطویل تھا، لیکن عام امور کی نگرانی سیما الطویل کے سپرد تھی۔ سیما ایک مرتبہ انطاکیہ آیا مگر الارمنی نے اُسے شہر میں داخل ہونے سے روکا۔ سیما نے اہل شہر سے سازش کر کے الارمنی کو قتل کرا دیا۔ اس واقعہ سے ثغور پر فساد پھیلنے کا اندیشہ ہوا، اور جب فساد فرو ہونے کی کوئی امید نہ رہی تو الموفق نے احمد بن طولون کو حکم دیا کہ ثغور پر قبضہ کر لے۔ اسی حکم کی بنا پر احمد بن طولون انطاکیہ اور وہاں سے طرسوس گیا تھا۔ مگر سیما الطویل نے علانیہ طور پر معاندانہ طرزِ عمل اختیار کیا، اور قلعبند ہو کر شہر میں بیٹھ رہا۔ مگر بدقسمتی سے اہل شہر اُس سے نالاں تھے۔ جب منجنیق شہر پر لگا دئے گئے، اور محاصرے میں شدت ہونے لگی تو اہل شہر نے احمد بن طولون کے پاس آدمی بھیج کر بتا دیا کہ کس سمت سے شہر میں داخلہ آسان ہو گا۔ سیما الطویل کو قتل کیا گیا، اور اس کے اموال اور آدمی مباح قرار دئے گئے۔ صفر ۲۶۵ھ میں فتح انطاکیہ کی خبر فسطاط پہنچی، اور احمد بن طولون اپنی فوج کے ساتھ طرسوس کی طرف چلا۔ فوج کی وجہ سے طرسوس میں گرانی بڑھی، اور اہل شہر نے مجبور ہو کر جنگ کی تیاری کی لیکن احمد بن طولون نے اس خیال سے کہ یونانیوں کو اس کا علم ہو جائے کہ وہ بھی اہل طرسوس کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتا، اپنی فوج کو پسپا ہونے کا حکم دیا، اور طخشی بن بلبرد کو وہاں کا حاکم مقرر کر کے واپس ہوا جیسا کہ پہلے ہی ذکر ہو چکا ہے۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ اُس نے یونانی سرحد پر حملہ کرنے کا بھی ارادہ کیا تھا، اور طرسوس سے واپسی سے قبل اُس نے حَرّان اور رَقّہ میں محافظ فوجیں مقرر کی تھیں۔ حران کا حاکم محمدؐ بن اناش[۳۲] تھا، جسے احمد بن طولون کے مقدمۃ الجیش کے افسر لُجران بن جیبونہ نے وہاں سے نکال کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ یونانیوں کی ایک درخواست کہ عارضی صلح (ھدنہ) ہو جائے، احمد بن طولون نے رد کر دی، اور حکم دیا کہ ثغور کے قلعوں کی مرمت کی جائے اور سپاہیوں (غزاۃ) کے

---

[۳۲] ابن الاثیر (ج ۷، ص ۱۰۵) نے اس کا نام محمدؐ بن اتامش اور بجائے جیبونہ کے جبعونہ لکھا ہے۔

ارزاق، جو گذشتہ فساد میں مسدود کر دئے گئے تھے، دوبارہ جاری کئے جائیں۔[۷۹]

معلوم ہوتا ہے کہ احمد بن طولون کے ان نئے کارناموں اور خصوصاً ثغور کے نئے استحکامات سے یونانی بہت متاثر ہوئے تھے۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ انھوں نے عارضی صلح کی درخواست بھی کی تھی، جسے احمد بن طولون نے رد کر دیا تھا۔ غالباً اسی درخواست کو مزید تقویت پہنچانے کی غرض سے یونانیوں نے عبد اللہ بن رشید بن کاؤس کو، جو ان کی قید میں تھا، دوسرے قیدیوں کے ساتھ احمد بن طولون کے پاس بھیج دیا، اور متعدد قرآن شریف بھی ہدیۃً اسے بھیجے۔[۸۰] ثغور اور شام پر قبضے کا اثر یہ ہوا کہ احمد بن طولون نے اپنے نام کا سکہ مسکوک کرایا۔ اس وقت تک پرانے سکے مروج تھے، اور ان پر صرف خلیفہ کا نام ہوتا تھا۔ لیکن ۲۶۶ھ میں جب احمد بن طولون کی حکومت بیرون مصر تک وسیع ہو گئی تو اس نے نیا سکہ مسکوک کرایا۔ ان دیناروں پر، جو احمدی کہلاتے ہیں، خلیفہ کے علاوہ احمد بن طولون کا نام بھی پایا جاتا ہے۔ یہ سکے ۲۶۶ھ، ۲۶۷ھ، ۲۶۹ھ اور ۲۷۰ھ کے مسکوک شدہ دستیاب ہوتے ہیں اور رافقہ اور دمشق میں مسکوک ہوئے ہیں۔[۸۱]

احمد بن طولون اب اپنے انتہائی عروج پر پہنچ چکا تھا۔ وہ مصر و شام کا بلا شرکت غیرے

---

۷۹ الکندی ص ۲۰۹، ۲۲۰ + ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۴۰، ۴۱ + ابن خلدون ج ۴ ص ۳۰۰، ۳۰۱ + ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۴۔۱۰۴، ۱۰۵ + طبری ج ۱۱۔ ص ۲۵۲ + مقریزی ج ۱۔ ص ۳۲۰ + ابن عساکر ج ۲۔ ص ۱۱۵ + ابن عساکر (ج ۲۔ ص ۱۰۶) نے لکھا ہے کہ احمد بن وصیف کو، جسے عراق سے جلاوطن کر دیا گیا تھا، اور جسے احمد بن طولون صور سے اپنے ساتھ لایا تھا، دمشق مصر کا حاکم مقرر کیا گیا۔ مگر الکندی اور ابن خلدون نے دمشق پر مقرر ہونے والے حاکم کا نام احمد بن دوغباش لکھا ہے؛ اور خود ابن عساکر نے بھی ان مورخوں کی پیروی کی ہے۔ دیکھو ج ۲۔ ص ۱۱۵ + کیا یہاں ناموں میں کچھ خلط ملط واقع ہوا ہے؟

۸۰ طبری ج ۱۱۔ ص ۲۵۳ +

۸۱ بیکر ص ۱۷۲ + لین پول ص ۱۶۷۔ لین پول نے یہاں پھر وہی غلطی کی ہے کہ دوسرے والیان صوبہ جات کی طرح احمد بن طولون نے الموفق کا نام اپنے سکوں پر مسکوک نہیں کرایا تھا۔ ہم لکھ آئے ہیں کہ ایسا کرنا اس کے لئے ضروری نہیں تھا۔

مالک تھا۔ اس کے حریف اماجور کا انتقال ہو گیا تھا، اور دوسرا حریف احمد بن المدبر اب فتح شام کے بعد ایک مرتبہ پھر اس کے پنجے میں پھنس گیا تھا، جس سے اُسے ۲۷۰ھ میں موت ہی نے رہائی دلوائی۔ ثغور الشام پر ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ خود الموفق کی اجازت سے وہ ان سرحدوں پر قابض اور ان کے امور کا نگران تھا۔ لیکن ابھی وہ طرسوس سے شام واپس ہو رہا تھا کہ اُسے اپنے بیٹے عباس کی بغاوت کی خبر ملی، جسے وہ شام روانہ ہوتے وقت بطور نائب مصر چھوڑ آیا تھا۔ اس واقعے سے احمد بن طولون بالکل نہیں گھبرایا، بلکہ شام کے متعلق تمام انتظامات مکمل ہونے کے بعد مصر واپس ہوا۔[82]

گو عباس مصر میں اپنے باپ کا نائب تھا، لیکن اصل حکومت احمد بن محمد الواسطی کی تھی، اور احمد بن طولون نے چلتے وقت عباس کو تاکید کی تھی کہ وہ ہر حالت میں اس کارآزمودہ افسر کی ہدایات پر عمل کرے۔ چند قائد جن کے نام الکندی[83] نے لکھے ہیں، عباس کے خاص بے تکلف دوست تھے۔ یہ لوگ احمد بن طولون سے خائف تھے، اور اس کے خلاف بغاوت پھیلانے کی فکر میں تھے۔ عباس ان میں سے ایک کو کسی خدمت پر مامور کرنا چاہتا تھا۔ لیکن الواسطی نے اس بنا پر مخالفت کی کہ اس سے امور سلطنت میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ اب ان بے تکلف دوستوں نے الواسطی کی شکائتیں کرنی شروع کیں، اور عباس کو بالآخر اس سے منحرف کر دیا۔ الواسطی نے بھی ان تمام معاملات کی اطلاع احمد بن طولون کو کر دی۔ اس نے جواب میں لکھا کہ اس کے مصر واپس آنے تک کسی طرح کام چلاتا رہے۔ محمد (یا محبوب) بن رجا شام میں احمد بن طولون کا کاتب اور الواسطی کا حریف تھا۔ عباس سے اس کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ وہ الواسطی کے یہ خط عباس کے پاس بھیجتا رہا۔

---

[82] ویسٹن فیلڈ نے تعجب ظاہر کیا ہے کہ احمد بن طولون اس بغاوت سے گھبرا گیا تھا، اور بعض مورخ لکھتے ہیں کہ وہ بالکل نہیں گھبرایا تھا۔ اصل یہ ہے کہ یہ اختلاف مورخوں کی بے احتیاطی کی وجہ سے واقع ہوا ہے۔ احمد بن طولون کو تشویش اس وقت ہوئی تھی جب عباس کی بغاوت کے ساتھ دوسرے کوائف مل جل گئے تھے، اور حالات نے خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔ منقول از بیکر ص ۱۶۹ +

[83] کتاب الولاۃ۔ ص ۲۲۰ +

نتیجہ یہ ہوا کہ الواسطی اور عباس میں کشمکش شروع ہوئی، اور عباس کو بالآخر اس کا مزید ثبوت بھی مل گیا کہ الواسطی نے احمد بن طولون سے اس کی شکایت کی ہے۔ ایسی حالت میں جب کہ تمام باتیں ظاہر ہو چکی تھیں عباس کے لئے سوائے اس کے چارہ نہ تھا کہ وہ باپ کی مخالفت پر آمادہ ہو جائے۔ لہٰذا اس نے صاحب الخراج ابو ایوب ابن اخت الوزیر سے دس لاکھ دینار، اور تاجروں سے دو لاکھ دینار وصول کئے، اور تمام اسلحہ پر قبضہ کر لیا، پھر اپنے دوستوں کے مشورے کے مطابق اُس نے برقہ کا قصد کیا۔ الواسطی اور ایمن الاسود پابہ زنجیر اُس کے ساتھ تھے۔ ۸ شعبان ۲۶۵ھ کو وہ اپنے بھائی ربیعہ بن احمد کو بطور نائب فسطاط میں چھوڑ کر جیزہ کی طرف روانہ ہوا، اور یہ ظاہر کیا کہ احمد بن طولون کا حکم ملا ہے کہ وہ اسکندریہ جائے۔ پھر جیزہ سے وہ برقہ کی طرف پھرا۔

جمعرات کے دن ۴ رمضان ۲۶۵ھ کو احمد بن طولون فسطاط واپس آیا۔ اس نے چند معتبر آدمی، جن میں مصر کے قاضی ابو بکرہ بکار بن قتیبہ بھی تھے، عباس کے پاس بھیجے اور وعدہ کیا کہ اگر وہ واپس آجائے تو اس کی خطائیں معاف کر دی جائیں گی اور کوئی مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ قاضی بکار نے عباس کو بہت سمجھایا لیکن جب عباس نے یہ سوال کیا کہ کیا تم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہو کہ مجھے امان دلا دو گے تو قاضی اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکے کہ احمد بن طولون نے اس کے متعلق حلف اٹھایا ہے۔ اس سے عباس کو شبہ ہوا، اور دوسری طرف ان لوگوں کو جنھوں نے اسے بغاوت پر اکسایا تھا، خوف ہوا کہ عباس مواخذے سے خود بچ بھی گیا لیکن یہ لوگ ہر حالت میں سزا کے مستوجب قرار پائیں گے۔ آخر بکار کی جماعت بے نیل مرام واپس آگئی، اور عباس اپنے ہمدردوں کے مشورے سے افریقہ روانہ ہو گیا، جہاں کے بربری قبائل سے وہ پہلے خط و کتابت کر چکا تھا، اور بعض نے مدد کا وعدہ بھی کیا تھا۔ عباس نے ابراہیم بن الاغلب کو لکھا کہ خلیفہ معتمد نے اُسے افریقہ اور اس کے اعمال کا حاکم مقرر کیا ہے۔ وہ حصن لبدہ پہنچا۔ اہل شہر نے دروازے کھول دئے لیکن اس کے باوجود عباس نے اہل شہر کے ساتھ بدسلوکی کی اور شہر کو لوٹ لیا۔ اب ان لوگوں نے قبیلۂ نفوسہ اور اباضیہ کے رئیس الیاس بن منصور النفوسی سے مدد مانگی۔ الیاس نے عباس کو اطاعت قبول کر لینے کے لئے لکھا۔ اُدھر

ابراہیم بن الاغلب نے اپنے خادم بلاغ کی سرکردگی میں ایک فوج بھیجی، اور اپنے عامل اطرابلس محمد بن قہرب کو حکم دیا کہ بلاغ کی مدد کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ الیاس، بلاغ اور محمد بن قہرب کی متحدہ فوجوں نے عباس کو شکست دی، اس کے اموال و ذخائر لوٹ لئے، سپاہیوں کی بڑی تعداد کو تہ تیغ کیا، اور ابن الاسو کو قید و بند سے آزاد کرایا، اور وہ مصر چلا گیا۔

اب عباس نہایت بری حالت میں برقہ کی طرف پس پا ہوا۔ رمضان ۲۶۷ھ میں احمد بن طولون نے ابراہیم بن بلبرد کو ایک فوج دے کر برقہ بھیجا۔ ابراہیم اسکندریہ اور برقہ کے درمیان ٹھیرا۔ ادھر احمد بن طولون بذات خود ایک لاکھ فوج لے کر برقہ جانے کے لئے تیار ہوا۔ ۱۲ ربیع الاول ۲۶۸ھ کو جمعرات کے دن وہ فسطاط سے روانہ ہوا، اور اسکندریہ میں آکر ٹھیرا۔ اس اثنا میں الواسطی بھی عباس کی قید سے بھاگ کر اسکندریہ میں احمد بن طولون سے آملا، اور اُسے یقین دلایا کہ عباس کی شورش اتنی سنگین نہیں کہ وہ خود تکلیف کرے۔ اس لئے احمد بن طولون نے ایک اور فوج طبار کی ماتحتی میں برقہ روانہ کی۔ ۲ جمادی الثانی ۲۶۸ھ میں اس کا مقابلہ عباس سے ہوا۔ عباس نے شکست کھائی، اور اس کے سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد بھی قتل ہوئی۔ آخر وہ خود ۴ رجب ۲۶۸ھ کو گرفتار ہوا، اور ۱۱ رجب کو احمد بن طولون کے پاس فسطاط لایا گیا۔ تمام فتنہ پرداز لوگوں کو جنھوں نے اس شورش میں حصہ لیا تھا سخت سزائیں دی گئیں، اور عباس کو چابکوں کی سزا دیکر قید کر دیا گیا۔[۴۴] جب سب طرح کا

---

[۴۴] الکندی ص ۲۲۰-۲۲۲ + ابن الاثیر ج ۷- ص ۱۰۷، ۱۱۱، ۱۲۳ + ابن خلدون ج ۴- ص ۳۰۱، ۳۰۲ + ابن تغری بردی ۳- ص ۴۱ + طبری نے یہ واقعہ تفصیل سے بیان نہیں کیا۔ ناموں میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ مثلاً الکندی نے محمد بن قہرب کی بجائے محمد بن قرھب، ابن خلدون نے طبار کی جگہ طبارجی، اور ابن العذاری (البیان المغرب ج ۲- ص ۱۲۲) نے الیاس بن منصور کی جگہ ابو منصور لکھا ہے۔ بہر حال ناموں کے اس اختلاف سے نفس واقعہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ابراہیم بن اغلب کا پورا نام ابراہیم بن احمد بن الاغلب ہے۔ مقریزی (ج ۱- ص ۳۰۲) نے عباس کے فسطاط لائے جانے کی تاریخ شوال ۲۶۸ھ لکھی ہے۔

اطمینان ہوگیا تو احمد بن طولون ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا، جنھوں نے فسطاط میں عباس کی مدد کی تھی۔ ابوضحاک محمد (یا محبوب) بن رجاء کو اس بنا پر قید کیا گیا کہ اُس نے الواسطی کے خط عباس کے پاس بھیجے تھے، اور یہی خط اس بغاوت کی اصلی بنیاد تھے۔ ابوایوب ابن اخت الوزیر اور اُس کے بیٹے کو موت کی سزا دی گئی، کیونکہ عباس نے فسطاط سے روانہ ہونے سے قبل تاجروں سے جو رقم وصول کی تھی، ابوایوب کو حکم دیا تھا کہ اس رقم کی ادائی زرعی زمینوں کی کاشت سے جو مال وصول ہوتا ہے اُس سے کی جائے۔ ابوایوب نے اس حکم کی تعمیل کی تھی۔ احمد بن طولون نے اس کی پاداش میں ابوایوب کی جائداد بھی ضبط کر لی۔ اس کے متعلق تمام اطلاعات احمد بن طولون کو خود اُسی کے ایک بیٹے سے ملی تھیں۔ اب صاحب الخراج کا کام احمد بن ابراہیم الاطرش اور علی بن حسین (یا حسن) المدائنی میں تقسیم کیا گیا۔ احمد بن ابراہیم مصر کے خاندان ماذرائیون کا پہلا شخص تھا۔ اس خاندان نے مصر میں بڑا اثر و نفوذ پیدا کیا، اور فاطمیین کی فتح سے ذرا قبل تک وہاں ہر لحاظ سے تمام سیاہ وسفید کے مالک بنے رہے۔ ان کے حالات زیادہ تفصیل سے آئندہ بیان کئے جائیں گے۔ مقریزی نے اپنی کتاب المقفیٰ میں احمد بن ابراہیم کے تقرر کی تاریخ ۲۶۶ھ بیان کی ہے۔ بہت جلد علی بن حسین کو اس الزام میں معزول کیا گیا کہ اُس نے احمد بن المدبر کو ایک خط لکھا تھا، اور اس سے ہمدردی ظاہر کی تھی۔ اس طرح ماذرائی بلا شرکت غیرے مصر کا صاحب الخراج ہوگیا۔[۵۵]

عباس کی بغاوت سے یہ بات صاف ظاہر ہوگئی کہ احمد بن طولون کے قدم مصر میں اتنے جم گئے تھے کہ اُسے وہاں سے ہلانا ناممکن تھا۔ یہ بھی بخوبی اندازہ ہوگیا کہ درحقیقت تمام اقتدار فوج کے ہاتھ میں تھا، اور فوج جس کا ساتھ دے وہی مصر کا حکمران رہ سکتا تھا۔ احمد بن طولون کو اپنی فوج پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ اس قسم کے معاملات کو بالکل معمولی بات سمجھتا تھا، اور ان سے گھبراتا نہیں تھا۔ احمد بن طولون کے بعد ہم دیکھیں گے کہ فوج کے اس اقتدار سے اُس کی اولاد کو کتنا

---

۵۵ بیکر (بحوالۂ ابن سعید) ص ۱۶۹ - ۱۷۱ +

نقصان پہونچا، اور فوج ہی حقیقی طور پر آل طولون کی تباہی کا باعث ہوئی۔

ایک طرف تو یہ واقعات گذر رہے تھے، اور دوسری طرف احمد بن طولون ان فرائض سے بھی غافل نہیں تھا جو ثغور پر حاکم ہونے کی حیثیت سے اُس پر عائد ہوتے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اُس نے سرحد پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں کے استحکامات کی مرمت کا حکم دیا تھا۔ اس کا نتیجہ جلدی ہی ظاہر ہوا۔ ۲۶۴ھ میں ثغور الشامیہ پر احمد بن طولون کے نائب نے اہل طرسوس کے تین ہزار آدمی لے کر یونانی سرحد پر حملہ کیا۔ ہرقلہ کے چار ہزار یونانیوں سے اس کا مقابلہ ہوا۔ جنگ میں دشمن کی ایک بڑی تعداد قتل ہوئی، مگر مسلمانوں نے بھی بہت نقصان اٹھایا[۵۶]۔ اس کے بعد ۲۶۵ھ میں ملک الروم، ابن الصقلبیہ نے ملطیہ پر فوج کشی کی۔ اہل مرعش اور حدث نے اہل ملطیہ کی مدد کی، اور یونانیوں کو شکست دی۔ غالباً اسی حملے کے جواب میں احمد بن طولون کے حاکم ثغور الشامیہ خلف الفرغانی الترکی نے یونانی علاقوں پر فوج کشی کی اور تقریباً دس ہزار آدمیوں کو قتل کیا۔ اس واقعے میں اتنا مال غنیمت حاصل ہوا کہ ہر سپاہی کو چالیس دینار حصہ ملا[۵۷]۔ ۲۶۵ھ ہی میں شام میں ایک معمولی سی شورش ہوئی۔ عبد الملک بن صالح الہاشمی کی اولاد میں سے ایک شخص بکار نے سلمیہ، حلب اور حمص کے درمیان الموفق کی موافقت میں خروج کیا، اور ابو العباس الکلابی کی فوج کو شکست دی۔ احمد بن طولون کے مولا لؤلؤ نے جسے ۲۶۵ھ ہی میں شام بھیجا گیا تھا[۵۸]، ایک قائد ابو ذر کی سرکردگی میں ایک فوج بھیجی، جس نے بکار کے آدمیوں کو منتشر کر دیا اور کوئی بڑا واقعہ پیش نہیں آیا[۵۹]۔

---

۵۶ ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۱۱ + ابن الاثیر نے احمد بن طولون کے نائب یا والئ ثغور کا نام سیما لکھا ہے۔ یہ سیما الطویل تو نہیں ہو سکتا۔ پھر خلف الفرغانی الترکی وہی طخشی بن بلبرد ہے جس کا والئ ثغور مقرر ہونا ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

۵۷ طبری ج ۱۱۔ ص ۲۵۸ + ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۲۳ + ابن تغری بردی ج ۳۔ ص ۴۵ + اس مصنف نے یونانی مقتولین کی تعداد ایک لاکھ لکھی ہے۔

۵۸ مقریزی ج ۲۔ ص ۳۲۰ + ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۳	۵۹ ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۲۳ +

(۴)

اب الموفق اور احمد بن طولون کی مخاصمت کا دوسرا باب شروع ہوا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کبھی غافل نہیں ہوئے تھے، لیکن اپنے اپنے علاقوں میں امن قائم کرنے اور اپنی قوت کو مجتمع اور استوار کرنے میں اتنے مصروف تھے کہ کسی اور طرف توجہ نہیں کر سکتے تھے۔ اب ۲۶۸ھ میں انھیں ان معاملات سے فرصت ہوئی اور وقت آگیا کہ اس مرتبہ جھگڑے کا آخری فیصلہ کر دیا جائے۔ اس کا آغاز لُؤلُؤ مولائے احمد بن طولون کی وجہ سے ہوا۔

۲۶۹ھ میں عباس کی شورش فرو ہوگئی تو احمد بن طولون نے لُؤلُؤ کو قنسرین اور دیار مضر کا والی مقرر کیا۔ یہ احمد کا خاص معتمد علیہ تھا، مصر میں کارہائے نمایاں انجام دے چکا تھا، اور اس کے اور احمد بن طولون کے تعلقات اتنے گہرے اور دوستانہ تھے کہ احمدی دیناروں پر بھی اُس کا نام مسکوک کر دیا گیا تھا[۹۰]۔ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ایسا شخص کبھی احمد بن طولون کی مخالفت پر آمادہ ہو جائے گا۔ اس انحراف کے مختلف اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ احمد بن طولون بُخل سے کام لیتا تھا[۹۱]۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لُؤلُؤ نے مخالفت کا آغاز اس طرح کیا کہ احمد بن طولون کے پاس سے جو خزانہ جا رہا تھا اُس پر قبضہ کر لیا[۹۲]۔ جب مخالفت علانیہ ہونے لگی تو احمد بن طولون نے لُؤلُؤ کے کاتب محمد بن اسمٰعیل کو سزا دی۔ یہی وہ شخص ہے جو بعد میں آل طولون کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوا۔ اس پر لُؤلُؤ نے مال بھیجنا بند کر دیا۔ محمد بن اسماعیل کو بھی انجام کا خوف ہوا، اور اس نے لُؤلُؤ کو اطاعت سے انحراف پر آمادہ کیا۔ لُؤلُؤ کی طرف سے اب مخالفت کا اظہار اس طرح ہوا کہ اُس نے بالس کو لوٹ لیا، پھر الموفق سے خط و کتابت شروع کی، اور مفید مطلب شرائط حاصل کرنے کے بعد اُس کی طرف روانہ ہو گیا۔ الموفق اس زمانے میں رُقّہ میں

---

۹۰ بیکر ص ۱۷۴ + لین پول ص ۶۸۔ حاشیہ

۹۱ بیکر (بحوالۂ نویری) ص ۱۷۴ +

۹۲ بیکر (بحوالۂ نویری) ص ۱۷۴ +

مقیم تھا۔ لُولُو راستے میں قرقیسیا سے گذرا، جہاں ابن صفوان العقیلی موجود تھا۔ لُولُو نے قرقیسیا سے اُسے بے دخل کر کے شہر احمد بن مالک بن طوق کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد وہ الموفق کی طرف چلا جو حسب سابق صاحب الزنج کے محاصرے میں مصروف تھا۔ جمادی الاولیٰ ۲۶۹ھ میں براہ دریا لُولُو وہاں پہنچا، اور اس محاصرے میں شریک ہوا۔ آخرکار الموفق نے اُسے موصل کا حاکم مقرر کر دیا۔ مگر افسوس ہے کہ لُولُو کا انجام اچھا نہیں ہوا۔ ۲۷۳ھ میں الموفق نے اُسے گرفتار کرایا، اور چار لاکھ دینار جرمانہ کیا۔ اس سے لُولُو بالکل مفلس ہو گیا، اور ہارون بن خمارویہ کے زمانے میں از بیں سو رانده وازاں سو درمانده فقر و فاقہ کی حالت میں مصر واپس ہوا۔[۹۳]

احمد بن طولون کو جب لُولُو کے انحراف کی خبر ملی تو وہ اس کی طرف سے مایوس نہیں ہوا، بلکہ اپنے بیٹے خمارویہ کو مصر میں چھوڑ کر صفر ۲۶۹ھ میں اس امید پر شام روانہ ہوا کہ اب بھی لُولُو اُس کا وفادار ثابت ہوگا۔[۹۴] لیکن لُولُو اس کے شام پہنچنے سے قبل ہی الموفق کے پاس پہونچ چکا تھا۔ اب معاملات انتہائی درجہ نازک ہو گئے تھے، اور ضرورت تھی کہ ان کا فیصلہ کر لیا جائے۔ اتفاق سے اُسی زمانے میں خلیفہ معتمد کا ایک خط احمد بن طولون کے پاس آیا۔ معتمد کی حالت یہ تھی کہ وہ محض برائے نام خلیفہ رہ گیا تھا، حتیٰ کہ کسی چھوٹے یا بڑے معاملے میں توقیع بھی نافذ نہیں کر سکتا۔ تمام امر و نہی الموفق کے قبضۂ اقتدار میں تھا، اور محاصل تک اسی کے نام اور اسی کی طرف سے جمع ہوتے تھے۔ معتمد ان حالات سے بے زار تھا۔ اُس کی نظر احمد بن طولون پر پڑی، اور وہ یہ سمجھا کہ

---

۹۳ ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۲۔۳۰۳ + ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۲۳، ۱۳۱ + الکندی ص ۲۲۴ + ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۴۵ + طبری ج ۱۱۔ ص ۲۹۵، ۲۹۶ + مقریزی ج ۱۔ ص ۳۲۰ + ابن خلدون نے قرقیسیا کے بجائے رَقّہ لکھا ہے۔ لیکن ابن الاثیر اور طبری کا قول جنھوں نے قرقیسیا لکھا ہے، زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔ رَقّہ کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ لُولُو کا صدر مقام رَقّہ تھا، اور پھر آگے لکھا ہے رَقّہ بہ ابن صفوان العقیلی قابض تھا۔ ابن الاثیر اور طبری نے لکھا ہے کہ اُس وقت الموفق رَقّہ میں تھا۔ اس کے علاوہ دیکھو بیکر (ص ۴۷) جس نے ابن سعید سے استفادہ کیا ہے +

۹۴ الکندی ص ۲۲۴ +

احمد بن طولون کی مدد سے وہ الموفق کے پنجے سے رہائی پا سکتا ہے[۹۵]۔ دوسری طرف الموفق کو بھی احمد بن طولون سے اس وجہ سے نفرت تھی کہ خلیفہ معتمد اس کی جانب مائل ہے۔ ایک دوسری روایت ابن خلدون[۹۶] نے بیان کی ہے کہ لُولُو کی بغاوت اور اُس کے الموفق سے مل جانے کے سبب سے خود احمد بن طولون نے خلیفہ کو مصر آنے کی دعوت دی تھی۔ ممکن ہے کہ یہ روایت صحیح ہو، اور معتمد نے اپنی روانگی کی آخری اطلاع احمد بن طولون کو دی ہو۔ گو احمد بن طولون کے اہل الرائے مشیروں نے اُسے خلیفہ کے معاملات سے دور رہنے کا مشورہ دیا تھا، اور کہا تھا کہ معتمد اور الموفق آخر ایک ہی ہیں، مگر وہ باز نہ آیا، اور خلیفہ کا فسطاط آنا قبول کر لیا، بلکہ یہ بھی ارادہ کیا کہ خلیفہ کی مدد کے لئے اپنا ایک لشکر رَقّہ بھیج دے۔ اسی زمانے میں یہ بھی خبر ملی کہ الموفق کو صاحب الزنج پر فتح ہونے ہی والی ہے۔ اس لئے اور بھی عجلت سے کام لیا گیا۔ ادھر معتمد نے الموفق کی عدم موجودگی کو غنیمت سمجھا اور نصف جمادی الاولی ۲۶۹ھ میں قائدوں کی ایک جماعت کے ساتھ روانہ ہو گیا[۹۷]، اور شکار کھیلنے کے لئے الکحیل میں ٹھیرا۔ مگر اس سے قبل ہی الموفق کے کاتب صاعد بن مخلد نے، جسے ابن الاثیر نے الموفق کا وزیر لکھا ہے، اپنے آقا کی طرف سے اسحاق[۹۸] بن کنداج، عامل موصل و جزیرہ کو لکھا کہ ان لوگوں کو گرفتار کر لیا جائے۔ خلیفہ کی جماعت جب ابن کنداج کے اعمال میں داخل ہوئی تو اُس نے اطاعت کا اظہار کیا، اور اپنے آپ کو معتمد کا ہمدرد بتایا۔ وہ خود بھی خلیفہ کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ جب یہ جماعت احمد بن طولون کے اعمال کے قریب پہنچی تو ابن کنداج نے نوکروں اور غلاموں کو تو آگے روانہ کر دیا، مگر قائدوں کو روک لیا، اور معتمد کی موجودگی میں

---

۹۵ ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۳۱ + ۹۶ تاریخ۔ ج ۴ ۳۰۳ +

۹۷ ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۳۱ + طبری ج ۱۱۔ ص ۲۹۹، ۳۰۰ + ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۳ + ابن خلدون نے بجائے ۲۶۹ھ کے ۲۶۸ھ لکھا ہے لیکن ابن الاثیر کا بیان زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے، اور طبری اس سے متفق ہے۔

۹۸ ابن الاثیر نے یہ نام اسحاق بن کنداج اور ایک اور جگہ اسحاق بن کنداجیق لکھا ہے۔ ابن خلدون کی تاریخ میں ابو اسحاق بن کنداج ہے +

ان سے گفتگو کی کہ اب تم اعمال احمد بن طولون کے قریب ہو، اور چند دن میں اسی کا حکم تم پر ناطق ہوگا، حالانکہ وہ بھی تمہارے ہی جیسا ایک امیر اور امیر المومنین کا مولا ہے۔ اس بحث مباحثے میں دن چڑھ آیا، اور معتمد آگے روانہ نہ ہوسکا۔ ابن کنداج نے قائدوں سے کہا کہ وہ سب خلیفہ سے الگ اس امر پر غور کرلیں تو بہتر ہے۔ یہ کہ کر وہ انھیں اپنے خیمے میں لے آیا، اور یہاں انھیں گرفتار کرکے پابہ زنجیر کردیا، اور باقی ماندہ قائدوں کو بھی خلیفہ کے ساتھ رہ گئے تھے قید کرلیا۔ ان سے فارغ ہوکر وہ معتمد کے پاس آیا اور اُسے اپنے دارالخلافہ کو چھوڑنے، اپنے آباؤ اجداد کے طرزِ عمل کو ترک کرنے اور اپنے بھائی الموفق سے مخالفت مول لینے پر ملامت کی، حالانکہ یہی الموفق اُس کے ایسے دشمن سے لڑ رہا ہے جو اس کے اہلِ بیت کے خون کا پیاسا اور ان کی بربادی کا خواہاں ہے۔ اس کے بعد ابن کنداج خلیفہ کو سامرا لے آیا۔[۹۹] ۴ شعبان کو معتمد سامرا واپس پہونچا۔ اُسے دارالخلافہ میں اترنے کی اجازت نہیں دی گئی، بلکہ، سیوطی[۱۰۰] کے مطابق احمد بن الخصیب کے مکان میں اُتارا گیا، اور پانچ سو آدمی اس لئے مقرر کئے گئے کہ خلیفہ کو دارالخلافہ نہ جانے دیں۔

صاعد بن مخلد اور اسحاق بن کنداج نے الموفق کی بڑی خدمت انجام دی تھی۔ اس کے صلے میں اُس نے صاعد کو ذوالوزارتین کا اور ابن کنداج کو ذوالسیفین[۱۰۱] کا خطاب دیا، خلعت سے سرفراز کیا، اور ان قائدوں کی جاگیریں (ضیاع) ضبط کرکے، جنھوں نے معتمد کا ساتھ دیا تھا، اُسے عطا کیں۔[۱۰۲] اس کے علاوہ الموفق نے احمد بن طولون کے تمام اعمال پر بھی ابن کنداج کو حاکم مقرر کیا اور باب الشماسیہ سے برقہ تک تمام ممالک اُس کے سپرد کردئے، اور شرطۃ الخاصہ کے عہدے پر مامور کیا۔[۱۰۳] صرف یہی نہیں بلکہ جب ابن کنداج معتمد کو ساتھ لے کر سامرا آیا ہے تو

---

۹۹ طبری ج ۱۱۔ ص ۲۹۹، ۳۰۰ + ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۳۱ + ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۳ +

۱۰۰ تاریخ الخلفا، ص ۳۴۲ + اس کے علاوہ دیکھو طبری ج ۱۱۔ ص ۳۰۱ +

۱۰۱ سیوطی (ص ۳۴۲) نے ذوالسندین، لیکن طبری (ج ۱۱۔ ص ۳۰۱) نے ذوالسیفین لکھا ہے۔

۱۰۲ سیوطی تاریخ الخلفا، ص ۳۴۲ +　　۱۰۳ ابن الاثیر ج ۷، ص ۱۳۲ + مقریزی ج ۱۔ ص ۳۲۰ +

صاعد بن مخلد، ہارون بن الموفق اور دوسرے قائدوں نے اس کا استقبال کیا، اُسے جوسق میں اُتارا گیا، اور یہ لوگ رات کے کھانے میں بھی اُس کے ساتھ شریک ہوئے[۱۰۴]۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ احمد بن طولون کو اُس کے اعمال سے معزول کر دیا گیا ہے۔ اس کا جواب احمد بن طولون نے بھی دیا۔ سیوطی کے مطابق وہ اُس وقت دمشق میں تھا[۱۰۵]، اور مقریزی کے مطابق وہ اب دمشق آیا[۱۰۶]۔ اور اپنے اعمال کے تمام فقہا و قضاۃ کو جمع کیا۔ اُس نے اہل مصر کے نام ایک خط لکھا کہ الموفق نے خلیفہ معتمد کی بیعت کو فسخ کر کے اُسے احمد بن الخصیب کے مکان میں قید کر دیا ہے، اور خلیفہ پر ایسی گزر رہی ہے جس کا بیان کرنا ناممکن ہے۔ جمعہ کے دن خطیب نے خطبے میں خلیفہ کے مصائب کا ذکر کیا۔ مصر سے قاضی ابو بکرہ بکار بن قتیبہ اور دیگر فقہا کی جماعت دمشق آئی، اور شام اور ثغور کے فقہا بھی وہاں بھی جمع ہوئے۔ اس مجلس نے ایک فیصلہ مرتب کیا، جس کے مطابق الموفق کو خلیفہ کی مخالفت اور اُسے قید کر دینے کی بنا پر ولی عہدی سے معزول کیا گیا، اور چونکہ اُس نے خلیفہ کی اطاعت سے انحراف کیا تھا اُس کے خلاف جہاد واجب قرار دیا گیا۔ سوائے قاضی بکار کے تمام حاضرین نے اس کی شہادت دی۔ قاضی بکار نے احمد بن طولون سے کہا کہ جب الموفق ولی عہد مقرر کیا گیا ہے تو تم نے معتمد کا فرمان پیش کیا تھا، اب تاوقتیکہ معتمد ہی طرف سے اُس کی معزولی کا فرمان نہ دکھاؤ میں کوئی حکم نہیں دے سکتا۔ احمد بن طولون نے عذر کیا کہ خلیفہ اس وقت مجبور و مقہور ہے۔ مگر قاضی نے یہ عذر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر احمد بن طولون کو بہت غصہ آیا، اور اُس نے کہا کہ لوگوں میں جو یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ تم عدیم المثال قاضی ہو اس سے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم سٹھیا گئے ہو۔ اس کے بعد اُس نے قاضی بکار کو قید کر دیا، اور جو فیصلہ مجلس نے کیا تھا اُسے شائع کر دیا۔ یہ ذوالقعدہ ۲۶۹ھ کا واقعہ ہے[۱۰۷]۔

---

[۱۰۴] طبری ج ۱۱، ص ۱۳۰۱۔ [۱۰۵] تاریخ الخلفاء ص ۳۴۳۔ [۱۰۶] خطط ج ۱، ص ۳۲۰۔

[۱۰۷] مقریزی ج ۱، ص ۳۲۰۔ سیوطی۔ تاریخ ص ۳۴۳، ۳۴۴۔ الکندی ص ۲۲۴۔ ۲۲۶۔

بیکر نے یہاں لکھا ہے کہ احمد بن طولون نے خلیفہ سے دوستی اور ہمدردی جو اظہار کیا تھا وہ محض دکھاوا تھا۔ جب وقت آیا تو بجائے اس کے کہ اپنی فوج لے کر فوراً خلیفہ کو چھڑانے کی کوشش کرتا۔ اُس نے صرف اسی پر اکتفا کیا کہ الموفق کے ساتھ اب تک جو وابستگی رہ گئی تھی اُسے بھی خلیفہ کا نام لے کر ختم کر دے۔ ولی عہد خلافت کی حیثیت سے الموفق کا نام خطبے میں لیا جاتا تھا، اسے بھی موقوف کر دیا، اور طراز پر سے بھی اُس کا نام مٹا دیا[۱۰۸]۔ لیکن چونکہ وہ کوئی کام خلاف قانون نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے باضابطہ طور پر فقہا و قضاۃ کی مجلس منعقد کر کے الموفق کی معزولی کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ یہ فتویٰ کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا، اور اسی قسم کا ایک فتویٰ تھا جو ہندوستان اور مصر میں ایسے موقعوں پر آج کل بھی شائع ہوتے رہتے ہیں[۱۰۹]۔ لیکن تصویر کا ایک رُخ اور بھی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ان واقعات سے قبل ہی ثغور پر فتنہ و فساد پھوٹ پڑا تھا، اور یونانیوں کے حملے شروع ہو گئے تھے، اور چونکہ ان جھگڑوں کی وجہ سے احمد بن طولون اس طرف توجہ نہیں کر سکا تھا اس لئے وہاں کے حالات روز بروز اور بھی خراب ہوتے جا رہے تھے، اور خلیفہ کی فوری مدد کرنے سے معذور تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری تھا کہ اتنا بڑا اقدام کرنے سے پہلے احمد طولون رائے عامہ کو اپنا ہمدرد بنانے کی کوشش کرتا، اور شروع ہی میں یہ اعلان کر دیتا کہ یہ کشمکش خلیفہ کے خلاف نہیں بلکہ اُس کی طرفداری میں ہے۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ کر سکے اُس کا انتقال ہو گیا، اور الموفق کے ساتھ اس کا جو جھگڑا تھا وہ اُس کے بیٹے خمارویہ کو ورثے میں ملا۔

بہر حال احمد بن طولون نے جب یہ طرزِ عمل اختیار کیا تو الموفق بھی خاموش نہیں رہا۔ وہ پہلے ہی احمد بن طولون کو اُس کے اعمال سے معزول کر چکا تھا۔ اب مجبور و مقہور خلیفہ معتمد نے طوعاً و کرہاً دار العامہ میں احمد بن طولون پر لعنت بھیجی اور حکم دیا کہ تمام منبروں پر سے اُس پر لعنت کی جائے۔ چنانچہ جعفر المفوض نے بغداد کی جامع مسجد میں اُس پر لعنت بھیجی[۱۱۰]۔ خلیفہ کا یہ حکم بے اثر نہیں رہا

---

[۱۰۸] ابوالفداء ج ۲۔ ص ۵۳ + ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۳۲۔ [۱۰۹] بائی ٹراگ۔ ص ۱۷۷، ۱۷۸ +

[۱۱۰] طبری ج ۱۱۔ ص ۴۰۳ + مقریزی ج ۱۔ ص ۳۲۰ + الکندی ص ۲۲۸، ۲۲۹ +

ذو القعدہ ۲۶۹ھ ہی میں ہم اس کی صدائے بازگشت مکہ میں سنتے ہیں۔ احمد بن طولون اس لعنت سے بچنا چاہتا تھا۔ اس نے دو قائدوں کے ماتحت ایک لشکر مکہ روانہ کیا۔ ستر سوار اور دو ہزار پیادوں کے ساتھ یہ دونوں قائد ۲۷ر یا ۲۸ر ذو القعدہ کو مکہ پہونچے، اور گندم فروشوں (حناطین) اور قصابوں (جزارین) میں مال تقسیم کیا۔ مکہ کا حاکم ہارون بن محمد بستان ابن عامر میں مقیم تھا۔ وہ اس لشکر کے خوف سے بھاگ گیا۔ اب جعفر الناعمودی (یا طبری کے مطابق الباغودی) ۳ر ذی الحجہ کو تقریباً دو سو سواروں کے ساتھ مکہ آیا۔ ہارون کو ڈھارس ہوئی، اور ایک سو بیس سواروں اور سو حبشیوں کے ساتھ وہ بھی الناعمودی سے آملا۔ اس کے علاوہ عمرو بن لیث کے تین سو سواروں اور دو سو حبشیوں نے بھی اس کی مدد کی۔ عراق کے دو سو سوار بھی اس جھگڑے میں شریک ہوئے۔ احمد بن طولون اور جعفر الناعمودی کی فوج میں جنگ ہوئی۔ احمد بن طولون کے تقریباً دو سو آدمی بطن مکہ میں قتل ہوئے اور باقی ماندہ پہاڑوں میں بھاگ گئے۔ ان کا مال و اسباب لوٹا گیا۔ مصریوں، گندم فروشوں اور قصابوں کو امان دی گئی۔ احمد بن طولون پر لعنت بھیجنے کا فرمان مسجد حرام میں پڑھا گیا[۱۱۱]۔ اس سے وہ بچنا چاہتا تھا۔ کیونکہ مسجد حرام میں اس فرمان کے پڑھے جانے کا مطلب یہ تھا کہ اس کا اعلان اب تمام اسلامی دنیا میں کر دیا گیا ہے۔

الموفق نے جو طرز عمل احمد بن طولون کے خلاف اختیار کیا تھا اس کا سب سے زیادہ اثر ثغور الشام پر ہوا[۱۱۲]۔ ان دونوں کے آخری جھگڑے سے قبل یا اسی دوران میں طخشی بن بلبرد، جس کا

---

۱۱۱ طبری ج ۱۱ - ص ۳۰۴ + ابن الاثیر ج ۷ - ص ۱۳۲ + ابن خلدون ج ۴ - ص ۳۳۱ + اس سے قبل ۲۶۶ھ میں ایک اور جھگڑا مکہ ہی میں احمد بن طولون اور عمرو بن لیث کے آدمیوں میں حج کے موقعے پر ہو چکا تھا۔ باعث نزاع یہ تھا کہ مسجد ابراہیم کے منبر کے داہنے جانب فریقین میں سے کس کا جھنڈا نصب کیا جائے۔ اس وقت بھی ہارون بن محمد مکہ کا حاکم تھا۔ عمرو بن لیث کا پلہ بھاری تھا۔ اس لئے اس کی بات مانی گئی۔ مگر موقع کی نزاکت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہارون بن محمدؒ نے خطبہ قصر کر دیا تھا۔

۱۱۲ محمد کرد علی (خطط الشام ج ۱ - ص ۲۰۴) نے بلذیار کی شورش کو احمد بن طولون پر لعنت بھیجے جانے کا سبب قرار دیا ہے۔ اس مہم کی تاریخوں میں اختلاف ہے۔ طبری اور ابن تغری بردی کے مطابق یہ ۲۶۹ھ کا واقعہ ہے لیکن ابن خلدون کا بیان زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہم ۲۶۹ھ اور ۲۷۰ھ دونوں سنین میں جاری رہی تھی۔

نام خلف الفرغانی تھا، ثغور پر حاکم تھا اور طرسوس اُس کا صدر مقام تھا۔ فتح بن خاقان کا خادم (مولا) مازیار (بازمان یا بازمار) بھی وہیں تھا۔ خلف کو اس پر انحراف اطاعت کا شبہ ہوا، اور اسی شبہ پر اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ مگر اہل طرسوس نے شور و غوغا کر کے اُسے قید سے چھڑا لیا۔ یہ ۲۶۹ھ کا واقعہ ہے[۱۱۳]۔ خلف نے بھاگ کر دمشق میں پناہ لی۔ ادھر اہل طرسوس نے منبر پر سے احمد بن طولون پر لعنت بھیجنی شروع کی۔ یہ اطلاعات ملنے پر احمد بن طولون مصر سے چلا، اور پہلے دمشق آیا، اور یہاں سے ثغور الشام میں اَذِنہ پہنچ کر اُس نے خط و کتابت کے ذریعے مازیار کو مطیع کرنا چاہا۔ مگر بے سود۔ مطیع ہونے کے بجائے مازیار طرسوس میں قلعبند ہو گیا، اور فصیل پر منجنیقیں لگا دیں۔ احمد بن طولون اَذِنہ سے حمص آیا پھر دمشق گیا اور پھر واپس ہوا، اور سردی کے موسم میں بارش اور برف باری کی حالت میں مازیار کا محاصرہ کیا، مگر کامیاب نہیں ہوا، بلکہ مازیار نے اُسی کی چھاؤنی لوٹ لی، اور دریائے بردان کا رُخ اُس کی چھاؤنی کی طرف بدل کر پوری چھاؤنی کو غرقاب کر دیا۔ مجبوراً احمد بن طولون نے طرسوس کا محاصرہ اٹھا لیا، اور اَذِنہ واپس آگیا۔ پھر وہاں سے مصیصہ گیا۔ یہیں مصیصہ میں بیمار ہوا۔ بیماری کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ وہ بھینس کا دودھ بڑی مقدار میں پی گیا تھا، جس سے تخمہ میں مبتلا ہوا۔ طبیب کی ہدایت کے باوجود وہ چھپا کر کھاتا پیتا رہا، اور بالآخر اُس کا جگر ماؤف ہو گیا۔ جب یہ حالت ہوئی کہ گھوڑے پر بیٹھنا بھی مشکل ہو گیا تو اس حالت میں وہ بسرعت تمام واپس ہوا۔ اُسے بہ مشکل فرماتک لائے۔ وہاں سے وہ مصر لایا گیا۔ بیماری کی حالت میں اُس کا غیظ و غضب ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے بہت سے عمائد کو طرح طرح کی سزائیں دیں۔ انھیں میں اُس کا طبیب سعد بن نوفیل[۱۱۴] تھا۔ جب بیماری نے طول پکڑا تو اہل فسطاط اُس کے حکم سے ۲ شوال ۲۷۰ھ کو اُس کے لئے دعا کرنے کی غرض سے جبل مقطم کی مسجد محمود میں جمع ہوئے۔ مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں نے

---

۱۱۳ طبری ج ۱۱۔ ص ۲۹۶ + ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۴ + ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۴۶ +

۱۱۴ ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۴ + ابن تغری بردی ج ۳ ص ۱۸۔ سعد بن نوفیل النصرانی، احمد بن طولون کا طبیب +

اپنی اپنی مقدس کتابیں لے کر دعائیں کیں[۱۱۵]۔ مگر بے اثر۔ بالآخر ۱۱ر ذوالقعدہ ۲۷۰ھ کو سولہ برس حکومت کرنے کے بعد اُس کا انتقال ہوگیا[۱۱۶]۔ مرنے سے پہلے اُس نے اپنے خیرخواہوں اور موالی کو جمع کر کے اپنے بیٹے ابوالجیش خمارویہ کو ولی عہد مقرر کیا، اور وصیت کی کہ یہ لوگ اُس کی خبر گیری کریں۔ اس تقرر سے عباس کی طرف سے جو خطرہ تھا اُس کا سد باب ہوگیا[۱۱۷]۔

خلیفہ معتمد کو احمد بن طولون کے مرنے کا سخت رنج ہوا۔ وہ اس کے مرثیہ میں کہتا ہے[۱۱۸]

ا لی اللہ ا شکو اسی　　　عـ ا الی کو قع الا سـل
علی ر جل ا ر و ع　　　یری فیہ فضل الوجل
شہابٌ خفی وقدہٗ　　　وعارض غیثٍ اُفل
شکت دولتی فقدَہ　　　وقد کان زین الدول

احمد بن طولون کی وفات سے قبل الموفق سے کسی قسم کا سمجھوتا نہیں ہو سکا تھا لیکن بکر نے[۱۱۹]

---

۱۱۵ ابن ایاس ج ۱۔ ص ۳۹ + الکندی ص ۲۳۲ +

۱۱۶ الکندی ص ۲۳۳ + ابن خلکان (ج ۱۔ ص ۵۵) نے ۱۱ر کے بجائے ۱۰ر ذوالقعدہ لکھا ہے۔ ابن خلدون (ج ۴ ص ۳۰۳) نے اس کا سنہ وفات ۲۷۶ھ لکھا ہے، مگر یہ یقیناً طباعت کی غلطی ہے۔ اسی طرح اس مورخ نے، ابن الاثیر (ج ۷۔ ص ۱۳۶) نے اور ان کے علاوہ ابوالفداء (ج ۱۔ ص ۵۳) نے اس کا زمانۂ ولایت چھبیس برس بیان کیا ہے۔ یہ صریحاً غلط ہے۔ کیوں کہ سب اس پر متفق ہیں کہ ۲۵۴ھ میں وہ مصر کا حاکم مقرر ہوا تھا، اور ۲۷۰ھ میں اس کا انتقال ہوا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ محمد کرد علی (خطط الشام ج ۱۔ ص ۲۰۳) نے بلا سوچے سمجھے اس غلط حساب کی پیروی کی ہے، اور اس کا زمانۂ ولایت چھبیس برس قرار دیا ہے۔

۱۱۷ طبری ج ۱۱۔ ص ۲۹۶ + الکندی ص ۲۲۹۔۲۳۲ + ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۳۶، ۱۳۷ + ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۴ + ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۴۶ +

۱۱۸ الکندی ص ۲۳۲ + مقریزی ج ۱۔ ص ۳۲۱ +

۱۱۹ بائی تراگ ص ۱۷۹، ۱۸۰ +

نویری کے حوالے سے لکھا ہے کہ الموفق نے نہایت ہوشیاری سے احمد بن طولون کے ساتھ خط و کتابت شروع کر دی تھی، مگر صلح کی تکمیل سے پہلے اُس کا انتقال ہو گیا۔ دونوں کو اپنی قوت کا پورا اندازہ تھا۔ احمد بن طولون کے لئے ممکن نہ تھا کہ الموفق کی فاتح فوج کا مقابلہ کر سکتا' اُدھر الموفق بھی جانتا تھا کہ احمد بن طولون سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے۔ دونوں نے اپنی حالت پر قانع رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دونوں لعنت بھیجنے کا عمل موقوف کر چکے تھے۔ اس لئے اگر احمد بن طولون کا انتقال نہ بھی ہوتا تو بھی یہ دونوں حریف میدان میں نہ اترتے' اور صلح و امن کا زمانہ شروع ہو جاتا۔ لیکن اگر لڑتے تو بھی نہ سیاسیات میں کوئی تبدیلی ہوتی اور نہ ایک دوسرے کے حلقۂ اثر میں۔ (باقی)



مسٹر کینس اور مالیات جنگ

از

جناب مولوی امتیاز حسین خاں صاحب۔ بی۔ کام (لندن)
شعبۂ معاشیات جامعہ عثمانیہ سرکار عالی۔

واٹرلو کی لڑائی کے متعلق کسی کا یہ کہنا کہ وہ ایٹن کے کھیل کود کے میدانوں میں جیتی گئی تھی۔ صحیح ہو یا غلط موجودہ زمانے کی جنگوں کے متعلق یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ لڑنے والے ملکوں کے کارخانوں، کھیتوں اور معملوں میں جیتی یا ہاری جاتی ہیں۔ ان کے مسائل اتنے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ جب تک ان کی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے بہترین دماغوں سے کام نہ لیا جائے حل کرنا دشوار اور مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر جنگ نہ ہوتی تو بھی دماغ انسانیت کی بہبودی اور بہتری کے لئے کچھ سوچ بچار کرتے۔ یہ مسئلہ کہ کسی ملک کی حکومت جنگ کے اخراجات کس طرح سے پورے کرے اگر فوجی حکمت عملی میں سب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تو بہت زیادہ اہم ضرور کہا جا سکتا ہے۔ آج تک کسی حکومت کو جنگ میں فتح محض اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ اس کی مالیاتی پالیسی درست اور بہتر تھی اور نہ ہی قوموں کی شکست کا باعث خراب اور غلط مالیاتی پالیسی ہوتی ہے۔ آج کل فتح اسی قوم کو ہوتی ہے جس کے ہاں زیادہ سے زیادہ معاشی وسائل موجود ہوں یا پھر کسی دوسری قوم سے معاشی وسائل حاصل کئے جا سکتے ہوں۔ جنگ میں فتح کا انحصار لڑنے والوں کی تعداد اور جنگی ساز و سامان کی بر وقت موجودگی پر ہوتا ہے۔ لیکن مالیات جنگ کی اہمیت کو بالکل فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ صحیح اور غلط مالیاتی پالیسی کے

اثرات معاشرہ کے لئے اچھے یا برے ہو سکتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ جنگ کے بعد کے مسائل کے حل کرنے میں آسانی یا دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پچھلی لڑائی میں شکست کی وجہ سے جرمن قوم کو اتنے نقصانات نہیں اٹھانے پڑے جتنے کے جنگ کے دوران اور بعد کی غلط مالیاتی پالیسی کے باعث۔

انگلستان کی حکومت نے موجودہ جنگ کے شروع کے دنوں میں پرانے طریقوں سے جنگ کے اخراجات پورا کرنے کی کوشش کی لیکن سال ڈیڑھ سال کے بعد ضرورت محسوس کی گئی کہ صرف پرانے طریقوں سے کام نہیں چل سکتا اور ضرور بعض جدید ذرائع کو اختیار کرنا پڑے گا۔ مارچ ۱۹۴۱ء کے بجٹ میں ان ذرائع پر عمل کیا گیا ہے جن کی بعض تفصیلات آگے چل کر بیان کی جائیں گی۔ حکومت کی جو پالیسی اس عرصہ میں رہی اس پر مختلف معاشین اور معاشی جرائد نے اعتراضات کئے اور مختلف قسم کے مشورے دئے۔ مسٹر کینس نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور حکومت اور عوام کے سامنے ایک نئی اسکیم پیش کی۔ اس مضمون کا مقصد ان کی اس اہم اسکیم کا خلاصہ بیان کرنا ہے۔

مسٹر کینس انگلستان کے معاشین کے حلقہ میں ایک خاص شخصیت رکھتے ہیں ان کی حیثیت نہ صرف معاشیات کے ایک اعلیٰ استاد اور مصنف کی ہے بلکہ وہ اپنے ملک کے عملی مسائل سے بھی بہت زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ حکومت بھی اکثر ان کے مفید مشوروں سے فائدہ اٹھاتی رہتی ہے۔ مسٹر کینس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ حالات کے ساتھ ساتھ اپنے خیالات میں بھی تبدیلی کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کبھی بھی خاموش نہیں بیٹھتے۔ انھوں نے لڑائی چھڑنے کے دوسرے ہی مہینے اپنی اسکیم کا اظہار ایک تقریر کی شکل میں مارشل سوسائٹی کے ممبران کے سامنے کیمرج میں کیا اور کچھ روز بعد اسی کو لندن ٹائمز میں دو قسطوں میں شائع کرایا۔ پہلے انھوں نے اپنی اسکیم کو لازمی نہیں کہا تھا بعد میں اس میں بہت سی ترمیمات کے ساتھ ایک مختصر سے رسالہ کی شکل میں شائع کیا اور نیا نام ملتوی ادائیگی[1] رکھا۔

---

[1] Deferred Pay

کینس کی اسکیم کا خلاصہ معلوم کرنے سے پہلے انگلستان کی قومی آمدنی اور حکومت کے مالیہ کے متعلق چند اعداد و شمار کا جاننا ضروری ہے۔ قومی آمدنی کی تعریف اور اس کے اندازے لگانے کے طریقے معاشین اور ماہرین اعداد و شمار نے مختلف بیان کئے ہیں۔ سیدھے سادھے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قومی آمدنی سے مراد حکومت کی آمدنی نہیں بلکہ قوم کی مجموعی آمدنی ہے۔ حکومت بھی اس میں سے ایک خاص حصہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے لیتی ہے قومی آمدنی کا اندازہ لگانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اندازہ لگانے میں اس کا امکان رہتا ہے کہ ایک ہی آمدنی ایک سے زیادہ مرتبہ شمار نہ کرلی جائے۔ اسی لئے اس کام کو انجام دینے میں بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ قومی آمدنی کا اندازہ اگر حکومت کی طرف سے کیا جائے تو بہت زیادہ مناسب ہے۔ لیکن بد قسمتی سے انگلستان کی حکومت کے شعبۂ اعداد و شمار کی طرف سے جنگ سے پہلے ایسا نہیں کیا گیا۔ جنگ کے حالات نے حکومت کو مجبور کیا اور ایک نیا مرکزی شعبہ اعداد و شمار قائم کیا گیا ہے۔ جس کی طرف سے مارچ سنہ ۱۹۴۱ء میں ایک مفید کتاب شائع کی گئی ہے۔ اس میں انگلستان کی جو قومی آمدنی سنہ ۱۹۴۰ء اور سنہ ۱۹۳۸ء میں تھی اس کا اندازہ لگا کر ایک دوسرے سے مقابلہ کیا ہے۔ شعبۂ اعداد و شمار نے بتلایا ہے کہ سنہ ۱۹۳۸ء میں انگلستان کی قومی آمدنی ۴۶۱۵ ملین پونڈ تھی اور سنہ ۱۹۴۰ء میں ۵۵۸۶ ملین پونڈ

اس کتاب کے شائع ہونے کی وجہ سے بہت سے معاشی مسائل حل کرنے اور دلائل دینے میں معاشین کو بہت کافی مدد ملے گی۔ لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا اس سے پہلے حکومت کی طرف سے کسی قسم کی معلومات مہیا نہیں کی جاتی تھیں۔ اس لئے معاشین مسٹر کولن کلرک (سابق لکچرار شعبہ معاشیات جامعہ کیمبرج) نے جو انفرادی طور پر انگلستان کی قومی آمدنی کا اندازہ اپنی کتاب[1] میں کیا ہے اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ جنگ کے اخراجات کے متعلق جو کچھ

---

[1] National Income and outlay

مباحث جنگ کے شروع کے دنوں میں ہوئے ہیں ان میں کلارک کے تخمینہ نے دوسرے ماہرین کے اندازوں کی بنیاد کا کام دیا ہے۔ مختلف ماہرین معاشیات کے اندازے مختلف ہیں۔ کروتھر[1] کا خیال ہے کہ لڑائی شروع ہونے کے وقت سالانہ آمدنی ۶۰۰۰ ملین پونڈ تھی ہارسفیلڈ کا ۵۳۰۰ ملین پونڈ اندازہ ہے۔ لیکن چونکہ ہمیں مسٹر کینس کی اسکیم سے غرض ہے اس لئے انھیں کے دئے ہوئے اعدادشمار کا خیال رکھنا چاہیئے۔ ان کے اندازے کے مطابق سالانہ آمدنی ۴۸۰۰ ملین پونڈ تھی۔

سب معاشیین اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ لڑائی کے دوران میں قومی آمدنی ضرور بڑھ جائے گی۔ گو جنگ نے بہت سے ایسے اسباب پیدا کردئے ہیں جو قومی آمدنی میں کمی کا باعث ہونگے۔ بہت سے لوگ فوجوں میں بھرتی کرلئے گئے ہیں اور ان کی جگہ کارخانوں اور پیدائش دولت کے دوسرے شعبوں میں ایسے لوگوں نے لی ہے جو یا تو نوسکھ ہیں یا خاص مستعدی اور ہوشیاری سے کام نہیں کرسکتے۔ خام اشیاء اور جہازوں کی کمی کی وجہ سے بھی دولت کی پیدائش میں کمی ہوگی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جنگ نے بہت سے ایسے حالات بھی پیدا کردئے ہیں جو قومی آمدنی میں اضافہ کریں گے۔ بہت سے عاملین پیدائش جو جنگ شروع ہونے سے پہلے بیکار تھے اب پیدائش دولت کے مختلف طریقوں میں ان سے کام لیا جارہا ہے۔ جنگ چھڑنے سے پہلے کوئی ۲۰ لاکھ مزدور انگلستان میں بیکار تھے اب وہ تقریباً سب کے سب کام سے لگ گئے ہیں اور ایک حد تک کامل روزگاری پائی جاتی ہے بہت سے ایسے لوگ جو پہلے کچھ کام نہیں کرتے تھے اب ان سے ممکن کام لیا جارہا ہے۔ کارخانے دن رات چل رہے ہیں۔ اسی طرح کے اور دوسرے اسباب ہیں جن کی وجہ سے انگلستان کی قومی آمدنی میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بحیثیت مجموعی قومی آمدنی بڑھ جائے گی۔ کینس کا خیال ہے کہ قومی آمدنی کا پندرہ یا بیس فیصد اضافہ ہوگا۔ اگر ان دونوں کا اوسط لیا جائے تو ½ ۱۷ فیصد ہوتا ہے یعنی تقریباً ۸۲۵ ملین

---

[1] Mr. Crowthers

پونڈ کے برابر قومی آمدنی بڑھ جائے گی۔

جس طرح سے ہم نے انگلستان کی قومی آمدنی کے اندازہ کو معلوم کیا اسی طرح سے ہمیں وہاں کی حکومت کے سالانہ اخراجات یا مالیہ اور جو اضافہ جنگ کی وجہ سے اس میں ہوا ہے کے متعلق بھی چند اعداد شمار کو جاننا چاہیئے تب ہی ہم مالیات جنگ کے مسئلہ اور مسٹر کینس کی اسکیم کو سمجھ سکیں گے۔ ۱۹۳۸-۳۹ء کا مالیہ ۱۰۵۰ ملین پونڈ تھا۔ یہ تو امن کے زمانہ کا بجٹ ہے۔ جنگ کی وجہ سے اخراجات میں جو اضافہ ہوگا اس کے متعلق معاشین میں پھر اختلاف پایا جاتا ہے اور اس اختلاف کی محض وجہ یہ ہے کہ جنگ کے اخراجات کا صحیح صحیح اندازہ لگانا تقریباً ناممکن ہے۔ مسٹر کروتھر[1] اور بعض دوسروں کے خیال میں جنگ کے سالانہ اخراجات جبکہ یہ جنگ اپنی پوری شدت کو پہونچ جائے ۱۰۰۰ ملین پونڈ سے کم نہیں ہونگے۔ وہ اپنی دلیل اس طرح سے دیتے ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں یعنی جنگ عظیم کے آخری سال میں حکومت برطانیہ نے جنگ پر ۲۷۰۰ ملین پونڈ خرچ کیا تھا اور اس وقت انگلستان کی قومی آمدنی ۵۵۰۰ ملین پونڈ تھی اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قومی آمدنی کا آدھا حصہ جنگی ضروریات پر خرچ کیا گیا اور آدھا حصہ قوم نے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے صرف کیا۔ اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ موجودہ جنگ پچھلی جنگ سے ہر حیثیت سے انسانیت کے لئے بہت زیادہ مہنگی ثابت ہوگی۔ پچھلے بیس پچیس سال کے عرصہ میں حکومت کے اخراجات رفاہ عامہ اور معاشرتی بہبودی کے کاموں پر خرچ کرنے کی وجہ سے ویسے ہی بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں پھر جنگ عظیم کے زمانہ کے قومی قرضہ پر سود کی ادائیگی ایک اور بھاری مد حکومت کے مالیہ میں شامل ہے۔ اگر وتھر یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ حکومت کو قومی آمدنی کا آدھے سے زیادہ حصہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے لینا پڑے گا تب ہی جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے کچھ امکانات پیدا ہوں گے۔

---

[1] Mr. Crowther

دوسرے معاشیین کے انداز سے مختلف ہیں۔ ان تمام اندازوں میں مسٹر کینس کا اندازہ بہت زیادہ واجبی ہے، وہ کہتے ہیں کہ سالانہ اخراجات ۲۸۵۰ ملین پونڈ ہوں گے۔ حکومت برطانیہ کے سامنے جو مسئلہ پیش ہے وہ یہ کہ لڑائی سے پہلے حکومت ۴۸۰۰ ملین پونڈ میں سے تقریباً ۱۲۰۰ ملین پونڈ اپنی ضروریات کے لئے لیتی تھی یعنی قومی آمدنی کی ایک چوتھائی مقدار حکومت کے حصہ میں جاتی تھی۔ اب لڑائی کی وجہ سے حکومت کو قومی آمدنی کا آدھا یا آدھے سے کچھ زیادہ حصہ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے لینا پڑے گا۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ حکومت کس طرح سے ایسا کر سکتی ہے اس کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ عام لوگ اپنے اخراجات کم کر دیں یعنی اپنی ضروریات کی تکمیل اتنی فراخدلی کے ساتھ نہ کریں جتنی کہ وہ امن کے زمانے میں کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اپنے خرچ کو کم کرنے کا مطلب یہ ہوگا عوام اتنے آرام و آسائش کی زندگی بسر نہیں کر سکیں گے اور انھیں بڑی حد تک قربانی سے کام لینا پڑے گا لیکن کوئی جنگ بھی بغیر قربانیوں کے چاہے ان کی نوعیت جانی ہو یا مالی، نہیں جیتی جا سکتی۔ ہر مالیات جنگ کی پالیسی میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ عوام کی قوت خرید کم ہو جائے اور یہ قوت خرید حکومت کی طرف منتقل ہو جائے تاکہ اس کی مدد سے حکومت جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اپنی ضروریات کی اشیاء اور خدمات بازار میں خرید سکے۔ ہر ایسی اسکیم جس میں یہ کوشش نہ کی گئی ہو اور ایسے ذرائع اختیار نہ کئے گئے ہوں جو عام لوگوں کے صرف کو کم کراتے ہوں کبھی بھی مالیات جنگ کی کامیاب پالیسی نہیں کہی جا سکتی۔

امن اور جنگ کے زمانہ میں فرق یہ ہے کہ امن کے دنوں میں لوگ جتنی زیادہ محنت کریں اور معاشی وسائل سے کام لیں گے قومی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ جس کی وجہ سے عوام زیادہ خوشحالی کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس کے برخلاف جنگ کے زمانہ میں جیسا کہ مسٹر کینس نے کہا ہے کیک کی مقدار معین ہوتی ہے۔ جتنا ہی زیادہ لوگ کام کریں گے وہ اچھی طرح اور مستعدی سے اپنے دشمن کا مقابلہ کر سکیں گے لیکن انھیں اپنے صرف کو بڑھانا نہ چاہئے۔ جنگ کی وجہ سے قومی

آمدنی میں جو کچھ اضافہ ہوا ہے اس کو تو کسی طرح سے بھی عام لوگوں کو اپنے صرف میں نہیں لانا چاہیئے۔ اگر ہو سکے تو اپنے معمولی خرچ میں اور کمی کرنی چاہیئے۔

لوگوں کی قوت خرید اور صرف کو کم کرنے کے مختلف طریقے اختیار کیئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان کے اثرات جماعت کے مختلف طبقات پر مختلف ہوتے ہیں۔ بعض طریقے ایسے ہیں جن میں غریبوں کو زیادہ قربانیاں کرنی پڑتی ہیں اور اگر دوسرے طریقے اختیار کیئے جائیں تو ان کی قربانیوں کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ مالیات جنگ کی کامیاب پالیسی وہی کہی جا سکتی ہے جس کی وجہ سے جنگ کا بار مختلف طبقات پر ان کی استعداد کے لحاظ سے پڑے [redacted] طبقہ چاہے امیروں کا یا غریبوں کا اس کے بھاری بوجھ سے دب نہ جائے۔ عام طور پر جنگ کی ضروریات پوری کرنے کے لئے تین طریقے اختیار کیئے جاتے ہیں۔

(۱) محاصل کے ذریعے سے۔ اگر حکومت چاہے تو مختلف قسم کے محاصل میں اس قدر اضافہ کر سکتی ہے اور نئے نئے محاصل عائد کر سکتی ہے کہ اس کی ضروریات پوری ہو جائیں اور قومی آمدنی کا باقی حصہ عام لوگوں کے صرف کے لئے چھوڑ دے لیکن ایسا کرنے میں بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ محاصل میں بہت زیادہ اضافہ کا اثر پیدائش دولت کے طریقوں پر برا ہوگا۔ اسی لئے کوئی حکومت تمام جنگی ضروریات صرف محاصل سے پورا کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔

(۲) قرضوں کے ذریعہ سے۔ یہ قرضے مختلف قسم کے ہو سکتے ہیں۔ کم مدت کے لئے قرضے لئے جا سکتے ہیں اور زیادہ مدت کے لئے بھی۔ قرضے حاصل کرنے اور محاصل لگانے کے فوری معاشی اثرات ایک ہی ہوتے ہیں یعنی عام لوگوں کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے اور اس طرح سے حکومت کو اشیاء اور خدمات بازار میں مل جاتی ہیں لیکن ان دونوں کے نفسیاتی اثرات یکساں نہیں ہوتے۔ عام طور پر قرضے دینا لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور اس لئے قرضے دینا لوگوں کو زیادہ کھلتا نہیں، وہ جانتے ہیں کہ اگر وہ اب خرچ نہیں کر سکتے تو آیندہ انہیں تھوڑی بہت آمدنی ہو جائے گی اور ان کا روپیہ ایک خاص مدت کے بعد واپس مل جائے گا۔

ایک دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ حکومت کو جنگ کے دوران اور جنگ کے بعد حاصل شدہ قرضوں پر سود دینا پڑتا ہے جس کی وجہ سے مالیات عامہ میں نئے نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ قرضے دینے والے عموماً امیر لوگ ہوتے ہیں۔ اگر قرضوں کی مدد سے زیادہ اخراجات پورے کئے گئے اور محصول بلا واسطہ میں اضافہ نہ کیا گیا تو اس کا اثر غریب طبقے پر بُرا پڑے گا اور انھیں زیادہ قربانیاں کرنی پڑیں گی۔

(۳) افراط زر۔ افراط زر سے مراد یہ ہے کہ زر کی مقدار میں مختلف طریقوں سے اضافہ کیا جاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زر کی قوت خرید گھٹ جاتی ہے یا قیمتیں بڑھ جاتی ہیں لوگ خرچ اتنا ہی کرتے ہیں یا اس سے کچھ زیادہ جتنا کہ وہ پہلے کر رہے تھے لیکن بازار میں اشیا، اور خدمات کی قیمتیں بڑھنے کی وجہ سے ان کی کم مقداریں خرید سکتے ہیں اور اس طرح سے اشیا، اور خدمات کی جو چیزیں بچ جاتی ہیں انھیں حکومت جنگی ضروریات پوری کرنے کے لئے اپنی طرف منتقل کر سکتی ہے۔

تمام معاشیین کا اسی پر اتفاق ہے کہ محاصل میں اضافہ کرنے سے جنگ کے اخراجات پورے نہیں کئے جا سکتے اور نہ ہی ارادی بچتوں کی رقم اس مقصد کے لئے کافی ہوگی۔ اس لئے افراط زر کی پالیسی پر تھوڑا بہت عمل کرنا پڑے گا یعنی اشیا، اور خدمات کی قیمتوں کو قابو میں رکھنے کے ساتھ ساتھ ان میں تھوڑا بہت اضافہ ہونے دیا جائے۔ کروتھر[ا] کا خیال ہے کہ حکومت برطانیہ کو سب سے پہلے محاصل کے حربہ کو استعمال کرنا چاہیئے اور مختلف قسم کے محاصل میں جتنا بھی ہو سکے اضافہ کر دینا چاہیئے۔ جنگ کے زمانہ میں محاصل لگانے میں ان اصولوں کا زیادہ خیال نہیں کیا جاتا جن کا امن کے زمانہ میں کیا جاتا ہے ایک حد تک بہت سے محاصل میں اضافہ کر دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ وہ مشورہ دیتے ہیں کہ ۲۰۰۰ پونڈ سے زیادہ آمدنی حکومت کو سر محصول کے ذریعہ سے لے لینی

ا۔ Crowthers

چاہیئے۔ انکم ٹکس کی شرح دس شلنگ فی پونڈ کر دینی چاہیئے۔ اور پانچ فی صد محصول عام اشیاء کی فروخت پر لگانا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت یہ بھی کوشش کرے کہ جہاں تک ہوسکے لوگ اپنی آمدنی کا زیادہ حصہ اپنی ضروریات پر خرچ نہ کرسکیں اور اس طرح سے جو کچھ بچائیں وہ حکومت کو قرض دیں۔ ایسا کرنے میں کامیابی اسی وقت حاصل کی جاسکے گی جب کہ رسد بندی کے طریقے کو عام طور پر اختیار کیا جائے اور اس پر عمل سختی سے ہو۔ قرضے حاصل کرنے میں ایک بڑا ڈر یہ لگا رہتا ہے کہ کہیں اس کی وجہ سے افراط زر کے اثرات پیدا نہ ہوجائیں۔ ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب کہ لوگ حقیقی معنوں میں بچا نہیں رہے ہوں بلکہ بنکوں کی تخلیق اعتبار کی پالیسی سے فائدہ اٹھا رہے ہوں۔

کراتھر[1] کا اپنا خیال ہے کہ ان دونوں ذریعوں کو اختیار کرنے کے باوجود حکومت کو اتنی آمدنی نہیں ہوسکے گی کہ وہ اپنے تمام اخراجات پورے کرسکے اور لازماً افراط زر کی پالیسی پر تھوڑا بہت عمل ضرور کرنا پڑے گا۔ مسٹر کینس اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کی بھی یہی رائے ہے کہ پہلے دو طریقوں سے اخراجات پورے نہیں کئے جاسکتے لیکن وہ افراط زر کی پالیسی اختیار کرنے کے سخت مخالف ہیں۔ معاشیات کے طالب علم جانتے ہیں کہ افراط زر کے بہت سے برے معاشی، معاشرتی اور سیاسی اثرات معاشرہ کے مختلف طبقات کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ جن کا تجربہ پہلی جنگ کے دوران اور خاص طور پر اس کے بعد بعض ممالک کو حاصل ہوا۔ اس لئے افراط زر کی پالیسی حکومت کو اختیار نہ کرنی چاہیئے۔

مسٹر کینس کی اسکیم کو سمجھنے کے لئے ان کے دئیے ہوئے چند اعداد وشمار کو پھر دھرانا پڑے گا۔ اوپر یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ ان کے اندازے کے مطابق انگلستان کی ۳۹-۱۹۳۸ء میں قومی آمدنی ۴۸۰۰ ملین پونڈ تھی۔ جنگ کی وجہ سے حکومت کے اخراجات میں اضافہ ۱۸۵۰ ملین پونڈ ہوگا

---

[1] Crowther

دو مدیں ایسی ہیں جن سے حکومت ۵۰۰ ملین پونڈ حاصل کر سکتی ہے۔ اشیائے پیدائش کے مطالبات زسودگی کی حد سے ۱۵۰ ملین پونڈ حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ ہر سال تقریباً ۴۰۰ ملین پونڈ اس مد پر خرچ کئے جاتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ تمام رقم حکومت نہیں لے سکتی۔ حکومت کا اپنا مفاد اس میں ہے کہ ایک خاص رقم اشیائے پیدائش کو قائم رکھنے کے لئے خرچ کی جائے تاکہ اس کی ضروریات کی چیزیں آسانی سے تیار ہوتی رہیں۔ البتہ اس مد کا ایک خاص حصہ بغیر کسی قسم کی خرابی پیدا کئے ہوئے لیا جا سکتا ہے۔ اس کا اندازہ کینس نے ۱۵۰ ملین پونڈ لگایا ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسری مد بھی ہے جس سے ۳۵۰ ملین پونڈ سالانہ حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ انگلستان کے لوگوں اور اداروں نے تقریباً ۴۰۰۰ ملین پونڈ کے برابر اپنا سرمایہ دوسرے ملکوں میں لگا رکھا ہے۔ ان اثاثوں کو بیچ کر اور سونے کے ذخیرہ کو فروخت کر کے ۳۵۰ ملین پونڈ سالانہ حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کو جلد از جلد استعمال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ حکومت برطانیہ کے ساکھ کی ایک اہم وجہ یہی مد ہے۔

اس طرح سے حکومت کو ۵۰۰ ملین پونڈ مل جاتے ہیں لیکن پھر بھی اخراجات پورے کرنے کے لئے اسے ۱۳۵۰ ملین پونڈ کی اور ضرورت ہوگی اور اس مقصد کے لئے حکومت کو محاصل میں اضافہ کرنا پڑے گا اور ایسی تدبیر اختیار کرنی پڑیں گی کہ عوام زیادہ بچائیں اور حکومت کو قرض دیں۔ انگلستان میں امن کے دنوں میں تقریباً ۴۰۰ ملین پونڈ ہر سال لوگ ارادی طور پر بچتیں کرتے تھے۔ اگر یہ تمام کی تمام رقم حکومت کو مل جائے تب ۹۵۰ ملین پونڈ کی اور ضرورت پڑے گی۔ اس میں ۱۰۰ ملین پونڈ کینس کی اسکیم پر عمل کرنے کی وجہ سے حکومت کو خرچ کرنا پڑیں گے اس طرح سے ۱۰۵۰ ملین پونڈ کی کمی رہ جاتی ہے۔

آگے چل کر وہ اپنے رسالے میں بتلاتے ہیں کہ اگر حکومت موجودہ محاصل میں زیادہ سے زیادہ اضافہ بھی کر دے اور ارادی بچتوں سے بھی اسے زیادہ سے زیادہ رقم ملے تب حکومت ۵۰۰ ملین پونڈ اور حاصل کر سکتی ہے۔ پھر بھی تقریباً ۶۰۰ ملین پونڈ کی کمی حکومت کے اخراجات میں رہ جاتی

ہے۔ اسی کمی کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ حکومت پانچ پونڈ سالانہ سے زیادہ آمدنی پانے والوں سے زائد رقم پوری کی پوری ٹکس کے طور پر وصول کرے۔ اگر اس ذریعہ کو اختیار بھی کیا جائے تب بھی اخراجات پورے نہیں کئے جا سکتے اور دوسرے یہ کہ اس کے معاشی اثرات بہت زیادہ خراب ہوں گے۔ اس کے علاوہ ایک اہم خرابی اس ذریعہ میں یہ بھی ہے کہ ۵۰۰ پونڈ سالانہ سے کم آمدنی پانے والی جماعت کے اراکین جنگ کے بار سے بچ جائیں گے۔ اس لئے کوئی ایسا ذریعہ جنگ کے اخراجات پورا کرنے کے لئے اختیار کرنا چاہیے جس کی وجہ سے پانچ سو پونڈ سے کم آمدنی پانے والے لوگ بھی جنگ کا بار اٹھانے میں شریک ہو سکیں اور وہ لوگ بھی جن کی آمدنی پانچ پونڈ فی ہفتہ سے کم ہے اور جن کی آمدنی میں جنگ کی وجہ سے تقریباً ۱۵ فیصد اضافہ ہوا ہے۔

پانچ سو پونڈ سالانہ سے کم آمدنی رکھنے والے اور پانچ پونڈ فی ہفتہ والے گروہ سے اگر بلاواسطہ محصول لگا کر جنگ کا بار اٹھانے میں شریک کیا گیا تو ان کو سخت قسم کی قربانیاں کرنی پڑیں گی۔ اسی لئے مسٹر کینس کا کہنا ہے کہ اگر ان کی اسکیم پر عمل کیا گیا تو یہ لوگ جنگ کا بار اٹھانے میں شریک بھی ہو سکیں گے اور انھیں بہت زیادہ قربانیوں سے بھی کام نہیں لینا پڑے گا۔ کینس کی رائے میں لوگوں کو قانوناً مجبور کرنا چاہیئے کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک خاص حصہ بچائیں اور حکومت کو قرض دیں۔ لازمی بچت قرضہ کے طریقے اور محاصل کے طریقے کے بین بین ہے۔ اور اس میں دونوں کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ کینس اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ جو کچھ تفصیلات انھوں نے اپنی اسکیم میں بیان کی ہیں ضروری نہیں کہ دوسرے معاشین اور ماہرین اعداد و شمار ان سب سے اتفاق کریں۔ اگر لازمی بچتوں کا اصول مان لیا جائے تو اس کے متعلق تفصیلات بعد میں طے ہو سکتی ہیں۔

کینس کا اپنا مشورہ یہ ہے کہ ایسے غیر شادی شدہ اشخاص کو جن کی آمدنی پچیس شلنگ یا اس سے کم ہے بچانے کے لئے مجبور نہ کیا جائے۔ شادی شدہ لوگوں کے لئے وہ ۴۵ شلنگ مقرر کرتے ہیں۔ ان حدوں سے زیادہ آمدنی پانے والے لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی زائد آمدنی کا ایک خاص فی صد حکومت کو بطور ملتوی ادائیگی دیں۔ جیسے جیسے کسی شخص کی آمدنی میں اضافہ

ہوتا جائے گا یہ فیصد بھی بڑھتا جائے گا مثلاً ایک ایسا شادی شدہ شخص جس کے اولاد نہیں ہے اور اس کی آمدنی ۵۰ شلنگ فی ہفتہ ہے اسے ۳½ فیصد دینا پڑے گا اور اس کی آمدنی پانچ پونڈ فی ہفتہ ہے تو پھر اسے ۱۹¼ فیصد ادا کرنا پڑے گا۔ کینس کا کہنا ہے کہ اگر حکومت نے ان کی اسکیم اور تفصیلات پر عمل کیا تو حکومت کو تقریباً ۴۰۰ ملین پونڈ سالانہ مل سکیں گے اور وہ کمی جو انھوں نے بتلائی ہے اس نئے طریقہ کے اختیار کرنے سے پوری ہو جائے گی۔

ایک اہم سوال اسکیم کی تفصیلات کے سلسلہ میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس رقم کو لوگ کس ادارے میں امانتاً رکھیں گے۔ پہلے ان کا خیال تھا کہ اگر یہ رقم ڈاک خانہ کے سیونگ بنک میں رکھی جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ مزدور طبقہ نے ان کے اس خیال کو شک کی نظر سے دیکھا تھا۔ ان کو ڈر تھا کہ ان کی رقم سرمایہ دارانہ حکومت کے قبضہ میں رہے گی۔ اس لئے کینس نے اپنی رائے میں تبدیلی کر دی ہے اور اب وہ ہر شخص کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ جس قسم کے ادارے میں چاہے اپنی رقم امانتاً رکھ سکتا ہے۔ مزدور جماعت کے اراکین اپنی سبھاؤں میں رقم جمع کر سکتے ہیں یا پھر امدادی انجمنیں میں۔ اس طرح سے مزدور طبقہ کے مختلف ادارے بھی اسکیم میں دلچسپی لیں گے اور اپنے اراکین کے وسائل کو جمع رکھیں گے۔

ایک خوبی اسکیم کی یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ سے معاشرتی بہبودی اور انصاف بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بہت دنوں سے انگلستان میں اس بات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ خاندانی بھتہ کے طریقہ کو اختیار کیا جائے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کم آمدنی رکھنے والے خاندانوں کو بچوں کی تعداد کے لحاظ سے حکومت کی طرف سے کچھ بھتہ ملنا چاہیئے تاکہ ان کی مصیبتوں میں کمی ہو اور بچوں کو غذا وغیرہ اچھی مل سکے۔ اسی قسم کا مطالبہ مختلف اشخاص نے کیا ہے۔ جس میں مسٹر ایمری موجودہ وزیر ہند کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس طریقہ کو اختیار کرنے کی وجہ سے غریب خاندانوں کو بہت زیادہ فائدہ پہونچے گا۔ جنگ کی وجہ سے قیمتیں باوجود تمام تدابیر اختیار کرنے کے بڑھ رہی ہیں۔ اور اس کا بُرا اثر ایسے غریب خاندانوں پر پڑ رہا ہے جن میں بچوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ضروریات زندگی کی

چیزوں کی قیمتیں بڑھنے کی وجہ سے یہ خاندان بہت زیادہ غربت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے موقعہ پر جب کہ قوم موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہے اس قسم کی مہنگی معاشرتی پالیسی اختیار کرنا کچھ زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ حکومت کو چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ وسائل دشمن کو شکست دینے کے لئے استعمال کرے۔ لیکن حقیقت میں اس قسم کی اصلاح کا موزوں ترین وقت یہی ہے جبکہ غریب خاندان مصیبت کے دن گزار رہے ہیں۔ ہر ایسے بچے کو جس کی عمر پندرہ سال سے کم ہو پانچ شلنگ فی ہفتہ ملنا چاہیئے۔ ان کا اندازہ ہے کہ بھتوں پر حکومت کے اخراجات تقریباً ۱۰۰ ملین پونڈ سالانہ ہوں گے۔

صرف ملتوی ادائیگی اور خاندانی بھتہ کا طریقہ اختیار کرنے سے مسئلہ پوری طرح سے حل نہیں ہو جاتا۔ بہت سے ایسے خاندان ہیں جن کی آمدنیاں کم ہیں اور جنگ کی وجہ سے کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا ہے۔ اگر تھوڑا بہت اضافہ ہوا بھی ہے تو وہ قیمتوں میں اضافہ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس کے علاوہ مزدور طبقے کے رہنماؤں کی طرف سے برابر یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ قیمتوں کو بڑھنے سے روکا جائے تاکہ غریب لوگ جنگ کی وجہ سے بہت زیادہ متاثر نہ ہوں کینس کی اسکیم کو مزدور سبھاؤں کے لیڈر شک کی نظر سے دیکھتے تھے اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ اگر اس اسکیم پر عمل بھی کیا گیا تب بھی قیمتیں بڑھیں گی اور ان کے اراکین کا معیار پست سے پست تر ہو جائے گا۔ اس شک کو دور کیا جا سکتا ہے اگر حکومت رسد بندی کے طریقہ پر سختی سے عمل کرے اور ضروریات زندگی کی چیزوں کی قیمتوں کو زیادہ نہ بڑھنے دے۔ کینس کی رائے میں تو حکومت کو ایسی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے کہ سب لوگ ضروری اشیاء صرف کی خاص مقداریں کم اور مقررہ قیمت پر خرید سکیں۔ اگر مصارف پیدائش بڑھنے کی وجہ سے حکومت کو تاجروں کی کچھ تھوڑی بہت مدد بھی کرنی پڑے تو ہرج نہیں۔ اس قسم کی کوشش انگلستان میں برابر کی جا رہی ہے اور اس کی وجہ سے مالیہ پر خاصہ بار پڑ رہا ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ حکومت بالکل وعدہ تو نہ کرے کہ قیمتوں میں اضافہ کسی قسم کا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر کسی وجہ سے قیمتوں میں اضافہ کرنا ہی پڑے تو ہم مزدور سبھاؤں کو بھی

اجرتیں بڑھانے کا مطالبہ کرنے کی اجازت ملنی چاہیئے۔ اسی قسم کی رسد بندی کی حمایت بعض دوسرے معاشین نے بھی کی ہے جن میں سالٹر[1] اور ہکس کے نام خاص طور پر لئے جاسکتے ہیں۔ لازمی قرض دینے والوں کے لئے کچھ اور آسانیاں بھی پیدا کردی گئی ہیں۔ جب تک لڑائی کا سلسلہ جاری رہے گا قرض دینے والے اس رقم کو جو انھوں نے امانتاً کسی ادارے میں رکھوادی ہے خرچ نہیں کرسکیں گے اور حکومت اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے ان رقموں کو استعمال میں لائے گی۔ اور ان پر ۲½ فیصد سود مرکب ملتا رہے گا۔ لیکن بعض خاص خاص حالات میں قرض دینے والے اس رقم کو اپنی ذاتی ضروریات پوری کرنے کے لئے واپس لے سکیں گے۔ اگر کسی شخص کو زندگی کے بیمہ کی قسط یا امدادی انجمن کی قسط ادا کرنی ہو تو اس رقم کا ایک حصہ استعمال کیا جا سکے گا۔ یا پھر قسطوں پر جو مال خرید اگیا ہے اس کی ادائیگی کے لئے بھی اس طرح سے اگر کوئی شخص زندگی کا نیا بیما کرانا چاہتا ہے تب بھی یہ رقم واپس مل سکے گی۔ بیماری، بے روزگاری یا خاص خاص خاندانی اخراجات کے لئے بھی بشرطیکہ امدادی انجمن سفارش کرے یہ رقم نکالی جاسکتی ہے۔ ان خاص حالات کے علاوہ یہ رقم جنگ کے دوران میں نکالی نہیں جاسکتی۔ البتہ لڑائی ختم ہونے کے بعد حکومت طے کرے گی کہ کب اور کتنی کتنی قسطوں کی صورت میں اس کی واپسی کی جائے۔

اسکیم کی ایک دوسری خوبی یہ بیان کی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ سے جنگ کے بعد کی کساد بازاری کے مسائل کو حل کرنے میں کافی مدد ملے گی۔ جنگ کے دوران میں اس بات کی ضرورت سختی سے محسوس کی جاتی ہے کہ قوت خرید عام لوگوں سے منتقل ہو کر حکومت کو مل جائے اور لوگ اپنی ذاتی ضروریات پر کم خرچ کریں۔ جنگ کے دنوں میں اشیاء اور خدمات کی طلب ان کی رسد سے بڑھ جاتی ہے اور اسی لئے عام لوگوں کی طلب کو مختلف طریقوں سے روکا جاتا ہے۔ جنگ کے ختم پر حالات بدل جاتے ہیں۔ رسد طلب سے بڑھ جاتی ہے۔ اشیاء اور خدمات موجود ہوتی ہیں یا پھر تیار کی جاسکتی ہیں۔ لیکن قوت خرید کی کمی کی وجہ سے وہ فروخت نہیں کی جاسکتیں۔

---

[1] Saltor

ممالک کو کساد بازی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور معاشرہ ہی تفریط زر کے اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ تفریط زر کے اثرات بھی افراط زر کی طرح جماعت کے لئے مضر ثابت ہوتے ہیں۔ کساد بازاری کو اسی وقت قابو میں کیا جاسکتا ہے جبکہ صارفوں کی طلب کو بڑھایا جائے۔ جو کچھ لوگوں نے مجبوراً جنگ کے دوران میں بچایا تھا اگر اس کو حکومت واپس کرنا شروع کردے تو صارفوں کی طلب خودبخود بڑھ جائے گی۔ اگر حکومت نے اس اسکیم پر عمل نہیں کیا تو اس صورت میں کساد بازاری کا مشاہدہ کرنے سے حکومت کو بیکاری کے بھتّوں اور رفاہ عام کے کاموں کے لئے قرضے لینے پڑیں گے۔

قومی قرضہ کے اس خاص حصہ کی ادائیگی کے لئے کینس حکومت کو مشورہ دیتے ہیں کہ جنگ کے بعد حکومت سرمایہ باج[1] لگانے کا وعدہ کرے۔ پچھلی جنگ کے بعد اس مسئلہ پر کہ سرمایہ باج کے ذریعہ کو استعمال کرکے قومی قرضہ کے بوجھ کو کم کیا جائے بہت زیادہ بحث ہوئی اور اکثر معاشین مثلاً پروفیسر پیگو اور ڈاکٹر ڈالٹن وغیرہ اس کی حمایت میں تھے لیکن حکومت اس پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئی۔ موجودہ جنگ کے بعد سرمایہ باج کے ذریعہ کو استعمال کرکے ملتوی ادائیگی کی واپسی ہونی چاہیے۔ سرمایہ باج لگانے کے لئے حکومت کو جنگ کے بعد کی کساد بازاری کا انتظار نہ کرنا چاہیے بلکہ جنگ کے فوراً بعد اس پر عمل شروع ہو جائے اور قسطوں کی شکل میں اس کو وصول کرنا چاہیے۔ اگر کساد بازاری (جبکہ ملتوی ادائیگی کا وقت آئے گا) کا انتظار کیا گیا تو پالیسی غلط ثابت ہوگی۔ قسطوں کی شکل میں سرمایہ باج وصول کرنے کی وجہ سے بہت سے انتظامی تجربات حاصل ہوں گے۔ اس طرح سے سرمایہ پر مستقل ٹکس لگانے کے راستے پیدا ہو جائیں گے اور مالیات عامہ میں آمدنی کی ایک مفید مد کا اضافہ ہو جائے گا۔

مزدور جماعت کی طرف سے اکثر یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ جنگ کے دوران میں اس کی اخراجات پورے کرنے کے لئے سرمایہ پر مستقل ٹکس لگانا چاہیے۔ کینس اس سے اتفاق نہیں کرتے

---

[1] Capital Levy

ان کے خیال میں ایسا کرنے میں اول تو بہت سی انتظامی دقتیں پیدا ہونگیں اس کے علاوہ سرمایہ پر ٹکس لگانے سے مالیات جنگ کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔ اگر سرمایہ باج کی مقدار کافی ہے تو اس صورت میں سرمایہ کے مالک اپنے ذاتی خرچ میں کسی طرح سے کمی نہیں کریں گے بلکہ وہ ٹکس کی ادائیگی مختلف قسم کے اثاثوں کے ذریعہ سے کریں گے اور مالیات جنگ کی پالیسی کا مرکزی مقصد کہ عام لوگوں کے صرف کو کم کیا جائے، حاصل نہیں ہوگا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مسٹر کینس کی نئی اسکیم کا خیر مقدم انگلستان کے عوام جن کے فائدہ کے لئے اصل میں یہ اسکیم پیش کی گئی تھی اور معاشیین کے حلقہ میں کیسا ہوا۔ شروع میں جس کام اور جن تفصیلات کے ساتھ اسکیم بیان کی گئی تھی مزدور جماعت کو کچھ زیادہ نہیں بھائی۔ اتنا ضرور ہوا کہ مزدور سبھاؤں کے بعض رہنماؤں نے ان سے ملاقات کی اور اسکیم کو سمجھنے اور جو کچھ شکوک تھے ان کو دور کرنے کی کوشش کی۔ مسٹر کینس نے خود پارلیمنٹ کے بعض ارکین کے سامنے اس کی تشریح کی لیکن اس کا بھی کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ کچھ تو شائد محض اس وجہ سے کہ ہر نئی چیز کو شک کی نظر سے دیکھنا انسانی خاصیت ہے اور کچھ عوام کی لاعلمی کے باعث۔ البتہ ماہرین اقتصادیات کے حلقہ میں اس کا خیر مقدم بہت اچھی طرح سے کیا گیا۔ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس نے معاشیین میں اتفاق و اتحاد پیدا کر دیا۔ ڈاکٹر ہائک پروفیسر رابنس اور پروفیسر ہکس جیسے لوگوں نے اس کی حمایت کی اور ڈاکٹر گریگری کا یہ کہنا کہ جس جگہ چھ معاشیین جمع ہوں وہاں سات رائیں ہوتی ہیں جن میں سے دو مسٹر کینس کی، کم سے کم ایک مرتبہ تو ضرور غلط ثابت ہوا۔

کینس کی اسکیم کی مخالفت اور موافقت دونوں میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ سب سے بڑا اعتراض جو ان کی اسکیم کے خلاف کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے جنگ کے اخراجات کا تخمینہ لگانے میں بہت زیادہ اعتدال سے کام لیا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ ان کی رائے میں ۱۹۴۰ء میں حکومت کے اخراجات جس میں جنگ کے اخراجات بھی شامل ہیں۔ ۲۸۵۰ ملین پونڈ ہونگے

لیکن ۴۱-۱۹۴۰ء کے مالیہ کا اندازہ ۳۱۰۹ ملین پونڈ ہے اور یہی ۴۲-۱۹۴۱ء میں ۳۷۰۰ ملین پونڈ ہو جائیں گے۔ قرضہ اور ٹیکہ کا قانون پاس ہونے کی وجہ سے یہ اخراجات پھر بھی کم ہیں نہیں تو اس سے بھی کہیں زیادہ ہوتے۔ کینس اپنے واجبی تخمینہ کی وجہ سے اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ حکومت کو ایسی کوشش کرنی چاہیئے کہ لوگ اپنی اضافہ شدہ آمدنی کو اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ نہ کرسکیں بلکہ حکومت کو قرض دے دیں۔ خاندانی بھتوں کے ذریعہ سے وہ غریبوں کی اور مدد کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح سے جنگ کے پہلے سال کے اخراجات تو پورے کئے جاسکتے تھے لیکن اب جبکہ جنگ نے بہت زیادہ شدت پکڑلی ہے اس قسم کی رعایت غریبوں کے ساتھ نہیں کی جاسکتی۔ بعض ایسے شدید ذرائع ضرور اختیار کرنے پڑیں گے جن سے ان لوگوں کے صرف میں کمی کی جاسکے۔ لیکن اس اہم اعتراض کی وجہ سے مسٹر کینس کی اسکیم کو بالکل مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے برخلاف اس جیسی اسکیم پر عمل کرنے کی ضرورت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

ایک دوسرا اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اوسط آمدنی رکھنے والوں کے ساتھ بھی رعایت برتی ہے۔ اسکیم کی تفصیلات کے سلسلہ میں بیان کیا گیا کہ بعض خاص خاص حالات میں ملتوی ادائیگی کی رقم واپس لی جاسکے گی۔ ان مستثنیات کی وجہ سے بہت سے ایسے لوگوں پر جن کی آمدنی ۳۰۰ اور ۳۰۰۰ پونڈ سالانہ کے درمیان ہے اطلاق نہیں ہوگا۔ اور ان کے صرف میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوسکے گی۔

اس اسکیم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں غریبوں کا خاص طور پر خیال کیا گیا ہے۔ شروع میں جس طرح سے انھوں نے اپنی اسکیم کو بیان کیا تھا اس وقت وہ امیر طبقہ کو زیادہ بھائی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس طرح سے مزدور جماعت پر بھی جنگ کا بار ڈالا جاسکے گا اور ان کا اپنا بوجھ کم ہو جائے گا۔ لیکن کینس کا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا اور بعد میں انھوں نے ترمیمات کرکے مزدور طبقہ کے لئے اسے اور زیادہ مفید بنادیا۔ خاندانی بھتہ آئینی رسد بندی اور سرمایہ باج اور دوسری تفصیلات کا اضافہ اسی غرض کو پیش نظر

رکھ کر کیا گیا ہے۔ کینس چاہتے یہ ہیں کہ مزدور طبقہ اور کم آمدنی پانے والے لوگ بھی جنگ کے بار کو اٹھائیں لیکن وہ ان سے بہت زیادہ قربانی کا مطالبہ نہیں کرتے۔ صرف انھیں اپنی اضافہ شدہ آمدنی کے خرچ کو کچھ مدت کے لئے ملتوی کرنا پڑے گا۔ ایسا کرنے سے وہ قومی قرضہ کے ایک خاص حصہ کے مالک بھی بن جائیں گے۔ اگر مزدور جماعت اور مزدور سبھائیں ان کی اسکیم کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں تو جنگ کی وجہ سے افراط زر کے اثرات ضرور پیدا ہونگے۔ اور جب ایک مرتبہ افراط زر کا بُرا چکر شروع ہو گیا تو اس کو روکنا مشکل ہو جائے گا اور مزدور طبقہ بہت زیادہ نقصان میں رہے گا۔ وہ اپنی اضافہ شدہ آمدنی سے کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھا سکے گا۔ ان کی محنت بے کار جائے گی۔ اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مختلف معاشرتی ہیجان پیدا ہوں گے اور دولت کی غیر مساوی تقسیم میں اضافہ ہو جائے گا۔ آجر اور امیروں کا طبقہ اس صورت میں سب سے زیادہ فائدہ میں رہے گا اور وہی پورے قومی قرضہ کے مالک بن جائیں گے۔

یہ تو حال تھا مزدور جماعت کی بے توجہی کا۔ حکومت نے بھی ان کی اسکیم کی جانب خاص توجہ مبذول کی۔ جنگ کے پہلے سال میں جو مالیے پارلیمنٹ کی منظوری کے لئے پیش ہوئے ان میں اسکیم کا کچھ خیال نہیں کیا گیا۔ بعض ممبران نے وزیر مالیات کی توجہ مبذول بھی کرائی تو اس کو ناقابل عمل ٹھیرا کر مسترد کر دیا گیا اور حکومت پرانے طریقوں سے جنگ کے اخراجات پورے کرتی رہی۔ محاصل میں اضافہ کیا گیا اور ارادی بچتوں سے زیادہ کام نکالا گیا۔ لیکن جیسے جیسے جنگ نے شدت پکڑی اور روز بروز جنگ کے اخراجات بڑھتے گئے حالات نے حکومت کو مجبور کیا کہ وہ کینس کی اسکیم پر تھوڑا بہت عمل کرے گو اس شکل میں نہیں جس طرح سے انھوں نے اپنے رسالہ میں بیان کیا ہے۔ مارچ ۱۹۴۱ء کے بجٹ کو لندن کے ایک مشہور معاشی اخبار نے جنگ کا پہلا مالیہ کہا ہے۔

اس مالیہ میں سر کنگزلے وُڈ[1] نے اعلان کیا کہ جنگ کے بعد اس رقم کا جو زائد منافع محصول کے ذریعہ

---

[1] Sir Kingslywood

ذریعہ سے حکومت کو ملے گی پانچواں حصہ اس کے مالک کمپنیوں کو واپس کر دیا جائے گا۔ اس ٹکس کے خلاف یہ اہم اعتراض کیا جاتا تھا کہ اس کا بار کمپنیوں پر بہت زیادہ پڑ رہا ہے۔ محصول ادا کرنے کے بعد ان کے پاس کسی قسم کا محفوظ ذخیرہ رہنے کی کوئی امید نہیں ہے اور بغیر اس قسم کے ذخیرہ کے جنگ کے بعد کی مصیبتوں کو برداشت کرنا ان کے لئے بالکل ناممکن ہو جائے گا۔ حکومت نے اس اعتراض کو مان لیا ہے اور پانچواں حصہ واپس کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ رقم جنگ کے بعد صنعتوں کو نئے طریقے سے منظم کرنے پر خرچ کی جائے۔

دوسری اہم تجویز بجٹ والی تقریر میں یہ ہے کہ انکم ٹکس لگانے کی حد کو کم کر دی گئی ہے۔ اس سے پہلے ۱۲۰ پونڈ سالانہ آمدنی سے کم پر انکم ٹکس نہیں لیا جاتا تھا۔ اب حد ۱۱۰ پونڈ مقرر کی گئی ہے۔ حد کو گھٹانے کی وجہ سے تقریباً ۲۰ لاکھ اشخاص انکم ٹکس کے حلقہ میں شامل کر دئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ اسپشل بھتہ میں بھی کمی کر دی گئی ہے اور انکم ٹکس کی شرح ۸ شلنگ ۶ پنس سے بڑھا کر دس شلنگ فی پونڈ مقرر ہوئی ہے۔ اس قسم کی بعض دوسری تبدیلیوں نے لوگوں پر انکم ٹکس کا بوجھ بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ وزیر مالیات کا تخمینہ ہے کہ ان نئے انتظامات کی وجہ سے حکومت کو مزید ۲۵۰ ملین پونڈ سالانہ کی آمدنی ہوگی، جنگ کے بعد اس مزید رقم کا ایک خاص حصہ ٹکس ادا کرنے والوں کے نام پر سیونگ بنک میں جمع کرا دیا جائے گا۔ وزیر مالیات نے کچھ زیادہ تفصیلات نہیں بتلائی ہیں کہ کب اور کتنی رقم واپس کی جائے گی۔

حکومت نے مسٹر کینس کی اسکیم کو مسترد کر دیا تھا لیکن بالآخر ایک بگڑی ہوئی شکل میں اس کو اختیار کرنے پر مجبور ہوئی۔ خود کینس نے اپنے رسالہ میں اس بات کو مان لیا ہے کہ اگر انکم ٹکس کی حد گھٹا دی جائے اور اس کی شرح اور سر محصول کی شرح کافی بڑھا دی جائے تو نتائج وہی پیدا ہونگے جو ان کی اسکیم پر عمل کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ کسی نئی اسکیم کو اختیار کرنا حکومت نے شاید مناسب نہیں سمجھا اور اس لئے پرانے طریقوں میں حسب منشا تبدیلی پیدا کر دی گئی۔ خاندانی بھتہ اور سرمایہ باج کا تذکرہ حکومت کی طرف سے بالکل نہیں کیا گیا ہے اس لئے کینس کی اسکیم پھر بھی

بہتر معلوم ہوتی ہے جس کی وجہ سے معاشری مساوات قائم ہونے کے زیادہ امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔

آخر میں یہ بتلانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جرمنی میں اسی قسم کی اسکیم پر عمل ہو رہا ہے گو جنگ کی وجہ سے اس کی تفصیلات معلوم کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ نہ صرف یہ کہ ملتوی ادائیگی کا طریقہ جرمنی میں اختیار کیا گیا ہے بلکہ دوسرے طریقوں سے بھی جرمن مزدور دوسرے ملکوں کو غلام بنانے کے لئے بہت زیادہ قربانی کر رہے ہیں۔ اگر کینس برطانوی مزدوروں سے اپنے گھروں کی حفاظت کے لئے قربانی کا مطالبہ کرتے ہیں تو ان کا یہ مطالبہ کسی طرح سے بھی بیجا نہیں کہا جاسکتا۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مزدور جماعت اور مزدور سبھائیں ایک مفید ذریعہ کو اختیار کرنے کی طرف سے بے توجہی برت رہی ہیں اور معاشرتی مساوات قائم کرنے کا ایک زرین موقعہ اپنے ہاتھ سے کھو رہی ہیں۔

رفتارِ عالم

اس وقت تین محاذوں پر زبردست لڑائی جاری ہے۔ روس کا محاذ، لیبیا کا محاذ اور بحرالکاہل کا محاذ۔ یہ مشہور مقولہ صحیح ثابت ہوا کہ روس کا سب سے بڑا اور زبردست جنرل موسم سرما ہے۔ اسی موسم سرما نے نپولین اعظم کے چھکے چھڑا دئے تھے اور آج ہی موسم ہٹلر کے ٹڈی دل کو پریشان کئے ہوئے ہے۔ پچھلے تقریباً دو ماہ سے جرمن فوج کا اقدام رُکا ہوا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ پچھلے چند ہفتوں سے روسیوں نے ایسے سخت حملے شروع کر دئے ہیں کہ جرمنوں کے لئے سوائے پیچھے ہٹنے کے اور کوئی چارہ نہیں۔ جرمن جرنلوں کا خیال تھا کہ پیچھے ہٹتے ہٹتے وہ پورے محاذ پر زمین دوز مورچے قائم کرلیں گے تاکہ کسی نہ کسی طرح موسم سرما گزر جائے، اس کے بعد اپریل میں پھر اپنا اقدام شروع کردیں گے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ روسی نپولین کے اس مقولے سے بخوبی واقف ہیں کہ جو دشمن چاہے وہ نہ کرو۔ چنانچہ جرمن فوج چاہتی تھی کہ پیچھے ہٹتے ہٹتے روسیوں کو اس طور پر روکے رہے کہ پچھلی فوج مورچہ بندی کرلے۔ لیکن روسیوں نے اتنی فرصت نہیں دی۔ جرمنوں کا شاید خیال تھا کہ روسی فوج پر ایسی مرعوبانہ ذہنیت طاری ہوگی کہ وہ جرمن اقدام کے رُک جانے ہی کو غنیمت جانے گی لیکن انھوں نے روسی ذہنیت کے متعلق غلط اندازہ لگایا۔ روسی فوج آج بھی اُسی جوش و استقلال سے لڑ رہی ہے جس جوش سے وہ لڑائی کے پہلے دن لڑ رہی تھی۔ چنانچہ اب روسی فوج کے سخت حملوں کے باعث جرمنوں میں بڑی بددلی پیدا ہوگئی ہے۔ اس بددلی کی سب سے بڑی نشانی جرمن کمان کی پے بہ پے تبدیلیاں ہیں اور نوبت یہاں تک پہونچی ہے کہ ہٹلر نے خود روسی فوج کی سربراہی اسمولنسک میں قیام کرکے شروع کردی ہے۔ اس سربراہی سے ممکن ہے

جرمن فوج کی بددلی اور کم حوصلگی کا تھوڑا بہت مداوا ہو جائے لیکن اگر ہٹلر نے اپنے جنرلوں کے مشورہ کے خلاف خود اپنے وجدان کی رہبری میں کوئی فنی غلطی کر ڈالی تو ممکن ہے جرمن فوجوں کا بھی وہی انجام ہو جو نپولین کے ساتھیوں کا ہوا تھا۔ اب اگر مارچ اپریل تک جرمن فوجیں روسیوں کے حملے جھیل گئیں تو آئندہ موسم بہار میں روسی محاذ پر سخت لڑائی ہوگی۔ اس وقت بحر ارکٹک سے لیکر کریمیہ تک روسی فوجوں نے جرمنوں کا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ اگر ماسکو کے علاقے میں موجائسک اور اکرین کے علاقے میں خارخو پر روسیوں نے قبضہ کر لیا تو جرمنوں کو بہت زیادہ پیچھے ہٹنا پڑے گا اور شمال و جنوب روس کے رسل و رسائل پھر سے قائم ہو جائیں گے جو اگرچہ اب بھی قائم تھے لیکن بڑی دشواری اور چکر سے۔ ہٹلر چاہتا تھا کہ جب تک روس کی سردی کا زور ہے اس وقت تک پیچھے ہٹ کر مدافعتی مورچوں میں اپنی فوج کو دم لینے کا موقع دے اور اُن کو جو سامان حرب تیار کرنے میں کام آسکتے ہیں کچھ دنوں کے لئے جرمنی واپس بھیج دے لیکن اب جبکہ جرمن فوجوں کی پورے روسی محاذ پر پسپائی جاری ہے ایسا کرنا ممکن ہو گا۔ اگر جرمنی اسی طرح روس میں الجھا رہا تو بہ ظاہر اس کا امکان نظر نہیں آتا کہ وہ کوئی اور بڑی مہم شروع کرے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ روس کی ناکامی کے داغ کو تھوڑا بہت مٹانے کے لئے ممکن ہے وہ کوئی چھوٹی موٹی فوج کشی کر ڈالے۔ چنانچہ انگلستان کے بعض فوجی مبصروں کا خیال ہے کہ ممکن ہے مالٹا پر یا ترکی کے راستے سے مشرق قریب میں وہ کوئی اقدام کرے۔ لیکن جب تک روس کی جانب سے اس کو یکسوئی نہیں حاصل ہوگی اس قسم کی فوج کشی جرمنوں کے لئے اور زیادہ دشواریاں پیدا کرنے کا موجب ہوگی۔

روس کی طرح لیبیا میں بھی جرمن اور اطالوی فوجوں کو پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ جلفیہ میں انگریزی افواج کو جو شاندار کامیابی ہوئی ہے اس سے مصر کی سرحد کو کوئی خطرہ باقی نہیں رہا۔ اُدھر انگریزی بیڑے نے بحر روم میں اطالوی بیڑے کو بالکل نیچے دکھا دیا ہے اور اس راستہ سے اب جنرل رومل کو مدد نہیں پہونچ سکتی۔ کریٹ سے ہوائی امداد رومل کو

مل رہی ہے جس کی روک تھام کی کوشش جاری ہے۔ جنرل اُکن لک چاہتے ہیں کہ رومل سے آمنے سامنے کے دوچار ڈٹ کر مقابلے ہو جائیں تاکہ جرمن فوجوں کا لیبیا میں بالکل ہی خاتمہ ہو جائے لیکن رومل مقابلے سے گریز کر رہا ہے اور پیچھے ہٹ کر اپنی فوج کو اس وقت تک بچانے کی فکر میں ہے جب تک کہ اس کو کمک نہ پہونچ جائے۔ لیکن بظاہر آثار یہ ہیں کہ اب رومل زیادہ عرصے تک مقابلے کی تاب نہیں لاسکے گا۔ لیبیا کی کامیابیوں میں ہندوستانی سپاہ کا بڑا ہاتھ رہا ہے جس کا اعتراف انگریز مدبر اور فوجی ماہر کر رہے ہیں۔ ابھی حال میں عراق اور ایران کو جنرل اکن لک کی کمان میں دیدیا گیا ہے تاکہ لیبیا سے یکسوئی حاصل کرنے کے بعد وہ مشرق قریب میں برطانوی مفاد کی نگہداشت کر سکیں۔ ان علاقوں میں بھی ہندوستان کی فوجیں اپنے ملک کی حفاظت کا فرض اپنے ملک کی سرحد سے دور انجام دے رہی ہیں۔

جاپان آخر لڑائی میں کود ہی پڑا۔ اس نے اپنے مفاد کے پیش نظر لڑائی میں شرکت کا ایسا موقع چُنا جو اس کے لئے موزوں ترین تھا۔ ادھر روس اس بری طرح سے الجھا ہوا ہے کہ وہ مجبور ہے کہ جاپان کے ساتھ اپنے پنج سالہ معاہدہ کو نباہے۔ انگریزی فوجیں بھی مختلف محاذوں پر بٹی ہوئی ہیں۔ امریکہ، انگلستان، چین اور ڈچ حکومتوں نے متحدہ کمان قائم کرلی ہے تاکہ جاپانی عزائم کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ ری پلس اور پرنس آف ویلز کے ڈوبنے سے برطانوی بیڑہ کو اگرچہ سخت نقصان پہونچا ہے لیکن ابھی سنگاپور کا بحری مرکز موجود ہے جو جاپان کو بحر ہند میں آنے سے روکے ہوئے ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جاپان نے فلپائن، بورنیو اور ملایا میں اب تک کامیابی حاصل کی ہے لیکن اس کا قوی امکان ہے کہ یہ کامیابی اس کے لئے آئندہ سخت مشکلات کا باعث بھی بن سکتی ہے، اس لئے کہ اس کے رسل و رسائل کا خط وسیع ہوتا جارہا ہے جسے بیچ میں سے توڑنا جنرل ویول جیسے تجربہ کار جنرل کے لئے بہت زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ جنوبی برما کی طرف بھی جاپان کا اقدام ہو رہا ہے اور رنگون پر متعدد مرتبہ گولا باری بھی ہو چکی ہے۔ گویا کہ اب جنگ ہندوستان کے بالکل دروازہ تک پہونچ چکی ہے۔ ہندوستان کی فوجیں مشرق بعید میں بھی جاپانیوں کے مقابلے میں

بڑی بہادری سے دادِ شجاعت دے رہی ہیں۔ اب مشرقِ بعید کی جنگ کی وجہ سے صورت حال اتقدر نازک ہوگئی ہے کہ اہلِ ہند کا فرض ہے کہ وہ سیاسی بحث و مباحث کو چھوڑ کر اپنے ملک کی حفاظت کی خاطر متحد ہو جائیں اور جاپان کے جارحانہ اقدام کو روکنے میں اپنے انتہائی وسائل صرف کردیں۔ اس کی بھی ضرورت ہے کہ اندرون ملک ایسی تنظیم قائم ہو جو عوام کو اطمینان دلاتی رہے کہ وہ ضبط وصبر سے کام لیں۔ کلکتہ اور مدراس میں حال ہی میں بدحواسی کے جو منظر پیش آئے وہ کسی خوددار اور ضبط آشنا قوم کے لئے باعث شرم ہونے چاہئیں۔ اس جانب حکومت اور پبلک کے لیڈروں کو پوری توجہ کرنی چاہیے تاکہ عوام بدحواسی کی بجائے اپنے اوپر بھروسہ کرنا سیکھیں۔

ہندوستان

پچھلے دنوں بردولی میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے گاندھی جی کو کانگریس کی قیادت سے سبکدوش کر دیا ہے اور ملک کے دفاع کی ذمہ داری کو صرف ایک تجویز میں تسلیم کر لیا ہے جو کانگریس پر عاید ہوتی ہے۔ واردھا میں گزشتہ ہفتہ آل انڈیا کانفرنس کمیٹی نے اس تجویز کی تصدیق کر دی اور اس طرح کانگریس اور حکومت کی مفاہمت کی راہ بڑی حد تک صاف ہوگئی۔ مسلم لیگ بھی اس بات پر آمادہ ہے کہ دوران جنگ تک حکومت کے ساتھ دفاع وطن کی ذمہ داری میں شریک ہو بشرطیکہ اس وقت کوئی ایسا دستوری انتظام پیش نظر نہ ہو جس سے مسلمانوں کی آیندہ سیاسی حیثیت متاثر ہو۔ اب اگر حکومت کی طرف سے بھی مفاہمت کا اقدام کیا جائے تو ہندوستان کی سیاسی گتھی بہت کچھ سلجھ سکتی ہے۔ اگر اس وقت یہ صورت ممکن ہو کہ مرکزی حکومت میں کانگریس اور لیگ کے نمائندے حکومت کے ساتھ تعاون کریں تو ان دونوں سیاسی جماعتوں میں آئندہ مفاہمت کے لئے بھی بڑی حد تک راستہ صاف ہو جائے گا اور دونوں جماعتوں کے چوٹی کے لوگوں کے باہمی قرب و اتصال سے ممکن ہے۔ بہت ساری غلط فہمیاں رفع ہو جائیں۔ کانگریس بھی غالباً حکومت کے ساتھ اس وقت تعاون کے لئے تیار ہوگی جبکہ صوبوں کے علاوہ مرکزی حکومت کی موجودہ اہم ذمہ داریوں میں اس کو شریک کیا جائے اور مسلم لیگ بھی شائد مرکزی عاملہ کی نئی تشکیل ہی پر زور دے گی۔ اب

ضرورت اس امر کی ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ مرکزی عاملہ میں اپنی اپنی نمائندگی کے تناسب کے متعلق کوئی تصفیہ کرلیں اس واسطے کہ بغیر ایسا کئے ہوئے کوئی قدم حکومت کی جانب سے آگے نہیں بڑھایا جاسکتا۔ اگر بدقسمتی سے ایسا نہیں کیا گیا تو مسٹر ایمری پھر اپنی پرانی دلیل کا اعادہ کریں گے کہ جب تک کانگریس اور مسلم لیگ میں باہمی تصفیہ نہیں ہو جاتا اس وقت تک ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ امید ہے کہ دونوں جماعتوں کے ذمہ دار لیڈر اپنی ذمہ داری کو محسوس کرکے ملک کے مجموعی مفاد کی خاطر کوئی نہ کوئی سمجھوتا کرلیں گے چاہے وہ دوران جنگ کے لئے عارضی نوعیت ہی کا کیوں نہ ہو۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو برطانوی حکومت کو الزام دینا کہ وہ حکم و اقتدار میں ہمیں شریک نہیں کرتی ہے بے معنی ہوگا۔

دوسرے رسائل

The Indian Journal of Economics. "دی انڈین جرنل آف اکنامکس" بابتہ جنوری ۱۹۴۲ء معاشی کانفرنس کا پچیسواں سالانہ اجلاس ڈاکٹر جبوگی کی صدارت میں بمقام بمبئی منعقد ہوا۔ کل ۴۶ مقالے مندرجہ ذیل تین عنوانات پر پڑھے گئے۔

(۱) ہندوستانی معاشی تخیل۔ (۲) دیہی امداد باہمی۔

(۳) مقامی مالیات۔

یہ پچھلا اجلاس معاشی کانفرنس کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس سال کانفرنس کی پچیسویں سالگرہ اور جسٹس راناڈے (۱۸۴۲-۱۹۰۱) کی صدسالہ سالگرہ کا جشن ایک ساتھ منایا گیا۔ راناڈے ہندوستانی معاشی مسائل کے پہلے محقق سمجھے جاتے ہیں۔ انہیں نے سب سے پہلے ہندوستانی معاشی تخیل کو ایک نیا رنگ دیا اور ایک نئے اسکول کی بنا ڈالی جس کی پیروی ہندوستانی معاشئین اب تک کرتے چلے آتے ہیں۔

پہلے عنوان کے تحت جتنے مضمون لکھے گئے ہیں ان میں سے زیادہ تر راناڈے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں ہندوستان کے معاشی مسائل کے متعلق راناڈے کے خیالات کی تشریح کی گئی ہے۔ راناڈے کے زمانے میں انگلستان میں کلاسیکل معاشئین کا زور تھا اور حکومت ہند نے انھیں کے نظریوں سے متاثر ہوکر اپنی معاشی پالیسی کا تعین کیا تھا۔ ان ماہرین اقتصادیات نے اپنی تصانیف میں بتلایا کہ آزاد تجارت ہر ملک کے لئے چاہے وہ صنعتی ہو یا زرعی مفید ہے۔ آزاد تجارت کی پالیسی ان اثرات کے تحت ہندوستان کے لئے بھی مفید سمجھی گئی۔ معاشی معاملات میں حکومت کی عدم مداخلت کی پالیسی پر انگلستان میں عمل ہو رہا تھا اس لئے ہندوستان کی حکومت نے بھی عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کی۔ راناڈے پہلے شخص ہیں جنہوں نے معاشی نقطۂ نظر سے حکومت ہند کی پالیسی پر اعتراضات کئے اور علمی دلائل دیکر اس کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔

راناڈے کے خیال میں معاشیات دولت کا علم نہیں بلکہ قومی دولت اور لوگوں کی مادی اور اخلاقی بہبودی کا علم ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ معاشی قوانین اور اصول عالمگیر اور بین اقوامی حیثیت نہیں رکھتے اس لئے ان کا اطلاق ہر ملک پر نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ انگریز مصنفین نے بتلانے کی کوشش کی تھی بلکہ ہمیں ان قوانین کی اضافیت پر زور دینا چاہیئے جس کا مطلب یہ ہے کہ مقامی حالت میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان میں بھی تھوڑی سی تبدیلی کی ضرورت پڑتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتلایا کہ کلاسیکل معاشئین نے جن مفروضوں پر اپنے علم کی عمارت تعمیر کی تھی وہ ہندوستان کے خاص حالات میں صحیح نہیں ہیں۔ ہندوستان میں معاشی انسان، آزاد مقابلہ محنت و اصل کی انتقال پذیری اور اسی قسم کے دوسرے مفروضے غلط ہیں۔ اور جب مفروضے ہی غلط ہوں تو اُن سے جو قوانین اخذ کئے گئے ہیں ان کا اطلاق ہندوستان کے مقامی اور سیاسی حالات پر کیسے کیا جا سکتا تھا۔ کلاسیکل معاشئین کے خلاف جو کچھ دلیلیں انھوں نے بیان کی ہیں ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر جرمنی اور امریکہ کے تاریخی اسکول کے حامیوں کا زیادہ اثر پڑا ہے۔ سب لوگ اس بات کو مانتے ہیں کہ جسٹس راناڈے نے بہت سے خیالات ان ہی لوگوں سے اخذ کئے ہیں۔

اس طرح سے راناڈے معاشی قوانین کی بین اقوامی حیثیت اور عالمگیر معشیت سے انکار کرتے ہیں اور اس بات کا مشورہ دیتے ہیں کہ ہمیں یہاں مقامی حالات کا خیال کرتے ہوئے معاشی مسائل کا علحدٰہ مطالعہ کرنا چاہیئے۔ جب سے انھوں نے معاشی مسائل کے مطالعہ کا نیا راستہ بتلایا ہے تقریباً تمام ہندوستانی ماہرین اقتصادیات نے ہندوستانی مسائل کی تشریح اور توضیح میں خاص مہارت پیدا کی ہے نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی معشیت کے مختلف پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اس سلسلہ میں کام برابر جاری ہے اور اسی کی وجہ سے ہماری جامعات میں عملی معاشیات کو بہت زیادہ فروغ ہوا ہے۔ عملی معاشیات کی اہمیت سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ نظری معاشیات کو ہم نے اپنے نصاب میں اس کی حقیقی جگہ سے

محروم کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں اب تک کوئی ایسا ماہر معاشیات پیدا نہیں ہوا جس کی شہرت بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔ ہماری جامعات میں نظری معاشیات پر کم توجہی اور معیار کے پست ہونے کی طرف ڈاکٹر تیوگی نے بھی اپنے خطبہ صدارت میں توجہ دلائی ہے۔ انھوں نے بعض مثالیں دیکر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے نظری معاشیات کا مطالعہ اور پچھلے بیس سال میں جو کچھ کام اس سلسلہ میں ہوا ہے اس سے واقفیت ہمارے ملک کے معاشی مسائل کے حل کرنے میں بہت کافی مدد دے گی۔

رانا ڈے نے حکومت کی عدم مداخلت کی پالیسی کی بھی مخالفت کی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک حد تک ریاستی اشتراکیت کے حامی تھے۔ ان کے نزدیک ہندوستان کے افلاس کا مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ حکومت کی پالیسی کی وجہ سے عام لوگوں کی حالت اور زیادہ خراب ہوگئی تھی۔ انگلستان کے کارخانوں کی بنی ہوئی چیزوں نے ہمارے بازاروں میں اپنا سکہ جما لیا تھا۔ یہاں کی دیسی صنعتیں اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہی تھیں۔ ہمارے یہاں دستکاروں اور مزدوروں میں بے روزگاری بڑھ رہی تھی۔ اور لوگوں کی زندگی کا دارومدار زیادہ تر زراعت پر تھا اور اس کی وجہ سے زمین پر آبادی کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ حالات پر قابو پانے اور لوگوں کی زندگی سدھارنے کا ایک ذریعہ ہوسکتا تھا اور وہ یہ کہ حکومت اپنی پالیسی بدلے اور صنعتی ترقی کے مواقع فراہم کرے۔ رانا ڈے کی رائے میں حکومت کو ملک کی صنعتی ترقی میں ہر قسم کی مدد دینی چاہیئے۔ اگر افراد میں مختلف قسم کی صنعتیں قائم کرنے کی سکت اور ہمت نہیں ہے تو حکومت خود صنعتیں قائم کرے۔ انھوں نے صنعتی نظام کو نئے سرے سے تنظیم دینے کی طرف توجہ دلائی۔ لیکن ہمیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا چاہیئے کہ اس طرح سے انھوں نے زراعت کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی۔ وہ صنعتی اور زرعی ترقی دونوں کے حامی تھے ان کے بغیر ہندوستان کے افلاس کا مسئلہ حل نہیں کیا جاسکتا تھا۔

آخر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ رانا ڈے کو ہندوستانی معاشی تخیل کی تاریخ میں ہمیشہ ایک

خاص جگہ حاصل رہے گی۔ بعض مقالہ نگاروں نے ان کا مقابلہ لسٹ مصنف معاشیات قومی سے
کیا ہے۔ جرمنی کی جو معاشی حالت انیسویں صدی کے وسط میں تھی ہمارا ملک اس دور سے انیسویں
صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں گزر چکا ہے۔ لسٹ نے بھی کلاسیکل پولیٹکل اکانمی
کے اصولوں کی عالمگیر سچائی سے انکار کیا اور اضافی نوعیت پر زور دیا۔

دوسرے مقالے جو ہندوستانی معاشی تخیل سے متعلق ہیں ان میں سے ایک میں
پروفیسر انجاریہ نے مہاتما گاندھی کے معاشی خیالات کی تشریح اور ان کی اہمیت پر زور دیا ہے۔
اور ایک دوسرے مقالے میں ڈاکٹر لوکناتھن نے گوکھلے کی معاشیات کے عنوان کے تحت
ان کے معاشی خیالات کا خاکہ پیش کیا ہے۔ یہاں دوسرے مقالے کا خلاصہ بیان کرنے پر اکتفا کیا جائیگا۔

گوکھلے کو ہندوستانی مالیات کے مسئلہ سے بہت زیادہ دلچسپی تھی اور مالیات عام کے
متعلق انھوں نے جو کچھ تقریریں کیں ہیں وہ بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ گوکھلے نے سرکاری
خرچ کے متعلق کلاسٹیسن کا اصول مان لیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے حکومت
کم خرچ کرے اور اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے اسے کم سے کم محاصل عائد کرنے چاہئیں۔
بعد میں انھوں نے اپنے خیالات میں تبدیلی کی اور سرکاری اخراجات کے اصول کو اور زیادہ وسعت
دی اور بتلایا کہ حکومت کو عام لوگوں کی مادی اور اخلاقی بہبودی پر کافی خرچ کرنا چاہئے۔ ان کی
رائے میں ہندوستان میں رفاہ عام کے کاموں پر زیادہ خرچ اسی وقت کیا جاسکتا ہے جبکہ حکومت
فوج اور دفاع کے اخراجات میں تخفیف کرے۔

محصول بندی کے متعلق گوکھلے نے جن خیالات کا اظہار کیا ان کا خلاصہ یہ ہے۔ "ہندوستان
میں محاصل کا بار غریب طبقہ پر بہت زیادہ پڑ رہا تھا۔ اور اس بار میں کسی نہ کسی طرح سے کمی ہونی چاہیئے
تھی۔ انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ مالگزاری میں کمی اور نمک کے محصول اور اسی قسم کے دوسرے
محاصل میں کمی کرنے کی وجہ سے غریبوں کے بار کو کم کیا جاسکتا تھا وہ دوامی بندوبست کے بھی
حامی تھے۔ جب ان پر اعتراض کیا گیا تو کس طرح سے رفاہ عام پر زیادہ خرچ کرنے کی پالیسی اور

محاصل میں تخفیف کی پالیسی پر ایک ساتھ عمل کیا جاسکتا تھا تو انھوں نے بتلایا کہ بعض مزید محاصل مثلاً شراب، تمباکو وغیرہ پر عائد کئے جاسکتے تھے بشرطیکہ ان کی آمدنی رفاہ عامہ کے کاموں پر خرچ کی جائے۔

گوکھلے نے دوسرے مسائل کے متعلق بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جن میں سے آزاد تجارت اور تامینی تجارت کا مباحثہ اور ہندوستان کا نظام زر کا سکہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ ان مسائل پر دوسرے ہندوستانی معاشیین سے تھوڑا سا اختلاف رکھتے تھے۔ ان کا رجحان گو تامینی تجارت کی حمایت کی طرف تھا لیکن ان کی رائے میں ہندوستان کے سیاسی اور معاشی ارتقائیں سب سے زیادہ بے ضرر جو پالیسی ہوسکتی تھی وہ آزاد تجارت کی پالیسی تھی۔ انھیں یہ خطرہ تھا کہ اگر تامینی تجارت کی پالیسی پر عمل کیا گیا تو اس سے ایک خاص جماعت زیادہ فائدہ اٹھائے گی اور یہ عام لوگوں کے لئے بہت زیادہ مہنگی ثابت ہوگی۔ (ا-م)

Journal of the Aligarh Historical Research Institute. بابتہ جولائی، اکتوبر ۱۹۴۲ء

اس اشاعت میں پروفیسر محمد حبیب صاحب کا مضمون "ترکی حملوں کے وقت اہل ہند کی تمدنی اور عمرانی زندگی" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس میں مضمون نگار نے البیرونی کی "کتاب الہند" کا نہایت قابلیت سے تجزیہ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ گیارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں لوگ کس قسم کی زندگی بسر کرتے تھے۔ البیرونی کی طرح کسی غیر ہندی نے ابتک ہندوستان کو علم کی گہری نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ ویسے سرسری طور پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالنے والے بہت ہوئے لیکن وسط ایشیا کے اس فاضل نے اپنے مشاہدات میں اہل ہند کی روح کو پالیا۔ ظاہر ہے یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ مشاہدہ کرنے والا خاص ہمدردی کے ساتھ مشاہدہ نہ کرے۔ البیرونی کے مشاہدات میں ہمدردی اور علمی بے تعلقی دونوں ساتھ ساتھ ملتی ہیں۔ البیرونی نے اہل ہند کے فلسفہ، ان کے رسم ورواج، مذہبی فرقہ بندیاں، اور ان کا ادب سب ہی کو اپنی تحقیق کا موضوع قرار دیا ہے زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس پر اس کی نظر نہ پڑی ہو اور اس کی روح کی گہرائیوں تک نہ پہنچا ہو۔ کتاب الہند میں اہل ہند کی عام زندگی کے متعلق ہمیں جو معلومات ملتی ہیں وہ نہ صرف گیارہویں صدی عیسوی کی زندگی کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتی ہیں بلکہ ان سے اس زمانے کے حالات کو سمجھنے میں بھی بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان گزشتہ آٹھ صدیوں میں بنیادی طور پر بہت کم بدلا ہے۔

تنقید و تبصرہ

اقبال کا مطالعہ اور دوسرے مضامین

از جناب سید نذیر نیازی صاحب۔ شائع کردہ کتاب خانۂ پنجاب۔ لاہور قیمت عہ/۸ر

سید نذیر نیازی صاحب ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جنھیں علامۂ اقبال مرحوم کا فیض صحبت نصیب ہوا اس لئے علامۂ مرحوم کے متعلق وہ جو کچھ بھی لکھیں یا کہیں وہ خاص توجہ کا مستحق ہے۔ زیر نظر مجموعہ سید نذیر نیازی صاحب کے چار مضامین پر مشتمل ہے (۱) اقبال کا مطالعہ (۲) اقبال اور حکمائے فرنگ (۳) اقبال کی عظمت فکر اور (۴) اقبال کی آخری علالت۔

ان چاروں مضمونوں میں سید نذیر نیازی صاحب نے محض ایک عقیدت مند کی حیثیت سے نہیں بلکہ فلسفہ و اخلاق کے ایک محقق کی حیثیت سے علامۂ اقبال مرحوم کے تصور حیات و کائنات کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ نیازی صاحب ان مقالہ نگاروں کی رائے کی مخالفت کرتے ہیں جن کے نزدیک اقبال نے جدید فلسفۂ یورپ سے خوشہ چینی کی ہے۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس مسئلہ کو غیر ضروری طور پر اہمیت دی جارہی ہے۔ اگر کوئی صاحب فکر دوسرے صاحب فکر لوگوں کے خیالات کا اثر قبول کرتا ہے تو یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ اثر پذیری بھی زندگی کی نشانی ہے۔ مردہ جسم اور دماغ کوئی اثر نہیں قبول کرسکتا۔ پھر خود علامہ مرحوم کا یہ خیال تھا کہ یورپ کا جدید فلسفۂ سائنس بڑی حد تک اسلامی اثر کا مرہون منت ہے تو ایسی صورت میں اگر علامہ مرحوم فکر یورپ سے متاثر ہوئے تو گویا خود اپنی متاع گم شدہ کو انھوں نے پایا۔ اقبال کے نزدیک اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے کلاسکی سکون آفرینی کے نظریہ کی جگہ حرکت و حرارت کے اصول کو اپنا رہنما بنایا اور استقرائی طریق فکر کی بنا ڈالی جس کے بطن سے

فی الحقیقت جدید فلسفۂ سائنس نے جنم لیا ہے۔ جدید طریق فکر و عمل کی نسبت انھوں نے صاف صاف فرمایا ہے :-

"اس تحریک میں کوئی خرابی نہیں اس واسطے کہ یورپین تہذیب ذہنی اعتبار سے اسلامی تہذیب کے بعض نہایت اہم پہلوؤں کی مزید نشو و نما سے عبارت ہے۔ ہمیں خوف ہے تو یہ ہے کہ کہیں یورپین تہذیب کی ظاہری چمک دمک ہماری اس تحریک کو روک نہ دے اور ہم اس کی (یورپین تہذیب کی) حقیقی اندرونی روح تک نہ پہونچ جائیں"۔

(اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل۔ ص ۷)

جدید سائنٹفک تہذیب کی اصلی روح ایجاد و تسخیر میں مضمر ہے جس کی بدولت انسان تحقق و اثبات خودی کے بہتر مواقع فراہم کرسکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہمارا یہ بھی خیال ہے کہ اقبال یورپین فلسفہ سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔ سرسید مرحوم اور اقبال کے نقطۂ نظر میں یہی بنیادی فرق ہے جس کے مضمرات نہایت اہم ہیں۔ اقبال نے جدید فلسفۂ سائنس میں سے صرف وہی لیا جو ان کے روحانی مزاج کے لئے سازگار تھا اور جسے انھوں نے اپنی متاع گم شدہ تصور کیا۔ اقبال نے نہایت زور و شور سے جدید تمدن پر تنقید بھی کی ہے اور بتایا ہے کہ جب تک حسّی تجربہ اور استقرائی طریق کار کے ساتھ عقیدہ و وجدان کی رہبری شامل نہ ہو زندگی صحیح راستہ سے بھٹک جائے گی۔ ہمارے نزدیک اقبال کا نظام فکر سائنٹفک علم اور عقیدہ کے تانے بانے سے بنا ہے کہ یہی صالح تمدن کی بنا ہے۔ فکر اقبال کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے دوسروں سے جو کچھ بھی لیا ہے اس کو اپنا لیا ہے۔ اس اپنانے میں اس کو سہولت اس وجہ سے بھی ہوئی کہ خود اسلامی روایات میں اس کو وہ سب عناصر مل گئے جنھیں وہ اپنے نظام فکر میں جگہ دینا چاہتا تھا اور جن کی مدد سے وہ حیات اور کائنات کی توجیہ کرنا چاہتا تھا۔

نیازی صاحب کے یہ چاروں مضامین اس قابل ہیں کہ اقبال کا ہر شیدائی اور اس کے تصور حیات سے ہر دلچسپی رکھنے والا ضرور پڑھے۔ یہ مضامین اقبالیات میں نہایت مفید اور قابل قدر

اضافہ ہے۔ انداز بیان شگفتہ اور دلکش ہے۔ فلسفیانہ خیالات کو ادا کرنے میں بھی ادبیت کو برابر قائم رکھا گیا ہے جو مشکل ہے لیکن بہت ضروری ہے۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ اس کتاب کی اردو داں پبلک پوری قدر کرے گی۔

مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر | مرتبہ پروفیسر محمد سرور صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ ناشر کتاب خانہ پنجاب۔ لاہور۔ قیمت ۸عہ۔

اس مجموعہ میں مولانا محمد علی مرحوم وہ خطوط درج ہیں جو انھوں نے مختلف اوقات میں سفر کے دوران میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کو لکھے تھے۔ زیادہ تر خطوط پانچویں سفر کے حالات پر مشتمل ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں مولانا مرحوم کے اور دوسرے خطوط بھی جو ان کے احباب کے پاس موجود ہیں، شامل کر دئے جائیں گے۔ خود حیدرآباد میں بعض صاحبوں کے پاس مولانا مرحوم کے خطوط موجود ہیں جن کی نقلیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

مولانا مرحوم کا یورپ کا پانچواں سفر علاج کے سلسلہ میں کیا گیا تھا۔ ان خطوط میں پیرس، لندن اور فرانکفورٹ کے قیام کے حالات مولانا نے اپنے مخصوص بے ساختہ اور بے تکلف انداز میں لکھے ہیں جس سے ان کی شخصیت، خصوصاً ان لوگوں کے لئے جنھیں ان سے شرف نیاز حاصل تھا، جیتی جاگتی شکل میں نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ مولانا مرحوم انگریزی زبان کے بلند پایہ ادیب تو تھے ہی لیکن اردو میں بھی ادبیت کی شان کہیں ماند نہیں پڑتی۔ باوجود متانت کے ظرافت طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ چنانچہ بعض اوقات اپنے احباب و اعزہ بلکہ خود اپنے آپ کو بھی نہیں چھوڑتے۔ اپنے علاج کے سلسلہ میں ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"وہ (ڈاکٹر) کہتے ہیں کہ اگر میری سانس لمبی ہو گئی تو غذا بھی زیادہ ہضم کی جا سکے گی اور تھوڑی بہت بدپرہیزی سے بھی زیادہ نقصان نہیں پہونچے گا۔ بہرحال یقیناً اس ڈیڑھ مہینے کے علاج میں اتنا افاقہ ہوا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور میں شوکت صاحب (مولانا شوکت علی مرحوم) کو بھی لکھنے والا ہوں کہ وہ بھی اب پھلوں پر

گذارہ کیا کریں اور جس طرح سے میں زمین پر لوٹ لوٹ کر اور دوسری ورزشوں میں لمبی لمبی سانسیں لیا کرتا ہوں وہ بھی لیا کریں۔ میرا وزن سات سیر گھٹ چکا ہے۔ کمر چار انچ کم ہو گئی ہے۔ اور سانس ایک سو ستر سے ترقی کر کے دو سو تک پہنچ گئی ہے۔ ان کا وزن تو یقیناً بیس پچیس سیر گھٹ جائے گا بلکہ اس سے بھی زائد اور وہ تھوڑے ہی عرصہ میں۔ مصرعہ۔

کمر پتلی صراحی دار گردن۔

کے مصداق ہو جائیں گے۔"

مولانا محمد علی مرحوم کے خطوط کا یہ مجموعہ ہر اس شخص کو پڑھنا چاہئے جو مولانا مرحوم کی ہمہ گیر اور دلکش شخصیت کو سمجھنا چاہتا ہے اور ان کی بے ساختگی سے ادبی لطف اٹھانا چاہتا ہے۔

The Hindu-Muslim Question مصنفہ جناب ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب پروفیسر سیاسیات۔ الہ آباد یونیورسٹی۔ ناشر کتابستان۔ الہ آباد۔

اس کتاب میں ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب نے نہایت قابلیت سے ہندوستان کی سیاست کے اہم ترین مسئلہ (یعنی ہندو مسلم مسئلہ) کی نسبت بڑی قابلیت اور علمیت سے بحث کی ہے۔ ان کی تحریر سے نہ صرف ان کے تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی ان کی طبیعت کی سادگی، غیر جانبداری اور وسعت قلب کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ کتاب یقیناً اس قابل ہے کہ اس کا ترجمہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں شائع کیا جائے۔ سوائے باب اول اور باب چہارم کے چند مطالب کے جو ذرا دقیق تجریدی بحث پر مشتمل ہیں کتاب کا باقی حصہ سہل اور عام فہم ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ہندو مسلم مسئلہ کی تاریخی اور نفسیاتی نوعیت پر بحث کی ہے اور ان محرکات کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو دونوں فرقوں میں کبھی توافق و ہم آہنگی کا موجب بنتے اور اب تصادم و انتشار کا باعث بن گئے ہیں۔ موصوف نے بتایا ہے کہ باہمی اثر و تاثر سے کس طرح ایک مشترک زبان، مشترک آرٹ اور مشترک تمدن نے جنم لیا اور بعد میں اٹھارویں اور انیسویں

صدی میں کس طرح افتراق و انتشار کے رجحان قوی ہوتے گئے۔ مسلمانوں کے آنے اور حکومت قائم کرنے سے ہندوستان کو سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ اس ملک میں ایک سیاسی وحدت قائم ہوئی اور اس کا تعلق دنیا کے دوسرے حصوں سے قائم ہوگیا۔ انگریزی حکومت کے قیام کے بعد اس ملک کی قسمت دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح عالمگیر معاشی قوتوں کے تحت آگئی۔

ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب کی یہ رائے یقیناً قابل قدر ہے کہ سیاسی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اقلیتیں اپنے تئیں اس ملک میں اسی طرح محفوظ نہ محسوس کرنے لگیں جس طرح کہ خود اکثریت۔ پھر ہندو مسلم مسئلہ کا سیاسی حل ایک ایسے سمجھوتہ کی صورت میں ہونا چاہئے جسے دستور کا جزء بنایا جاسکے تاکہ وہ کسی متقننہ کی اکثریت یا عاملانہ اقتدار کے تحت نہ رہے (ص ۱۳۶) اس ضمن میں عمومیت اور ہندوستان میں اس کے اطلاق سے جو دشواریاں پیدا ہورہی ہیں ان کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے اس ملک کے ارباب سیاست کے لئے قابل قدر ہے کہ اگر ہر بالغ شخص کو حق رائے دہندگی مل گیا تو کیا فرقہ واریت میں اور زیادہ اضافہ تو نہیں ہوگا اور اگر ہر بالغ کے حق رائے دہندگی کی بناء پر مجلس دستور ساز بنائی گئی تو کیا اس میں کسی معقول تصفیہ کی امید ہوسکتی ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے کانگریس کے ایک پارٹی والے نظریہ کی بھی تنقید کی ہے اور مشترکہ عاملہ (کولیشن) کی تائید کی ہے جس کے بغیر کوئی حکومت تشفی بخش طریقہ پر اس ملک میں نہیں چلائی جاسکتی۔ یہ بھی موصوف نے بڑے گر کی بات کہی ہے کہ "اکثریت کا اصول فی الحقیقت کوئی اخلاقی نوعیت نہیں رکھتا بلکہ مصلحت پر مبنی ہے اور اسی نقطہ نظر سے اس کی توجیہ کرنی چاہئے اگر اقلیت سے اس کو تسلیم کرانا ہے۔" (ص ۶۱)۔ ہندوستانی سیاست کے تقریباً تمام اہم مسائل ہندو مسلم مسئلہ کے ضمن میں اس کتاب میں بڑی خوبی اور صفائی کے ساتھ بیان کردئے گئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے ملک کے ارباب سیاست اور طلباء سیاسیات اس کتاب سے کماحقہ استفادہ کریں گے۔ ہم ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ان کی اس بے لوث خدمت پر جو اس کتاب کی تصنیف سے انھوں نے انجام

دی ہے، مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

The One party State مصنفہ پروفیسر بول چند صاحب۔ شائع کردہ منروا بک شاپ۔ لاہور۔ قیمت ۶ر

منروا بک شاپ لاہور کی جانب سے ایک سلسلہ سیاسی مسائل پر انگریزی زبان میں شائع ہو رہا ہے تاکہ کم داموں کے پمفلٹوں کے ذریعہ علم سیاست کے موضوع کے متعلق عام لوگوں کو معلومات فراہم کی جاسکیں۔ یہ رسالہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اس میں اٹلی، جرمنی اور روس کی حکومتوں کا حال بیان کیا گیا ہے اور جدید سیاست کے ایک پارٹی والے اصول کی تشریح کی گئی ہے۔ اگرچہ ان تینوں ملکوں کے موجودہ دستوروں کا مختلف قسم کے حالات میں نشو ونما عمل میں آیا لیکن ان میں ایک یہ بات مشترک پائی جاتی ہے کہ یہاں پارٹیاں زبردست تحرکوں کے ساتھ وابستہ ہیں جن کا مقصد صرف یہ نہیں کہ اپنے پروگرام کو پارلیمانی اور دستوری حدود کے اندر بروئے کار لائیں بلکہ وہ عوام الناس کی زندگی کے ہر رخ پر حاوی ہو جانا چاہتی ہیں۔ انگلستان اور امریکہ وغیرہ کی پارٹیوں کے برخلاف ان ملکوں میں مملکت اور پارٹی ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ فاضل مقالہ نگار نے بتلایا ہے کہ کس طرح روس، جرمنی اور اٹلی میں کن حالات میں ایک پارٹی کا نظام سیاسی وجود میں آیا اور کیوں پارلیمانی اور دستوری طرز کی پارٹیاں ان ملکوں میں گزشتہ بیس سال میں سرسبز نہ ہوسکیں۔ یہ رسالہ طلبا سیاسیات کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

The Minister as a King-Maker از جناب ڈاکٹر ایشور ناتھ صاحب ٹوپا۔ ناشر کتابستان۔ الہ آباد۔

اس کتاب میں ڈاکٹر ٹوپا صاحب نے کوتلیا کے فلسفۂ سیاست پر بحث کی ہے۔ کوتلیا کی کتاب ارتھ شاستر بادشاہوں کی رہبری اور ہدایت کے لئے لکھی گئی تھی تاکہ وہ اپنے تسلط واقتدار کو مستحکم کرسکیں۔ کوتلیا کا فاتح مملکت کا روح رواں ہے۔ اس نے فاتح اور معمولی بادشاہوں میں فرق کیا ہے۔ اگر کوئی بادشاہ اپنے حدود مملکت کو وسیع کرنے کی جدوجہد نہیں کرتا تو اس کو اس کے لئے

تیار رہنا چاہئے کہ دوسرے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنی مملکت کی حدود کو وسیع کریں گے۔
بقول ڈاکٹر ڈوپا صاحب کوتلیا کی ارتھ شاستر:

"اس کی قوت تجزیہ کا بین ثبوت ہے۔ اس سے کوتلیا کی فراست اور تنقیدی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس نے ارتھ شاستر میں اس سب مواد کا تجزیہ کر ڈالا ہے جو اس کو اپنے زمانے میں دستیاب ہو سکا۔ اس نے تمام سیاسی حقائق کو عقیدہ کے طور پر تسلیم نہیں کیا بلکہ تنقیدی طور پر اپنے زمانہ کی سیاست کا تجزیہ اور خلاصہ پیش کر دیا ہے۔"

کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں بنیادی مسائل بیان کئے گئے ہیں، دوسرے میں بادشاہت اور تیسرے میں مملکت پر بحث کی گئی ہے۔ انداز بیاں دلچسپ ہے۔ اور قدیم ہند کی سیاسیات و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مفید ہے۔

ہمارے مزدور از محمد عبدالقادر، بی۔ ایس۔ سی (اکنامکس) لندن۔ لکچرار شعبۂ معاشیات جامعہ عثمانیہ۔ شائع کردہ انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی۔ ۷۵ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔

اب تک معاشیات کے مختلف مسائل پر اُردو زبان میں بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ بہت سے ایسے لوگ ہمارے ملک میں موجود ہیں جو معاشی مسائل سے کافی دلچسپی رکھنے کے باوجود محض زبان کی دقت کی وجہ سے ان کے متعلق معلومات حاصل نہیں کر سکتے۔ زیر نظر کتاب معاشی لٹریچر میں ایک مفید اضافہ ہے اور اُردو داں طبقہ کے لئے بہت زیادہ مفید ثابت ہوگی۔
قابل مؤلف نے اپنے دیباچہ میں ان الفاظ میں کتاب کا مقصد بیان کیا ہے "ہمارے مزدور لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اُردو داں طبقہ کو ہندوستان کے کارخانوں کے مزدوروں کے اہم معاشی مسائل سے روشناس کرایا جائے۔"
اس سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا کہ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے اور زراعت پیشہ طبقہ کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہے گی لیکن پچھلے پچیس تیس سال کے عرصہ میں ہندوستان نے بہت کافی

صنعتی ترقی کی ہے اور صنعتی حیثیت سے دنیا کے ملکوں میں اس کا نمبر چھٹا ہے۔ پچھلی لڑائی کی وجہ سے ہمیں اپنی صنعتوں کو ترقی دینے کا موقع ملا تھا۔ موجودہ جنگ نے پھر ہمیں دوسرا زرین موقعہ دیا ہے۔ نئی نئی صنعتیں قائم کی جارہی ہیں اور جو صنعتیں پچھلی جنگ کے دوران میں قائم ہو چکیں تھیں انھیں اور زیادہ فروغ ہو رہا ہے۔ لیکن ہر ملک میں صنعتی انقلاب کے ساتھ ساتھ نئے نئے معاشی اور معاشرتی مشاغل بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ صنعتی مزدور بھی ایک اہم عامل پیدائش کی حیثیت اختیار کرتے جارہے ہیں اور اس لئے نئے نئے معاشی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ مولف صاحب نے انھیں مسائل کے متعلق نہ صرف معلومات فراہم کی ہیں بلکہ اکثر مسائل پر تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے۔ خاص خاص مسائل جن سے اس کتاب میں بحث کی گئی ہے یہ ہیں۔ صنعتی بے روزگاری۔ مزدوروں کی اجرتیں۔ مزدوروں کی کارکردگی۔ صنعتی فلاح و بہبود۔ صنعتی مزدور کی معیار زندگی۔ مزدور سبھا تحریک اور صنعتی جھگڑے۔

ظاہر ہے کہ اس مختصر سے رسالے میں ان مسائل پر تفصیل سے بحث کرنا ناممکن تھا اور نہ ہی ان کا مقابلہ دوسرے ممالک کے مسائل سے کیا گیا ہے لیکن اس میں عام دلچسپی کے لئے کافی مواد جمع کر دیا گیا ہے۔

کتاب آسان زبان میں لکھی گئی ہے اور طالب علموں اور عام پبلک دونوں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ ہماری معاشی و معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اس قسم کے مختصر رسالوں کے لکھوائے جانے کی سخت ضرورت ہے تا کہ عام لوگ ان سے مستفید ہو سکیں۔

(ا۔ م)

*

سیاست ۱ جنوری سنہ ۱۹۴۲ء

روح اقبال

از

جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب

اس کتاب میں جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے بڑی دقیقہ سنجی اور کاوش سے علامہ اقبال مرحوم کی شاعری اور فلسفہ کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ نہایت دقیق مضامین کے بیان کرنے میں بھی لطف زبان اور ادبیت کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یہ کتاب کئی سال کی محنت، فکر اور تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اس میں فکر اقبال کے مختلف پہلو جیسے آرٹ، فلسفہ، تمدن، مذہبی تصورات وغیرہ، سب ہی کچھ آگیا ہے۔ بلا مبالغہ یہ پہلی کتاب ہے جو شاعر مشرق کے شایان شان کہی جا سکتی ہے اور جس کی بدولت اُردو ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہوا ہے۔

(صفحات ۳۹۲، تقطیع ...... قیمت ۱۲ سکہ حیدرآباد
۸ سکہ انگریزی)

ناشر

سیّد عبدالقادر اینڈ سنز چارمینار

حیدرآباد (دکن)

عہد نبوی کی سیاست خارجہ کا نقشہ

از

جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب

پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تاریخ عالم میں ایک انقلابی نقطہ اور ایک عہد آفریں دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایران اور روم کی سلطنتیں دنیا پر چھا جانے کی کوشش میں باہم زندگی و موت کی آویزش میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ اگرچہ چین اور ہند میں بھی متمدن قومیں حکمران تھیں لیکن بحر متوسط اس زمانے میں بھی نہ صرف جغرافی اعتبار سے بلکہ سیاسی و معاشی حیثیت سے "وسط الارض" (میڈی ٹرانین) تھا۔ یونان اسی سمندر پر آباد ہے تو روم بھی، مصر و شام بھی اسی کے ساحل پر ہیں تو خود عرب کی شمالی سرحدیں اسی پر ختم ہوتی ہیں۔ ایران بھی اپنے حدود مملکت اس تک پہنچانے کی کوشش میں تھوڑی تھوڑی مدت کے لئے کئی بار کامیاب ہو چکا تھا۔ قدرت نے عرب کو ایشیا، یورپ اور افریقا کے تینوں براعظموں کے بیچوں بیچ پیدا کیا ہے اور اس عرب میں بھی مکہ آباد ساحلی علاقے کے وسط میں واقع ہے۔ اور یہ کوئی شاعری نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے کہ مکہ معظمہ ناف زمین پر آباد ہے اور پرانی دنیا کی کوئی عالمگیر تحریک اس سے بہتر مرکز مشکل سے پا سکتی ہے۔ یورپ کی سردیوں، افریقا کی گرمیوں اور ایشیا کی سرسبزیوں میں سے ہر ایک کا کچھ نہ کچھ حصہ حجاز کو عطا ہوا ہے اور اس امر نے وہاں والوں کو تینوں براعظموں کی اخلاقی خوبیاں عطا کر دی تھیں۔ جنگی نقطۂ نظر سے بھی اس سے محفوظ تر مقام کم مل سکتے ہیں۔

۱۳ ق ھ / ۶۱۰ء میں پیغمبر اسلام نے اپنے آبائی شہر مکہ میں اصلاح دین کی کوشش شروع

فرمائی اور معدودے چند لوگوں کے ہم خیال ہونے کے ساتھ ساتھ عام اہل ملک کی دشمنی اور عملی مخالفت میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ آخر تیرہ کٹھن سالوں کے اختتام پر ۱ھ ۶۲۲ء میں آپ کو وطن سے بے وطن ہو کر مدینۂ منورہ جا رہنا پڑا۔ جیسا کہ معلوم ہے نزاع میں آپ نے

حدود مملکت نبویہ بوقت صلح حدیبیہ ۶ھ
نقشہ عرب

توسیع مملکت نبویہ:—
۱ھ مدینہ و نواح
۲ھ بدر
۳ھ (زرہ و نجد)
۵ھ فید (نجد)
۵ھ قبیلہ کلب مقام عسفان
۶ھ قبیلہ کلب و یمامہ

ایک تنظیم پیدا کرنے اور ایک شہری مملکت کے قائم کرنے میں کامیابی حاصل فرمائی جس کا تحریری دستور تاریخ نے آج تک (۵۲) دفعات کی ایک دستاویز کی صورت میں محفوظ رکھا ہے۔[1]

---

[1] اس پر میرا مضمون "دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور" مجلہ طیلسانین حیدرآباد دکن، جولائی ۱۹۳۹ء

مدینہ آنے کے چند ہی مہینوں بعد آپ آس پاس کے قبائلی علاقوں کا دورہ فرمانے اور ان سے حلیفانہ تعلقات فرمانے لگے چنانچہ مدینے سے ینبع تک جو علاقہ ہے وہاں کے قبائل (بنی ضمرہ مُدلج وغیرہ) نے باوجود اسلام قبول نہ کرنے کے اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ اگر کوئی مدینے پر حملہ آور ہو تو یہ مسلمانوں کو مدد دیں اور اگر ان کے علاقے پر کوئی چڑھائی کرے تو مسلمان ان کو مدد دیں البتہ جارحانہ پیش قدمی میں غیر جانبداری برتی جائے[1]۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں سے کاروانی قافلے گزرا کرتے تھے اور مکے والے اگر شام، مصر یا عراق جانا چاہتے تو اسی راستے سے گزرتے تھے۔ اس راستے کی بندش قریش پر معاشی دباؤ ڈالنے میں اتنی موثر ثابت ہوئی کہ بدر کی فاش شکست بھی انھیں اتنا بے بس نہ کرسکی۔ ۳ھ میں اُحد میں مسلمانوں کو صدمہ پہنچا لیکن فوراً ہی انھوں نے اس کی تلافی یوں کی کہ نجد کے علاقے میں جو مدینے کے مشرق میں ہے، اپنے اثرات پھیلادئے اور مکے والوں کو عراق جانے کا جو متبادل گو تکلیف دہ راستہ باقی رہ گیا تھا وہ بھی بند ہوگیا۔ اسی اثناء میں بنی قَینُقاع اور بنی النَضیر کے یہودی مضافاتِ مدینہ سے جلاوطنی پر مجبور ہوئے تو انھوں نے مدینے کے شمال میں خیبر وغیرہ کی یہودی بستیوں میں جاکر بسنا اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنی شروع کیں اور قریش وغطفان وغیرہ قبائل کو ورغلا [illegible] آغاز کیا۔ عرب کے شمال میں دومۃ الجندل ایک بڑا اہم کاروانی جنکشن تھا۔ مدینہ آنے والے کاروانوں کو یہاں چھیڑا جانے لگا[2] جو کوئی تعجب نہیں کہ یہودی سرمایہ داروں کے اثرات ہی کے باعث ہو۔ اور انھیں یہودیوں کی کوشش سے غطفان وفزارہ نے ایک طرف سے اور قریش اور ان کے حلیفوں نے دوسری طرف سے خَندَق کے معرکے میں مدینے کا محاصرہ کیا اور انتظام کرلیا گیا کہ عین نازک لمحے میں مدینے کے اندر کے مابقی یہودی یعنی

---

[1] ان کے متن کے لئے دیکھئے میری عربی تالیف الوثائق السیاسیہ (قاہرہ ۱۳۶۰ھ)

[2] التنبیہ والاشراف للمسعودی ص ۲۴۸

بنی قُریظہ بھی غداری کریں۔ جب کسی طرح یہ بلا ٹلی اور بنی قُریظہ کو اپنے کیے کی بھگتنی پڑی تو خیبر وتیماء اور وادی القریٰ ومقنا وغیرہ کے یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف نئے سرے سے شدید جدوجہد کا آغاز کیا۔

یہ مسلمانوں کے لئے بڑا نازک زمانہ تھا۔ شمال میں خیبر وغیرہ یہودی قوت کے مرکز تھے۔ شمال مشرق میں فزارہ وغطفان کے قبایل خیبر والوں کے حلیف تھے اور ان کی مسلمانوں سے بنتی نہ تھی اور جب موقع ملتا یہ مسلمانوں کی تاخت کے درپے رہتے تھے[1]۔ جنوب میں مکّہ تھا جس کی قوت چاہے معاشی طور سے متاثر ہوئی ہو، جنگی حیثیت سے برقرار تھی اور یہ سب کے سب غم وغصہ سے بے قرار اور مسلمانوں کے خلاف خار کھائے بیٹھے تھے اور سابقہ ناکامیوں کی جلن الگ تھی۔ آثار یہ نظر آرہے تھے کہ خیبر میں جا بسے ہوئے (جلا وطنان مدینہ یعنی) بنی النضیر کی کوششیں رنگ لائیں گی اور یہود، غطفان اور قریش کی سہ گانہ قوت مدینے پر ہلہ بول دے گی جس کی مدافعت آسان نہ تھی۔ معرکۂ خندق میں دس ہزار کا لشکر مدینے پر چڑھ آیا تھا جس میں یہود شریک نہ تھے۔ مجوزہ حملے میں کچھ نہیں تو تین چار ہزار مزید سپاہیوں کا اضافہ ہو جاتا۔ خندق میں جوان اور بچے ملا کر مسلمانوں کے پاس کوئی تین ہزار آدمی تھے۔ اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔

ضرورت تھی کہ خیبر اور مکّہ دونوں کی قوت کا استیصال کیا جائے مگر مسلمانوں کے پاس اتنی قوت نہ تھی کہ وقت واحد میں ان دونوں مرکزوں پر حملہ کر سکتے یا کم از کم مدینے کی مدافعت کے قابل محافظ دستہ چھوڑ کر کسی ایک مرکز کو تباہ کر سکنے والی فوج روانہ کر سکتے۔ ساتھ ہی اس کا بھی خوف لگا ہوا تھا (جیسا کہ شمس الائمہ سرخسی نے کتاب المبسوط[2] میں نہایت بالغ نظری اور تہ بینی سے واضح کیا ہے) کہ اگر مسلمان مکہ جاتے ہیں تو خیبر وغطفان مدینے پر چڑھ نہ دوڑیں

---

[1] عُیینہ بن حصن الفزاری کی تاخت مدینہ وغیرہ کی طرف اشارہ ہے۔ [2] جلد ۱۰ ص ۸۶

اور اگر مسلمان خیبر جائیں تو مکہ والے اپنے حواشی و موالی کے ساتھ آکر مدینہ لوٹ نہ لیں۔ کیونکہ مدینہ بیچوں بیچ واقع ہے۔ خیبر اس کے شمال میں کوئی آٹھ منزل کی مسافت پر ہے تو مکہ اس کے جنوب میں بارہ منزل پر ہے۔

ان حالات میں سیاست دانی کا اقتضا یہی ہو سکتا ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک دشمن سے صلح کر کے دوسرے کے مقابلے میں اس کو دوست ورنہ کم از کم ناطرفدار بنا دیا جائے اور جب ایک سے فراغت ہو جائے گی تو دوسرا تو وہیں ہتھیار ڈال دے گا اور پھر اسے سرزوری کی جرأت نہ ہوگی۔ سوال یہ تھا کہ صلح مکے والوں سے کی جائے یا خیبر والوں سے؟ خیبر کے حلیف و معاون یعنی فزارہ و غطفان محض لوٹ مار کے شائق اور بالکل بے اصول خانہ بدوش عرب تھے۔ خیبر میں یہودی تھے جو تمدنی اور نسلی وجوہ سے عربوں سے الگ تھے۔ ان کو اپنی جلاوطنی اور جائداد کے لٹنے کا داغ تھا جو جائداد کی واپسی کے بغیر مٹ نہ سکتا تھا۔ سرمایہ داری کی وجہ سے کوئی معمولی "مابہ الاحتفاظ" ان کو مطمئن نہ کر سکتا تھا اور نہ ہی ان کی بات پر کوئی اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ خیبر کا مالدار مرکز ایک نسبتہً غیر جنگجو قوم کے قبضے میں ہونے سے آسان تر مال غنیمت بھی تھا۔

دوسری طرف مکہ مسلمانوں کے لیے بہت سی رعایتوں کا متقاضی تھا۔ مسلمان مہاجرین سب مکی ہی تھے اور اہل مکہ ان کے رشتہ دار۔ کعبہ مسلمانوں کی نماز کا قبلہ اور حج کی منزل مقصود تھا۔ اہل مکہ کی تباہی سے زیادہ ان کا اسلام زیادہ مفید ہو سکتا تھا۔ کیونکہ قریش کے معاشی اور تمدنی تعلقات تمام عرب سے تھے۔ اور ان کی صلاحیتیں پورے عرب میں سب سے زیادہ تھیں کیونکہ ان میں بات کا پاس تھا، وہ دھن کے پکے تھے، قومی مفاد کے لیے تن من دھن سے لگ جاتے تھے، طبیعت مہمات پسند تھی، ادبی ذوق اور انتظام ملک کی قابلیت وغیرہ بھی عام بدویوں کے مقابلے میں ان میں کہیں بڑھا ہوا تھا۔ اور شاید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے معاشی دباؤ کے باعث اب وہ واقعی صلح پر آمادہ بھی ہو چکے تھے اور طرف

لاج رکھنے کے لئے کسی اچھی شرط کے منتظر تھے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں حجاز میں سخت قحط پڑا تھا اور مکے والوں کی رسد کے مرکز یمامہ پر بھی مسلمانوں کا (ثمامہ بن اُثال کے اسلام لانے کے باعث) قبضہ ہو کر درآمد بند ہو گئی تھی[1]۔ رسول کریمؐ نے اس بندش کا اثر محسوس کرا دینے کے بعد اپنی مرضی اور اختیار سے ممانعت اٹھا کر[2] نیز مکے والوں میں سے غربا و فقراء کی امداد کے لئے سرمایۂ قحط میں اسی زمانے میں پانچ سو اشرفیاں روانہ کر کے[3] وہاں کے عوام کے دل موہ لئے تھے اور مکے کے سب سے بڑے اور با اثر سردار ابوسفیان کی لڑکی بی بی ام حبیبہؓ سے جو حبشہ گئی ہوئی تھیں اسی زمانے میں عقد غائبانہ کر لیا تھا نیز مختلف سامان ضرورت (کھجور وغیرہ) ابوسفیان کو "ہدیہ" بھیج کر معاوضہ میں جانوروں کی کھالیں طلب کی تھیں[4]۔ غرض باوجود حالتِ جنگ قائم رہنے کے یہ خاموش دلدہی کے کام جاری تھے۔ قریش کے حج کا زمانہ بھی آ گیا تھا جس میں وہ مسلسل تین ماہ تک لڑائی بھڑائی حرام سمجھتے اور اس میں ان کا سخت ترین دشمن بلکہ قابلِ قصاص ملزم بھی ان کے شہر میں انھیں ملتا تو اس پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ مسلمانوں نے بھی قریش ہی کے کعبہ کو اپنا قبلہ بنا لیا تھا اور حج کعبہ کو بھی اپنے دین کا جزء بنا لیا تھا جس کا نفسیاتی اثر قریش پر پڑے بغیر رہ نہ سکتا تھا۔

ان حالات میں معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریمؐ نے یہ سوچا کہ اگر حج کے مہینوں میں مکہ جائیں اور ارادہ طواف کعبہ اور قربانی و عمرہ کے لئے ہو اور قریش کو منہ مانگی شرطیں پیش کی جائیں تو کوئی تعجب نہیں جو وہ صلح پر آمادہ ہو جائیں۔ اور اتفاق سے اسی زمانے میں نینوہ کے مقام پر ایران و روم کی صدیوں سے چلی آنے والی جنگ ایران کی مکمل اور قطعی شکست پر

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ص ۹۹۷ تا ۹۹۸۔ استیعاب ابن عبد البر، سوانح عمری ص ۲۷۸
[2] ایضاً
[3] مبسوط سرخسی جلد ۱۰ ص ۹۱ تا ۹۲۔ شرح السیر الکبیر سرخسی جلد ۱ ص ۶۹
[4] مبسوط سرخسی جلد ۱۰ ص ۹۲۔ شرح السیر الکبیر سرخسی جلد ۱ ص ۷۰

منتج ہوئی تھی[1] اور کچھ اور نہیں تو عرب میں جو "لاوارث" ایرانی صوبے مثلاً یمن، بحرین اور عمان تھے، ان کے متعلق حسب دلخواہ کارروائی کرنے کا اس بین الاقوامی صورت حال کے باعث ایک خداداد اور نادر موقع بھی ہاتھ آگیا تھا۔ یمامہ پر قبضہ کے باعث مسلمان پہلے ہی بحرین و عمان کے قریب پہنچ گئے تھے۔ قریش کا ہموار ہونا یمن کا راستہ بھی کھول دیتا تھا اور رومیوں کی نینوہ میں کامیابی ابھی فی الحال شمال میں کسی بڑی کارروائی میں مانع تھی۔

ہمیں معلوم ہے کہ مدینے میں قابل کار مسلمان مرد تقریباً تین ہزار تھے۔ اب ذی قعدہ کے مہینے میں رسول کریمؐ چودہ سو آدمیوں کے ساتھ مدینے سے چلتے ہیں۔ حج کا احرام بندھا ہوا ہے۔ ساتھ قربانی کے جانور ہیں۔ اور ارادہ محض مسالمانہ ہے اس لئے ساتھ جنگی ہتھیار تک نہیں ہیں (البتہ کچھ دور جانے کے بعد حضرت عمرؓ کے مشورہ سے احتیاطاً مدینے سے فوجی مخزن منگالیا جاتا ہے[2] جو ساتھ تو رہتا ہے مگر بند حالت میں)۔ مسلمان کافی فوج مدینے میں چھوڑ گئے تھے اور خاموشی کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں سے حدودِ حرم شروع ہوتے ہیں۔ جہاں سے ساحلی میدان ختم ہو کر دشوار گزار وادیاں اور پہاڑی سلسلے شروع ہوتے ہیں۔ مکے والوں کو اطلاع مل گئی تھی اور جنگی نقطۂ نظر سے حدیبیہ کے درّے کے دہانے پر حریف کو روکنے سے بہتر ان کے لئے کوئی اور مقام نہیں مل سکتا تھا۔ یہ جگہ مکہ سے صرف دس بارہ میل پر واقع ہے اور ایک طرح قریش اپنے گھر ہی میں رہ کر دور دراز سے آئی ہوئی اور ہر طرح کی رسد اور مدد سے منقطع اسلامی فوج سے لڑ سکتے تھے۔

حدیبیہ میں آتے ہی سفارتی سرگرمی شروع ہوگئی۔ قریش کے نمایندے اور کارندے آ آ کر مقصد معلوم کرنے لگے۔ آخر رسول کریمؐ نے اپنے داماد حضرت عثمانؓ کو مکہ بھیجا کہ مختار کل کی حیثیت سے گفت و شنید کریں۔ مکے میں عجیب بدنظمی تھی اور کوئی مرکزیت نہیں پائی جاتی

---

[1] دیکھئے گرلانڈ کی جرمن کتاب "قیصر ہرقل کی جنگی مہیں"۔

[2] تاریخ طبری ص ۱۵۳۱

تھی۔ ان کا سب سے با اثر سردار ابو سفیان بھی کسی نامعلوم راستے سے چھپ چھپا اور بچ بچا کر ان دنوں شام گیا ہوا تھا۔ اسی لئے حضرت عثمانؓ نظر بند ہو گئے اور ان کی واپسی میں دیر ہوئی تو مسلمانوں کو خوف ہوا کہ کہیں انھیں شہید نہ کر دیا گیا ہو۔ اب مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور حدیبیہ میں انھوں نے مرنے مارنے کا اقرار کیا جس کا "اِذ یُبایعونک تحت الشجرۃ" کے الفاظ میں قرآن مجید میں بھی ذکر ہے۔ قریش کو خبر ملی تو وہ گھبرائے آخر صلاح کر کے انھوں نے سُہیل بن عمرو کو مختار کل کر کے سفیر بنا کر حدیبیہ بھیجا اور تھوڑی سی رد و قدح کے بعد صلحنامہ طے ہو گیا۔ قریش کو اطمینان ہو گیا کہ ان کا مطالبہ کہ:۔

۱۔ مسلمان اس سال مکہ آئے بغیر واپس ہو جائیں اور سال آئندہ عمرہ کرنے آئیں۔

۲۔ کوئی مسلمان بھاگ کر مکہ آئے اور پناہ گزین ہو تو اس کی تحویل عمل میں نہ آئے لیکن کوئی مکی بھاگ کر آنحضرتؐ کے پاس آئے تو مطالبہ پر اس کی قریش کے ہاتھ تحویل عمل میں آجائے۔

۳۔ دس سال تک باہم صلح رہے۔ ایک دوسرے کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں اور تجارت وغیرہ مسالمانہ ضرورتوں سے ایک دوسرے کے علاقے سے گزرنے کی اجازت ہو۔

اسے سب مسلمانوں نے منظور کر لیا اور معاہدہ کے متن میں بجائے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے خالص اسلامی فارمولے کے قریشی فارمولا "باسمک اللھم" لکھا جانا اور "محمد رسول اللہ" کی جگہ "محمد بن عبد اللہ" لکھا جانا طے ہوا تو گویا فتح قریش ہی کی ہوئی اور انھیں دبنا پڑا۔ اور بظاہر یہ صحیح بھی تھا اور مسلمان سپاہیوں میں عام طور پر رنج کی لہر دوڑ گئی حتی کہ حضرت عمرؓ جیسے دقیقہ رس مدبر بھی اپنی بے چینی کو چھپا نہ سکے لیکن مسلمانوں میں نظم و ضبط اتنا کچھ آچکا تھا کہ جب آنحضرتؐ نے فرمایا کہ یہ طے ہو چکا ہے اور آپؐ اس کو پسند کرتے ہیں تو پھر کسی کی مجال نہ تھی کہ سوائے خاموشی اور اطاعت شعاری کے کچھ اور کر سکیں۔

حدیبیہ کی اس صلح (یا بقول قریش "شکست") کو قرآن مجید میں مسلمانوں کے لئے "فتح مبین" اور "نصر عزیز" کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ بادی النظر میں حیرت

ہوتی ہے کہ یہ "برعکس نہند نام زنگی کا فور" کیوں؟ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلامی حکومت تو قریش کی منہ مانگی شرطیں منظور کرنے تیار تھی صرف خیبر سے جنگ میں ان کی غیر جانبداری مطلوب تھی۔ اسے قریش نے منظور کر لیا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ رعایتیں منظور کرلی تھیں۔ "باسمک اللّٰھُمَّ" کے فارمولے میں کوئی شرک یا بت پرستی نہیں ہے اور اس کو نیز "محمدؐ بن عبد اللہ" کو منظور کرنے میں مسلمانوں کا کوئی نقصان نہ تھا۔ اسی طرح عمرے میں رکاوٹ معمولی امر ہے اور "مَن استطاع الیہ سبیلا" کے باعث اس وقت وہ مسلمانوں پر فرض ہی نہ تھا۔ یک طرفہ تحویل ملزمین کی توجیہہ خود جناب رسالتؐ نے یہ فرمائی کہ ہمارے پاس سے بھاگ کر جانے والا کافر ہی ہوگا ہمیں اس کی ضرورت نہیں اور قریش کے پاس سے بھاگ کر آنے والا مسلمان ہی ہوگا اور اگر وہ اپنے ہموطنوں کے مظالم پر صبر کرے گا تو خدا اسے اجر دے گا۔ یوں بھی چند ہی دنوں میں اسلامی عملداری سے باہر نومسلموں نے قریشی کاروانوں کا کچھ وہ ناطقہ تنگ کیا کہ خود قریش نے جناب رسالتؐ سے التجا کی کہ اس شرط کو منسوخ کرکے ان نومسلموں کو مدینہ بلالیں۔ اور تیسری شرط تو مسلمان خود ہی چاہتے تھے کہ قریش مسلمانوں سے صلح کریں اور مسلمانوں کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں۔ اور اس میں ذرا بھی شبہ نہیں رہتا کہ مسلمانوں کے لئے سخت ترین نازک زمانے میں حدیبیہ میں قریش کا اس صلح پر آمادہ ہوجانا اسلامی سیاست خارجہ کی ایک واقعی "فتح مبین" "نصر عزیز" تھی، جس کے باعث ان کے ہاتھ کھل گئے اور فوری خطرات پر نجات ملنے پر انھوں نے آزادی کے ساتھ تین ہی سال میں پر امن ذرائع سے اپنی مملکت کو تقریباً دس گنا پھیلا کر پورے جزیرہ نمائے عرب کو اپنا مطیع بنالیا اور وہاں سے رومی اور ایرانی اثرات بالکل خارج کرکے ایک ایسی مستحکم حکومت قائم کردی جو پندرہ ہی سال میں تین براعظموں پر پھیل گئی۔ اور جو اس سے ٹکرایا پاش پاش ہوکر رہ گیا اور جس نے سر تسلیم خم کیا وہ اسلام کے رنگ و زبان سے بالا قومیت میں برابری کے حصے کے ساتھ شریک ہوگیا۔

یہی وہ صلح حدیبیہ ہے جسے عہد نبوی کی سیاست خارجہ کا شہ کار کہنا چاہئے!

اس معاہدہ کا متن عربی ماخذوں میں کہیں تو پورا پورا، کہیں جستہ جستہ ملتا ہے جس کی تفصیل میں نے الوثائق السیاسیة (مطبوعہ مصر ۱۳۵۶ھ) میں دستاویز ۱۱ کے تحت دی ہے۔ یہاں اس کا ترجمہ کافی ہوگا:۔

معاہدۂ حدیبیہ

ف ۱۔ تیرے نام سے اے اللہ!

ف ۲۔ یہ وہ معاہدہ ہے جو محمدؐ بن عبد اللہ اور سُہیل بن عمرو میں طے ہوا۔

ف ۳۔ ان دونوں نے اس بات پر صلح کرلی ہے کہ دس سال تک جنگ روک دی جائے جس دوران میں لوگ امن سے رہیں۔ اور ایک دوسرے سے رُکیں رہیں۔

ف ۴۔ یہ کہ محمدؐ کے ساتھیوں میں سے جو حج یا عمرے یا تجارت کے لئے مکہ آئے تو اس کی جان ومال کا امان ہوگا اور قریش کا جو شخص تجارت کے لئے مصر یا شام ——— (بروایت ابوعبید عراق یا شام) ——— جاتے ہوئے مدینے سے گزرے تو اسے جان ومال کا امان حاصل ہوگا۔[1]

ف ۵۔ یہ کہ قریش کا جو شخص اپنے ولی (سرپرست) کی اجازت کے بغیر محمدؐ کے پاس آئے گا تو آپ اسے ان کے سپرد کردیں گے۔ اور محمدؐ کے ساتھیوں میں جو شخص قریش کے پاس آجائے گا وہ اسے آپ کے سپرد نہیں کریں گے۔

ف ۶۔ یہ کہ ہم میں باہم سینے ہر طرح بند رہیں گے (جن میں باہر سے کوئی غداری داخل نہ ہوسکے گی) اور نہ تو خفیہ کسی دوسرے کو مدد دی جائے گی نہ علانیہ خود خلافِ عہد دغا کرینگے۔

ف ۷۔ یہ کہ جو محمدؐ کے معاہدہ اور ذمہ داری میں داخل ہونا چاہتا ہے وہ بھی ایسا کرسکے گا۔

(اس پر قبایل خزاعہ نے اٹھ کر کہا کہ ہم محمدؐ کے معاہدہ
اور ذمہ داری میں شریک ہوتے ہیں اور بنی بکر نے کہا کہ ہم
قریش کے معاہدہ اور ذمہ داری میں شریک ہوتے ہیں)

---

[1] یہ دفعہ ابن اسحاق اور ابن ہشام میں نہیں ہے، نہ ہی تاریخ طبری میں۔ لیکن تفسیر طبری، ابوعبید کی کتاب الاموال، فتوح البلدان اور بکری وغیرہ میں ہے۔

ف ۵۔ یہ کہ تو اس سال ہمارے پاس سے واپس چلا جائے گا اور ہمارے ہاں مکہ نہ آئے گا البتہ سال آئندہ ہم باہر چلے جائیں گے اور تو اور تیرے ساتھی وہاں (مکے میں) داخل ہو کر تین راتیں ٹھیر سکیں گے۔ تیرے ساتھ سوار کا ہتھیار ہوگا یعنی تلوار میان میں پڑی ہوئی۔ اس کے سوا کوئی اور ہتھیار لے کر تو وہاں نہ آسکے گا۔

ف ۹۔ یہ کہ یہ قربانی کے جانور وہیں رہیں گے جہاں ہم نے ان کو پایا (یعنی حدیبیہ میں) اور ان کو حلال کر دیا جائے گا اور ان کو ہمارے پاس (مکہ قربانی کے لئے) نہیں لایا جائے گا۔

(غالباً) مہر نبویؐ

اور صراحت کہ ہمارے اور تمہارے حقوق اور واجبات برابر کے ہونگے۔

(غالباً) مہر سُہیل بن عَمرو

گواہان اسلام: ابو بکرؓ، عمرؓ، عبد الرحمٰن بن عوف، عبد اللہ بن سُہیل بن عَمرو، سعد بن وقاص، محمود بن مسلمہ، ابو عبیدۃ بن الجراح وغیرہ۔

گواہانِ قریش: مکرز بن حفص، وغیرہ

کاتب: علیؓ بن ابی طالب

ماخذ ہائے متن: ۔ تفسیر طبری ص ۲۶ ص ۶۱۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۷۴۷ تا ۷۴۸، فارسی ترجمہ سیرۃ ابن اسحٰق ورق ۱۷۷/ب (مخطوطہ پاریس)۔ مغازی واقدی (مخطوطہ برٹش میوزیم) ورق ۱۴۷/ا۔ طبقات ابن سعد ج ۱ حصہ ۲ ص ۷۴ نیز ج ۲ حصہ ۱ ص ۷۰ تا ۷۱۔ تاریخ طبری ص ۱۵۴۶ تا ۱۵۴۷۔ سیرۃ طبری بروایۃ الکبریٰ (مخطوطہ آیاصوفیا) فصل حدیبیہ تاریخ ابن کثیر ص ۴ ص ۱۶۸ تا ۱۶۹۔ تاریخ الخمیس للدیار بکری ج ۲ ص ۲۳۔ تاریخ ابن الاثیر ج ۲ ص ۱۵۶۔ سیرۃ حلبی ج ۳ ص ۲۳۳۔

ماخذ ہائے اقتباس متن: ۔ کتاب الاموال لابی عبید ص ۱۴۴ تا ۱۴۴۔ صحیح البخاری

٦۴/٣۴ ، ٦۴/٢٩/٣٥ ، ٥٣/٤٦ ، ۴/٥٤ وغیرہ۔ من کتب سید المرسلین لابن طولون ۲٦۔ فتوح بلاذری ص ٣٦۔ تاریخ الیعقوبی ج ۲ ص ۵۵۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد۔

جدید بحث و ترجمہ:۔ کائتانی کی اطالوی تاریخ اسلام حالات ٦ھ ص ٣۴۔

ہیننگ کی جرمن کتاب "اسلام کا قانون خارجہ" ضمیمہ دوم۔ اشپرنگر کی جرمن "سوانح و تعلیمات محمدی" ص ٣ ص ۲۴٦ جہاں تیمی کے ایک اور متن کا ذکر ہے، نقل نہیں۔ مجید خدوری کی انگریزی کتاب "اسلام کا قانون جنگ و امن" ص ۸۹

مزید حوالے ونسنک کی مفتاح کنوز السنہ میں تحت عنوان حدیبیہ ہیں۔

مالیات عامہ اور ہندوستانی مالیات

از

جناب ڈاکٹر جعفر حسن صاحب۔ پی، ایچ، ڈی صدر شعبۂ عمرانیات
جامعہ عثمانیہ سرکار عالی

مالیات عامہ آمدنی کے ذرائع

جہاں تک کہ آمدنی کا تعلق ہے سرکاری مالیات (پبلک فینانس) اور خانگی مالیات (پرائیویٹ فینانس) میں یہ نمایاں فرق ہے کہ خانگی میں اہم ترین شئے آمدنی ہوتی ہے اور آمدنی کو اخراجات کا تابع رہنا پڑتا ہے یعنی یہ کہ خانگی معاملوں میں انسان کو آمدنی کی نسبت سے اخراجات کرنے چاہئیں۔ اس کے برخلاف سرکاری مالیات میں اخراجات کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اور ضروری اخراجات کے اندازہ سے آمدنی حاصل کرنی چاہیئے۔ عام طور پر دنیا اور ہندوستان میں بھی حکومتوں کے ذرائع آمدنی چار ہوتے ہیں۔

۱۔ سرکاری ملکیت مثلاً جنگل، زمین، تالاب، آبشار۔

۲۔ تجارتی کاروبار اور تجارتی اداروں کا منافعہ مثلاً ریل، محکمہ ڈاک و تلغراف، سرکاری کارخانے، کاروبار یا کمپنیوں کے حصے وغیرہ۔

۳۔ تنظیمی محکموں کی آمدنی مثلاً عدالت۔

۴۔ محصول یا ٹیکس۔

جدید زمانہ میں حکومتوں کے فرایض

یہ جدید عہد ہی کی خصوصیت ہے کہ حکومتیں اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کی خاطر ہر امکانی ذریعہ سے آمدنی حاصل

کرنا چاہتی ہیں: کمپنیوں کے حصے خریدنا، تجارتی کاروبار جاری کرنا اور نفع بخش اداروں کو قایم کرنا موجودہ عہد ہی کی خصوصیت ہے۔ آمدنی میں اضافہ کرنے کی خواہش، ہوس دولت نہیں ہے بلکہ ضرورت! گذشتہ زمانوں میں حکومت کے فرایض محدود تھے، اب نظریہ سلطنت اور تخیل حکومت وہ نہیں رہا جو عہد قدیم یا قرون وسطیٰ میں تھا۔ اُس زمانہ میں حکومت کا اہم ترین فریضہ سپاہی یا پولیس والے کی خدمت انجام دینا اور ملک کو بیرونی حملوں اور اندرونی فسادوں سے محفوظ رکھنا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض دوربیں، دردمند، عاقل حکمرانوں نے اس زمانے میں بھی ملک کی مرفہ الحالی کے لئے سرکاری طور پر بہت کچھ کیا تھا۔ مگر پھر بھی قرون وسطیٰ اور عہد قدیم میں وہ تنظیم نہیں تھی جو موجودہ زمانہ میں نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر بے روزگاروں کی امداد ہی کو لیجئے۔ بعض ہمدرد بادشاہوں نے گذشتہ زمانوں میں قحط سالی کے وقت لاکھوں روپیہ محض لوگوں کی جان بچانے کے لئے خرچ کیا تھا مگر پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ان کا آئینی فرض نہیں بلکہ ایک طرح کا احسان تھا برخلاف اس کے موجودہ زمانہ کے مہذب ملک مثلاً انگلستان، امریکہ اور جرمانیہ میں حکومتوں کا آئین سلطنت کے اعتبار سے یہ فرض ہے کہ وہ ہر اس شخص کی امداد کرے جو خود اپنی مدد نہ کرسکتا ہو چنانچہ بے روزگاروں کو اسی مقررہ و معینہ اصول کے اعتبار سے ہفتہ واری رقمی امداد دی جاتی ہے۔

بہر طور حکومتوں کے فرایض کی تعداد میں اضافہ ہوگیا ہے اور ان کی اہمیت بھی بڑھ گئی ہے اس کا فریضہ نہ صرف ملک کی حفاظت کرنا ہے بلکہ قوم کی مرفہ الحالی کے لئے ان تھک کوشش کرنا ہے۔ موجودہ زمانہ میں تمام متمدن ملکوں کی حکومتیں قومی بہبودی کی ذمہ دار ہیں۔ ان کا راہ نما ستارہ خدمت گزاری ہے اور ان کا نصب العین مرفہ الحالی ہے! ظاہر ہے کہ ان گوناگوں فرایض کی انجام دہی کے لئے اور اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے ان حکومتوں کو بھی کثیر آمدنی کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ آمدنی کیونکر حاصل کی جاتی ہے یا یہ کہ اس آمدنی کو کیونکر حاصل کرنا چاہیئے؟ اضافہ آمدنی کے لئے متمدن ملکوں کی حکومتیں کیا کیا طریقے اختیار کرتی

ہیں ؛ حاصل کردہ آمدنی کو کس طرح خرچ کیا جاتا ہے اور اسے کس طرح خرچ کرنا چاہیئے ؛ اس قسم کے سوالوں پر مالیات میں بحث ہوتی ہے۔

اس مضمون میں میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ نظری مالیات کے اصول تفصیل سے پیش کئے جائیں، میرا مقصد صرف یہ ہے کہ مالیات عامہ کی روشنی میں ہندوستانی مالیات کی حقیقت واصلیت بیان کروں اور ہندوستانی مالیات سے متعلقہ بعض مسئلوں پر اپنے مطالعہ کا ماحصل بیان کروں۔ صرف تسلسل بیان کی خاطر میں نے مختصر طور پر بیان کر دیا کہ موجودہ زمانہ میں حکومتوں کا مسلک قوم اور عوام کی ہر جہتی فلاح ہے اور اس غرض کی تکمیل کے لئے حکومتوں کو کثیر آمدنیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور عام طور پر حکومتوں کو (۱) سرکاری ملکیت (۲) تجارتی یا نیم تجارتی نوعیت کے کاروبار (۳) نفع بخش تنظیمی اداروں اور محصول یا ٹیکس سے آمدنی ہوتی ہے۔

مرکزی حکومت ہند کی آمدنی موجودہ دستور کے مطابق مرکزی حکومت ہند کے ذرایع آمدنی میں کروڑ گیری (درآمد و برآمد کا محصول) آبکاری، دیسی ریاستوں کا خراج، افیون، کرنسی اور سکہ سازی، ڈاک خانہ اور تار گھر، مالگزاری، اسٹمپ وغیرہ داخل ہیں۔ ان میں بھی اہمیت صرف کروڑ گیری، آمدنی محصول، نمک، کارپوریشن ٹیکس، دیسی ریاستوں کے خراج اور ریلوں کو حاصل ہے۔

مرکزی حکومت ہند کی راست حکمرانی میں جتنے علاقے ہیں مثلاً دہلی اور نواح دہلی (صوبہ دہلی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے) بلوچستان، اجمیر وغیرہ ان سے جتنی آمدنی حاصل ہوتی ہے وہ بھی مرکزی حکومت کو ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مالگزاری، زراعت، عدالت، آبپاشی، رجسٹریشن، صنعت و حرفت وغیرہ سے بھی آمدنی وصول ہوتی ہے۔ یہ البتہ صحیح ہے کہ مرکزی حکومت ہند کے یہ غیر اہم ذرایع آمدنی ہیں۔

موجودہ دستور کے مطابق بعض ذرایع آمدنی مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت کے مشترک ذرایع آمدنی ہیں مثلاً آمدنی محصول جس سے ۱۹۳۷-۳۸ء میں مرکزی حکومت کو ۱۲ ۱/۲ کروڑ

اور صوبوں کو ½ ۱ کروڑ ملا تھا۔ اسی طرح آبکاری اور نمک کی آمدنی میں سے تقریباً ایک کروڑ صوبوں کو ½ ۸ کروڑ مرکزی حکومت ہند کو ملے تھے۔

خالص مرکزی حکومت کے ذرایع آمدنی صرف ریلیں، ڈاک خانہ، تار گھر، افیون، سکہ سازی، کرنسی، پرواز اور ہندوستان کی دیسی ریاستوں کا خراج ہے۔

صوبائی حکومتوں کے خاص ذرایع آمدنی مالگزاری، عدالتی سٹمپ، آبکاری، جنگل، آبپاشی، رجسٹریشن ہیں مگر ان ذرایع سے مرکزی حکومت کو بھی آمدنی وصول ہوتی ہے۔ کیونکہ اُس کی راست حکمرانی میں جو علاقے ہیں ان کی کل آمدنی اسے بھی ملتی ہے۔ لہذا ظاہر ہے کہ جو ذرایع آمدنی صوبائی حکومت کے ہیں ان سے کچھ نہ کچھ آمدنی ہوتی ہے۔ پھر بھی یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ مالگذاری، جنگل، رجسٹریشن، زراعت، آبپاشی وغیرہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے مشترک ذرایع ہیں کیونکہ مرکزی اور صوبائی حکومتیں اپنے اپنے علاقوں کی متعلقہ آمدنی حاصل کرتی ہیں۔ اس کے برخلاف آمدنی محصول کا بہت بڑا حصہ مرکزی حکومت کو ملتا ہے۔

مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کے ذرایع آمدنی کی جدولوں پر نظر ڈالنے سے خاص اور مشترک ذرایع کا فرق زیادہ آسانی سے ذہن نشین ہو جائے گا اسی لئے ہم زیادہ تفصیل سے تشریح کرنے کی بجائے مرکزی حکومت ہند کی آمدنی بیان کرتے ہیں

مرکزی حکومت ہند کے متعلق جدید ترین اعداد سنہ ۴۱-۱۹۴۰ء کے بجٹ سے حاصل کئے گئے ہیں۔ اس بجٹ میں تین سالوں کے متعلق اعداد دئے گئے ہیں سنہ ۴۱-۱۹۴۰ء کے اعداد محض بجٹ کے مطابق اندازہ ہیں سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء کے اعداد ترمیمی اندازہ کے اعداد ہیں اگرچہ ان اعداد میں بہت زیادہ رد و بدل عام طور پر نہیں ہوتا اور وہ اندازہ ختم سال کے قریب کیا ہوا ہونے کی وجہ سے زیادہ قرین حقیقت ہوتا ہے پھر بھی وہ قطعی طور پر صحیح نہیں ہوتا سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء کے سال کے متعلقہ اعداد البتہ بالکل حقیقی ہیں۔ ہم نے اسی لئے سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء کے اعداد اس جدول میں پیش کئے ہیں کیونکہ یہ اعداد اندازہ کے یا متوقع نہیں بلکہ ختم شدہ حساب کے

حقیقی اعداد ہیں۔

مرکزی حکومت کی آمدنی کے ذریعے (۱۹۳۸-۳۹ء کے حقیقی اعداد)

(ذرائع آمدنی کی ترتیب آمدنی کی رقمی اہمیت کے مطابق کی گئی ہے)

۱۔ کروڑ گیری	۴۰، ۵۰، ۵۳، ۰۰۰
۲۔ ریلوے	۳۱، ۳۰، ۰۹، ۰۰۰
۳۔ محصول	۱۳، ۱۷۴، ۴۳، ۰۰۰
۴۔ آبکاری (مرکزی حصہ)	۸، ۶۵، ۷۳، ۰۰۰
۵۔ نمک	۸، ۱۲، ۰۴، ۰۰۰
۶۔ فوج	۵، ۸۸، ۹۰، ۰۰۰
۷۔ غیر معمولی	۳، ۰۰، ۵۵، ۰۰۰
۸۔ کارپوریشن ٹیکس	۲، ۰۳، ۷۲، ۰۰۰
۹۔ محفوظے سے منتقلی	۱، ۰۵، ۸۰، ۰۰۰
۱۰۔ ڈاک خانہ اور تار گھر	۹۲، ۴۳، ۰۰۰
۱۱۔ سود	۷۳، ۷۵، ۰۰۰
۱۲۔ متفرق	۶۶، ۵۹، ۰۰۰
۱۳۔ ہندوستانی دیسی ریاستیں	۶۰، ۴۷، ۰۰۰
۱۴۔ سکہ سازی اور کرنسی	۵۸، ۱۶، ۰۰۰
۱۵۔ افیون	۵۰، ۸۹، ۰۰۰
۱۶۔ اسٹمپ	۳۴، ۷۴، ۰۰۰
۱۷۔ سول کام	۳۲، ۲۳، ۰۰۰
۱۸۔ آبکاری (مرکزی علاقے کی)	۲۵، ۷۷، ۰۰۰

۱۹۔	چھپائی اور سٹیشنری	۲۳، ۳۲، ...
۲۰۔	بندرگاہیں اور ناخدائی	۲۱، ۹۰، ...
۲۱۔	ہندوستانی سٹور محکمہ	۲۱، ۱۰، ...
۲۲۔	جنگل	۱۹، ۹۱، ...
۲۳۔	متفرق محکمے	۱۸، ۹۹، ...
۲۴۔	مالگذاری (مرکزی علاقے کی)	۱۸، ۴۶، ...
۲۵۔	روشنی گھر اور روشن کشتیاں	۹، ۱۵، ...
۲۶۔	بڑھاپے کی امدادیں وصولیاں	۷، ۹۵، ...
۲۷۔	براڈکاسٹنگ (لاسلکی نشرگاہ)	۷، ۳۹، ...
۲۸۔	جانوروں کا علاج	۷، ۶۳، ...
۲۹۔	صحت عامہ	۴، ۳۷، ...
۳۰۔	زراعت	۴، ۰۱، ...
۳۱۔	علاج	۳، ۴۵، ...
۳۲۔	موٹر سواری محصول	۳، ۴۱، ...
۳۳۔	عدالت	۲، ۴۵، ...
۳۴۔	جیل خانے اور مجرم گاہیں	۲، ۲۱، ...
۳۵۔	تعلیم	۱، ۹۲، ...
۳۶۔	پرواز	۱، ۴۸، ...
۳۷۔	رجسٹریشن	۹۲، ...
۳۸۔	آبپاشی	۸۷، ...
۳۹	پولیس	۷۴، ...
۴۰	صنعت وحرفت	۲۳، ...
		۱،۲۱،۰۶،۶۸، ...

مرکزی حکومت ہند کے ذرایع آمدنی کی طویل فہرست پر نظر ڈالنے سے یہ غلط فہمی ہوسکتی ہے اور عام طور پر ہوتی ہے کہ مختلف سرچشموں سے مرکزی حکومت ہند کو آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ مالیاتی ادب کی ورق گردانی اور چند کتابوں کے دیکھنے سے میں نے یہ بات معلوم کی کہ سرکاری کتابوں، روداووں اور موازنوں میں جسے آمدنی کہا جاتا ہے وہ صرف آمدنی نہیں بلکہ "وصولی" یعنی (رسیٹس) ہیں۔ اس میں آمدنی کے علاوہ عام طور پر منتقلیاں اور بسا اوقات قرض کی وجہ سے حاصل شدہ رقم بھی شامل ہوتی ہے۔ چنانچہ سرکاری "آمدنی" کے متعلق یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ وہ حقیقی آمدنی، منتقلی اور وصولی کا مجموعہ ہوتی ہے۔

آمدنی کی اصلی حقیقت معلوم کرنے کے لئے یہ دیکھنا چاہیئے کہ سرکاری آمدمیں

(۱) نئے قرض سے حاصل شدہ رقم ہے یا نہیں ؟

(۲) سابقہ قرض یا بچت سے منتقل شدہ رقم بھی شریک تو نہیں کی گئی ہے ؟

(۳) آمدنی حاصل کرنے پر کتنا خرچ ہوتا ہے ؟

آمدنی اور اخراجات کا مقابلہ کرنے سے یہ معلوم کرکے مجھے بڑا اچنبھا ہوا کہ بعض "آمدنی" کے ذریعے ایسے ہیں جن پر خرچ آمدنی سے زیادہ ہوتا ہے! اس پر طرہ یہ کہ پھر بھی ان کا شمار "ریونیو" کے اہم وسائل میں کیا جاتا ہے مثلاً مرکزی حکومت ہند کو ۳۹-۱۹۳۸ء میں جنگلوں سے ۱۹،۹۱،۰۰۰ آمدنی ہوئی تھی مگر ان پر خرچ ۲۲،۶۵،۰۰۰ ہوا[۱]۔ گویا دو لاکھ چوہتر ہزار کے گھاٹے کے باوجود جنگلوں کا شمار ریونیو میں کیا جاتا ہے اور ریونیو سے مراد عرف عام میں آمدنی لی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں!! ریونیو میں منتقلیاں اور بعض مرتبہ نئے قرضے بھی شامل کرلئے جاتے ہیں! بہرحال مالیاتی اصطلاحوں کی پبلک ناواقفیت اور اصطلاحی پیچیدگیوں کے نازک فرق سے فائدہ اٹھاکر عمداً یا بخوشی یہ غلط فہمی پیدا ہونے دی جاتی ہے کہ کل ریونیو دراصل

---

[۱] حکومت ہند کے محکمۂ فینانس کا شائع کردہ "۴۱-۱۹۴۰ء کا بجٹ" ناشر حکومت ہند (مینیجر مطبوعات) نئی دہلی۔ سنہ ۱۹۴۰ء صفحہ ۷۴ اور صفحہ ۷۶۔

آمدنی ہے۔ بعض موازنوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ گذشتہ سال کی "بچت" سے منتقل کر لی جاتی ہے اور وہ "بچت" بھی دراصل گذشتہ قرض عامہ کا جزو ہوتی ہے!! گویا آمدنی کا اصلی سرچشمہ بعض صورتوں میں قرض عامہ ہوتا ہے۔ خسارہ کو بچت میں "بدلنے" کے لئے یہ ترکیب کی جاتی ہے کہ سرکاری آمد یا ریونیو میں ایسی قابل لحاظ رقم شامل کر لی جاتی ہے جو "منتقل" کے نام سے موازنہ یا حساب میں شریک رہتی ہے۔ یہ منتقلی بھی دراصل بسا اوقات گزشتہ سال یا پیوستہ سال میں حاصل کئے ہوئے قرض عامہ کا جزو ہے گویا آمدنی کا سرچشمہ قرض ہے۔ اصطلاحی زبان سے ہٹ کر اس مطلب کو ادا کرنا ہو تو یہ فارسی کہاوت کافی ہے۔ برعکس نہند نام زنگی کافور!!

غرض سرکاری "آمدنی" کی اصل حقیقت معلوم کرنے کے لئے کل حاصل (ٹوٹل ریونیو) منتقلی (ٹرانسفر)، کل وصولی (ٹوٹل ریسیٹس) اور خالص آمدنی (نٹ ریونیو) کے نازک فرق کا اچھی طرح ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

سرکاری مالیات کو بخوبی سمجھنے کے لئے "خالص آمدنی" کا لحاظ بہت ضروری ہے اور خالص آمدنی سے مراد وہ رقم ہے جو آمدنی حاصل کرنے کے اخراجات منہا کرنے بعد بچ جاتی ہے آمدنی حاصل کرنے کے اخراجات اتنے مختلف ہوتے ہیں کہ نہ صرف تعجب ہوتا ہے بلکہ آمدنی کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے اور بسا اوقات بڑا فرق ہوتا ہے۔ ہم نے جنگلوں کی کم آمدنی اور زیادہ خرچ کی حقیقی اعداد دے کر ثابت کر دیا ہے کہ کم سے کم ۳۹-۱۹۳۸ء میں جنگل ذریعہ آمدنی نہیں بلکہ خرچ کی مدبن گئے تھے۔ سابقہ جدول پر نظر ڈالئے سرکاری ذرائع آمدنی میں کروڑگیری کے بعد دوسرا نمبر ریلوں کا ہے۔ ریلوں کی آمدنی ...،۹، ۳۰، ۳۱ ظاہر کی گئی ہے مگر ریلوں میں کارفرما سرمایہ کا سود ...،۸۰، ۱۴، ۲۸ ہوتا ہے اور غیر معمولی متفرق خرچ کے ساتھ ...،۹، ۳۰، ۳۱ میں سے ...،۷۷، ۹۲، ۲۹ صرف ہو گئے اور ریلوں سے اکتیس کروڑ تیس لاکھ ۹ ہزار نہیں بلکہ صرف ...،۳۲، ۳۷، ۱ آمدنی ہوئی۔ یہی رقم ریلوں سے حاصل شدہ خالص آمدنی ہے اس مثال سے بھی ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ "کل وصولی" (ٹوٹل ریسیٹس) یا کل حصول (ٹوٹل ریونیو) میں سے

اخراجات سود وغیرہ نکالنے کے بعد جو خالص آمدنی رہ جاتی ہے اس کی کیا اہمیت رہتی ہے۔

تھوڑی سے دردسری گوارا کر کے میں نے مرکزی حکومت ہند کی "آمد" (ریونیو) کے ذرایع اور اس کے متعلق اخراجات نکال کر خالص "آمدنی" کے ذریعے معلوم کئے ہیں۔ تمام اعداد وشمار جدید ترین سرکاری مطبوعہ بجٹ بابت ۱۹۴۱-۴۲ء سے لئے گئے ہیں اور بار بار حساب اور مقابلے کر کے انتہائی احتیاط سے یہ جدول تیار کی گئی ہے۔ تاہم بشریت کا تقاضہ ہے، جمع تفریق کوفت انگیز محنت ہے، کسی ہمدرد یا کرم فرما کی شرکت سے محرومی ہے لہذا غلطیوں کا امکان بہرحال ہے مگر ان سے بچنے کی چونکہ مقدور بھر کوشش کی گئی ہے۔ اس لئے توقع ہے کہ جدول بجز غیر اہم جزئیات کے قابل بھروسہ ہے۔

۱۹۳۸-۳۹ء میں مرکزی حکومت ہند کی خالص آمدنی[1] کے ذریعے

(۱) کروڑ گیری۔	۳۹،۳۰،۹۸،۰۰۰
(۲) آمدنی محصول	۱۳،۰۷،۶۱،۰۰۰
(۳) آبکاری کا مرکزی محصول	۸،۱۹،۹۶،۰۰۰
(۴) نمک	۷،۰۸،۱۹،۰۰۰
(۵) غیر معمولی	۲،۹۹،۳۷،۰۰۰
(۶) کارپوریشن	۱،۹۴،۷۹،۰۰۰
(۷) ریلیں	۱،۳۷،۳۲،۰۰۰
(۸) دیسی ریاستوں کا خراج	۶۰،۴۷،۰۰۰
(۹) متفرق	۳۹،۲۵،۰۰۰
(۱۰) افیون	۲۵،۳۳،۰۰۰
(۱۱) کرنسی اور سکہ سازی	۲۲،۱۴،۰۰۰

[1] (یہ نوٹ صفحہ ۱۶۳ پر ملاحظہ ہو)

(۱۲) صوبائی آبکاری	۱۹،۵۵،۰۰۰،
(۱۳) ٹپہ خانہ اور تار گھر	۱۸،۹۸،۰۰۰،
(۱۴) سٹمپ	۱۷،۹۳،۰۰۰،
(۱۵) صوبائی مالگزاری	۱۳،۵۵،۰۰۰،
(۱۶) موٹر سواری قانون	۱،۰۸،۰۰۰،
(۱۷) رجسٹریشن	۸۲،۰۰۰،
	۷۷،۱۵،۵۸،۰۰۰،

اب آپ پھر سے ایک نظر پہلی جدول پر ڈالکر اس کے بعد خالص آمدنیوں کے ذریعوں کو دیکھیئے۔ آدھے سے زیادہ آمدنی کے ذریعے خود بخود غائب ہو جاتے ہیں اور رقمی اہمیت سے ذرایع آمدنی کی شماری ترتیب میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ ریلوں کا درجہ دوسرے نمبر سے گر کر ساتویں پر آجاتا ہے دیسی ریاستوں کے خراج کا درجہ ۱۳ سے ترقی پا کر آٹھویں پر آتا ہے۔ ٹپہ خانہ اور تار گھر جیسے تجارتی نوعیت کے محکمہ کی آمدنی دسویں نمبر سے گھٹ کر تیرھویں پر آجاتی ہے اور جن محکموں سے آمدنی ہونے کی توقع کی جاسکتی تھی یا جنھیں (بعض اور ملکوں کی طرح مثلاً امریکہ) نفع بخش بنانا چاہیئے اور بنایا جاسکتا ہے۔ ہماری فہرست سے نکل جاتے ہیں۔ مثلاً جنگل، سٹور کا محکمہ، براڈ کاسٹنگ، پرواز، آبپاشی، باہمی امداد وغیرہ[1]

خالص آمدنی کا لحاظ نہ بھی کیا جائے۔ بلکہ سرکاری آمدنی میں ریلوں اور ٹپہ خانہ یا تار گھر کی خالص بچت (نٹ بیونگ) کو شامل کیا جائے جیسا کہ خود حکومت ہند کرتی ہے تب بھی[2] نٹ ریونیو تقریباً اسی کروڑ رہتی ہے۔

---

[1] خالص آمدنی سے مراد وہ رقم ہے جو آمد (ریونیو) میں سے آمد پر راست مطالبے منہا کرنے کے بعد بچے یعنی کل آمدنی کے حاصل کرنے کا خرچ منہا کرنے کے بعد یا اس پر خرچ ہونے والی رقم منہا کرنے کے بعد باقی بچے۔

[2] Net-Revenue

عام طور پر چونکہ سرکاری، درسی، علمی، اور حوالے کی کتابوں میں ریلوے کی آمدنی کو بھی شامل کیا جاتا ہے اور خام آمدنی کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ لہذا ہم بھی سرکاری رودادوں اور علمی و درسی کتابوں کی تقلید میں کل سرکاری وصولی کو ملحوظ رکھتے ہوئے گذشتہ موازنوں کی آمدنیاں بیان کرینگے۔

سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء سے مرکزی حکومت ہند کی آمدنی یہ تھی۔

سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء	۱، ۱۵، ۲۲، ..، ...
سنہ ۱۹۲۲-۲۳ء	۱، ۲۱، ۴۱، ..، ...
سنہ ۱۹۲۳-۲۴ء	۱، ۳۲، ۷۹، ..، ...
سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء	۱، ۳۷، ۵۳، ..، ...
سنہ ۱۹۲۵-۲۶ء	۱، ۳۳، ۱۷، ..، ...
سنہ ۱۹۲۶-۲۷ء	۱، ۳۱، ۶۵، ..، ...
سنہ ۱۹۲۷-۲۸ء	۱، ۲۷، ۲۲، ..، ...
سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء	۱، ۲۸، ۹۷، ..، ...
سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء	۱، ۳۲، ۷۰، ..، ...
سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء	۱، ۲۴، ۶۰، ..، ...
سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء	۱، ۲۱، ۶۵، ..، ...
سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء	۱، ۲۵، ۴۴، ..، ...
سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء	۱، ۱۹، ۳۷، ..، ...
سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء	۱، ۲۲، ۱۲، ..، ...
سنہ ۱۹۳۵-۳۶ء	۱، ۲۱، ۰۷، ..، ...
سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء	۱، ۱۷، ۸۳، ..، ...
[ل] سنہ ۱۹۳۷-۳۸ء	۱، ۲۲، ۵۸، ..، ...

[ل] سنہ ۱۹۳۷ء کی پہلی اپریل سے برما ہندوستان سے علحدہ کردیا گیا۔ سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء لو آخری مالی سنہ تھا (بقیہ نوٹ صفحہ آیندہ پر ملاحظہ ہو)

۳۹-۱۹۳۸ء		۱، ۲۱، ۰۶، ۰۰، ۰۰۰
۴۰-۱۹۳۹ء	(متوقع)	۱، ۲۳، ۹۶، ۰۰، ۰۰۰
۴۱-۱۹۴۰ء	(بجٹ)	۱، ۳۱، ۷۳، ۰۰، ۰۰۰

ان اعداد سے ظاہر ہے کہ مرکزی حکومت ہند کی سالانہ آمدنی لگ بھگ ایک ارب ۲۳ کروڑ رہی۔

ہندوستان کے صوبوں کی آمدنی

ہندوستان میں گیارہ صوبے ہیں جو (آمدنی کی اہمیت کے لحاظ سے) مختلف حیثیتیں رکھتے ہیں۔ سب سے زیادہ آمدنی مدراس کی ہے تقریباً ۱۶ کروڑ۔ بنگال۔ بمبئی۔ آگرہ و اودھ کے متحدہ صوبے اور پنجاب کی آمدنی بارہ تیرہ کروڑ ہے۔ اس کے بعد بہار کا نمبر آتا ہے۔ جس کی آمدنی پنجاب کی نصف آمدنی سے کم ہوتی ہے۔

مدراس، بنگال، بمبئی، متحدہ صوبے اور پنجاب کی آمدنیوں میں نسبتاً تھوڑا فرق ہے۔ مگر پنجاب کے بعد آمدنیوں میں نمایاں کمی ہو جاتی ہے۔ اور بہار کے بعد دو، دو، ایک ایک کروڑ کم ہوتے ہوتے متوسط صوبے اور برار، سندھ، آسام، اڑیسہ، اور سرحدی صوبہ کا نمبر آتا ہے۔

۳۸-۱۹۳۷ء میں ہندوستان کے گیارہ صوبوں کی آمدنی یہ تھی۔

۱۔ مدراس	۱۶، ۰۰، ۶۲، ۰۰۰
۲۔ بنگال	۱۳، ۰۰، ۸۵، ۰۰۰
۳۔ بمبئی	۱۲، ۴۳، ۸۱، ۰۰۰
۴۔ متحدہ صوبے (آگرہ و اودھ)	۱۲، ۳۳، ۷۸، ۰۰۰

بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ :۔ جس میں برما کی آمدنی ہندوستان کی آمدنی میں شمار ہوئی تھی۔ ۳۸-۱۹۳۷ء کے قبل اور بعد کے اعداد میں (برما کی علحدگی کے باعث) کئی مرتبہ نمایاں فرق ہوتا ہے۔ اکثر کتابوں اور رسالوں میں اعداد و شمار دیتے وقت برما کی علحدگی کا خیال نہیں رکھا جاتا جس کی وجہ سے ایک ہی موضوع کے متعلق مختلف حوالے اور اعداد ملتے ہیں۔

۵۔ پنجاب	۱۱،۹۸،۳۵،۰۰۰
۶۔ بہار	۵،۰۳،۲۷،۰۰۰
۷۔ متوسط صوبے اور برار	۴،۵۳،۷۱،۰۰۰
۸۔ سندھ	۳،۹۲،۰۳،۰۰۰
۹۔ آسام	۲،۷۳،۶۱،۰۰۰
۱۰۔ اڑیسہ	۱،۸۴،۶۶،۰۰۰
۱۱۔ سرحدی صوبہ	۱،۸۱،۹۲،۰۰۰
تمام صوبوں کی آمدنی	۸۵،۶۶،۶۱،۰۰۰

گذشتہ سالوں میں ہندوستان کے تمام صوبوں کی آمدنی یہ تھی۔

۱۹۲۳-۲۴ء	۷۸،۸۵،۰۰،۰۰۰
۱۹۲۴-۲۵ء	۸۱،۲۸،۰۰،۰۰۰
۱۹۲۵-۲۶ء	۸۷،۵۱،۰۰،۰۰۰
۱۹۲۶-۲۷ء	۸۶،۴۳،۰۰،۰۰۰
۱۹۲۷-۲۸ء	۹۳،۲۹،۰۰،۰۰۰
۱۹۲۸-۲۹ء	۹۱،۴۸،۰۰،۰۰۰
۱۹۲۹-۳۰ء	۹۴،۵۷،۰۰،۰۰۰
۱۹۳۰-۳۱ء	۸۳،۰۸،۰۰،۰۰۰
۱۹۳۱-۳۲ء	۸۳،۱۸،۰۰،۰۰۰
۱۹۳۲-۳۳ء	۸۴،۳۴،۰۰،۰۰۰
۱۹۳۳-۳۴ء	۸۲،۸۴،۰۰،۰۰۰
۱۹۳۴-۳۵ء	۸۶،۲۹،۰۰،۰۰۰

سنہ ۱۹۳۵-۳۶ء	۸۹،۰۲،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء	۹۲،۳۳،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۷-۳۸ء	۸۵،۸۰،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء	۸۵،۶۰،۰۰،۰۰۰

ان اعداد سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کے صوبوں کی سالانہ آمدنی تقریباً ۸۵ کروڑ ہے۔

صوبائی حکومتوں کے ذرایع آمدنی

موجودہ دستور کے مطابق صوبائی حکومتوں کے ذرایع آمدنی (اہمیت کے لحاظ سے) مالگزاری، آبکاری، عدالتی ٹکٹ (رسوم)، جنگلات، رجسٹریشن، زراعتی آمدنی پر محصول، موٹر ٹیکس، وغیرہ ہیں۔ مگر ہر صوبہ کو زیادہ تر مالگزاری، آبکاری اور عدالتی رسوم سے آمدنی ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مرکزی حکومت کے اہم ترین ذرایع آمدنی کروڑگیری، ریلیں اور محصول آمدنی ہے۔ ذرایع آمدنی مقرر کرنے سے آسانی تو ہوئی مگر بعض صوبوں کو بجا شکایت کا موقع ملا۔ ظاہر ہے کہ جس صوبہ میں صنعت وحرفت اور تجارت کی گرم بازاری ہوگی اور افراد یا کمپنیوں کی آمدنی میں خاطرخواہ اضافہ ہوگا۔ اس کا فائدہ زیادہ تر مرکزی حکومت کو ہوگا۔ کیونکہ بڑھتی ہوئی آمدنیوں سے محصول آمدنی زیادہ وصول ہوگا۔ اس کے برعکس جو صوبہ زراعتی نقطہ نظر سے سب سے بہتر ہوگا اس کی مالی حالت بہتر ہوگی کیونکہ مالگزاری صوبائی ذریعہ آمدنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوبہ بمبئی کی آمدنی سے مدراس کے صوبہ کی آمدنی زیادہ ہے۔ حالانکہ معاشی اعتبار سے بمبئی زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ بمبئی کی صنعت وحرفت اور تجارت مدراس سے بہت زیادہ ہے۔ مگر محصول آمدنی اور کروڑگیری چونکہ ذرایع آمدنی ہیں۔ اس لئے اپنے صوبہ کی گرم بازاری اور صنعت سے خود بمبئی کم مستفید ہوتا ہے۔ اسی لئے بمبئی کو شکایت ہے اور بمبئی والوں کا یہ کہنا معقول ہے کہ بمبئی کی صوبہ واری حکومت کو محصول آمدنی سے زیادہ حصہ ملنا چاہئے۔ اس کا جواب دیا جاتا ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے قانون اور اس کے اختیار کئے ہوئے طریقوں کی یہ عام خصوصیت ہے کہ ان سے کسی نہ کسی کو زیادہ اور

کسی نہ کسی کو کم فائدہ ہوتا ہے۔ نیز بمبئی کے ترقی پذیر لوگوں کو چاہیئے کہ کل ہند کا خیال رکھیں۔ آخر مرکزی حکومت ہند بھی تو "اپنی ہی ہے"! اعتراض کرنے والوں میں وسعت نظر ہونی چاہیئے صوبائی تنگ نظری ٹھیک نہیں۔

جنگ کی وجہ سے اور اس خیال سے کہ موجودہ دستور میں فی الحال ترمیم یا تبدیلی کی کوئی توقع نہیں لوگ خاموش ہیں مگر آئندہ ذرایع آمدنی کی تقسیم پر ضرور سخت اختلاف ہوگا۔

مقامی حکومت کی آمدنی

مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت کے علاوہ مقامی سرکار بھی افراد اور گھرانوں سے ٹیکس وصول کرتی ہے۔ مقامی سرکار یا حکومت سے مراد (۱) بلدیئے یا میونسپلٹیاں (۲) لوکل یا ڈسٹرکٹ بورڈ اور (۳) بندرگاہی ٹرسٹ ہیں۔

یوں سمجھئے کہ مالدار لوگ جو محصول آمدنی ادا کرتے ہیں وہ مرکزی حکومت کو ملتا ہے۔ مقدمہ بازی کرنے والوں سے صوبائی حکومت مستفید ہوتی ہے۔ اور مکان کا ٹیکس، موٹر کا سالانہ ٹیکس وغیرہ میونسپلٹی کو ملتا ہے۔ دیہات کی نمک حلال رعایا بہرحال نمک استعمال کرتی ہے اور نمک کی قیمت میں ــــ محصول چھپا رہتا ہے۔ رعایا کو معلوم نہیں ہوتا مگر تھوڑا تھوڑا بہت ہوتا جاتا ہے اور ــــ مرکزی حکومت کو نمک کا کل محصول ملتا ہے۔ (موجودہ زمانے میں تقریباً ۸، ۹ کروڑ سالانہ) جن زمینوں پر کاشت ہوتی ہے اس کا لگان ادا کیا جاتا ہے۔ یہ لگان درحقیقت محصول زمین ہے جو صوبائی حکومت کو ملتا ہے اور جب بیوپاری پیداوار بیچنے منڈی جاتے ہیں تو انھیں کہیں "راستہ پٹی" (راستہ پر سے گزرنے کا محصول) ادا کرنا پڑتا ہے۔ کہیں منڈی میں مال لیتے ہوئے محصول ادا کرنا پڑتا ہے۔ مویشی بیچتے ہیں تو فی جانور تھوڑا بہت محصول ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہ ڈسٹرکٹ بورڈ کا حق ہوتا ہے۔

اسی طرح بندرگاہوں کی سرکار مچھیروں اور کشتی رانوں اور چھوٹے بڑے جہازوں سے مختلف ناموں اور مختلف طریقوں سے محصول لیتی ہے۔ یہ سب "پورٹ ٹرسٹ" بندرگاہ کی مقامی

میونسپالٹیاں

میونسپالٹیوں کے متعلق جدید ترین اعداد ۱۹۳۶-۳۷ء تک مل سکے۔ وہ بھی "برطانوی ہند" کے دیسی ریاستوں کی میونسپالٹیوں اور ان کی آمدنی کا کچھ علم نہیں۔ ۱۹۳۶-۳۷ء کے اعداد کو پیش نظر رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ برطانوی ہند میں آٹھ سو سے زیادہ میونسپالٹیاں ہیں اور ان کی مجموعی آمدنی کروڑ ہوتی ہے۔

سب سے زیادہ آمدنی ظاہر ہے بمبئی، کلکتہ اور مدراس کی ہے۔ کیونکہ یہی ہندوستان کے سب سے بڑے شہر ہیں۔ دولت و حکومت راج اور سامراج کے یہ بڑے مرکز ہیں۔ بااثر بیرونیوں اور پردیسی حاکموں کا یہاں اکثر قیام رہتا ہے۔ لہذا اور کچھ نہیں تو انہی کی خوشنودی اور حاکموں کے آرام کے لئے کم سے کم شہر کے کچھ حصوں کو بنا سجا کر رکھنا پڑتا ہے۔ ذاتی آمدنی ناکافی ہوتی ہے تو صوبائی حکومت سے امداد طلب کی جاتی ہے اور اکثر مل جاتی ہے۔ وہ بھی ناکافی ہو تو میونسپالٹیاں قرض لیتی ہیں۔ قرض لے لے کر اپنے ضروری اور من مانے اخراجات کو پورا کرنے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔

میونسپالٹیوں کے ذرایع آمدنی یہ ہیں:-

راہداری (شہروں میں مال لینے کا محصول)
مکان یا زمین کا ٹیکس (میونسپالٹی کے حدود میں مکانوں اور زمینوں کا ٹیکس)
جانوروں اور سواریوں پر ٹیکس۔
تاجروں اور بیوپاریوں پر ٹیکس۔
راستہ پٹی (راستہ پر سے گزرنے کا ٹیکس)
ناؤ پٹی (ندی کو پار کرنے کا ٹیکس)
واٹر ریٹ (پانی پہنچانے کا معاوضہ)
لائیٹنگ ریٹ (بجلی روشنی کا معاوضہ)

ان محصولوں یا محصول نما معاوضوں کے علاوہ میونسپالٹی کے اسکولوں سے تھوڑی بہت

فیس مل جاتی ہے، حکومتوں سے تقریباً ایک کروڑ سالانہ امداد ملتی ہے، خانگی افراد اور سرکار سے قرض بھی لیا جاتا (اور ـــــ روشن خیالی ملاحظہ ہو ـــــ قرض کو بھی آمدنی میں شامل کیا جاتا ہے۔) غرض محصول و فیس، معاوضوں اور کرایوں وغیرہ سے برطانوی ہند کی تقریباً ۸۰۰ میونسپالٹیوں کو لگ بھگ ۴۰ کروڑ ملتے ہیں۔

سنہ ۱۹۲۷-۲۸ء سے سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء کے اعداد و شمار یہ ہیں۔

سنہ ۱۹۲۷-۲۸ء میں تمام میونسپالٹیوں کی کل آمدنی

سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء " " " "

سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء " " " "

سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء " " " "

سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء " " " "

سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء " " " "

سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء " " " "

سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء " " " "

سنہ ۱۹۳۵-۳۶ء " " " "

سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء " " " "

اس آمدنی میں قرض بھی شامل ہے۔ قرض کی رقم کم سے کم ایک کروڑ اور زیادہ سے زیادہ ۴ کروڑ سالانہ ہوتی ہے۔ لہذا یہ کہنا صحیح ہے کہ میونسپلٹیوں کی حقیقی سالانہ اوسط آمدنی ۳۹ یا ۴۰ کروڑ ہوتی ہے۔

ڈسٹرکٹ بورڈ اور لوکل بورڈ

برطانوی ہند میں ڈسٹرکٹ اور لوکل بورڈوں کی کل تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے اور ان کو مجموعی طور پر سالانہ پندرہ سولہ کروڑ روپیوں کی آمدنی ہوتی ہے۔

گذشتہ چند سالوں کے اعداد یہ ہیں۔

سنہ ۲۸-۱۹۲۷ء	میں تمام ڈسٹرکٹ	اور	لوکل بورڈوں	کی آمدنی	۱۵،۵۶،۰۰،۰۰۰
سنہ ۲۹-۱۹۲۸ء	″	″	″	″	۱۵،۹۸،۰۰،۰۰۰
سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء	″	″	″	″	۱۶،۳۶،۰۰،۰۰۰
سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء	″	″	″	″	۱۶،۵۷،۰۰،۰۰۰
سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء	″	″	″	″	۱۵،۵۲،۰۰،۰۰۰
سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء	″	″	″	″	۱۵،۵۱،۰۰،۰۰۰
سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء	″	″	″	″	۱۵،۹۶،۰۰،۰۰۰
سنہ ۳۵-۱۹۳۴ء	″	″	″	″	۱۶،۱۷،۰۰،۰۰۰
سنہ ۳۶-۱۹۳۵ء	″	″	″	″	۱۶،۳۱،۰۰،۰۰۰
سنہ ۳۷-۱۹۳۶ء	″	″	″	″	۱۶،۲۲،۰۰،۰۰۰

ان اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈسٹرکٹ بورڈ کی سالانہ اوسط آمدنی پندرہ سولہ کروڑ ہوتی ہے۔

بندرگاہی ٹرسٹ | ہندستان کی بڑی بڑی بندرگاہوں میں خصوصی انتظام کرنے کے لیے بندرگاہی ٹرسٹ قایم ہیں ان ٹرسٹوں کی تعداد صرف ۵ ہے یعنی کلکتہ۔ بمبئی۔ کراچی۔ مدراس اور چٹاگانگ۔ ان بندرگاہوں کی مجموعی آمدنی ہرسال تقریباً سات آٹھ کروڑ ہوتی ہے۔

گذشتہ چند سالوں کے اعداد یہ ہیں۔

سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء	۷،۲۸،۰۰،۰۰۰
سنہ ۳۵-۱۹۳۴ء	۷،۶۳،۰۰،۰۰۰
سنہ ۳۶-۱۹۳۵ء	۶،۷۴،۰۰،۰۰۰
سنہ ۳۷-۱۹۳۶ء	۶،۹۰،۰۰،۰۰۰
سنہ ۳۸-۱۹۳۷ء	۷،۳۲،۰۰،۰۰۰

(باقی)

مصر آل طولون کے عہد میں

(بسلسلۂ جنوری ۱۹۴۲ عیسوی)

از

جناب محمد جمیل الرحمن ایم۔ اے۔ پروفیسر تاریخ۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

(۵)

مورخ اس بات پر متفق ہیں[۱۲۰] کہ احمد بن طولون عقلمند، محتاط اور سیاس شخص تھا، دین دار تھا اور علماء واہل دین کو عزیز رکھتا، خیرات و مبرات میں پیش پیش تھا؛ اور مصالح مسلمین ہمیشہ اُس کے مدنظر رہتے تھے۔ عقاید کے لحاظ سے وہ شافعی مذہب کی طرف مائل تھا، اور اس مذہب کے لوگوں سے عزت و تکریم سے پیش آتا تھا، عادل، جواد، اور شجاع تھا، تمام کام بذات خود انجام دینے کا عادی تھا، اور اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتا تھا۔ چنانچہ مقریزی[۱۲۱] نے لکھا ہے کہ جہاں تک اُسے علم ہے امراء مصر میں مظلوموں کی فریاد سننے اور اُن کے مقدموں کا فیصلہ کرنے کے لئے بذات خود اجلاس کرنے والا پہلا امیر ابو العباس احمد بن طولون تھا، اور اُس نے ہفتے میں دو دن اس کام کے لئے مخصوص کر رکھے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مورخ یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہ خون ریزی میں جلدی کرتا تھا اور جب مصر و شام کا والی ہوا تو اس نے بہت مظالم کئے اور بے حد خون ریزی کی۔ چنانچہ قضاعی کی روایت نقل کی گئی ہے کہ اُس کے قید و بند میں اور تلوار سے اٹھارہ ہزار انسانوں کا خون ہوا تھا۔ مگر ابو صالح الارمنی نے

۱۲۰۔ ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۴ + ابن تغری بردی ج ۲ ص ۱۲ + ابن الاثیر ج ۷، ص ۱۳۶ + ابن خلکان ج ۱۔ ص ۵۵۔

۱۲۱۔ خطط ج ۲۔ ص ۲۰۷ +

جس کی تاریخ ۵۶۷ھ میں لکھی گئی ہے، ان مقتولین کی تعداد صرف دو ہزار بتائی ہے۔[۱۲۲]

لیکن یہ حالات پڑھتے وقت اس کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ احمد بن طولون ایسے زمانے میں گذرا ہے جب، کہ کوئی شخص جو اپنی قوت مجتمع کرنا اور بڑھانا چاہتا ہو خون ریزی سے گریز نہیں کرسکتا تھا، بلکہ اس سے محترز رہنا خودکشی اور مکمل تباہی کے مترادف تھا۔ اس افراتفری کے زمانے میں ہمیں متعدد شخصیتیں ایسی بھی ملتی ہیں جن میں احمد بن طولون کی تمام خوبیاں مفقود اور تمام برائیاں موجود تھیں۔ اصلی معیار جس سے ہمیں احمد بن طولون کے کارناموں کو جانچنا چاہئے یہ ہے کہ اس سولہ برس کے عرصے میں اہل مصر اس کی حکومت پر کہاں تک بھروسہ کرتے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ جب وہ مصر آیا ہے تو وہاں ہر طرف فساد پھیلا ہوا تھا، اور بالخصوص علویوں کی شورشیں جاری تھیں۔ ان فسادوں اور شورشوں کو اُس نے فرو کیا۔ اس کے بعد صرف اس کے بیٹے عباس کی وجہ سے مصر میں ایک مرتبہ فساد پھیلا۔ اہل مصر کے لئے بہت ہی اچھا موقع تھا کہ اگر وہ احمد بن طولون کی حکومت اور اس کے طرز عمل سے نالاں ہوں تو عباس کا ساتھ دے کر حکومت تبدیل کر دیں لیکن واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہل مصر نے اس بغاوت سے کوئی دلچسپی نہیں لی، اور مجبوراً عباس کو مصر کے باہر ہمدرد تلاش کرنے پڑے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اس کی ناکامی کا بڑا سبب یہی تھا کہ اہل مصر اس سے بالکل الگ رہے، اور بقیۃ العمر اُسے قید وبند میں گذارنی پڑی۔ اس مدت میں بھی اہل مصر کی طرف سے کوئی کوشش عباس کو چھڑانے یا اپنے آپ کو احمد بن طولون کے پنجے سے نجات دلانے کے لئے نہیں ہوئی۔ عباس کی بغاوت بہت خطرناک بن سکتی تھی۔ اس نازک وقت میں احمد بن طولون کی کامیابی کے دو اسباب تھے: ایک اہل مصر کا اس شورش سے الگ رہنا، اور دوسرے اُس کی فوج کی وفاداری۔

حقیقت میں دیکھا جائے تو احمد بن طولون کی تمام کامیابیوں کا دارومدار اُس کی فوج پر تھا، اور یہ فوج نہایت ہی تندہی اور فراست سے جمع اور مرتب کی گئی تھی۔ یوں تو خلیفہ معتصم کے

[۱۲۲] ابو صالح الارمنی ص ۳۷ +

زمانے ہی سے مصری فوج میں ترکی عنصر بڑھنا شروع ہو گیا تھا، اور پھر اشناس کے حاکم مقرر ہونے سے سیاست اور شہری حکومت میں بھی ترکوں کو اثر و نفوذ حاصل ہو گیا تھا۔ لیکن ۲۴۲ھ میں جب عرب امراء آنے بند ہو گئے، اور ترکوں نے ان کی جگہ لی، تو یہ تبدیلی مکمل ہو گئی۔ ۲۵۴ھ میں جب احمد بن طولون نے وادی نیل میں قدم رکھا ہے تو یہ تبدیل شدہ حالات مصری زندگی کا جز بن چکے تھے، اور کوئی حوصلہ مند بالغ نظر حاکم ان ترکی عناصر کی مدد سے وہاں ایک مستقل جگہ پیدا کر سکتا تھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ مصر میں آنے کے بعد بہت جلد خلیفہ کے حکم سے اُسے مستقل فوج مرتب کرنے کا موقع مل گیا، اور مصر کے خزانے سے ضروری اخراجات کی بجاآوری کر دی گئی تھی۔ اس سے احمد بن طولون نے پورا فائدہ اٹھایا۔ مقریزی[۱۲۳] کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ اُس نے مصری فوج کی بالکل نئی تنظیم کی تھی۔ یہ فوج چوبیس ہزار ترک غلاموں کے علاوہ چالیس ہزار سوڈانی غلاموں اور سات ہزار مرتزق سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ چالیس ہزار سوڈانی غلاموں میں غالباً یونانی (رومی) غلام بھی شریک تھے، جن کا ذکر مقریزی[۱۲۴] نے ایک موقع پر کیا ہے۔ غلام ہونے کی حیثیت سے ممکن ہے کہ سوڈانیوں اور یونانیوں کو تنخواہیں نہ ملتی ہوں، گو ان کے تمام اخراجات حکومت برداشت کرتی تھی۔ لیکن سات ہزار مرتزق سپاہی یقیناً تنخواہ دار تھے۔ ان کے علاوہ ضرور ہے کہ اس نئی فوج میں مصر کے تھوڑے بہت عرب بھی شریک کئے گئے ہوں، لیکن ان کی تعداد بیان نہیں ہوئی، اور حقیقت یہ ہے کہ فوج میں عربی اور مصری عناصر کو احمد بن طولون کے بیٹے خمارویہ نے شریک کیا تھا۔ یہ فوج ناآزمودہ کار تھی، اور اس قابل نہیں تھی کہ میدان جنگ میں بھیجی جائے۔ مگر حسن اتفاق سے ابن الشیخ کے خلاف کوئی جنگ پیش نہیں آئی اور اس نئی مرتب شدہ فوج کا کوچ محض ایک مناورہ ثابت ہوا۔ احمد بن طولون نے صرف فوج جمع کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ سپاہیوں سے حلف لیا کہ وہ ہر حالت میں اس کے وفادار رہیں گے۔ اس کے بعد جب عباس کی بغاوت ہوئی تو ایک مورخ کے مطابق

۱۲۳۔ خطط ج ۱۔ ص ۳۱۵۔

۱۲۴۔ خطط ج ۱۔ ص ۹۴، ۳۱۵۔

ایک لاکھ سپاہی بھرتی کئے گئے۔ اگر یہ تعداد محض ایک اندازہ ہی تصور کیا جائے، تب بھی یہ تو یقیناً معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے اپنی فوج میں اس موقع پر معتدبہ اضافہ کیا تھا۔[۱۲۵] اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ احمد بن طولون نے جب الموفق سے جھگڑا مول لیا ہے تو اُسے پورا اندازہ ہوگا کہ اگر جنگ کی نوبت آئی تو وہ حریف کا مقابلہ بلا کھٹکے کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ فوج کی وابستگی اور وفاداری کا سب سے اچھا مظاہرہ اس سے ہوتا ہے کہ تمام عہد امارت میں کہیں یہ پڑھنے میں نہیں آتا کہ مصری فوج میں کبھی کسی قسم کا غدر ہوا ہو، یا احمد بن طولون کو اپنی فوجوں پر ذرا سا شبہ بھی ہوا ہو۔ اس کے برعکس مرکز خلافت کی فوجوں کا حال ہم اوپر پڑھ آئے ہیں کہ الموفق کے اشارے سے جب موسیٰ بن بغا اُس کے خلاف فوجیں لے کر روانہ ہوا ہے تو رقم کی کمی کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکا، اور فوج کے غدر اور فساد سے یہ نوبت پہنچی کہ موسیٰ بن بغا کے کاتب کو جان بچانے کے لئے روپوش ہونا پڑا۔ فوج کے سپاہی منتشر ہو گئے، اور یہ زبردست ناکامی آخر موسیٰ بن بغا کی موت پر ختم ہوئی۔

اس زمانے میں فوج کے سپاہیوں کے دلوں میں جوش و خروش پیدا کرنے، ضبط و تنظیم برقرار رکھنے اور اُن میں وفاداری کے جذبات ابھارنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت تھی۔ اول تو یہ کہ سپاہیوں کو معلوم ہو کہ جس کے لئے وہ اپنی جانیں دے رہے ہیں وہ انھیں کی طرح جفاکش ہے، تمام تکلیف و آسایش میں اُن کا رفیق ہے، اور سپاہی ہونے کی حیثیت سے کسی طرح ان سے کم نہیں۔ احمد بن طولون ابتدائی زمانہ میں خود معمولی سپاہی کی زندگی بسر کر چکا تھا، اور تمام نشیب و فراز سے واقف تھا۔ یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ وہ ہر مہم میں اپنی فوج کے ساتھ رہا تھا، اور ہر نرم و گرم تجربے میں سپاہیوں کا برابر کا حصہ دار تھا۔ دوسرے ضروری چیز یہ ہے کہ ان کی تنخواہیں باقاعدہ ملتی رہیں اور ان کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھا جائے۔ اس کا انتظام احمد بن طولون نے قطائع کی تعمیر سے کر دیا۔

ہم اپنے گزشتہ مضمون میں بیان کر چکے ہیں کہ جب فسطاط کی تخطیط کی گئی ہے تو ایک خطہ الحمراء القصوىٰ کہلاتا تھا۔ بنو امیہ کے امراء مصر اسی خطے میں رہتے تھے، لیکن کوئی دارالامارۃ

---

[۱۲۵] بیکر (بحوالہ جمال الدین) ص ۱۹۴۔

نہیں تھا، بلکہ وہ اپنے گھروں میں رہتے تھے۔ ۱۳۲ھ میں مروان الجعدی کی تلاش میں مسودہ مصر آئے ہیں تو یہ خطہ تباہ ہو گیا۔ لیکن امراء مصر اب تک وہیں قیام کرتے رہے۔ پہلے عباسی امیر مصر صالح بن علی الہاشمی نے وہاں ایک دار الامارۃ تعمیر کرایا۔ ابو عون عبد الملک حاکم مصر (۱۳۳ھ سے ۱۳۶ھ اور بار دوم ۱۳۷ھ سے ۱۴۱ھ) نے اپنے ساتھیوں کو وہاں مکانات بنانے کی اجازت دی، اور اب یہ خطہ "عسکر" کہلانے لگا، اور عسکر اور فسطاط مل کر "مدینۃ الفسطاط والعسکر" ہو گیا۔ یزید بن حاتم (۱۴۴ھ سے ۱۵۲ھ) کے عہد امارت تک عسکر ہی امراء کا قیام گاہ رہا۔ لیکن ۱۴۶ھ میں ایک بغاوت کی وجہ سے خلیفہ منصور نے حکم دیا کہ یزید فسطاط میں منتقل ہو جائے۔ ۲۵۴ھ میں جب احمد بن طولون مصر آیا ہے تو صالح بن علی کے تعمیر کردہ دار الامارۃ میں، جو عسکر میں تھا، ٹھیرا تھا[۱۲۶]۔ لیکن ابن الشیخ کے مقابلے کے لئے جب نئی فوج بھرتی کی گئی اور اس میں برابر اضافہ ہوتا گیا تو عسکر اس فوج کے لئے کافی نہ ہوا، اور احمد بن طولون کو کسی ایسی جگہ کی تلاش ہوئی جہاں وہ خود اور اس کی نئی فوج اطمینان اور آرام سے رہ سکیں۔ ۲۵۶ھ میں پائین کوہ (سفح الجبل) کے مقام کو پسند کر کے اس نے حکم دیا کہ وہاں یہودیوں اور عیسائیوں کا قبرستان منہدم کر دیا جائے۔ اس جگہ کو اس نے مختلف خطوں میں تقسیم کیا، اور وہیں اپنا قصر تعمیر کرایا۔ اپنے اصحاب، غلمان اور اتباع کو اجازت دی کہ اس میدان میں اور قصر کے گرد اپنے مکانات بنا لیں، یہاں تک کہ یہ عمارتیں فسطاط سے ملحق ہو گئیں۔ اس کے بعد قطائع بنائے گئے۔ ہر قطیعہ کا نام ان لوگوں پر رکھا گیا جو اس میں رہتے تھے۔ مثلاً قطیعۃ النوبہ، قطیعۃ الروم، قطیعۃ السودان وغیرہ۔ ان تمام عمارتوں، قصر، اور قطائع کو ملا کر "میدان" کہتے تھے۔ اس کی مساحت میل در میل تھی۔ رفتہ رفتہ میدان ایک مستقل شہر بن گیا، جو دمشق سے زیادہ آباد اور خوبصورت تھا۔ گلیاں اور سڑکیں بن گئیں، اچھی اچھی مسجدیں تعمیر ہو گئیں، پن چکیاں، حمام اور تنور قائم ہو گئے۔ مختلف بازاروں کے باقاعدہ نام رکھے گئے، اور ہر حرفت کے لئے ایک بازار مخصوص کر دیا گیا تھا، مثلاً سوق العیارین، سوق الجزارین، سوق البقالین، وغیرہ۔ یہاں پولو کھیلنے کا میدان بھی تھا۔ پورے میدان کی کیفیت ایک فوجی

---

۱۲۶ خطط ج ۲، ص ۲۶۴ + ابن تغری بردی ج ۱، ص ۳۶۲، ۳۶۳ + القلقشندی ج ۳، ص ۳۵

چھاؤنی کی تھی۔ قضاعی نے بیان کیا ہے کہ میدان ہی میں فوجی قواعد اور مظاہرے کے لئے ایک "منظر" تعمیر کیا گیا تھا، اور یہ فوجی قواعد (عرض الخیل) اسلام کے چار عجائبات میں سے ایک عجوبہ تھا[۱۲۷]۔ حفاظت کے لئے میدان کے گرد ایک فصیل کھینچی گئی تھی، جس میں آٹھ دروازے تھے۔ سال میں صرف تین مرتبہ عید، فوجی قواعد اور صدقہ کے دن یہ تمام دروازے عوام کے لئے کھولے جاتے تھے۔ باقی ماندہ دنوں میں صرف ضرورت کے لحاظ سے فصیل کے دروازے کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ قصر میں ایک بلند نشست گاہ تھی، یوم العرض اور یوم الصدقہ کو احمد بن طولون خود بیٹھتا تھا، تاکہ آیندو روند کو دیکھ سکے۔ باب الساج پر ایک اور نشست گاہ تھی جہاں وہ صرف عید کی رات کو غلمان کا معائنہ کرنے اور ان کی حاجتیں پوری کرنے کے لئے بیٹھتا تھا۔ اس تمام تعمیر پر، ابن تغری بردی کی روایت کے مطابق، اسی ہزار دینار خرچ ہوئے تھے۔ احمد بن طولون کے دو بیٹوں خمارویہ اور ہارون کے زمانے میں میدان کی چہل پہل برقرار رہی، بلکہ نئی عمارتیں بنتی گئیں اور آبادی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ۲۹۲ھ میں جب محمد بن سلیمان الواثقی کاتب نے خلیفہ مکتفی کے حکم سے آلِ طولون کا خاتمہ کیا ہے تو ان قطائع کو بھی برباد کر دیا اور قصر کو مسمار کر کے اس کی بنیادیں تک کھود ڈالیں۔ اس کے بعد میدان پھر کبھی آباد نہیں ہوا[۱۲۸]۔ میدان کے اندرونی انتظام کے متعلق افسوس ہے کہ مزید اطلاعات نہیں ملتیں۔

احمد بن طولون سے قبل، مورخ متفق ہیں کہ مصر کی معاشی زبون حالی انتہا کو پہنچ چکی تھی، اور عام طور پر احمد بن المدبر کو اس کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ خلافت عباسیہ کی

۱۲۷۔ دیکھو ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۷۷ + قضاعی نے لکھا ہے کہ باقی تین عجائبات مکہ کا رمضان، طرسوس کی عید، اور بغداد کا جمعہ تھے۔ ان میں سے دو، یعنی مصر کی فوجی قواعد اور طرسوس کی عید خود قضاعی کے زمانے میں ہی ختم ہو چکے تھے۔ اس پر ابن تغری بردی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ قضاعی کے بعد بغداد کا جمعہ بھی ختم ہو گیا تھا جب ہلاکو نے بغداد فتح کیا ہے اور خلیفہ مستعصم کو قتل کر دیا ہے۔ اس کے بعد عراق سے شعائر اسلام رخصت ہو گئے۔ اب صرف مکہ کا رمضان رہ جاتا ہے۔ نہ معلوم اس وقت اس کا کیا حال ہے۔

۱۲۸۔ الکندی ص ۲۱۵ + خطط ج ۱۔ ص ۳۱۳ - ۳۱۶ + قلقشندی ج ۳۔ ص ۳۳۵، ۳۳۶ + ابن تغری بردی ج ۳۔ ص ۱۴، ۱۵ +

ابتدا ہی سے اس زبون حالی کا آغاز ہوچکا تھا، اور اس کی تمام ذمہ داری مرکز خلافت پر تھی، نہ کہ کسی خاص شخص پر۔ ہم دیکھ چکے ہیں[129] کہ بنوامیہ کے آخری زمانے میں عبید اللہ بن الحبحاب نے مصر کے محاصل اور اراضی کی آخری تنظیم کی تھی، اور اس تنظیم کے بعد اس نے ستائیس لاکھ تئیس ہزار آٹھ سو انتالیس دینار بطور فاضل آمدنی دمشق بھیجے تھے۔ لیکن قبل اس کے یہ تنظیم پوری طرح بارآور ہو، اور اس سے کچھ نتائج مترتب ہوں مشرق کے انقلاب سے مصر کے حالات بھی تبدیل ہو گئے۔ عباسیوں نے معلوم ہوتا ہے کہ مصر کے ساتھ ہمیشہ سوتیلے بچوں کا سا سلوک کیا۔ ۱۴۲ھ کے واقعات میں بیان کیا گیا ہے کہ خلیفہ منصور نے محمد بن الاشعث بن عقبہ کو مصر پر علی الصلاۃ والخراج مقرر کیا، اور جب اُس کے قدم وہاں جم گئے تو نوفل بن الفرات کو وہاں بھیجا کہ وہ محمد بن الاشعث کے سامنے خراج مصر کا ضمان پیش کرے۔ اگر وہ اُسے منظور کرے تو حسب دستور صاحب الخراج کے فرائض انجام دیتا رہے، ورنہ نوفل بن الفرات ان فرائض کا جائزہ لے لے۔ محمد بن الاشعث نے ضمان قبول کرنے سے انکار کیا اور نوفل نے خلیفہ کے حکم کے مطابق دواوین کا جائزہ لے لیا۔ اس کے بعد محمد بن الاشعث خراج کے ہاتھ سے نکل جانے پر برابر پچھتاتا رہا[130]۔ یہ پہلا موقع ہے کہ مصر میں ضمان کا ذکر آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ اخراجات کی تکمیل کے بعد ایک مقررہ رقم بغداد کے سرکاری خزانہ میں داخل کرنے کی ضمانت دی جائے۔ اب یہ حالت ہوگئی کہ جو شخص صاحب الخراج مصر مقرر ہو وہ اس مقررہ رقم کی پابجائی کرتا رہے، اور اپنے لیے بھی کچھ نہ کچھ رقم پیدا کر لے، اور ان لوگوں کی خواہش اور مطالبات بھی پورے کرے جو اُس کے ساتھ مصر آتے تھے[131]۔ اس کے بعد ایک اور قدم آگے بڑھایا گیا، اور اس مقررہ رقم کے متعلق ایک تحریری عہدنامہ ہونے لگا۔

---

۱۲۹ "عرب مصر میں"۔ رسالہ سیاست (حیدرآباد دکن) جولائی ۱۹۴۱ء +

۱۳۰ ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۳۸۲، ۳۸۳ +

۱۳۱ بیکر۔ ص ۱۳۸ +

یاد رہے کہ یہ ضمان ہے تقبیل نہیں۔ مصر کی معاشی زبوں حالی کا آغاز یہاں سے ہوا۔

۱۴۳ھ میں محاصل کی رقم میں اضافہ ہوا، اور حمید بن قحطبہ کے عہد امارت میں اٹھائیس لاکھ چونتیس ہزار پانچ سو دینار وصول ہوئے[۱۳۲]۔ پھر موسیٰ بن عیسیٰ کے زمانے میں، جو ۱۷۱ھ سے ۱۸۰ھ تک تین مرتبہ مصر کا والی مقرر ہوا تھا، یہ رقم اخراجات کی منہائی کے بعد اکیس لاکھ اسی ہزار ہو گئی[۱۳۳]۔ ۲۱۲ھ میں عبداللہ بن طاہر بن حسین کو جب مصر کا والی مقرر کیا گیا ہے تو محاصل کی مقدار تیس لاکھ دینار تھی[۱۳۴]۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ محصول اراضی میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ چنانچہ مقریزی[۱۳۵] نے لکھا ہے کہ خلافت مامون اور اس کے بعد کے دور میں فی فدان (ایکڑ) دو دینار لگان عاید کیا جاتا تھا۔ ۲۱۳ھ میں جب مصر کے نظم ونسق میں پھر ایک دوررس تبدیلی ہوئی۔ اس سال مامون نے اپنے بھائی معتصم کو مصر کا ملک دے دیا۔ اب جاگیرداروں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ آشناس، ایتاخ، منتصر، فتح بن خاقان، باکباک اور یارجوخ اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ان میں سے معتصم اور اس سے قبل عبداللہ بن طاہر بن حسین دو ایسے شخص ہیں جو مصر میں تھوڑی مدت کے لئے رہے تھے۔ باقی ماندہ لوگوں کے لئے مصر کی حیثیت ایک دور افتادہ جاگیر سے زیادہ نہ تھی، جس سے وہ صرف مالی فائدہ اٹھانے کے متوقع تھے اور بس۔ اس تبدیلی کے شروع میں بھی مصر کا صاحب الخراج خلیفہ ہی کی طرف سے براہ راست مقرر ہوتا تھا[۱۳۶] لیکن زمانۂ مابعد میں اس کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ گو صاف اور صریح روایات ہم تک نہیں پہنچیں لیکن یہ سمجھنا ہرگز بعید از قیاس نہیں کہ خالص آمدنی میں اب مرکزی خزانہ اور جاگیردار دونوں حصہ دار ہوتے ہوں گے، اور اس کے

---

۱۳۲ بیکر (منقول از فون کریمر) ص ۱۳۸ +

۱۳۳ خطط ج ۱ ص ۹۹ +

۱۳۴ ابن تغری بردی ج ۱ ص ۶۱۰ +

۱۳۵ خطط ج ۱ ص ۹۹ +

۱۳۶ ابن تغری بردی ج ۱ ص ۱۶۶ : وکان الخراج للخلیفة یولی علیه من شاء فی هذه السنین۔

علاوہ صاحب الخراج بدستور باقی رہا۔ ۲۵۶ھ میں سات لاکھ پچاس ہزار دینار بطور باج مرکزی خزانہ میں ادا کئے گئے، کیونکہ اس رقم کو اب باج کہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ اس طرح عربوں کی فیض رساں حکومت کے اٹھ جانے اور ترکوں کے مسلط ہو جانے سے ملک کا نظم و نسق خراب ہو رہا ہے۔ مذکورہ بالا تبدیلیوں کی وجہ سے ملازموں کی رشوت ستانی اور بد اطواری بھی بڑھ رہی ہوگی۔ محصول اراضی میں برابر اضافہ ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ ۲۵۴ھ میں ایک فدان پر چار دینار عائد کئے گئے ہیں۔[۱۳۷]

ان سب باتوں کا نتیجہ معاشی زبوں حالی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟

اس موقع پر ۲۴۷ھ میں خلیفہ منتصر نے احمد بن المدبر کو مصر کا صاحب الخراج مقرر کیا۔ اُس نے مصر آ کر یہاں کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ آمدنی بڑھانے کے نئے وسایل دریافت کئے جائیں، اور اُس نے تین نئے محاصل عاید کئے۔ یہ سب غیر قانونی محاصل تھے، اور معاون و مرافق کہلاتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی وجہ سے عوام پر سختیاں ضرور ہوئی ہوں گی۔ مگر زمانۂ مابعد میں ابن المدبر کی معزولی کے بعد بھی ان محاصل کو مکمل طور پر منسوخ نہیں کیا جا سکا۔ چنانچہ مقریزی[۱۳۸] نے اعتراف کیا ہے کہ چراگاہوں، نطرون اور ماہی گیری کے محاصل مستقل (استمرّا) ہو گئے تھے۔

یہ حالات تھے جب ۲۵۴ھ میں احمد بن طولون مصر پہنچا، اور اُس کے ساتھ مصر کے بھلے دن بھی لوٹ آئے۔ مگر ۲۵۸ھ تک، معاشی معاملات میں اس کا کوئی دخل نہیں ہوا۔ کیونکہ یہ محکمہ حسب سابق احمد بن المدبر کے زیر اقتدار تھا۔ اس سال جب احمد بن المدبر کو شام میں منتقل کیا گیا تو اُسے شہری اور مالی حکومت کا پورہ جائزہ ملا۔ جس طرح مورخ احمد بن طولون سے قبل مصر کی زبوں حالی پر متفق ہیں۔ اسی طرح اُس کے عہد میں ملک کی خوش حالی کے متعلق

---

۱۳۷ بیکر (منقول از کار بنگ) ص ۱۴۱ + کار ابگ نے یہ نہیں لکھا کہ کس پیداوار پر چار دینار فی فدان وصول کئے جاتے تھے۔ کیوں کہ مختلف پیداواروں کے محاصل بھی مختلف تھے۔ لیکن بیکر کا قیاس ہے کہ گیہوں کی پیداوار پر یہ محصول عائد کیا گیا تھا۔

۱۳۸ خطط ج ۱ ص ۱۰۳، ۱۰۴ +

ایک زبان ہیں۔ اس سولہ سالہ مدت میں جو عام امن و امان ملک میں رہا وہی یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ ملک خوش حال تھا۔ مزید بر اں ہمیں اس کا بھی علم ہے کہ اس مدت میں کبھی ایسا موقع نہیں آیا جب احمد بن طولون مالی مشکلات میں مبتلا ہوا ہو۔ بلکہ وہ اتنا نقد چھوڑ گیا تھا کہ خمارویہ کی فضول خرچیوں کی وجہ سے معاشی حالات پھر خراب ہونے شروع ہوئے۔ اس سے ہم یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ احمد بن طولون کا مالی نظم ونسق ضرور قابل تعریف ہوگا لیکن افسوس ہے جب ہم اس نظم ونسق کی تفصیل معلوم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں مایوس ہونا پڑتا ہے کیونکہ اس کے متعلق ہماری معلومات بہت ہی تشنہ ہیں۔ مقریزی[۱۳۹] لکھتا ہے کہ ابن المدبر کے زمانے میں جب مصر کی مالی حالت تباہ تھی تو صرف آٹھ لاکھ خراج وصول ہوا تھا۔ پھر جب احمد بن طولون کو مالیات مصر پر تصرف حاصل ہوا ہے اور اس نے مصر کو خوشحال بنانے کی کوشش کی ہے تو ۲۶۳ھ میں خراج تینتالیس لاکھ تک پہنچ گیا تھا۔ اس سے قبل صرف ایک مرتبہ عبید اللہ بن الحبحاب کے زمانے میں خراج مصر میں اتنا معتد بہ اضافہ ہوا تھا۔ پھر یہ اضافہ اس طرح بھی نہیں ہوا تھا کہ عوام پر کسی طرح کی سختی گزری ہو، بلکہ دس اردب گیہوں کی قیمت ایک دینار، اور دس رطل روٹی کی قیمت صرف ایک درہم تھی۔[۱۴۰] اس کے علاوہ محاصل میں اضافہ کرنے یا نئے محصول لگانے کے بجائے وہ تمام غیر قانونی محاصل (مکوس) جو ابن المدبر نے عائد کئے تھے، منسوخ کر دیئے گئے تھے۔ مورخوں نے اُس کے اخراجات کی مدات بھی بیان کی ہیں، جنھیں مختصر طور پر لین پول[۱۴۱] نے یک جا جمع کر دیا ہے۔ ۲۶۵ھ میں صاحب الخراج نے سات لاکھ پچاس ہزار دینار بطور خراج خلیفہ کے پاس بھیجے تھے، اور چار سال میں اس خراج کی مقدار بائیس لاکھ دینار تھی۔ قطائع پر اسی ہزار دینار، جامع ابن طولون پر ایک لاکھ بیس ہزار دینار، مارستان پر اسی ہزار دینار، اور قلعہ روضہ پر بھی اسی ہزار دینار خرچ ہوئے تھے۔ اُس کی ماہانہ خیرات

---

۱۳۹ خطط ج ۱ ص ۹۹ + ابن تغری بردی ج ۱ ص ۹۴ + ابن ایاس ج ۱ ص ۴۰ +

۱۴۰ بیکر (بحوالہ ویوستن فیلڈ) ص ۱۹۶ +

۱۴۱ تاریخ مصر بعہد وسطیٰ (انگریزی) ص ۶۵، ۶۶،

ایک ہزار دینار، اور مطبخ کا روزانہ خرچ ایک ہزار دینار تھا۔ اس کے علاوہ علماء و فضلا کے انعامات، بڑی زبردست فوج، لاتعداد خانگی ملازمین اور فوجی لحاظ سے مختلف قلعوں کی دیکھ بھال کے اخراجات تھے۔ ابن ایاس[۱۴۲] نے لکھا ہے کہ اُس نے دس لاکھ طلائی دینار، جواہرات کے سو صندوق، لاتعداد فروش و تحائف ترکے میں چھوڑے تھے۔ ضیاع و املاک اور باغ اس کے علاوہ تھے۔

لین پول لکھتا ہے کہ یہ تمام اخراجات صرف تینتالیس لاکھ دینار سالانہ محاصل سے پورے نہیں ہوسکتے تھے، اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ قبطیوں سے زبردستی رقیں وصول کرتا تھا، جیساکہ عیسائی مورخوں نے بیان کیا ہے۔ لیکن اُس نے نہ کسی عیسائی مورخ کا حوالہ دیا اور نہ کسی مسلمان مورخ کا۔ جو ذرائع معلومات ہمارے پیش نظر ہیں ان سے بھی احمد بن طولون پر یہ الزام عائد نہیں ہوتا کہ وہ مسلمانوں یا عیسائیوں سے اس معاملے میں سختی کرتا تھا۔ مصری مورخوں نے جس طرح اپنے والیوں کے تمام عیوب و محاسن بلا کم و کاست بیان کردئے ہیں انھیں دیکھتے ہوے یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ احمد بن طولون کے متعلق یہ لکھنا بھول جاتے کہ اس نے قبطیوں کو لوٹا تھا، یا غیر معمولی سختیاں ان پر روا رکھی تھیں۔

ایک روایت مقریزی[۱۴۳] نے ابن الدایہ (جامع السیرۃ) سے نقل کی ہے جس سے احمد بن طولون کے عہد کی معاشی حالت پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جب خلیفہ معتمد نے مصر اور ثغور الشامیہ کا خراج احمد بن طولون کے سپرد کیا تو اس نے تمام اعمال میں معاون و مرافق کو منسوخ کرنے اور متقبلین کو مزارعین کے پٹے فسخ کرنے کی ممانعت کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر مصر کے معاون و مرافق منسوخ کرنے سے قبل اُس نے عبداللہ بن دسومہ سے جو اُس وقت ابوایوب ابن اخت الوزیر صاحب الخراج کا متولی (امین) تھا، اس بارے میں مشورہ کیا۔ ابن دسومہ بدنفس و بدطینت شخص تھا۔ اس نے مشورہ دیا کہ نہ صرف معاون و مرافق کو منسوخ نہ کیا جائے، کیونکہ صرف مصر (فسطاط) سے ایک لاکھ دینار سالانہ اُس مدمیں وصول ہوتے ہیں، بلکہ چونکہ

---

۱۴۲ بدائع الزہور۔ ج ۱۔ ص ۴۰۔ +

۱۴۳ خطط ج ۲۔ ص ۲۶۶، ۲۶۷۔ +

یہ خشک سالی کا زمانہ ہے اس لئے متقبلین کے اجازت نامے اور امراء کی ضیاع بھی منسوخ کردئے جائیں، تو اس سے ملک کی آمدنی میں بہت اضافہ ہوگا۔ احمد بن طولون نے اس مشورے کو فوراً قبول کرنے کے بجائے، جس سے فسخ شدہ اجازت ناموں کے بجائے زیادہ شرح پر نئے اجازت نامے جاری کرنا مقصود تھا، غور و فکر کیا۔ رات کو اس کے طرسوس والے زاہد دوستوں میں سے ایک زاہد اُسے خواب میں نظر آیا، جس نے ہدایت کی کہ وہ عبد اللہ بن دسومہ کے مشورے پر عمل نہ کرے، بلکہ جو فیصلہ کرچکا ہے اس پر بلا تامل کاربند ہو۔ اللہ اُسے اس کا عوض دے گا۔ صبح کو اس نے معاون و مرافق کی منسوخی کا حکم دے دیا، اور ابن دسومہ کو اس کی اطلاع دی۔ ابن دسومہ نے اب بھی اس کی مخالفت کی اور کہا کہ تم نے زندہ کی بات نہ مانی اور مردہ کے کہنے پر عمل کیا لیکن اگلے دن صبح کو احمد بن طولون چند غلاموں کے ساتھ مصر صعید روانہ ہوگیا۔ صحرا میں اس کے ایک غلام کے گھوڑے کا پاؤں ریت میں دھس گیا۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ وہاں ایک دفینہ ہے۔ خلیفہ کی اجازت سے یہ دفینہ مارستان پر خرچ کیا گیا۔ اسی قسم کے ایک اور دفینہ سے جامع ابن طولون تعمیر ہوئی۔ ابن دسومہ کو اس نے پھر بلایا، اور کہا کہ مردے کی بشارت کی یہ پہلی برکت ہے۔ اگر میں وعدہ نہ کرچکا ہوتا تو تجھے قتل کردیتا۔ چند روز کے بعد لوگوں کی شکایت پر کہ وہ ان پر بیجا سختیاں کرتا ہے، ابن دسومہ کو قید کردیا گیا، اور مال و اسباب ضبط کرلیا گیا۔

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ خلیفہ منصور کے زمانے میں ہی ضمان کا طریقہ رائج ہوچکا تھا۔ مقریزی[۱۰۵] کے مطابق بعد کے زمانے میں ایک اور برا رواج پڑ گیا تھا کہ ضمان میں ایک بارگی تبدیلی

۱۰۵۔ خطط ج ۱۔ ص ۸۴ قال لما انتهی الی المامون ما یعتمد فی الدواوین من قبول الزیادات و فسخ عقود الضمانات وانتزاعها من کابد فیها المشقة والتعب وتسلیمها الی باذل الزیادة من غیر کلفة ولا نصب انکر ذلك و منع من ارتکابها ونهی عن الولوج فی بابه وخرج امره باعفاء الکافة اجمعین والضمناء والمعاملین من قبول الزیادة فیما ینصرفون فیه ویستولون علیه ماداموا مخلقین وبافسا طهم قائمین وتضمن ذلك منشور قری فی الجامعین الازهر بالقاهرة والعتیق بمصر

بقیہ برصفحہ آئندہ ملاحظہ ہو

کردی جاتی تھی، اور تمام معاملہ اُس شخص کے سپرد کر دیا جاتا تھا جو زیادہ رقم ادا کرنے کا وعدہ کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جو شخص تکلیف اٹھاتا تھا، اور ابتدائی اخراجات برداشت کرتا تھا وہ اس سے فائدہ اٹھانے سے باز رکھا جاتا تھا، اور کوئی دوسرا شخص اس کے کام سے مستفید ہوتا تھا خلیفہ الآمر کے وزیر مامون کو جب اس طرزِ عمل کا علم ہوا تو اُس نے اسے بہت بُرا سمجھا، اور حکم دیا کہ آئندہ ایسا نہ کیا جائے، اور ضمناء و معاملین سے ان زمینوں کے متعلق جن پر وہ متصرف ہیں زیادہ رقم کا مطالبہ اُس وقت تک نہ کیا جائے جب تک کہ وہ اپنے ضمان پر قائم ہیں اور اقساط باقاعدہ ادا کرتے ہیں۔ ابن وسومہ نے جو مشورہ احمد بن طولون کو دیا تھا وہ درحقیقت یہی بدعت سیئہ تھی۔ لیکن یہاں بھی مقریزی نے صرف ضمان کا ذکر کیا ہے، تقبیل کا عمل مامون کے زمانے میں بھی نہیں ہے۔
اب احمد بن طولون کے زمانے میں دو نئی باتیں سننے میں آتی ہیں: ایک تقبیل اور دوسرے ضیاع الامراء[۱]
ہم فی الحال نہیں کہہ سکتے کہ تقبیل کا طریقہ کب وجود میں آیا۔ تقبیل اور ضمان میں تھوڑا ہی سا فرق ہے۔ مگر تقبیل کے بعد حکومت مالیات میں اتنا دخل نہیں دے سکتی تھی جتنا کہ ضمان کی صورت میں۔ اس لئے متقبل اپنی ذاتی منفعت کی بناء پر مزارعین کے پٹوں کو فسخ کر کے زمین کسی اور کے حوالے کر سکتا تھا جو اُسے زیادہ رقم دے۔ حالانکہ متقبل کی واجب الادا رقم مقررہ تھی، اور اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر ضیاع الامراء ہیں۔ خود مقریزی نے لکھا ہے کہ الپ ارسلان اور ملک شاہ کے زمانے میں سب سے پہلے نظام الملک طوسی نے ضیاع تقسیم کئے تھے۔ لیکن یہاں مصر میں احمد بن طولون کے عہد ہی میں ضیاع الامراء موجود ہیں، گو یہ تصفیہ کرنا مشکل ہے کہ امراء سے مراد یہاں فوجی افسر ہیں، جن کی خدمات کا صلہ ضیاع کی صورت میں دیا جاتا تھا، یا شہری امراء ہیں۔ بہرحال ابن وسومہ کے مشورے کو قبول نہ کر کے احمد بن طولون نے مصر کو ایک بہت

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ گذشتہ) وردیوان المجلس والخاص الامر بابن سعید بن ونسختہ بعد النصف یہ یہاں مامون سے مراد محمد بن ابی شجاع البطائحی المامون، وزیر خلیفہ الآمر فاطمی سے ہے، اور یہ تنسیخ ۵۱۵ھ میں عمل میں آئی ہے۔ جب المامون کو الافضل کے قتل کے بعد الآمر نے وزیر مقرر کیا ہے۔

[۱] خطط ج ۱ ص ۹۵ +

بڑے معاشی انقلاب بلکہ معاشی تباہی سے بچا لیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں یہ بدعت آخر جاری ہوگئی تھی، جسے وزیر المامون نے منسوخ کیا۔

اب صرف یہ رہ جاتا ہے کہ ابن ایاس[۱۴۷] کی روایت نقل کر دی جائے کہ جب احمد بن طولون کے حالات مستقل ہو گئے تو اُس نے مصر کو آباد کرنے اور خوشحال بنانے کی طرف خاص توجہ کی، اور اس غرض سے اُس نے پل (جسور و قناطر) تعمیر کرائے، نہریں (خلجان) کھدوائیں اور تالابوں کے بند بندھوائے۔ ان کاموں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصر کی بدحالی ختم ہو گئی اور خوش حالی کا دور شروع ہوا۔ ۲۶۱ھ میں مصر سے چار کروڑ تین لاکھ دینار وصول ہوئے۔ ضیاع الامراء اس کے علاوہ تھے[۱۴۸]۔ ابن تغری بردی[۱۴۹] نے لکھا ہے کہ ۲۵۹ھ میں احمد بن طولون نے خلیفہ متوکل کے مقیاس النیل کی، جس کی تعمیر ۲۴۷ھ میں ہوئی تھی، ایک ہزار دینار خرچ کر کے مرمت کرائی تھی[۱۵۰]۔ اس سے زیادہ ہم احمد بن طولون کے مالی انتظامات اور دوسری تبدیلیوں کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔

(۶)

احمد بن طولون کی بعض عمارتوں کا، جو اُس نے مصر میں تعمیر کرائی تھیں، اور پرانے مقیاس کی مرمت کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ یہ عمارتیں زیادہ تر سرکاری اغراض کے لئے بنائی گئی تھیں لیکن ان کے علاوہ مصر میں اور اُس کے باہر احمد بن طولون نے رفاہ عام کے بہت سے کام انجام دئے تھے، اور زبردست عالی شان عمارتیں تعمیر کرائی تھیں، جن کی وجہ سے اُس کا نام ہمیشہ باقی رہے گا۔ یہاں ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان عمارتوں پر اثری نقطۂ نظر سے بحث کی جائے، اور ان کی تعمیری خصوصیات پر نظر ڈالی جائے۔ ان امور کی کافی تفصیل کاربٹ[۱۵۱]، یوسف احمد[۱۵۲] اور خصوصاً کریسول[۱۵۳] نے

[۱۴۷] بدائع الزہور۔ ج ۱۔ ص ۳۷ +

[۱۴۸] دیکھو ابن تغری بردی ج ۱۔ ص ۴۹ +

[۱۴۹] النجوم الزاہرہ۔ ج ۱۔ ص ۳۴ +

[۱۵۰] تصاویر کے لئے دیکھو کریسول تصویر ۸۰۔ الخ +

[۱۵۱] لائف اینڈ ورک آف احمد بن طولون۔ از آسٹیس۔ کے۔ کاربٹ۔ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۹۳ء ص ۵۲۷۔ ۵۵۶ +

[۱۵۲] جامع ابن طولون۔ از یوسف احمد۔

[۱۵۳] ارلی مسلم آرکی ٹیکچر حصہ دوم ص ۳۲۷۔ ۳۰۶ +

اپنی تازہ ترین تصنیف میں کردی ہے، اور نقشوں، خاکوں اور تصویروں کے ذریعے ان کی خصوصیات کو واضح کر دیا ہے۔ لہذا ان باتوں کا یہاں اعادہ کرنا تحصیل حاصل ہوگا۔

مصر کے باہر احمد بن طولون کی صرف دو عمارتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے ایک عکا کی بندرگاہ ہے۔ مقدسی کا دادا اس عمارت کا مہندس اور تعمیر کنندہ (البنّاء) تھا، اور اسی جغرافیہ نویس نے اس تعمیر کے حالات بیان کئے ہیں۔ مقدسی[۱۵۴] کی عبارت، جس نے اپنی کتاب ۳۷۵ھ میں لکھی ہے، ہم یہاں نقل کرتے ہیں، تا کہ اندازہ ہو جائے کہ اس قسم کی عمارتیں اُس زمانے میں کس طرح بنائی جاتی تھیں۔

عکا مدینة حصینة على البحر كبيرة الجامع، فيه غابة زيتون تقوم لسرجه وزيادة۔ ولم تكن على هذه الحصانة حتى زارها ابن طولون، وقد كان رأى صور ومنعتها واستدارة الحائط على مينائها۔ فاحب ان يتخذ لعكا مثل ذلك المينا۔ فجمع صُنّاع الكورة وعرض عليهم ذلك۔ فقيل لا يهتدى احد الى البناء فى الماء فى هذا الزمان۔ ثم ذكر له جدّنا ابوبكر البنّاء وقيل ان كان عند احد علم هذا فعنده۔ فكتب

عکا ساحل بحر پر قلعہ بند شہر ہے۔ یہاں کی جامع مسجد وسیع ہے۔ اس کے صحن میں زیتون کے درختوں کا ایک جھنڈ ہے، جس کے تیل سے مسجد کے چراغ روشن کئے جاتے ہیں اور پھر نیل بچ رہتا ہے۔ احمد بن طولون کے وہاں آنے تک شہر قلعہ بند نہیں تھا۔ اُس نے صُور کے استحکامات دیکھے کہ کس طرح ایک فصیل بندرگاہ کے گرد کھنچی ہوئی ہے۔ اُس نے چاہا کہ عکا میں بھی صُور کا سا بندرگاہ (مینا) تعمیر کرے۔ چنانچہ اُس نے صوبے کے صنّاع جمع کئے، اور اُن کے

[۱۵۴] احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم ص ۱۶۲-۱۶۳+

الى صاحبه على بيت المقدس حتى انهضهُ اليه. فلما صار اليه وذكر له ذلك، قال "هذا امرٌ هيّنٌ. على بفلق الجُمَّيْز الغليظة." فصفها على وجه الماء، بقدر الحصن البري وَ خَيَّط بعضها ببعض. وجعلها باباً من الغرب عظيماً. فبنى عليها بالحجارة والشيد؛ وجعل كلما بنى خمس دوامس ربطها باعمدة غلاظة ليشتد البناء. وجعلت الفلق كلما ثقلت ونزلت، حتى اذا علم انها جلست على الرمل، تركها حولاً كاملاً، حتى اخذت قرارها. ثم عاد، فبنى حيث ترك. وكلما بلغ البناء الى الحائط القديم داخله فيه وخَيَّطَهُ. ثم جعل على الباب قنطرة. فالمراكب فى كل ليلة تدخل المينا وتجر السلسلة مثل صُور. قال فدفع اليه الف دينار سوى الخلع وغيره من المركوب واسمهُ عليه مكتوب وكان العلاء

سامنے یہ مسئلہ پیش کیا۔ اُس سے کہا گیا کہ ان دنوں کوئی ایسا نہیں رہا جو پانی میں عمارت بنا سکے۔ پھر احمد بن طولون سے ہمارے دادا ابو بکر البنّاء کا ذکر کیا گیا کہ اگر کسی کے پاس اس قسم کی تعمیر کا علم ہے تو وہ ابو بکر ہی ہے۔ احمد بن طولون نے اپنے حاکم بیت المقدس کو لکھا، اور اس نے ابو بکر کو بھیج دیا۔ جب وہ احمد بن طولون کے پاس آیا اور یہ مسئلہ اُس کے سامنے پیش کیا گیا تو اُس نے کہا کہ یہ آسان کام ہے۔ جتنے بڑے اور مضبوط انجیر (جُمّیز) کے درختوں کے ہو سکیں لاؤ۔ انھیں اس نے سطح آب پر قطار در قطار (سمندر کی سمت میں) فصیل شہر کی توسیع کی طرح پھیلا دیا، اور سب کو ایک دوسرے سے باندھ دیا، اور مغرب کی سمت ایک بڑے دروازے کا راستہ چھوڑ دیا۔ ان شہتیروں پر ابو بکر نے چونے پتھر سے ایک عمارت اٹھانی شروع کی۔ ہر پانچ ردوں کے بعد اُسے مضبوط کرنے کے لئے بڑے بڑے ستون لگائے۔ اس طرح بوجھ پڑنے سے شہتیر پانی کے اندر غرق ہونے شروع ہوئے، جب اس نے جان لیا کہ شہتیر ریت پر جم گئے ہیں تو پورے ایک سال تک عمارت کو اُسی حالت میں چھوڑ دیا، تاکہ وہ مستقل طور پر ریت میں جم جائے۔ پھر واپس آکر جہاں چھوڑا تھا وہاں سے

قبل ذلك يغير على المراكب +

تعمیر شروع کی۔ جب یہ تعمیر قدیم فصیل تک پہنچ گئی تو نئی تعمیر کو اس کے ساتھ جوڑ دیا۔ پھر (بندرگاہ کے مغربی) دروازے پر اُس نے ایک پل تعمیر کیا، ہر رات کو جب جہاز بندرگاہ (مینا) میں داخل ہو جاتے تھے تو صور کے بندرگاہ کی طرح ایک زنجیر اُن کے سامنے کھینچ دی جاتی تھی۔ اس کے صلے میں احمد بن طولون نے ابوبکر کو ایک ہزار دینار دئے، خلعتیں اور گھوڑے اس کے علاوہ تھے، اور اُس کا نام عمارت پر لکھا گیا۔ اس بندرگاہ (مینا) کی تعمیر سے قبل دشمن ان جہازوں کو جو وہاں ٹھیرتے تھے لوٹ لیا کرتا تھا۔

حکیم ناصر[155] خسرو نے پانچویں صدی کے نصف میں اس نواح کا سفر کیا ہے، اور اس بندرگاہ کے مختصر حالات لکھے ہیں۔ پھر یاقوت کی کتاب معجم البلدان چھٹی صدی کی تصنیف ہے۔ وہ مقدسی کی عبارت اُسی کے حوالے سے حرف بحرف نقل کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ ابوبکر کا نام اس عمارت پر اُس وقت تک موجود تھا[156]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی صدی تک یہ تعمیر اچھی حالت میں تھی۔ لی اسٹرینج[157] نے بیان کیا ہے کہ عکا کی اس بندرگاہ کے آثار اب تک باقی ہیں گو تہ آب ہیں۔ کرسیول[158] نے لکھا ہے کہ ستونوں کے ذریعے تعمیر کی بندشوں کو مستحکم کرنے کی یہ پہلی مثال ہے، ورنہ عہد اسلام میں یا اس سے قبل ایسی مثال شام میں دیکھنے میں نہیں

---

[155] سفرنامہ ص ۲۲، ۲۳ +

[156] معجم البلدان تحت عکہ : واسمه عليه مكتوب الى اليوم +

[157] پلسٹائن انڈر دی مسلمز ص ۳۲۹ +

[158] ارلی مسلم آرکی ٹیکچر ص ۳۶۰ +

آئی۔ بی اسٹرنج کا قول ہے کہ حروب صلیبیہ کے دوران میں ابوبکر کے طرز تعمیر کی نقل یورپ کے معماروں نے قلعوں کی تعمیر میں اکثر کی ہے۔

مقدسی نے اس کی صراحت نہیں کی کہ یہ بندرگاہ کب تعمیر ہوئی تھی، اور نہ کسی اور مصنف نے اس کا ذکر کیا ہے۔ مگر اپنی زندگی میں احمد بن طولون دو مرتبہ شام گیا تھا۔ پہلی مرتبہ ۲۱ شعبان ۲۶۴ھ میں اور رمضان ۲۶۵ھ میں مصر واپس آیا تھا۔ دوسری مرتبہ صفر ۲۶۹ھ میں شام گیا اور ۱۹ جمادی الثانی ۲۷۰ھ کو مصر واپس آیا[۱۵۹] ان دو سفروں میں سے ایک سفر میں عکا کی بندرگاہ تعمیر ہوئی ہوگی۔

بیرون مصر احمد بن طولون کی دوسری تعمیر یافہ کا قلعہ ہے۔ اس کا ذکر متعدد مورخوں نے کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس سے قبل وہاں قلعہ نہیں تھا[۱۶۰]۔ مگر اس عمارت کے تفصیلی حالات نہیں مل سکے۔ عکا کی طرح یافہ بھی ساحل بحر پر واقع ہونے کی وجہ سے فوجی اہمیت رکھتا تھا، ورنہ خود شہر میں کوئی خوبی نہیں تھی۔ چنانچہ یاقوت[۱۶۱] نے ابن بطلان کے ۴۴۳ھ میں لکھے ہوئے ایک رسالہ کے الفاظ نقل کئے ہیں:

"وبیا فابلد النحط والمولود فیہا قل ان یعیش حتی لا یوجد فیہا معلم للصبیان"۔

ممکن ہے کہ احمد بن طولون نے عکا کی طرح یہاں بھی بندرگاہ تعمیر کرایا ہو، اور ممکن ہے کہ ان مورخوں نے عکا اور یافہ کو غلط ملط کیا ہو۔ مگر یہ محض قیاسات ہیں۔ ان دو کے علاوہ احمد بن طولون کے تمام باقی ماندہ رفاہی عمارتیں مصر میں تعمیر ہوئی تھیں۔

غالباً احمد بن طولون کا سب سے زیادہ نمایاں رفاہی کام سقایہ ہے۔ اس سقایہ کے ذریعے برکۃ الحبش سے، جو فسطاط کے جنوب مشرق میں خطۂ مغافر میں واقع تھا، پانی بلند کیا جاتا تھا، اور اس پانی کو شمال کی طرف قرافۃ الکبری (بڑے قبرستان) کے پاس ایک مسجد تک پہنچایا جاتا

---

۱۵۹ الکندی ص ۲۱۹، ۲۲۱، ۲۲۴، ۲۳۱۔

۱۶۰ ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۴ + ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۳۶ + ابوالفداء ج ۲۔ ص ۵۳۔

۱۶۱ معجم البلدان تحت یافہ۔

تھا۔ یہ سقایہ قناطر ابن طولون اور اس کے کنویں کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی تعمیر کی وجہ مقریزی[۱۶۲] نے 'بحوالہ قضاعی' یہ بیان کی ہے کہ ایک مرتبہ احمد بن طولون سوار ہو کر سیر و شکار کے لئے نکلا اور مسجد اقدام[۱۶۳] کے پاس گزرا، جو خطۂ مغافر میں واقع ہے۔ لشکر کے آگے بڑھ جانے کی وجہ سے وہ اپنے سپاہیوں اور ساتھیوں سے الگ ہو گیا تھا، اور سخت پیاسا تھا۔ مسجد اقدام میں اُسے ایک درزی دکھائی دیا۔ اُس نے درزی سے پانی مانگا۔ وہ پیالے میں پانی لایا اور ساتھ ہی یہ تاکید کی کہ زیادہ نہ پی جانا۔ یہ سن کر احمد بن طولون مسکرایا، اور خوب سیر ہو کر پانی پینے کے بعد درزی سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ پانی بھی پلاتے ہو اور تاکید بھی کرتے ہو کہ زیادہ نہ پینا؟ درزی نے جواب دیا کہ خدا تمہارا بھلا کرے، ہمارے ہاں پانی نہیں ملتا۔ اب یہ اطمینان کر کے واقعی وہاں پانی کی قلت ہے احمد بن طولون آگے بڑھ گیا، اور قصر میں پہنچ کر مسجد اقدام کے درزی کو بلایا اور ایک ہزار دینار دے کر اُس سے کہا کہ مہندسوں کو ساتھ لے جائے تاکہ وہ سقایہ کی تخطیط کریں، اور خود درزی کے لئے بھی دس دینار ماہانہ مقرر کر دیا۔ درزی کو حکم دیا کہ جب پانی تم تک پہنچ جائے تو مجھے بھی خوش خبری سنانا۔ یہ مژدہ لانے والے کو اُس نے مالا مال کر دیا۔ احمد بن طولون کو مشورہ دیا گیا تھا کہ عین ابی خُلَیْد المعروف بالتنّور سے اس سقایہ کے لئے پانی لے۔ مگر اُس نے کہا کہ یہ چشمہ ہمیشہ عین ابی خُلَیْد ہی رہے گا، اور میرا نام کہیں نہیں ہو گا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک کنواں کھدوایا گیا اور اس کا پانی قناطر کے ذریعہ سے درب السالم تک پہنچایا جاتا تھا۔ یہ ایک خیر جاریہ تھی جس سے امیر و غریب یکساں مستفید ہوتے تھے۔

سقایہ کا مہندس ایک نصرانی تھا، جس سے غالباً قبطی مراد ہے، کیونکہ اگر وہ یونانی ہوتا تو صراحت کے ساتھ رومی لکھا جاتا۔ احمد بن طولون نے اُسے حکم دیا تھا کہ جب تعمیر مکمل

---

[۱۶۲] سقایہ کے متعلق حوالہ جات:۔ مقریزی ج ۱ص ۲۹۸ + ۲۔ص ۴۵۱، ۴۵۷، ۴۵۸ +

[۱۶۳] اس مسجد کی وجہ تسمیہ اور حالات کے لئے دیکھو خطط ج ۲۔ ص ۴۴۵ +

ہو جائے تو اُسے اطلاع دی جائے تاکہ وہ بذات خود تمام کام کا معائنہ کرے۔ یہ دن بھی آ گیا۔ احمد بن طولون کنویں اور قناطر کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اتفاقاً اُس کے گھوڑے نے چونے اور اینٹوں کے ایک ڈھیر سے ٹھوکر کھائی۔ احمد بن طولون شکی مزاج تو واقع ہوا ہی تھا۔ اُسے معاً یہ شبہ ہوا کہ نصرانی مہندس کی نیت بخیر نہیں۔ چنانچہ اسے فوراً گرفتار کر لیا گیا، اور اس کے کپڑے اتار کر پانچ سو چابکوں کی سزا دی گئی۔ یہ بیچارہ اتنے ہی دیناروں کے صلے کی امید میں تھا۔ اس کے بعد یہ مہندس جامع ابن طولون کی تعمیر شروع ہونے تک برابر مطبق (قید خانے) میں رہا۔

روایت ہے کہ سقایہ کی تعمیر کے بعد احمد بن طولون نے سنا کہ ایک جماعت ایسی ہے جو اس کا پانی پینا جائز نہیں سمجھتی محمد بن عبد اللہ بن عبد الحکم بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رات کو اچانک انھیں امیر کے حکم سے صحرا لے جایا گیا، اور خود امیر بھی وہاں مقیم تھا۔ "امیر کا خادم جو میرے ساتھ تھا اُس نے بتایا کہ ممکن ہے کہ تم سے سقایہ کے متعلق کچھ دریافت کیا جائے۔" وہ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ احمد بن طولون گھوڑے پر سوار سقایہ کے دروازے پر کھڑا ہے، اور سامنے شمع روشن ہے۔" میں نے فوراً کہا کہ آپ کا خادم مجھے ایسی تیز رفتاری سے لایا ہے کہ میں بہت تھک گیا ہوں۔ اور پانی پینا چاہتا ہوں۔ غلاموں نے پانی دینا چاہا، مگر میں نے کہا کہ میں خود ہی پی لوں گا، اور وہیں سقایہ کا پانی لے کر خوب سیر ہو کر پیا، اور امیر کو دعا دی کہ اللہ اُسے جنت کا پانی پینا نصیب کرے۔ اس پر امیر نے میری طرف دیکھا اور کہا کہ مجھے تم سے ایک کام تھا، مگر اس کا یہ موقع نہیں۔ انھیں واپس لے جاؤ۔" احمد بن طولون کا مقصد پورا ہو چکا تھا اور اب کسی کو اعتراض کی ہمت نہ ہو سکتی تھی۔

جب دولت طولونیہ برباد ہوئی تو سعید القاص نے آل طولون کا ایک مرثیہ کہا۔ اس مرثیے میں سقایہ کے متعلق کہتا ہے[۱۶۴]

---

۱۶۴ الکندی ص ۲۵۵، ۲۵۶ + خطط ج ۲۔ ص ۲۵۸ +

وعین معین الشراب غیر رکیۃ　　وغیر اجاج للرواۃ و للمطھر
کان وفود النیل فی جنباتھا　　تروح وتغدی بین مد الی جزر
فارفاھا مستنبطاً لمغیبھا　　من الارض من بطن عمیق الی ظہر
بناء لو ان الجن جاءت بمثلہ　　بقیلی لقد جاءت لمستفظع نکر
یمر علی ارض المغافر کلھا　　وشعبان والاحمور والحی من البشر
قبائل لو نوء السحاب یمدھا　　والنیل یرویھا والاجدول یجری

یہ سقایہ اب تک موجود ہے کہ کھنڈر ہو گیا ہے، اور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ اُس کی مرمت بھی ہوئی تھی۔ کنواں جبل مقطم کے دامن میں ایک ٹیلے کے نیچے کھدوایا گیا تھا، اور جیسا کہ مصر میں عام دستور ہے، رہٹ کے ذریعے اُس کا پانی اوپر پہنچایا جاتا تھا۔ اور وہاں سے ایک مرتفع نالی کے ذریعہ سے شمال تک پہنچتا تھا۔ یہ نالی شروع میں زمین سے چھ میٹر بلند ہے، لیکن جوں جوں زمین اونچی ہوتی جاتی ہے نالی نیچی ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ آخر زمین کے برابر آگئی ہے۔ نالی کو ایک پل پر بنایا گیا ہے، جس کی محرابیں نوک دار ہیں اور شکل وصورت میں جامع مسجد کی محرابوں سے ملتی ہیں۔ اصل تعمیر میں سرخ اینٹ اور چونا استعمال ہوا ہے، اور اینٹوں کا قد وقامت وہی ہے جو جامع مسجد کی اینٹوں کا ہے[۱۶۵]۔ ایسا ہونا تعجب خیز بھی نہیں کیونکہ سقایہ اور جامع ابن طولون کا مہندس ایک ہی تھا۔

احمد بن طولون کی سب سے زیادہ مشہور عمارت جامع ابن طولون ہے۔ الکندی[۱۶۶] نے لکھا ہے کہ اہل مصر (فسطاط) نے احمد بن طولون سے شکایت کی کہ جمعہ کے دن اس کی فوج اور حبشی غلاموں کی وجہ سے مسجد تنگ ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس نے جبل یشکر پر نئی جامع مسجد بنانے کا حکم دیا، جس کی تعمیر ۲۶۳ھ میں شروع ہوئی اور ۲۶۶ھ میں مکمل ہوئی۔ فتح کے بعد دیار مصر میں سب سے پہلی مسجد عمرو بن العاص نے فسطاط میں تعمیر کرائی تھی، اور جوں جوں

---

۱۶۵ کاربٹ ص ۵۳۲ +　　۱۶۶ کتاب الولاۃ ص ۲۱۹ +

ضرورت پڑتی گئی اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ پھر بنو عباس کے آغاز خلافت میں فسطاط کے باہر عسکر میں بستی بسائی گئی تو علی بن صالح الہاشمی حاکم مصر نے ۱۶۹ھ میں وہاں ایک نئی جامع مسجد بنوائی جو جامع العسکر کہلاتی تھی[۱۶۷]۔ یہی ابن طولون کے وقت تک جامع مسجد کا کام دیتی رہی۔ لیکن ۲۶۹ھ میں دوسری مرتبہ اسکندریہ سے واپس آنے پر احمد بن طولون نے نئی مسجد بنانے کا حکم دیا[۱۶۸]، جس کی وجہ اوپر بیان کی گئی ہے۔ اس کی جا، وقوع جبل یشکر پر ہے۔ یہ پہاڑ قاہرہ اور مصر (فسطاط) کے درمیان واقع ہے، اور عرب قبیلہ یشکر بن جدیلہ یا جزیلہ کے نام پر جبل یشکر کہلاتا ہے۔ قطع نظر اس کے یہ پہاڑی اجابت دعا کی وجہ سے مشہور تھی اور یہ بھی روایت بیان کی جاتی تھی کہ اللہ نے حضرت موسیٰ سے یہیں باتیں کی تھیں، یہ مقام اس کام بھی آتا تھا کہ منجنیقوں کو ثغور پر بھیجنے سے قبل ان کی آزمایش یہیں کی جاتی تھی[۱۶۹]۔ قطائع کی تعمیر کے بعد ۲۶۳ھ میں جامع ابن طولون کی تعمیر پر غور کیا۔ اس پر وہ دفینہ خرچ کیا گیا تھا جو احمد بن طولون کو تنور فرعون کے مقام پر ملا تھا۔ جب مسجد کا نقشہ تیار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس عمارت میں تین سو ستونوں کی ضرورت ہوگی، اور احمد بن طولون کو بتایا گیا کہ ان کے حاصل کرنے کی صرف یہی ایک سبیل ہے کہ اریاف اور ضیاع کے تباہ شدہ گرجاؤں سے انہیں لیا جائے۔ مگر اس نے ایسا کرنے سے انکار کیا، اور بہت دن تک اس معاملے پر غور کرتا رہا۔ آخر اس نصرانی مہندس کو جس نے سقایہ تعمیر کیا تھا اس کی اطلاع ہوئی۔ وہ ابھی تک مطبق ہی میں تھا۔ اس نے وہیں قید خانے سے احمد بن طولون کو لکھا کہ امیر کی مرضی کے مطابق میں مسجد کو بے ستونوں کے تعمیر کر سکتا ہوں، صرف قبلے کے لئے دو ستون درکار ہوں گے۔ احمد بن طولون نے اسے قید خانے سے بلوایا اور دریافت کیا کہ کیا واقعی وہ ایسا کرنے پر قادر ہے۔ نصرانی مہندس نے کھالوں کے ذریعہ تمام نقشہ تیار کر کے دکھایا۔ امیر نے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا، اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ

۱۶۷؎ خطط ج ۲۔ ص ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۶۵ +　　۱۶۸؎ الکندی ص ۲۱۶ +

۱۶۹؎ خطط ج ۱ ص ۱۲۵ + ج ۲۔ ص ۲۶۵ +

بجائے ستونوں کے مسجد کی چھت کھمبوں پر قائم کی جائے۔ اسی طرح مسجد کے مینار کے متعلق بھی ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ احمد بن طولون کبھی کوئی کام بے کار نہیں کرتا تھا۔ ایک دن وہ کاغذ ہاتھ میں لئے ہوئے اسے لپیٹ رہا تھا کہ اچانک اُسے خیال آیا کہ یہ عبث کام ہے، مگر اُس نے فوراً مسجد کے معمار کو بلاکر حکم دیا کہ مسجد کا مینار اس شکل کا بنایا جائے۔ بہرحال اُس نے مہندس کو خلعت سے سرفراز کیا، اور ایک لاکھ دینار اس کے حوالے کئے کہ تعمیر شروع کردے، اور باقی ماندہ رقم حسب ضرورت مہیا کردی جائے گی۔ احمد بن طولون کا خیال تھا کہ مسجد کی عمارت ایسی بنائی جائے کہ اگر شہر جل جائے یا غرقاب ہوجائے تو مسجد کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ چنانچہ اسے مشورہ دیا گیا کہ رُخام کے ستون استعمال نہ کئے جائیں، اور تمام عمارت جبیر (کھریا مٹی) اور راکھ (رماد) سے تیار کی جائے۔ کیونکہ پتھر آگ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اصلی عمارت میں میضاۃ تعمیر نہیں کیا گیا تھا۔ مسجد کے آخری حصے میں مشروبات اور ادویہ کا ایک ذخیرہ رہتا تھا، اور جمعہ کے دن مسجد میں ایک طبیب مقرر تھا کہ اگر کسی نمازی کو حادثہ پیش آجائے تو فوراً اس کا تدارک کیا جاسکے۔ جب مسجد تیار ہوگئی تو تانبے کی زنجیروں میں فانوس (مفرغہ؟) اور قندیلیں آویزاں کی گئیں عبدالیہ اور سامانیہ چٹائیوں کا فرش کیا گیا۔ قرآن شریف کے متعدد صندوق مہیا کئے گئے، اور قرّاد اور فقہا مسجد کے لئے مقرر کئے گئے۔ پہلے جمعہ کو قاضی ابوبکرہ بکار بن قتیبہ نے نماز پڑھائی اور ربیع بن سلیمان نے اس حدیث نبوی پر ایک تقریر کی:-

من بنی للہ مسجداً، ولو کمفحص قطاۃ، بنی اللہ لہٗ بیتاً فی الجنۃ "۔

ختم نماز کے بعد خیرات کا سلسلہ شروع ہوا، احمد بن طولون نے بہت بڑی رقم صدقہ کی اور فقرا ومساکین کو کھانا تقسیم کیا۔ "وکان یوماً عظیماً حسناً۔" اس پہلی نماز جمعہ کے موقع پر ایک عجیب واقعہ پیش آیا کہ ابویعقوب البلخی نے خلیفہ معتمد اور اس کے بیٹے کے لئے تو دعا کی مگر احمد بن طولون کو بھول گیا، اور منبر پر سے اتر آیا۔ احمد نے نسیم خادم کی طرف اشارہ کیا کہ اسے

پانچ سو چابک لگائے جائیں۔ اب خطیب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ پھر منبر پر آیا اور کہا کہ: ولقد عاہدنا الی آدم من قبل ولم نجد لہ عزماً[۱۷۰]۔ اس کے بعد احمد بن طولون کی تعریف اور دعا میں ایک پورا خطبہ کہہ ڈالا۔ اس پر احمد بن طولون نے نسیم کو حکم دیا کہ خطیب کو پانچ سو دینار انعام دئے جائیں۔

تعمیر مسجد کے دوران میں احمد بن طولون نے دیکھا کہ ماہ رمضان میں صناع عشا کے وقت بھی کام میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر اُس نے کہا کہ یہ ضعفا، اپنے بال بچوں کے لئے افطار کا سامان کب خریدتے ہوں گے؟ انھیں عصر کے وقت چھوڑ دیا جائے۔ رمضان گزر گیا تو اُس سے درخواست کی گئی کہ پرانا قاعدہ پھر جاری کر دیا جائے لیکن اُس نے کہا کہ مجھے ان کی دعاؤں سے برکت حاصل ہوئی ہے، اس لئے رمضان کا عمل جاری رہے۔ اس کے بعد مصر میں یہ عام قاعدہ ہو گیا تھا کہ مزدوروں کو عصر کے وقت چھوڑ دیا جاتا تھا۔ مسجد کی تعمیر رمضان ۲۶۶ھ میں مکمل ہوئی، اور اس پر ایک لاکھ، یا بقول ابن تغری بردی[۱۷۱] ایک لاکھ بیس ہزار دینار خرچ ہوئے تھے۔ ابن عبد الظاہر نے بیان کیا ہے کہ جب مسجد تیار ہو گئی تو احمد بن طولون نے جاسوس مقرر کئے کہ وہ دیکھیں کہ لوگ مسجد کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ عام طور پر تین اعتراض مسجد پر کئے جا رہے ہیں۔ ایک تو کہا جاتا ہے کہ محراب چھوٹی ہے، دوسرے مسجد میں ستون نہیں، اور تیسرا اعتراض یہ تھا کہ میضاۃ نہیں ہے۔ اس پر احمد بن طولون نے لوگوں کو جمع کیا اور انھیں بتایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تھا اور آپ نے بہ نفس نفیس محراب کا خط کھینچا تھا۔ رہ گئے ستون، میں نے یہ مسجد مال حلال یعنی دفینے سے تعمیر کی ہے، اور ستون کو حاصل کرنے کا صرف یہی ایک ذریعہ تھا کہ وہ کسی پرانی مسجد یا کسی منہدم شدہ گرجا سے لئے جاتے۔ لیکن میں نے اسے پسند نہیں کیا۔ میضاۃ سے مسجد میں صرف نجاست پھیلتی ہے۔ اس لئے میں نے اسے تعمیر نہیں کرایا۔ اب میں

---

[۱۷۰] سورۂ طٰہٰ آیت ۱۱۴ +

[۱۷۱] النجوم الزاہرہ۔ ج ۲۔ ص ۸ +

مسجد کے پیچھے اُسے تعمیر کرادوں گا۔[۱۷۲]

جامع ابن طولون کی محراب کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ قبلے سے منحرف ہے۔ اس بارے میں مقریزی نے دو روایتیں نقل کی ہیں۔ ایک تو کہا جاتا ہے جب اس کی تعمیر شروع ہوئی ہے تو احمد بن طولون نے خاص طور پر ایک شخص مدینہ بھیجا تھا کہ مسجد نبوی کی سمت دیکھ کر آئے، اور اُس نے اسی سمت کا اقتدا کیا تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور آپ نے بہ نفس نفیس محراب کی تخطیط فرمائی تھی۔ بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ یہ محراب اکثر معرض بحث میں آئی تھی اور بالآخر قاضی القضاۃ عزالدین عبدالعزیز بن محمد بن جماعۃ کے زمانے میں علمائے نے آخری فیصلہ کیا تھا کہ محراب واقعی قبلہ سے منحرف ہے۔ مگر اس کا کوئی تدارک نہیں کیا گیا۔[۱۷۳]

اس جامع کے متعلق تین روایتیں اوپر کے صفحوں میں بیان ہوئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کی تعمیر اُس دفینے سے ہوئی تھی جو احمد بن طولون کو تنور فرعون میں ملا تھا۔ دوسرے ستونوں کا مسئلہ پہلے ناقابل حل معلوم ہوتا تھا، اور بالآخر نصرانی مہندس نے اُسے حل کیا۔ تیسری روایت یہ ہے کہ احمد بن طولون کو محض کاغذ لپیٹتے لپیٹتے یہ خیال آیا تھا کہ مینار پیچ کش نما بنایا جائے۔ کاربٹ اور کریسول دونوں نے ان روایات کو ناقابل اعتبار اور محض افسانہ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک احمد بن طولون کو جامع کی تعمیر کے لئے کسی دفینے کی ضرورت نہیں تھی۔ کاربٹ کا خیال ہے کہ یہ رقم ظلم و تعدی سے وصول کی گئی تھی، اور لین پول نے لکھا ہے کہ اُس کے اور احمد بن طولون کی دوسری عمارتوں کے لئے

---

[۱۷۲] مقریزی (خطط ج ۲۔ ص ۲۶۵ + ۲۶۹) نے جامع ابن طولون کی تعمیر کے حالات اور اس کی جامع و مانع تاریخ بیان کی ہے۔ القلقشندی (ج ۳۔ ص ۳۴۴) نے اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا، اور نہ کسی اور مورخ نے کوئی نئی بات لکھی ہے۔ مقریزی اور ابن زولاق ہی دو مصنف ہیں جن میں تفصیلی حالات ملتے ہیں۔

[۱۷۳] مقریزی (خطط ج ۲۔ ص ۲۵۶۔ ۲۶۴) نے مصر کی محرابوں پر تفصیل سے بحث کی ہے، اور ان کے متعلق جو اختلاف واقع ہوئے ہیں ان کا ذکر کیا ہے۔

عیسائیوں کو لوٹا گیا تھا۔ ہم پہلے ہی لکھ آئے ہیں کہ یہ تمام خیالات ان مصنفوں کی ایجاد ہیں۔ ورنہ تاریخوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ دفینے کا ملنا بجائے خود اتنی اچھنبے کی بات نہیں کہ اُسے باور نہ کرلیا جائے۔ اس کے علاوہ مصر میں کھمبوں پر عمارت کی تعمیر ضرور نئی بات تھی۔ لیکن احمد بن طولون سامرا کا رہنے والا تھا، اور وہاں کی جامع مسجد میں یہ طرز تعمیر پہلے استعمال ہو چکا تھا۔ اس کی تصدیق مقریزی[174] سے بھی ہوتی ہے جس نے لکھا ہے کہ جامع ابن طولون میں جامع سامرا کے نقشے کی نقل کی گئی تھی۔ پھر یہ بھی یاد ہوگا کہ احمد بن طولون ایسی عمارت بنانا چاہتا تھا کہ جس پر آگ اور پانی کا اثر نہ ہو، اور اُسے مشورہ دیا گیا تھا کہ رخام استعمال نہ کرے۔ ممکن ہے کہ مصر میں چونکہ پہلے ایسی عمارت نہیں بنی تھی اس لئے سمجھنے اور سمجھانے میں دقت پڑی ہو، اور نصرانی مہندس نے اس مشکل کو حل کیا ہو۔ یہی حال مینار کا ہے۔ اس کا نمونہ بھی احمد بن طولون کے وطن سامرا میں پہلے سے موجود تھا، اور یہاں بھی ممکن ہے کہ معماروں اور مہندسوں کو سمجھانے کے لئے احمد بن طولون نے کاغذ لپیٹ کر معماروں کو تعمیر اور شکل کا نمونہ دکھا دیا ہو۔

جہاں تک ہمیں علم ہے ادریسی[175] ہی ایک ایسا مصنف ہے جس نے لکھا ہے کہ احمد بن طولون نے مصر (فسطاط) میں دو جامع مسجدیں تعمیر کرائی تھیں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

وبها (اي بمصر) مسجدان جامعان	مصر (فسطاط) میں جمعہ اور خطبہ کے لئے دو جامع مسجدیں ہیں۔
للجمعة والخطبة احدهما بناه	ایک جامع مسجد عمرو بن العاص نے بنوائی تھی، اور چاروں
عمرو بن العاص في وسط اسواق	طرف بازاروں سے گھری ہوئی تھی۔ یہ جامع پہلے رومیوں
محيطة من كل جهة وكان هذا الجامع	کا ایک گرجا تھا جسے عمرو بن العاص کے حکم سے
كنيسة للروم فامر فقلب	مسجد میں تبدیل کیا گیا۔ دوسرے جامع مسجد
مسجداً جامعاً والمسجد الجامع الثاني	موقف کے اوپر ہے۔ اس کا بانی ابو العباس

---

[174] خطط ج ۲۔ ص ۲۶۶

[175] نزھۃ المشتاق ص ۱۴۳ +

وھو باعلی الموقف۔ بناہ ابو العباس	احمد بن طولون ہے۔ احمد بن طولون کی
احمد بن طولون۔ وللاحمد بن طولون	ایک اور بھی جامع مسجد ہے، جو اُس نے قرافہ
ایضاً جامع اُخریٰ۔ بناہُ فی القرافہ	(قبرستان) میں تعمیر کرائی تھی۔ یہاں عُبّاد
وھو موضعٌ یسکنہ العباد وجمل	وصالحین رہتے تھے۔
من اھل الخیر والعفاف۔	

یہاں ادریسی کو مغالطہ ہوا ہے، اور اس کی تصحیح ابن حوقل[۱۷۶] سے ہوتی ہے۔ اُس نے فسطاط کے حالات میں جامع عمرو بن العاص اور جامع ابن طولون کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ جب قاہرہ بسایا گیا تو قائد جوہر نے ایک تیسری جامع مسجد تعمیر کرائی۔ یہ جامع الازہر ہے۔ اس کے بعد سیدۃ المعزیہ نے قرافہ میں چوتھی جامع مسجد تعمیر کرائی۔ اسی قرافہ والی جامع مسجد کو ادریسی نے احمد بن طولون کی تعمیر کردہ جامع مسجد سمجھ لیا ہے۔ مقریزی[۱۷۷] سے پتہ چلتا ہے کہ السیدۃ المعزیہ تغرید نام ایک عرب کنیز تھی، ورزان کہلاتی تھی، اور خلیفہ العزیز باللہ نزار کی والدہ تھی قرافہ میں اُس نے ۳۶۶ھ میں ایک جامع مسجد تعمیر کرائی تھی، اور مقریزی[۱۷۸] کے زمانے میں یہ جامع الاولیا کہلاتی تھی۔ اس سے ادریسی کے اس بیان کی توثیق ہوتی ہے کہ یہ مسجد عباد وصالحین کا مرکز تھی۔

احمد بن طولون کی ایک اور تعمیر کردہ مسجد تنور فرعون میں قلعۃ الجبل کے عقب میں جبل مقطم کی چوٹی پر واقع تھی[۱۷۹]۔ تنور فرعون کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ قدیم زمانے میں جب

---

[۱۷۶] کتاب المسالک والممالک ص ۹۷ +

[۱۷۷] خطط ج ۲۔ ص ۳۱۸ + یہاں یہ نام تغرید لکھا گیا ہے لیکن دوسری جگہ (خطط ج ۲۔ ص ۴۵۳) تغرید (بالفاء) ہے۔ ہم نے اسی املا کو ترجیح دی ہے۔ تغرید غالباً طباعت کی غلطی ہے۔

[۱۷۸] حالات کے لئے دیکھو خطط ج ۲۔ ص ۴۴۴ + یہ مسجد دراصل اہل فسطاط کی تفریح گاہ تھی +

[۱۷۹] خطط ج ۲۔ ص ۴۵۵ + الکندی ص ۲۵۵ +

فرعون سفر پر روانہ ہوتا تھا یا سفر سے اپنے دار السلطنت کو واپس آتا تھا تو یہاں آگ روشن کی جاتی تھی تاکہ گرد و نواح کے لوگ اُس کے استقبال کے لئے تیار ہو جائیں۔ اس کے بعد حضرت یوسف کے بھائی یہودا نے یہاں قیام کیا تھا۔ اس لئے تنور فرعون کو قابل احترام جگہ سمجھ کر ۲۵۹ھ میں احمد بن طولون نے وہاں ایک مسجد تعمیر کرا دی تھی، جسے مسجد تنور کہتے تھے، اور اس کے ساتھ ایک صہریج (حوض) بھی تعمیر کرایا تھا۔ مارستان اور قناطر کی طرح اس مسجد کے بھی اوقاف تھے۔ لیکن یہ مسجد زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہی۔ احمد بن طولون کے بعد اُس کے ایک قائد وصیف بن قاطر میز نے اس لالچ میں اُسے کھدوا ڈالا کہ اس کی بنیادوں میں مال ملے گا۔ مگر کچھ حاصل نہ ہوا، اور مسجد تنور اور تنور فرعون دونوں تباہ ہو گئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس مسجد کے قندیل سے اب بھی بھولے بھٹکے مسافر کو راستہ معلوم کرنے میں آسانی ہوتی تھی کیونکہ سعید القاص، جس کے چند اشعار ہم پہلے بھی نقل کر چکے ہیں، اُسی مرثیے میں کہتا ہے ؎

وتنور فرعون الذی فوق قُلّـۃ　　　علی شاھق عال علی جبل وَعِر
بنا مسجداً فیه یفوق بناءهٗ　　　ویھدی به فی اللیل ان ضلّ من یسری
تخال سنا قندیله وضیاءهٗ　　　سهیلاً اذا ما لاح فی اللیل للسفر

احمد بن طولون کی ایک اور عمارت دار الامارت ہے۔ یہ عمارت جامع مسجد کے جوار میں تھی، اور اُسی کے ساتھ تعمیر ہوئی تھی۔ جامع کی طرح یہ بھی قبلے کی سمت واقع تھی۔ اس میں سے ایک دروازہ مسجد کی دیوار میں کھلتا تھا، اور اس سے داخل ہو کر محراب و منبر کے پاس مقصورہ میں پہنچ جاتے تھے۔ احمد بن طولون نے یہاں ہر طرح کا ساز و سامان اور فروش اور پردے مہیا کر رکھے تھے۔ چونکہ یہ عمارت قصر اور میدان کے درمیان واقع تھی اس لئے جمعہ کے دن احمد بن طولون اپنے محل سے آکر وہیں آرام کرتا اور وضو کی تجدید اور لباس تبدیل کرتا تھا۔ خلیفہ المعز لدین اللہ کے افریقیہ سے آنے تک یہ عمارت باقی تھی، اور اس میں اموال الخراج کا دفتر تھا۔ ابن زولاق نے بیان کیا ہے کہ ۳۶۳ھ میں جب المعز نے ابو الفرج یعقوب بن یوسف بن

رکلس اور عسلوج بن حسن کو اموال کا والی مقرر کیا ہے تو انھوں نے اسی دار الامارۃ میں اجلاس کیا تھا۔[۱۸۰]

اب احمد ابن طولون کے صرف مارستان کا ذکر کرنا باقی رہ جاتا ہے۔ مقریزی[۱۸۱] نے اس کا موقع محل بیان کیا ہے، مگر لکھا ہے کہ اُس کے زمانے میں وہ ایسا برباد ہو گیا تھا کہ کھنڈر بھی باقی نہیں رہے تھے۔ یہ مارستان احمد بن طولون کے حکم سے، الکندی کے مطابق ۲۵۹ھ میں اور صاحب السیرۃ الطولونیہ کے مطابق ۲۶۱ھ میں تعمیر ہوا تھا، اور اس پر ساٹھ ہزار دینار خرچ ہوئے تھے۔ تکمیل کے بعد دار الدیوان، اساکفہ (کفشگروں کا بازار) قیساریہ[۱۸۲] اور سوق الرقیق کی آمدنی اس کے لئے وقف کی گئی تھی۔ اس سے قبل مصر میں کوئی مارستان تعمیر نہیں ہوا تھا۔ احمد بن طولون نے لازمی قرار دیا تھا کہ اس میں کسی سپاہی، یا مملوک یا امیر کا علاج نہیں کیا جائے گا۔ اس لحاظ سے یہ حقیقی طور پر ایک رفاہ عام کا کام تھا۔ مارستان سے متعلق دو حمام تھے، ایک مردانہ اور دوسرا زنانہ۔ قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی مریض اس شفا خانے میں آئے تو اپنے کپڑے اور نقدی امین مارستان کے پاس امانت رکھ دے۔ اس کے بعد شفا خانے سے اُس کے لئے کپڑے اور بستر مہیا کئے جاتے تھے، اور غذا اور دوا کے تمام اخراجات بھی شفا خانہ برداشت کرتا تھا۔ اطبا معالجے کے لئے مقرر تھے۔ صحت یاب ہونے پر جب مریض معمولی کھانا کھانے لگتا تھا تو شفا خانہ سے رخصت کر دیا جاتا تھا اور کپڑے اور نقدی اُسے واپس مل جاتی تھی۔ احمد بن طولون کو اس مارستان سے اتنی دلچسپی تھی کہ وہ ہر جمعہ کو خود معائنہ کے لئے آتا تھا، اس کے ذخائر دیکھتا،

[۱۸۰] خطط ج ۱۔ص ۸۲، ۳۹۷ + ج ۲۔ص ۲۶۹ +

[۱۸۱] خطط ج ۲۔ص ۴۰۵ + القلقشندی ج ۳۔ص ۳۴۷ +

[۱۸۲] مقریزی (ج ۲۔ص ۸۶۔۹۱) نے فسطاط و قاہرہ کے متعدد قیاسر کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک قیساریہ (ص ۹۱) احمد بن طولون کے زمانہ کا ہے اور "قیساریۃ الجامع الطولونی" کہلاتا ہے۔ یہ قیساریہ قصر سے متعلق عمارتوں میں شمار ہوتا تھا اور احمد بن طولون ہی کا بنایا ہوا تھا۔ یہاں اسی قیساریہ سے مراد لی گئی ہے، جس کی آمدنی مارستان کے لئے وقف تھی۔

اطبائے ملتا اور مریضوں سے بات چیت کرتا۔ اسی مارستان کے ایک حصے میں پاگل خانہ بھی تھا۔ ایک جمعہ کو وہ حسب دستور معائنہ کے لئے آیا، اور ایک دیوانے نے جسے اسی کی خواہش پر امیر کے سامنے ایک انار مہیا کیا گیا تھا، اُسے غافل پاکر انار اُسے کھینچ مارا۔ اس کے بعد احمد بن طولون نے وہاں آنا چھوڑ دیا۔ افسوس ہے کہ مارستان کے اندرونی انتظامات کی پوری تفصیل بیان نہیں کی گئی۔ مگر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ مریضوں کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ اس کے تقریباً چار سو برس بعد ۶۸۳ھ (م ۱۲۸۴ء) میں ملک المنصور قلاؤن نے ایک مارستان القدیم المنصوری قاہرہ میں تعمیر کرایا تھا۔ مقریزی[۱۸۳] نے اس کے حالات بہت تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ ان کے پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم موجودہ زمانے کے کسی اعلیٰ درجے کے شفاخانے کے حالات پڑھ رہے ہیں، اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اُس وقت تک مارستان اسلامی دنیا میں عام ہو چکے تھے۔

(۷)

ذکر ہو چکا ہے کہ احمد بن طولون نے وفات سے قبل اپنے موالی اور خیر خواہوں کو جمع کر کے ان کے سامنے اپنے بیٹے ابو الجیش خمارویہ کو جانشین مقرر کیا تھا۔ وفات کے بعد تمام اہل دولت، جن کا سرگروہ احمد بن محمد الواسطی تھا، جمع ہوئے، اور مشورہ کر کے سب نے بالاتفاق خمارویہ کو جانشین بنانا منظور کیا۔ اس امر پر متفق ہونے کے بعد عباس کو، جو اُس وقت تک قید میں تھا اس مجلس میں لائے جہاں خمارویہ بھی موجود تھا۔ الواسطی نے رسم تعزیت ادا کی، اور پھر عباس سے کہا کہ اپنے بھائی خمارویہ کے ہاتھ پر بیعت کرو۔ مگر عباس نے انکار کیا۔ اس پر موالی میں سے سعد الابسر (یا الآیس یا الاعسر) اور طبارجی کھڑے ہوئے اور عباس کو قصر کے ایک کمرے میں لے گئے جہاں سے دوسرے دن اُس کی لاش ہی برآمد ہوئی۔ اس کے بعد احمد بن طولون کو دفن کیا گیا، اور اور خمارویہ کی حکومت مستحکم ہو گئی۔ جند نے بھی اُس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ یہ ۱۰ ذی قعدہ ۲۷۰ھ کا

[۱۸۳] خطط ج ۲۔ ص ۴۰۶ +

واقعہ ہے[۱۸۴]۔ قطع نظر اس کے کہ احمد بن طولون بستر مرگ پر خمارویہ کو نامزد کر چکا تھا، عباس کا اپنے باپ کی جگہ لینا اس وجہ سے بھی ناممکن تھا کہ ارباب حل وعقد میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو عباس کی بدخوئی، بدطینیتی اور مذموم عادتوں سے نالاں نہ ہو۔ بغاوت کے دوران میں یہ مخاصمت اور بھی زیادہ ہوگئی تھی۔ اس وقت گو عباس قید میں تھا، لیکن جب تک وہ زندہ تھا تمام قائد اور موالی اطمینان کا سانس نہیں لے سکتے تھے۔ اس لئے ضروری تھا کہ اُس کا خاتمہ کر دیا جائے۔ احمد الواسطی خاص طور پر گزشتہ واقعات میں پیش پیش رہا تھا، اور یقیناً اُسے عباس سے بدسلوکی کا خوف سب سے زیادہ ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس قتل کے موافق تھا، اور درحقیقت اسی کے مشورے سے عباس کا خاتمہ کیا گیا تھا۔

ان واقعات میں کہیں ان کا پتہ نہیں چلتا کہ خمارویہ کی جانشینی کے متعلق مرکز خلافت سے استصواب کیا گیا ہو، یا جانشینی کے بعد بھی خلیفہ کی منظوری حاصل کی گئی ہو۔ کیونکہ احمد بن طولون کے انتقال کے وقت سیاسی حالت یہ تھی کہ اگر نویری کے مطابق اُس میں اور موفق میں صلح کے متعلق گفت وشنید ہوئی تھی تو اس کی تکمیل سے قبل احمد بن طولون کا انتقال ہو گیا تھا۔ مزید برآں آیندہ واقعات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مصر میں موفق پر لعنت بھیجنے کا حکم ابھی منسوخ نہیں ہوا تھا۔ جو فتوی کہ دمشق سے شائع کیا گیا تھا اُس کے مطابق خلیفہ مجبور ومقہور تھا، اور الموفق ولی عہدی سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ مرکز خلافت سے کسی قسم کا استصواب بے معنی تھا، اور احمد بن طولون کے جانشین اور الموفق میں قانوناً جنگ بدستور جاری تھی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ احمد بن طولون کے بعد گفت وشنید کا سلسلہ یک لخت ہی کیوں منقطع ہو گیا، اور خمارویہ سے کیوں صلح نہیں کر لی گئی۔ اس میں خمارویہ کا قصور نہیں تھا، کیونکہ وہ ایک تن آسان اور آرام طلب شہزادہ تھا، اور اُسی وقت لڑتا تھا جب اُسے جنگ پر مجبور کر دیا جائے۔

---

[۱۸۴] ابن خلدون ج ۴ ص ۳۰۵ + ابن تغری بردی ج ۲ ص ۵۰، ۵۱ +

یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ بغداد میں اس وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ طولونیہ کو ختم کرنے کا وقت اب آگیا ہے، اور خمارویہ کی ناتجربہ کاری اور آرام طلبی کی وجہ سے یہ کام اور بھی آسان معلوم ہوتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ خمارویہ کو باپ کا جانشین ہونے کے بعد ہی ان معاملات کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ یاد ہوگا کہ جب اسحاق بن کنداج نے خلیفہ معتمد کو مصر جانے سے روکا ہے تو اُس کے صلے میں اُسے باب الشماسیہ سے برقہ تک تمام علاقوں کا حاکم مقرر کیا گیا تھا، اور اس طرح احمد بن طولون کو معزول کر دیا گیا تھا۔ یہ حکم ابھی تک منسوخ نہیں ہوا تھا۔ جب تک احمد بن طولون زندہ رہا اسحاق بن کنداج اُس کے علاقوں پر قابض اور متصرف ہونے کی ہمت نہ کر سکا۔ لیکن اب خمارویہ کو اُس نے قابل اعتنا نہ سمجھا، اور محمد بن دیوداد، المعروف بہ ابن ابی الساج، حاکم کوفہ کو ساتھ ملا کر شام فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ دونوں متحدین نے موفق سے اس کی اجازت چاہی، اور الموفق نے نہ صرف اجازت دی بلکہ مدد کا بھی وعدہ کیا۔ ابتدا میں دونوں کو بڑی کامیابی ہوئی۔ اسحاق بن کنداج اپنے مستقر سے روانہ ہو کر پہلے رقہ اور عواصم گیا، اور احمد بن طولون کے عامل ابن دعباش سے یہ علاقے لے لئے، پھر حمص، انطاکیہ اور حلب آیا، اور اس کے بعد دمشق پر بھی قابض ہو گیا۔ یہ حالت دیکھ کر خمارویہ نے ایک فوج تیار کی اور الواسطی کی سرکردگی میں اُسے شام روانہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور فوج سعد الایسر کی ماتحتی میں ۶ رذی الحجہ ۲۷۰ھ کو براہ بحر روانہ کی[۱۸۵]۔ اس دوران میں الواسطی نے، جو فلسطین میں مقیم تھا، اس خوف سے کہ کہیں خمارویہ اپنے بھائی عباس کا بدلہ اُس سے نہ لے، الموفق سے خط و کتابت شروع کی، اور خمارویہ کے متعلق یقین دلایا کہ اگر اُس کے خلاف نقل و حرکت کی جائے تو اُس کا خاتمہ کر دینا آسان ہوگا۔ بہر حال خمارویہ کی فرستادہ فوج کو اتنی کامیابی ہوئی کہ دمشق پر دوبارہ قبضہ کر لیا گیا، اور وہاں کا نقض عہد کرنے والا حاکم فرار ہو گیا۔ پھر لشکر شیزر گیا۔ اس مقام پر اسحاق بن کنداج اور ابن ابی الساج قابض تھے، اور الموفق کی موعودہ امداد کا انتظار

۱۸۵۔ الکندی ص ۲۳۳، ۲۳۴ + ابن تغری بردی ج ۳۔ ص ۵۱، ۵۲ +

کر رہے تھے۔ لیکن چوں کہ سردی کا موسم شروع ہو چکا تھا اس لئے خمارویہ کی فوج شہر کے گھروں میں منتشر ہو گئی۔ اس اثناء میں ابو العباس احمد بن الموفق کی سرکردگی میں، جو بعد کو معتضد کے لقب سے خلیفہ ہوا، عراق کا لشکر وہاں پہنچ گیا، اور خمارویہ کے سپاہیوں کو چن چن کر قتل کرنا شروع کیا۔ بقیۃ السیف نے نہایت بری حالت میں دمشق میں پناہ لی۔ مگر معتضد تعقب میں تھا، اور خمارویہ کے سپاہی دمشق میں بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ شعبان ۲۷۱ھ میں معتضد نے دمشق پر قبضہ کر لیا۔ اب خمارویہ کی فوج رملہ میں ٹھیری اور خمارویہ کو صورت حال کی اطلاع دی۔[۱۸۶] معتضد اب تک ان کا تعقب کر رہا تھا۔ اُدھر خمارویہ بذات خود مصر سے لشکر لے کر روانہ ہوا۔ اس دوران میں ایک نیا واقعہ یہ پیش آیا کہ اسحاق بن کنداج اور ابن ابی الساج جنھوں نے الموفق کی مدد کی امید پر جنگ شروع کی تھی، اس وجہ سے الموفق سے بے زار ہو گئے کہ الموفق نے ان پر بزدلی کا الزام لگایا تھا۔ ایک طرف تو ان دونوں ترک امراء کی عراقی فوج سے علحدگی، اور دوسری طرف یہ خبر کہ خمارویہ بہت بڑی فوج لے کر مصر سے آرہا ہے، معتضد کو بے چین کر دینے کے لئے کافی تھیں۔ اُس نے چاہا کہ عراق واپس ہو جائے۔ مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔ آخر کار خمارویہ اور معتضد کی فوجوں کا مقابلہ رملہ میں نہر فُطرس (یا بُطرس) کے کنارے اُس جگہ ہوا جہاں پن چکیاں تھیں، اور اسی وجہ سے یہ جنگ واقعۂ طواحین کہلاتی ہے۔ خمارویہ کی فوج گو تعداد میں ستر ہزار تھی اور معتضد کے پاس صرف چار ہزار سپاہی تھے۔ لیکن مصری فوج میں زیادہ تعداد ایسے سپاہیوں کی تھی جنھیں اب تک جنگ کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے پہلے ہی حملے میں اس فوج کے پیر اکھڑ گئے، اور خمارویہ بے سروسامانی کی حالت میں میدان جنگ سے ایسا بھاگا کہ پھر مصر ہی میں آکر دم لیا۔ معتضد نے اسے اپنی فتح سمجھا اور خمارویہ کی چھاؤنی پر قبضہ کر لیا۔ ادھر جنگ سے قبل خمارویہ نے سعد الایسر کی ماتحتی میں ایک فوج کمین گاہ میں مقرر کی تھی۔ سعد الایسر نے

---

۱۸۶ ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۳۷ (حوادث ۲۷۱ھ) + ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۵، ۳۰۶ + مروج الذہب ج ۲۔ ص ۲۱۸ +

کمین گاہ سے باہر نکل کر عراقی فوج پر حملہ کر دیا۔ لیکن سعد کو خمارویہ کے فرار ہونے کی اطلاع ملی۔ یہ حملہ بہت کامیاب رہا، اور نہ صرف خمارویہ کی چھاؤنی پر دوبارہ قبضہ کر لیا گیا، بلکہ بارہ میل تک معتضد کا تعقب بھی کیا گیا۔ معتضد نے دمشق میں پناہ لینی چاہی، مگر اہل شہر نے شہر کے دروازے نہ کھولے۔ اب سعد الایسر کو خمارویہ کے میدان جنگ سے بھاگ جانے کی خبر ملی۔ اب فوج کا کوئی امیر نہیں تھا۔ اس لئے سعد الایسر نے وقتی طور پر خمارویہ کے بھائی ابو العشائر کو امیر فوج بنا دیا، اور میدان جنگ سے آگے بڑھ کر اُس نے اور الواسطی نے دمشق پر قبضہ کر لیا۔ یہ آخری موقع ہے کہ تاریخ میں الواسطی کا ذکر آتا ہے۔ اس کے بعد معلوم نہیں کہ اس کا کیا انجام ہوا۔ دوسری طرف معتضد جب دمشق سے مایوس ہوا تو طرسوس چلا گیا۔ مگر یہاں بھی یازمار مزاحم ہوا۔ مجبوراً معتضد نے شام و فلسطین کو خیر باد کہا اور بغداد واپس چلا گیا۔ یہاں معتضد کا شام سے تعلق بھی ختم ہو گیا، اور یہ ایسی فیصلہ کن جنگ تھی کہ شام و فلسطین پر خمارویہ کا قبضہ مستحکم اور مستقل ہو گیا۔[۱۸۷]

واقعہ طواحین سے بھاگ کر جب خمارویہ مصر پہنچا ہے تو اُس نے کمال چالاکی سے جنگ میں اپنی فتح کا اعلان کر دیا تھا۔ جب حقیقی فتح کا مژدہ اُس نے سنا تو اسے اور بھی خوشی ہوئی، اور اس نے بہت سا مال خیرات کیا۔ جو اسیران جنگ مصر آئے تھے ان کے ساتھ غیر معمولی طور پر نیک سلوک کیا گیا۔ پہلے تو خمارویہ نے انھیں اپنے پاس مہمان رکھا، اور اُس کے بعد جنھوں نے واپس جانا چاہا انھیں بڑی عزت و احترام کے ساتھ واپس کر دیا۔[۱۸۸] اب خمارویہ دوبارہ ذی القعدہ ۲۷۲ھ میں مصر سے روانہ ہو کر ۷ محرم ۲۷۳ھ کو فلسطین پہنچا۔

۱۸۷؎ مقریزی ج ۱۔ ص ۳۲۱ + ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۵۱، ۵۲ + ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۳۸، ۱۴۰ + ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۵، ۳۰۶ + مروج الذھب ج ۲۔ ص ۳۱۸ + الکندی ص ۲۳۲ + طبری ج ۱۱۔ ص ۳۳۰، ۳۳۱ + الیافعی ج ۲۔ ص ۱۸۶ +

۱۸۸؎ ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۴۰ +

اس دوران میں یہاں یہ تبدیلی ہوئی کہ سعد الایسر نے غالباً جنگ طواحین میں خمارویہ کے فرار کو اس کی بزدلی پر محمول کیا، اور مقبوضہ علاقوں پر خود قبضہ جمانے کی فکر کرنے لگا۔ یہی خبر خمارویہ کو مصر سے فلسطین لائی تھی۔ لیکن سعد الایسر زیادہ دن تک خمارویہ کا مقابلہ نہ کر سکا، اور بلا کسی بڑے واقعے کے اُسے گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ اور ۷ رمحرم کو خمارویہ دمشق میں داخل ہو گیا۔[۱۸۹] لیکن ابھی تک اسحاق بن کنداج اور ابن ابی الساج کا خطرہ باقی تھا۔ ان دونوں ترک امراء کو عراقی فوج سے جس مدد کی اُمید تھی وہ جنگ طواحین کے بعد بالکل ہی ختم ہو گئی۔ مگر خمارویہ سے ان کی مخالفت بدستور جاری رہی، اور خمارویہ کو بھی ان کی طرف سے اطمینان نہیں ہوا۔ سعد الایسر کے خاتمے کے بعد ہی رافقہ کے علاقے میں باجروان کے مقام پر اُس کا مقابلہ اسحاق بن کنداج سے ہوا۔ ایک مرتبہ پھر مصری فوج ثابت قدم نہ رہی۔ لیکن جو کارآزمودہ سپاہی خمارویہ کے ساتھ تھے انھوں نے شکست ماننے سے انکار کیا اور خمارویہ کے ذاتی تہور سے انھیں اور بھی مدد ملی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسحاق بن کنداج نے شکست کھائی اور خمارویہ نے شکست خوردہ فوج کا سامرا تک تعقب کیا۔[۱۹۰]

اسحاق بن کنداج کی یہ شکست خمارویہ کے لئے بڑی کارآمد ثابت ہوئی۔ واقعۂ طواحین سے عام طور پر خمارویہ کو حقیر سمجھا جانے لگا تھا۔ لیکن اب دوبارہ اس کی ہیبت لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گئی۔ اس طرح اپنی حالت کو مستحکم کرنے کے بعد خمارویہ نے الموفق سے صلح کرنے کا ارادہ کیا۔ اور اس معاملے میں خط و کتابت کر کے جو علاقے اُس کے سپرد کئے جائیں اُن کے متعلق مال ادا کرنے کا وعدہ کیا۔[۱۹۱] ادھر الموفق کو بھی پورا اندازہ ہو گیا تھا کہ ابھی آل طولون کو مصر سے بے دخل کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس لئے یہ درخواست

۱۸۹ء مقریزی ج ۲۔ ص ۳۲۱ + ابن تغری بردی ص ۵۳ + الکندی ص ۲۳۶ +

۱۹۰ء الکندی ص ۲۳۶ +

۱۹۱ء خطط ج ۱۔ ص ۳۲۱ + ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۵ + الکندی ص ۲۳۷ +

منظور کی گئی، اور رجب ۲۷۳ھ میں فائق خادم خلیفہ کا فرمان لے کر فسطاط آیا، جس کے مطابق خمارویہ اور اُس کی اولاد کو تیس برس کے لئے مصر و شام اور ثغور کا حاکم مقرر کیا گیا تھا اور صلاۃ و خراج و قضا بھی اس کے سپرد کئے گئے تھے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ فرات سے لے کر برقہ تک کے تمام علاقے آل طولون کو دے گئے تھے۔ فائق نے خمارویہ کو یہ بھی اطلاع دی کہ یہ فرمان معتمد، الموفق اور ابو العباس احمد بن الموفق (معتضد) نے "تعظیماً لخمارویہ" اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ خمارویہ کو اس عزت افزائی سے اور بھی خوشی ہوئی۔ سلخ رجب ۲۷۳ھ کو خمارویہ مصر واپس آیا۔ الموفق کو ولی عہدی سے الگ کرنے کا فتویٰ واپس لیا گیا، اور اُس پر جو لعنت بھیجی جاتی تھی اُسے بھی منسوخ کر دیا گیا۔ الکندی اور ابن تغری بردی دونوں اس پر متفق ہیں کہ یہ موقع تھا کہ جب لعنت بھیجنے کا عمل موقوف کیا گیا ہے۔[۱۹۲]

خلیفہ کی اس منظوری اور خمارویہ کے اس تقرر سے آل طولون کی وہی حیثیت باقی رہی جو احمد بن طولون کے وفات کے وقت تھی۔ اب خمارویہ کو باغی اور غیر قانونی عامل مصر نہیں کہا جا سکتا تھا، بلکہ اُسے قانونی طور پر احمد بن طولون کا جانشین تسلیم کر لیا گیا تھا۔ صرف تیس برس ہی کے لئے کیوں نہ ہو، لیکن امارت مصر آل طولون میں موروثی قرار دے دی گئی تھی، اور اس کا امکان تھا کہ آیندہ حالات اور واقعات کے لحاظ سے اس مدت میں توسیع کر دی جائے۔ خمارویہ بھی اپنے باپ کی طرح اب المفوض کے ممالک مفوضہ کا محض ایک وکیل تھا۔ اس لحاظ سے سکوں پر خمارویہ کے علاوہ اب بھی صرف المفوض کا نام مسکوک ہوتا تھا، مگر خطبوں میں المفوض اور الموفق کا نام بحیثیت ولی عہد خلافت لیا جانے لگا تھا۔ اس تقرر کی منظوری کے متعلق ایک اور امر بھی قابل غور ہے۔ فائق خادم جو یہ فرمان لے کر مصر آیا تھا، اُس نے خمارویہ کو اطلاع دی تھی کہ فرمان خلیفہ، الموفق اور معتضد نے بدست خاص لکھا ہے۔ صرف اتنی سی بات کو خمارویہ نے اپنی عزت افزائی سمجھا تھا، اور اُسے بہت خوشی ہوئی تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ گو خلفاء

۱۹۲ھ کتاب الولاۃ ص ۲۳۷، ۲۳۸ + النجوم الزاہرہ ج ۲ ص ۵۴، ۵۵ +

عباسیہ اس وقت بڑی حد تک اپنا سیاسی اقتدار کھو چکے تھے، اور انھیں مجبور ہو کر امراء صوبہ جات کے تقرر کی منظوریاں دینی پڑتی تھیں لیکن اسلامی سیاسی اتحاد کا تخیل زندہ تھا، اور خواہ ذاتی طور پر امراء کیسے ہی تمرد کا اظہار کریں، مگر وہ ہر حالت میں اپنے آپ کو خلافت سے وابستہ، اور خود کو خلیفہ کا مولیٰ ہی سمجھتے تھے۔ اس سے بھی زیادہ نمایاں مثال بیکر[۱۹۳] نے نقل کی ہے کہ اخشید نے خلیفہ متقی سے مدد کی درخواست کی تھی، اور متقی نے جو محض برائے نام خلیفہ تھا، اس درخواست کے جواب میں اُسے بجائے نام کے کنیت سے مخاطب کیا تھا، اور اخشید نے اس معمولی سی بات کو بھی اپنی عزت افزائی سمجھا تھا[۱۹۴]۔

اب خلیفہ کے اس تقرر سے اسحاق بن کنداج اور ابن ابی الساج بھی خمارویہ کے خلاف بے دست و پا ہو گئے تھے، اور قانوناً وہ یہ نہیں کر سکتے تھے کہ اُسے برطرف کرنے کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھیں۔ ایسی صورت میں ان کا اتحاد بھی قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ ابن الاثیر[۱۹۵] کے مطابق ۲۷۳ھ ہی میں اُن کے آپس میں بگاڑ شروع ہوا۔ وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ابن ابی الساج تقدم حاصل کرنا چاہتا تھا، اور اسحاق بن کنداج اس کا مخالف تھا۔ آخر کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن ابی الساج نے رُخ بدل دیا، اور خمارویہ سے خط و کتابت کر کے اس کی اطاعت قبول کر لی، اپنے زیر تصرف علاقے قنسرین میں اس کے نام کا خطبہ پڑھوایا، اور اپنے بیٹے دیوداد کو بطور یرغمال خمارویہ کے پاس بھیج دیا۔ اس کے بدلے میں خمارویہ نے ابن ابی الساج اور اس کے قائدوں کے لئے بہت بڑی رقم (مالاً جزیلاً) اُس کے پاس بھجوائی۔ اس کے علاوہ خمارویہ بذات خود

۱۹۳؎ بائی تراگ ص ۱۸۴ +

۱۹۴؎ گولڈ زیہر (محمد انشے استودین ج ۲ ص ۲۶۷) نے اس پر بحث کی ہے کہ کسی شخص کو کنیت سے مخاطب کرنا باعث عزت سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً خلیفہ الواثق اسحاق بن ابراہیم موصلی کو ہمیشہ کنیت سے مخاطب کیا کرتا تھا "دفعالہٗ" (اغانی ج ۵ ص ۶۰) اور ہارون رشید نے ابراہیم موصلی کی کنیت ابوصفوان مقرر کی تھی۔

۱۹۵؎ تاریخ کامل ج ۷ ص ۱۴۱ +

شام روانہ ہوا، اور بالس کے مقام پر اُس کا اور ابن ابی الساج کا اجتماع ہوا۔ اب ابن ابی الساج دریائے فرات کو عبور کرکے رقہ آیا، اور اسحاق بن کنداج سے اُس کا مقابلہ ہوا۔ اسحاق بن کنداج نے شکست کھائی اور ابن ابی الساج نے اُس کے علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ خمارویہ بھی دریائے فرات عبور کرکے رافقہ پہنچا۔ ابن کنداج نے ماردین میں پناہ لی۔ ابن ابی الساج نے اُس کا محاصرہ کیا اور ابن کنداج مجبوراً وہاں سے موصل چلا گیا پھر دونوں کا مقابلہ برقعید میں ہوا۔ انجام کار ابن ابی الساج جزیرہ اور موصل پر قابض ہوگیا اور ان علاقوں پر خمارویہ اور پھر ابن ابی الساج کا نام خطبے میں لیا جانے لگا[۱۹۶]۔ مگر یہ کامیابی ابن ابی الساج اور خمارویہ میں بگاڑ کا باعث ہوئی ۲۷۴ھ میں خمارویہ پھر مصری لشکر کے ساتھ ابن ابی الساج کے مقابلے کے لئے آیا، اور محرم ۲۷۵ھ میں ثنیۃ العقاب میں ابن ابی الساج کو شکست دے کر اُس کا جو مال حمص میں تھا اُس پر بھی قبضہ کرلیا، اور اس کے تعقب میں مدینۃ بلد تک پہنچا[۱۹۷]۔ اس جھگڑے کا آخر خاتمہ یوں ہوا کہ ابن ابی الساج کو خلافت کی طرف سے آذربائی جان کا والی مقرر کردیا گیا۔ اسحاق بن کنداج نے خمارویہ سے صلح کی سلسلہ جنبانی شروع کی، اور آخر دونوں میں مصاہرت کے تعلقات قائم ہوگئے، اور اُس کے علاقوں میں خمارویہ کا نام خطبوں میں لیا جانے لگا[۱۹۸]۔ ابن کنداج کا انتقال ۲۷۹ھ میں مصر ہی میں ہوا۔ اُس کا بیٹا محمدؐ بن اسحاق بن کنداج اُس کے عمال پر اُس کا جانشین ہوا[۱۹۹]۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی مصر میں رہا۔

۲۷۵ھ تک خمارویہ اپنے تمام منصوبوں میں کامیاب رہا تھا۔ خلیفہ نے مصر و شام و ثغور پر اس کو موروثی حق ولایت عطا کردیا تھا، اس کے دو حریف ابن ابی الساج اور

---

۱۹۶ ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۴۱ (حوادث ۲۷۳ھ) + ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۷۵، ۷۶ + ابن خلدون ج ۳۔ ص ۳۳۳ + ج ۴۔ ص ۳۰۶، ۳۰۷ + طبری ج ۱۱۔ ص ۲۳۲ +

۱۹۷ ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۴۲ (حوادث ۲۷۵ھ) + الکندی ص ۲۳۸ +

۱۹۸ الکندی ص ۲۳۷ +　　۱۹۹ طبری ج ۱۱۔ ص ۲۳۰ +

اسحاق بن کنداج، جنھیں مرکز خلافت ہی سے اس کے خلاف آمادہ پیکار کیا گیا تھا، زیر ہو چکے تھے اور ان میں سے ابن کنداج اب اس کے دربار کا درحقیقت ایک امیر بن گیا تھا۔ اس طرح اس سال آل طولون کا موقف پہلے سے کہیں زیادہ مستحکم اور مستقل معلوم ہوتا تھا۔ اس کے بعد خمارویہ کو ایک اور بڑی کامیابی طرسوس میں ہوئی۔ یاد ہوگا کہ ۲۷۰ھ میں احمد بن طولون طرسوس سے بے نیل مرام واپس ہوا تھا، اور مازیار وہاں بدستور قابض رہا تھا۔ اس دور ان میں ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جنگ طواحین کے بعد ۲۷۱ھ میں جب معتضد نے طرسوس میں پناہ لینی چاہی ہے تو پھر مازیار مزاحم ہوا تھا اور معتضد کو مجبوراً بغداد واپس جانا پڑا تھا[۲۰۰]۔ اس واقعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مازیار نے یہ محسوس کیا تھا کہ وہ یکہ وتنہا تمام مصائب اور حوادث کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تفصیلات سے ہم بے خبر ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے اپنی نجات صرف اس میں دیکھی تھی کہ خمارویہ سے صلح کر کے طرسوس اس کے حوالے کر دے۔ فریقین میں نامہ وپیام کا بھی ہمیں علم نہیں۔ ابن تغری[۲۰۱] بردی نے صرف اتنا لکھا ہے کہ خمارویہ نے اسے اپنی طرف مائل کر لیا، اور اس سے لطف و کرم سے پیش آیا۔ بطور امداد یا بطور تحائف خمارویہ نے تیس ہزار دینار، پانچ سو زرنگار چادریں (مُطرف)، پانچ سو مویشی اور بے شمار اسلحہ اُس کے پاس بھیجے۔ اس پر مازیار نے اُس کی اطاعت قبول کر لی، اور ثغور میں خمارویہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ مازیار نے ان تحائف کے بدلے میں پچاس ہزار دینار خمارویہ کے پاس بھجوائے۔ الکندی کے مطابق یہ جمادی الآخر ۲۷۸ھ کا واقعہ ہے[۲۰۲]۔ اس طرح

---

۲۰۰ ابن الاثیر ج ۷، ص ۱۴۹ (حوادث ۲۷۸ھ) +

۲۰۱ النجوم الزاہرہ ج ۲۔ ص ۸۲، ۸۳ +

۲۰۲ ابن خلدون ج ۷۔ ص ۳۰۷ + ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۴۶ (حوادث ۲۷۷ھ) + ص ۱۴۹ (حوادث ۲۷۸ھ) + الکندی ص ۲۳۹ + طبری ج ۱۱۔ ص ۳۴۳ + ابن خلدون اور ابن الاثیر نے مُطرف (چادر خز چہار گوشہ نگارین) اور طبری نے ممطر (مایلبس فی المطر یتوقی بہ) لکھا ہے۔ مگر یہاں بجائے ممطر کے مطرف زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ تحائف کی تعداد میں بھی طبری اور دوسرے مورخوں میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔

بغیر لڑے خمارویہ ثغور کا مالک ہو گیا۔

بہتر ہے کہ طرسوس کی باقی ماندہ تاریخ بھی سلسلے کی غرض سے یہیں بیان کر دی جائے۔ اس بارے میں سب سے زیادہ مدد ابن الاثیر[۲۰۳] اور ابن خلدون[۲۰۴] سے ملتی ہے۔ اطاعت قبول کر لینے کے بعد ۲۷۵ھ میں مازیار صائفہ پر گیا جہاں زخمی ہوا اور جاں بر نہ ہو سکا۔ اس کی موت پر ابن عُجیف، جسے ابن الاثیر نے عجیفی لکھا ہے، طرسوس کا حاکم ہوا، اور خمارویہ نے بھی اس تقرر کی منظوری دے دی۔ لیکن بعد میں اُسے معزول کر کے اپنے برادر عمزاد محمد بن موسیٰ بن طولون کو مقرر کیا۔ اس اثنا میں ثغور میں ایک اور تبدیلی ہوئی۔ ۲۷۸ھ میں الموفق کا انتقال ہوا۔ اُس کا ایک خادم راغب نامی نے آقا کی وفات پر جہاد فی سبیل اللہ کے ارادے سے طرسوس میں مستقل قیام کا ارادہ کیا۔ شام پہنچ کر راغب نے گھوڑے، مویشی، اسلحہ، اور خیمے تو آگے طرسوس بھیج دئے اور خود خمارویہ سے ملنے اور اُسے اپنے ارادے کی اطلاع دینے کی غرض سے دمشق چلا گیا۔ خمارویہ نے حسب عادت اس کی بڑی خاطر و مدارات کی، اور راغب اس سے اتنا متاثر ہوا کہ رخصت کی اجازت لینے میں اُسے شرم آئی۔ دمشق میں طویل قیام کی وجہ سے اس کے ساتھیوں کو طرسوس میں یہ خیال ہوا کہ خمارویہ نے اُسے گرفتار کر لیا ہے اور وہ اس لئے اور بھی زیادہ رنجیدہ ہوئے کہ خمارویہ نے ایک ایسے شخص کو گرفتار کیا ہے جس کا مقصد صرف جہاد فی سبیل اللہ تھا۔ آخر شورش ہوئی اور اہل طرسوس نے حاکم شہر محمد بن موسیٰ بن طولون کو یہ کہہ کر گرفتار کر لیا کہ جب تک خمارویہ راغب کو نہ چھوڑے گا تو بھی قید رہے گا۔ ان لوگوں نے محمد بن موسیٰ کا گھر بھی لوٹ لیا اور [illegible] کی فضیحت بھی کی۔ خمارویہ کو جب اس کا علم ہوا تو اُس نے راغب کو اس سے مطلع کیا۔ [illegible] راغب وہاں سے رخصت ہو کر جب طرسوس پہنچ گیا تو لوگوں نے اپنے امیر محمد بن موسیٰ کو رہا کر دیا۔ مگر محمد بن موسیٰ [illegible] ایسا دل برداشتہ ہوا کہ وہ وہاں سے اہل طرسوس سے یہ کہہ کر "قبح اللہ بلدا [illegible]" چلا آیا۔ اب ابن عجیف پھر خمارویہ کی طرف سے طرسوس کا حاکم مقرر ہوا، اور ۲۸۱ھ میں

---

۲۰۳ تاریخ کامل۔ ج ۷۔ ص ۱۴۹۔ (حوادث ۲۷۵ھ) +

۲۰۴ تاریخ ج ۴۔ ص ۳۰۷، ۳۰۸ +

طُغج بن جُف الفرغانی کو صائفہ کا افسر مقرر کیا گیا۔ اس ترک امیر کا نام آئندہ اکثر سننے میں آئے گا۔ خمارویہ اور اُس کے بیٹے جیش کے مرنے کے بعد ۲۸۳ھ میں راغب نے طرسوس پر غلبہ پاکر ابن عُجیف کو حکومت سے الگ کر دیا۔ اور ہارون طولونی کے لئے دعا کرنی بند کر کے بدر مولائی معتضد کے لئے دعا کرنی شروع کی۔ اس طرح طرسوس اور اعمال ثغور طولونی حکومت سے الگ ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ ہارون نے معتضد سے ایک نیا معاہدہ کرنے کی درخواست کی تھی، جس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

اس دوران میں اہم واقعات دار الخلافۂ بغداد میں پیش آ رہے تھے۔ ۶ شوال ۲۷۵ھ کو الموفق نے اپنے بیٹے ابو العباس احمد (المعتضد) کو حکم عدولی کی بناء پر گرفتار کرایا۔ معتضد سپاہیوں میں اتنا ہر دل عزیز تھا کہ اُس کی گرفتاری کی وجہ سے فوج میں شورش پھیلی، اور بالآخر الموفق نے بذات خود یہ فتنہ فرو کیا۔[۲۰۵] ۲۷۰ھ میں آخرکار الموفق نے صاحب الزنج کا فتنہ ختم کیا۔[عـ۵] اور ۲۷۸ھ میں ابھی معتضد معتوب اور قید ہی تھا کہ الموفق بیمار ہو کر بغداد واپس آیا۔ یہ اس کا مرض الموت تھا۔ اسی بیماری کے دوران میں الموفق کی اجازت کے بغیر معتضد کے موالی اُسے الموفق کے پاس لے آئے۔ باپ بیٹے میں دوبارہ ملاپ ہوا، اور الموفق نے اُسی کو اپنا جانشین بنایا۔ ۲۲ صفر ۲۷۸ھ کو الموفق کا انتقال ہو گیا۔ اسی دن قواد اور غلمان نے ابو العباس احمد کے ہاتھ پر المفوض کے بعد ولی عہدی کی بیعت کی، اور معتضد اُس کا لقب

---

۲۰۵ طبری ج ۱۱، ص ۳۳۴ + ابن الاثیر ج ۷، ص ۱۴۴ (حوادث ۲۷۵ھ) +

عـ۵ - اس مضمون کی پہلی قسط (سیاست جنوری ۱۹۴۲ء ص ۷۵) میں ہم نے بیان کیا ہے کہ الموفق کو صاحب الزنج کے خلاف فوج کشی پر مقرر کیا گیا ہے تو اسی وقت معتمد نے اُسے الناصر لدین اللہ کا خطاب دیا تھا۔ لیکن تغری بردی (ج ۲ ص ۸۵) نے لکھا ہے کہ یہ خطاب اُسے ۲۷۰ھ میں اُس وقت دیا گیا تھا جب اُس نے صاحب الزنج کا خاتمہ کیا ہے۔ اور یہی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے +

مقرر ہوا۔ جمعہ کے خطبے میں پہلے معتمد پھر المفوض اور اس کے بعد معتضد کا نام لیا گیا[۲۰۶]۔ لیکن معتضد کی ہر دلعزیزی سپاہیوں میں برابر بڑھتی چلی گئی، اور معتمد کو بہت جلد محسوس ہوا کہ الموفق کی موت سے اس کے موقف میں کوئی فرق نہیں پڑا، بلکہ باپ کی طرح معتضد اس پر حاوی ہے۔ آخر اس دباؤ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۲۲ محرم ۲۷۹ھ کو المفوض کو ولی عہدی سے خلع کرایا گیا، اور خلیفہ کا فرمان شہروں میں نافذ ہوا کہ معتضد کو براہ راست ولی عہد مقرر کیا گیا ہے۔ جمعہ کے خطبے میں بھی اب معتمد کے بعد صرف معتضد کا نام لیا جانے لگا۔ معتضد نے بھی اپنی طرف سے تمام عمال کو اطلاع دی کہ امیر المومنین نے اسے اپنا ولی عہد مقرر کیا ہے، اور تمام امر و نہی اور ولایت و عزل اس کے سپرد کر دئے ہیں[۲۰۷]۔ چند ہی مہینے گزرے تھے کہ ۲۰ رجب ۲۷۹ھ کو معتمد کا انتقال ہو گیا، اور ۲۸۰ھ میں المفوض نے بھی وفات پائی[۲۰۸]۔

یہ تمام سیاسی تبدیلیاں، عزل و نصب، اور بالآخر معتضد کی خلافت کا اثر آل طولون پر بہت گہرا پڑا۔ نیا خلیفہ اب صاحب اقتدار تھا۔ وہ بات نہیں رہی تھی کہ خلیفہ مجبور و مقہور رہا اور تمام نامہ و پیام بجائے خلیفہ کے کسی دوسرے شخص سے کرنا پڑے۔ معتضد کی بیعت کے بعد ہی خمارویہ نے اس کی خدمت میں تحائف پیش کئے، پرانے فرمان کی تجدید چاہی اور یہ درخواست کی کہ اس کی بیٹی قطر الندیٰ کا نکاح خلیفہ کے بیٹے مکتفی سے کر دیا جائے[۲۰۹]۔ مگر معتضد نے کہا کہ خمارویہ اس رشتے سے شرف حاصل کرنا چاہتا ہے اور ہم اس کے شرف میں اس طرح اضافہ کرتے ہیں کہ قطر الندیٰ سے ہم خود نکاح کریں گے[۲۱۰]۔ یہ تحائف اور پیغام حسین بن عبد اللہ بن مصور الجوہری

---

۲۰۶ طبری ج ۱۱۔ ص ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷ + ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۴۶ (حوادث ۲۷۸ھ)

۲۰۷ طبری ج ۱۱۔ ص ۳۴۰ + ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۴۹ (حوادث ۲۷۹ھ)

۲۰۸ ابو الفداء ج ۲۔ ص ۵۶ +

۲۰۹ طبری ج ۱۱ ۔ ص ۳۴۱ + طبری نے تحائف کی مکمل فہرست بھی نقل کی ہے۔

۲۱۰ مروج الذہب ج ۲۔ ص ۳۲۹ +

المعروف بہ ابن الجصاص[211] کے ہاتھ بھیجے گئے تھے۔ دونوں درخواستیں منظور ہوئیں، اور ۲۵ ربیع الاول ۲۸۰ھ کو معتضد کا فرمان مصر آیا، جس کے مطابق خمارویہ اور اُس کی اولاد کو تیس برس کے لئے فرات سے برقہ تک تمام علاقوں کا حاکم قرار دیا گیا، اور صلاۃ، خراج اور قضاء اُس کے سپرد کئے گئے۔ ساتھ ہی یہ بھی شرط کی گئی کہ دو لاکھ دینار سالانہ گزشتہ زمانے کے لئے اور تین لاکھ دینار آیندہ سالانہ ادا کئے جائیں[212]۔ نظم ونسق کے تمام اخراجات ظاہر ہے کہ خمارویہ کو برداشت کرنے پڑتے تھے۔ فرمان کے جو الفاظ نقل کئے گئے ہیں اُن سے اس کا پتہ نہیں چلتا کہ گزشتہ زمانے کا تعین کس طرح کیا گیا تھا، اور خمارویہ سے کتنے گزشتہ برسوں کی رقم وصول کی گئی تھی۔ خلیفہ نے رمضان ۲۸۰ھ میں سیف خادم کے ہاتھ بارہ خلعتیں، ایک تلوار، تاج اور جواہرات کا ایک ہار (وشاح) اس کے پاس بھجوائے[213]۔

خلیفہ معتضد سے قطر الندیٰ کی شادی کے حالات اکثر مورخوں نے تفصیل سے لکھے ہیں۔ سیوطی[214] نے جہیز کی پوری کیفیت بیان کی ہے، اور ابن تغری بردی[215] نے دوسری تفصیلات بیان کی ہیں۔ شادی کے تمام انتظامات ابن الجصاص کے سپرد تھے اور مورخ اس پر متفق ہیں کہ بعد کے زمانے میں اس شخص کی لامتناہی دولت کا مبدا یہی شادی تھی۔ جہیز پر کل دس لاکھ دینار خرچ ہوئے تھے۔ خمارویہ کا بھائی خزرج، بہن عباسہ اور ابن الجصاص قطر الندیٰ کے ساتھ گئے تھے، اور یہ انتظام کیا گیا تھا کہ سفر میں جہاں کہیں قطر الندیٰ کا قیام ہو وہاں فرش وفروش اور پردوں سے آراستہ اُسے ایک محل تیار ملے۔ چنانچہ ہر جگہ قطر الندیٰ کو

---

۲۱۱ اس شخص کے حالات کے لئے دیکھو نشوار المحاضرہ ۔ للتنوخی ص ۲۰ ۔ ۲۶۳ +

۲۱۲ الکندی ص ۲۴۰ + خطط ج ۱ ۔ ص ۳۲۱ + ابن تغری بردی ج ۲ ۔ ص ۵۵ + اصل الفاظ یہ ہیں: علیٰ ان یحمل فی کل عام من المال مائتی الف دینار عن مامضی وثلاثمائۃ الف دینار عن کل عام للمستقبل + ابو الفداء ج ۲ ۔ ص ۵۶ +

۲۱۳ الکندی ص ۲۴۰ + ابن تغری بردی ج ۲ ۔ ص ۵۵ +　　۲۱۴ تاریخ الخلفاء ص ۲۴۷ +

۲۱۵ ابن تغری بردی ج ۲ ۔ ص ۶۸ ، ۶۹ +

یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے باپ کے محل میں بیٹھی ہے، اور پھر سفر بھی ایسے کیا گیا تھا کہ جیسے کوئی شیر خوار بچہ پنگوڑے میں لیٹا ہو۔ مصر و شام کی سرحد پر جہاں عباسہ کے خیمے نصب کئے گئے تھے وہاں ایک گاؤں عباسہ کے نام پر آباد ہو گیا۔ جو رہبر قطر الندیٰ کے ساتھ تھا اُسے ایک لاکھ درہم انعام دیا گیا تھا[۲۱۶]۔ ۲ محرم ۲۸۲ھ کو یہ شاہانہ قافلہ بغداد میں داخل ہوا۔ معتضد اس وقت دار الخلافہ سے باہر موصل میں تھا۔ اس لئے قطر الندیٰ کو ابن صاعد کے محل میں ٹھیرایا گیا۔ ۴ ربیع الاول کو معتضد واپس آیا تو اُسے خلیفہ محل میں منتقل کیا گیا۔ اس کے لئے بھی خاص اہتمام کیا گیا تھا، جس کی تفصیل طبری نے بیان کی ہے[۲۱۷]۔ ابن الجصاص نے جواہرات کا ایک بڑا حصہ قطر الندیٰ سے یہ کہ کر اپنے پاس ہی رکھ لیا تھا کہ بوقت ضرورت اس کے کام آئے گا۔ مگر اس کی نوبت نہ آئی کیونکہ پانچ برس بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ ۲۸۷ھ میں قطر الندیٰ کا انتقال ہو گیا اور اور اُسے قصر رصافہ میں دفن کیا گیا[۲۱۸]۔

مورخ قطر الندیٰ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ چنانچہ ابن خلدون لکھتا ہے کہ

"وکانت اکمل النساء عصرها فی الجمال والآداب[ٍ]"

اس شادی کے متعلق علی بن عباس الرومی نے کہا ہے[۲۱۹]

یا سید العرب الذی زفت لہ　　　بالیمن والبرکات سیدۃ العجم

---

۲۱۶ الیافعی ج ۲ ص ۱۹۶، ۱۹۴ + خطط ج ۱ ص ۲۳۲ + مقریزی نے اس شہر کی مختصر تاریخ بیان کی ہے اور لکھا ہے :

مقام بادشاہوں کی رخصت گاہ بن گیا تھا۔

۲۱۷ تاریخ الرسل والملوک ج ۱۱ ص ۳۴۵، ۳۴۶ +

۲۱۸ طبری ج ۱۱ ص ۳۶۷ + مروج الذہب ج ۲ ص ۳۲۸ +

ٍ تاریخ ج ۴ ص ۳۰۷ +

۲۱۹ مروج الذہب ج ۲ ص ۳۴۴ +

اسعد بها کسعود هابك انها | ظفرت بما فوق المطالب والهمم
ظفرت بملائی ناظر یها بهجة | وضمیرها نبلاً وکفیها کرم
شمس الضحی زفت الی بدر الدجی | فتکشف بهما عن الدنیا ظلم

یہاں خط کشیدہ الفاظ خاص طور پر قابل غور ہیں جن میں شاعر نے معتضد اور خمارویہ کو مساویانہ درجہ دے دیا ہے اور ہمیں اس کا علم نہیں کہ ان الفاظ پر کوئی اعتراض کیا گیا تھا۔

اس شان و شکوہ کی شادی کے حالات صرف ایک مرتبہ اس سے قبل تاریخ اسلام میں اس موقعے پر ملتے ہیں جب مامون نے حسن بن سہل کی بیٹی بوران سے فم الصلح میں شادی کی ہے۔ لیکن مصر کا ملک اس قسم کی فضول خرچی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مورخوں نے لکھا ہے کہ اس شادی سے خلیفہ معتضد کا حقیقی مقصد ہی یہ تھا کہ آل طولون کو اس بہانے سے بالکل فقیر کر دیا جائے۔ اب یہ حالت ہو گئی تھی کہ اگر خمارویہ کو ایک شمع بھی درکار ہوتی تھی تو وہ بھی اسے دستیاب نہ ہو سکتی تھی۔[۲۲۰] ابن تغری بردی[۲۲۱] نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ ۲۸۲ھ میں خمارویہ کا انتقال عین وقت پر ہوا، کیونکہ اگر اس نازک زمانے میں اتفاق سے کوئی بڑی مہم پیش آ جاتی تو اموال کی کمی کی وجہ سے خمارویہ اس کا انتظام کرنے سے بالکل قاصر رہتا، اور نہ آئندہ وہ اپنی فضول خرچیاں جاری رکھ سکتا تھا۔

اب خمارویہ کے زمانے کا آخری واقعہ بیان کرنا رہ جاتا ہے۔ ۲۸۰ھ میں خمارویہ کی طرف سے احمد بن آبا (یا احمد بن ابالی) نے اور پھر ۲۸۱ھ و ۲۸۲ھ میں خمارویہ کے حاکم دمشق طغج بن جف نے یونانی سرحد میں داخل ہو کر فتوحات حاصل کیں۔[۲۲۲] اس کے بعد ۲۸۲ھ میں قیدیوں کی فداء کے لئے

۲۲۰ھ نشوار المحاضرہ ص ۲۶۲ + اس کے علاوہ دیکھو الیافعی ج ۲ ص ۳۲۸ +

۲۲۱ھ النجوم الزاہرہ ج ۲ ص ۹۵ :۔ وقال بعضهم: فبانت حقاً بين حاجته الی الموت لانه لو عاش اکثر من هذا حتی یلتمس ما کانت جرت عادته لاستصعب ذلك عليه لو نزلت به ملمة لا نفضح۔

۲۲۲ھ ابو الفداء ج ۲ ص ۵۶ + طبری ج ۱۱ ص ۳۴۳، ۳۴۴ +

یونانیوں اور مسلمانوں میں ایک عارضی صلح (ھدنہ) قرار پائی۔ مگر قبل اس کے کہ یہ فدا مکمل ہو ذیقعدہ ۲۸۲ھ میں خمارویہ کو دمشق میں قتل کر دیا گیا، اور فدا کی تکمیل جیش بن خمارویہ کے زمانے میں ۲۸۳ھ میں ہوئی۔ اس موقعے پر جو مسلمان مرد اور عورت قید سے آزاد کراوئے گئے ان کی تعداد دو ہزار چار سو پچانوے اور بروایتے تین ہزار تھی۔ یونانیوں اور مسلمانوں میں قیدیوں کا یہ چھٹا تبادلہ تھا[۲۲۳]۔

خلیفہ کے ساتھ مصاہرت کے تعلقات پیدا کر لینے کے بعد خمارویہ کے لئے بالکل امن چین کا زمانہ شروع ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن یہ اس کے نصیب میں نہ تھا۔ جمعرات کے دن ۸ رشعبان ۲۸۲ھ کو خمارویہ شام روانہ ہوا، اور اسی سفر میں ۲۸ رذی قعدہ ۲۸۲ھ کو خمارویہ اپنے بستر پر اپنے ہی غلاموں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اس کی مدت ولایت، بارہ سال، اٹھارہ دن ہے[۲۲۴]، اور اس نے صرف بتیس برس کی عمر پائی۔ قتل کے اسباب کے متعلق مختلف روایات نقل کی گئی ہیں[۲۲۵]۔ مگر ان کی تفصیل یہاں بیان کرنا بے سود ہے۔ خلیفہ کو قتل کی اطلاع، خمارویہ کے کاتب ابراہیم بن احمد الماذرائی نے دی تھی، جس نے اسی غرض سے دمشق سے بغداد کا سفر صرف گیارہ دن میں کیا تھا۔ اس سے قبل معتضد خمارویہ کے لئے تحائف اور ایک خط دیکر ابن الجصاص کو مصر روانہ کر چکا تھا۔ مگر جب خمارویہ کے قتل کی خبر ملی تو ابن الجصاص کو واپس بلا لیا گیا۔ جن غلاموں پر خمارویہ کے قتل کا الزام تھا ان کی تعداد بیس تھی، اور انھیں قصاص میں قتل کر دیا گیا[۲۲۶]۔ اس کے دفن کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ ابن عساکر[۲۲۷] نے ایک روایت یہ بیان کی ہے کہ اسے حوران میں دفن کیا گیا تھا

---

۲۲۳ کتاب التنبیہ والاشراف ص ۱۹۲ + مروج الذھب ج ۲ ص ۳۴۵ +

۲۲۴ الکندی ص ۲۴۱ + ابن خلدون (ج ۴ ص ۳۰۸) کے مطابق قتل کی واردات ذی الحجہ میں پیش آئی تھی۔ طبری (ج ۱۱ ص ۳۴۷) کی ایک روایت ہے کہ خمارویہ کے قتل کی تاریخ ۳ رذی الحجہ ہے۔

۲۲۵ طبری ج ۱۱ ص ۳۴۷ + ابن عساکر ج ۲ ص ۱۶۷ +

۲۲۶ ابن عساکر ج ۵ ص ۱۷۸ +

۲۲۷ تاریخ الکبیر ج ۵ ص ۱۷۸

لیکن ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے اُس کا جنازہ تابوت میں مصر لے جایا گیا تھا اور اُسے اُس کے باپ کے پہلو میں دفن کیا گیا تھا۔ اسی موخر الذکر روایت کو دوسرے مورخوں نے صحیح سمجھا ہے جس دن اس کا جنازہ فسطاط پہنچا ہے وہ وہاں ماتم کا دن تھا جس میں خمارویہ کے غلمان، موالی اور ہر مرد عورت نے حصہ لیا[۲۲۸]

(۸)

خمارویہ نے دو خصائل اپنے باپ سے ورثے میں پائے تھے۔ ایک تو بذل و نوال اور دوسرے تعمیرات کا شوق۔ جہاں تک بذل و نوال کا تعلق ہے یہ چیز فضول خرچی کی حد تک بڑھی ہوئی تھی، اور اس کی متعدد مثالیں تاریخوں میں جابجا مذکور ہیں۔ اس معاملے میں احمد بن طولون اور ابو الجیش خمارویہ میں جو فرق تھا وہ ابن عساکر نے ایک موقع پر خوب ظاہر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی نے ابن مہاجر سے پوچھا کہ احمد اور خمارویہ میں کون زیادہ وسیع النفقہ تھا۔ اُس نے جواب دیا کہ خمارویہ زیادہ کشادہ دل اور وسیع النفقہ ہے۔ لیکن احمد بن طولون مناسب موقعہ اور محل پر خرچ کرتا تھا اور خمارویہ کے اخراجات بے تکے ہوتے تھے[۲۲۹]۔ اس کے اخراجات کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ ابن تغری بردی[۲۳۰] کے مطابق خمارویہ کی فوج کے سالانہ اخراجات نو لاکھ دینار اور مطبخ کے ماہانہ اخراجات تیئیس ہزار دینار تھے۔ حرم اور جواری اور اُن کے متعلقات کے اخراجات اس کے علاوہ تھے۔ افسوس ہے کہ خمارویہ کی تعمیر کردہ نہ اب کوئی عمارت موجود ہے اور نہ کسی عمارت کے تفصیلی حالات ہی ملتے ہیں۔ بہر حال ابن تغری بردی[۲۳۱] نے ان عمارتوں کے نام اور بہت ہی مختصر حالات یک جا جمع کر دئے ہیں۔ اپنے باپ کے تعمیر کردہ قصر اور اس کے محاسن میں اضافہ کرنے کے علاوہ خمارویہ نے قصر کے سامنے ایک حوض (فسقیہ) بنوایا تھا جسے بجائے

۲۲۸ دیکھو مسعودی۔ مروج الذہب ج ۲۔ ص ۳۳۵ +

۲۲۹ ابن عساکر ج ۵۔ ص ۱۷۷۔ کان ابو الجیش اوسع صدراً و اکثر نفقة و احمد کان یجمل فی نفقته و ابو الجیش کان یهزل فیها +

۲۳۰ النجوم الزاہرہ ج ۲۔ ص ۶۴ +

۲۳۱ النجوم الزاہرہ ج ۲۔ ص ۵۵ - ۶۴ + اس کے علاوہ دیکھو خطط ج ۱۔ ص ۳۱۶ +

پانی کے پارے سے بھرا گیا تھا۔ اس کی تعمیر کی وجہ یہ ہوئی کہ خمارویہ کو نیند نہیں آتی تھی، اور طبیب نے یہ علاج تجویز کیا تھا کہ ایک حوض کو پارے سے بھرا جائے، پارے کو مسلسل ہلایا جاتا رہے، اور خمارویہ اس حوض میں سوے۔ چنانچہ اس بات کا خاص طور پر انتظام کیا گیا تھا کہ پارہ متحرک رہے۔ اس حوض کا رقبہ پچاس در پچاس درع تھا، اور اس پر بے انتہا مال خرچ کیا گیا تھا۔ چاندنی رات میں جب چاند اپنی پوری روشنی دے رہا ہو یہ پارے کا حوض بڑا پرلطف نظارہ پیش کرتا تھا۔ قضاعی کی روایت ہے کہ قصر کی تباہی کے بعد مدتوں تک لوگ حوض کی درازوں میں تلاش کر کے پارا نکالا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ قصر ہی میں ایک قبۃ الھوا تعمیر کرایا تھا۔ اس قبے کو ہر موسم کے لئے موزوں بنانے کے واسطے پردوں کا انتظام تھا، اور جاء وقوع ایسی رکھی گئی تھی کہ وہاں سے تمام محل، بستان، صحرا، دریائے نیل، پہاڑ اور پورا شہر نظر آتا تھا۔ قصر میں ان اضافوں کے علاوہ اس نے احمد بن طولون کے میدان سے بھی ایک بڑا میدان بنوایا تھا، جس میں درندوں کے رہنے کے لئے ایک مقام (دار السباع) تھا۔ اس کی طرز تعمیر اور دیگر انتظامات ابن تغری بردی نے بیان کئے ہیں۔ باپ کی خواصوں کے لئے ایک الگ محل بنوایا، جس کے انتظامات اس قدر مکمل تھے کہ ان عورتوں کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ خمارویہ کو مویشی اور گھوڑوں کا شوق تھا۔ ہر قسم کے مویشی کے لئے الگ الگ اصطبل اور تھان تھے، اور پرانے اصطبلوں کو بھی وسیع کیا گیا تھا۔ فسطاط کے علاوہ جیزہ، نہیا، سفط، اور طھرمس میں بھی الگ اصطبل تھے۔ ان ضیاع میں سوائے قرظ کے اور کسی چیز کی کاشت نہیں ہوتی تھی تاکہ مویشی اور گھوڑوں کو برابر آذوقہ میسر آتا رہے۔ یہ اصطبل تو خمارویہ کے تھے۔ ان کے علاوہ خلیفہ کے گھوڑوں کے اصطبل الگ تھے، جن میں گھڑ دوڑ کے گھوڑے بھی رہتے تھے اور رباط کے لئے بھی۔ ہر اصطبل کے ملازم الگ الگ تھے، اور اچھی تنخواہیں پاتے تھے۔ خمارویہ کو شکار اور گھڑ دوڑ سے شغف تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ گھڑ دوڑ اسی منظر میں ہوتی تھی جو احمد بن طولون نے فوج کی پریڈ کے لئے بنوایا تھا۔ اس موقعے پر خمارویہ تمام خدم وحشم اور مسلح فوج کے ساتھ گھڑ دوڑ کے

میدان میں آتا تھا۔ اہل فسطاط یہ دن عید کی طرح مناتے تھے اور فوج اور گھر دوڑ دیکھنے کے لئے جمع ہوتے تھے۔[۲۳۲]

اوپر بستان کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہی بستان خمارویہ کا سب سے بڑا کام سمجھا جاتا ہے، اور اسی کی سب سے زیادہ تفصیل سے ہم واقف ہیں۔ اس کے حالات ابن تغری بردی اور مقریزی دونوں نے بیان کئے ہیں، اور فون کریمر نے اپنی کتاب میں بھی اس عبارت کا ترجمہ کیا ہے۔ فون کریمر کے مضمون کا ترجمہ اُردو میں شائع ہو چکا ہے، اور اسی ترجمے سے ہم یہ حالات نقل کرتے ہیں[۲۳۳]۔ خمارویہ جب اپنے باپ کا جانشین ہوا تو جامع مسجد کے قریب کے میدان میں اُس نے باغ لگوایا۔ اُس میں طرح طرح کے خوشبودار پھول اور انواع واقسام کے درخت لگوائے تھے۔ اس باغ کے لئے اُس نے عجیب وغریب درخت اور مختلف قسموں کے گلاب دور دور سے منگائے تھے۔ باغ میں زعفران کی کاشت بھی ہوتی تھی۔ کھجور کے درختوں کے تنوں پر بڑی صناعی سے تانبے کے پترے لپیٹے تھے، اور ان پر سونے کا ملمع کیا تھا۔ ان پتروں اور درختوں کے تنوں کے درمیان سیسے کی نالیاں تھیں۔ جب پانی چھوڑا جاتا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کھجور کی جڑوں سے پانی ابل رہا ہے۔ پانی ایک حوض میں جمع ہوتا تھا، اور نالیوں کے ذریعے تمام باغ میں تقسیم ہوتا تھا۔ کیاریوں میں خوشبودار پھولوں سے طرح طرح کے نقش ونگار بنائے جاتے تھے۔ اکثر کیاریوں میں ان ہی پھولوں سے عبارتیں لکھی گئی تھیں۔ مالی ہر وقت ان پودوں کو تراشتے رہتے تھے کہ پتے حد سے نہ بڑھنے پائیں اور عبارتیں نمایاں رہیں۔ اس باغ کے لئے کھجور کے درخت اور سبز، زرد اور نیلے رنگ کے نیلوفر خراسان وغیرہ سے لائے گئے تھے، جو دوسرے علاقوں میں کمیاب تھے۔ زرد آلو کے بہت سے ایسے درخت تھے جن میں بادام کا پیوند لگایا گیا تھا۔ خاص طور پر قابل دید چیز باغ کی بارہ دری تھی جو ساگوان کی لکڑی سے

۲۳۲ء ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۶۷۔

۲۳۳ء مسلمانوں کی صنعت، وحرفت، زراعت وتجارت۔ مترجمہ محمد جمیل الرحمٰن۔ الہ آباد ۱۹۳۴ء۔ ص ۱۲۳ تا ۱۲۵۔

بنائی گئی تھی۔ اس پر عجیب و غریب نقش و نگار تھے۔ اس کے اندر کا حصہ بہت شاندار تھا، اور اس پر مختلف رنگوں سے نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ اس کا فرش سنگ مرمر کا تھا۔ ستونوں سے پانی کی چھوٹی چھوٹی آبشاریں بہتی رہتی تھیں۔ خوش الحان چڑیاں بارہ دری کی دیواروں میں کھلے گھونسلوں میں رہتی تھیں، اور بارہ دری کے اندر آزاد پھرتی تھیں۔ باغ میں جگہ جگہ مختلف قسم کے مور، مرغ حبشی (دجاج الحبشی) اور ان کے علاوہ دوسرے کم یاب پرندوں کی ایک بڑی تعداد پلی رہتی تھی۔[۲۳۴]

لازمی طور پر احمد بن طولون کی طرح خمارویہ نے بھی فوج کی طرف خاص توجہ کی تھی۔ حوف الشرقی کے عرب، جنھیں بنو امیہ کے زمانے میں وہاں لا کر بسایا گیا تھا، اب اپنی سب روایات بھول چکے تھے، اور رہزنی اور لوگوں کو اذیت دینے کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ مگر یہ شجاعت اور ہیبت میں مشہور تھے۔ خمارویہ نے حوف الشرقی کے ان عربوں کو جنھیں شنازہ کہتے ہیں، فوج میں بھرتی کیا، انھیں بڑی بڑی تنخواہیں دیں، اور حریر و دیباج کی بھڑک دار وردیاں، پٹکے اور تلواریں عطا کیں۔ شنازہ کی اس نئی فوج کا نام اس نے "مختارہ" (چیدہ فوج) رکھا۔ اس عمل سے اس نے ان مفسدوں کی شجاعت سے بھی کام لیا اور انھیں اذیت دینے اور رہزنی سے بھی باز رکھا۔ بیان کیا گیا ہے یہ شنازہ جب خمارویہ کے ساتھ چلتے تھے تو کندھوں پر تلواریں رکھ کر چلتے تھے، اور جب جنگ میں شریک ہوتے تھے تو فوج کے آگے لڑتے تھے اور دوسرے سپاہیوں کے مقابلے میں داد شجاعت دیتے تھے۔ ان عربوں کے علاوہ خمارویہ کی فوج میں ایک ہزار حبشی تھے۔ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ حبشی خمارویہ کی ذات سے وابستہ تھے۔ سوائے تلواروں اور خودوں کے، جو ان کے عماموں کے نیچے ہوتی تھیں، ان حبشی سپاہیوں کی پوری وردی سیاہ ہوتی تھی، اور جب یہ فوج چلتی تھی تو یہ معلوم

۲۳۴؎ خطط ج ۱۔ ص ۳۱۶ + النجوم الزاہرہ ج ۳۔ ص ۶۴، ۶۵ +

ہوتا تھا کہ جیسے سیاہ سمندر موجیں لے رہا ہے۔ خمارویہ خود بھی بلند و بالا شخص تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی چٹان سے اُسے کاٹا گیا ہے۔ اُس کے موکب میں انتہا درجے کی خاموشی رہتی تھی: "کانما علی رؤسھم الطیر۔" کھانسنے اور چھینکنے تک کی آواز نہیں آتی تھی۔[۲۳۵]

افسوس ہے کہ خمارویہ کے وقت میں مصر کی معاشی حالت کے متعلق کوئی خاص بات نہیں ملتی۔ اس لئے قیاس یہ ہے کہ احمد بن طولون کے زمانے کے معاشی انتظامات بدستور جاری رہے تھے۔ لیکن اول تو خمارویہ کی فضول خرچیاں، جن کے بعض کوائف اوپر بیان ہوئے، اور اُن کے علاوہ دو آفات سماوی ایسی چیزیں ہیں جن سے صرف یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مصر کی معاشی حالت اس دور ولایت میں ضرور بگڑتی گئی ہوگی۔[۲۳۶] ۲۷۲ھ میں طبری کے مطابق، مصر میں ایک زبردست زلزلہ آیا تھا، جس سے مکانوں کے علاوہ جامع مسجد کو بھی نقصان پہنچا تھا، اور جانی نقصان کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک ہزار جنازے ایک دن میں شمار کئے گئے تھے۔ اس کے بعد ۲۷۵ھ میں نیل میں طغیانی نہ آنے کی وجہ سے ملک میں سخت قحط پڑا تھا۔[۲۳۷]

۹

خمارویہ کا قتل آل طولون کے خاتمے کا آغاز تھا۔ اس موقعے پر اُس کا بیٹا ابو العساکر جیش دمشق میں اُس کے ساتھ تھا۔ ۲۸ ذی القعدہ ۲۸۲ھ کو جیش کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔ چند روز دمشق میں قیام کرنے کے بعد وہ مصر واپس آگیا اور پھر وہیں رہا۔ جیش کم سن ناآزمودہ کار لڑکا تھا۔ "وکان صبیاً غراً۔"[۲۳۸] واقعہ یہ ہے کہ خمارویہ کے انتقال کے وقت ہی بڑے بڑے قواد کی ایک جماعت نے اس بنا پر جیش کو جانشین بنانے میں پس و پیش کیا تھا کہ اس کے پاس

۲۳۵ء ابن تغری بردی ج ۲۔ص ۶۴۔ الخ + مقریزی ج ۱۔ص ۳۱۸ + دونوں مورخوں کی عبارت حرف بحرف ایک ہے +

۲۳۶ء تاریخ الرسل والملوک۔ ج ۱۱۔ص ۳۳۱ + ۲۳۷ء ابن تغری بردی ج ۲۔ص ۸۴ +

۲۳۸ء ابن الاثیر ج ۷۔ص ۱۵۷ + ابن تغری بردی ج ۲۔ص ۹۴ ۔ حاشیہ ۲ +

انعام و اکرام دینے کے لئے کوئی مال نہ تھا، کیونکہ خمارویہ بیٹی کی شادی میں خزانہ خالی کر چکا تھا۔ مگر جیش ان کے ساتھ تلطف و مدارات سے پیش آیا اور انھیں اپنی طرف مائل کر لیا۔ اس پر بھی بہت جلد جیش کی طرف سے سب کو بے اطمینانی ہوئی۔ حکمران ہونے کے بعد حکومت کے کاموں سے بے خبر ہو کر وہ لہو و لعب اور شراب خوری میں پڑ گیا۔ اوباش لوگ اُس کے مصاحب تھے۔ ان میں ایک رومی غلام بندقوش اور دو معمولی درجے کے لوگوں خضر اور ابن البواش کا نام خاص طور پر لیا گیا ہے[۲۳۹]۔ بڑے بڑے امرار اور قواد کو چھوڑ کر انھیں اوباشوں کی صحبت کو اُس نے ترجیح دی، بلکہ ان پر علانیہ یہ ظاہر بھی کر دیا۔ اور یہ بھی کہا، اور تمام حکومت کا کام وہ انھیں کے سپرد کر دے گا۔ ان امراء کی یہ حالت تھی کہ یہ لوگ زبردست شان و شوکت کے مالک تھے، اور ان میں سے ہر ایک شجاعت اور ریاست میں یکتا تھا۔ خمارویہ نے اُن کے ساتھ نیک سلوک کر کے انھیں اپنا بنا رکھا تھا۔ لیکن جیش کی کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ ایک مرتبہ نبیذ میں مدہوش ہو کر اس نے اپنے اوباش مصاحبوں سے کہا کہ ان کتوں (هولاء الکلاب) سے تم زیادہ تعظیم و تکریم کے مستحق ہو۔ اُس کے یہ الفاظ ان قواد تک پہنچے اور انھوں نے تصفیہ کیا کہ جیش کو حکومت سے الگ کر دیا جائے۔ مگر وہ اس پر بھی باز نہ آیا، اور قواد کو علانیہ دھمکیاں دیں۔ جیش تفریح کی غرض سے منیتہ الاصبغ جا رہا تھا اور یہ قواد ہم رکاب تھے کہ انھیں ان دھمکیوں کی اطلاع ہوئی۔ اُسی بے سروسامانی کی حالت میں اپنے اہل و عیال اور مال و متاع کو مصر میں چھوڑ کر خاقان المفلحی یا البلخی، محمد بن اسحاق بن کنداج، وصیف بن صوارتکین، بندقہ بن لمجور اس کا بھائی محمد بن لمجور اور طنج بن جف کا بھائی بدر بن جف، اور اسی طرح کے اور بڑے بڑے قوادتن بتقدیر تین سو غلام ساتھ لے کر خشکی کے راستے مصر سے چل کھڑے، چند روز صحرا میں سرگرداں

---

[۲۳۹] مسعودی (مروج الذہب ج ۲۔ ص ۳۴۵) نے لکھا ہے کہ یہ صاحب نجح المعروف بہ طولونی اور سلامہ المعروف بہ موتمن تھے، اور اس کے بعد سلامہ قاہر اور راضی وغیرہ کا مقرب رہا تھا + نجح طولونی کا نام ہم آیندہ بھی پڑھیں گے۔

رہے، اور ان کی ایک جماعت پیاسی مرگئی۔ آخر ہزاروں تکلیفیں اٹھا کر وہ کوفہ کے راستے پر نکلے، معتضد کو ان کے آنے کی اطلاع ملی تو صاحب الجیش محمد بن سلیمان نے کوفہ میں ان کا استقبال کر کے ان کے نام خلیفہ کے پاس بھیجے، اور کوفہ سے ان کے لئے وظائف مقرر کئے۔ جب یہ لوگ بغداد پہنچے تو معتضد نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور طعام، وظائف اور خیمے ان کے پاس بھیجے۔ قواد کو گھوڑے زین اور لگام اور باقی آدمیوں کو خلعتوں سے سرفراز کیا۔ اب تلف ہونے کے بعد ان کی تعداد صرف ساٹھ رہ گئی تھی۔ اس واقعے کا اثر جو آلِ طولون پر پڑا اس کا اندازہ ہم اس طرح کر سکتے ہیں کہ ۲۹۱ھ میں جب خلیفہ مکتفی نے قرامطہ کے خلاف فوجیں بھیجی ہیں تو خاقان المفلحی اور محمد بن لجور ان جنگوں میں حصہ لے رہے تھے۔[۲۴۰] اس دوران میں مصر سے دور طغج بن جف حاکم دمشق اور ابن طغان حاکم ثغور نے جیش کی اطاعت سے انحراف کیا اور اس کا نام خطبوں سے حذف کر دیا۔ یہ ۲۸۳ھ کا واقعہ ہے۔ اُدھر جو قواد اور امراء مصر میں باقی رہ گئے تھے انھوں نے جمع ہو کر تمام حالات پر غور کیا، اور یہ فیصلہ کیا کہ جیش جیسا شخص مسلمانوں کے امور کا والی بننے کے قابل نہیں ہے۔ لیکن کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے۔ ان درباری جھگڑوں کے متعلق ابن تغری بردی[۲۴۱] نے تین روایتیں بیان کی ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ سب جیش کے بہی خواہ تھے۔ لیکن اس بہی خواہی کے باوجود ہر شخص اپنا بھلا کرنا چاہتا تھا۔ آخری نتیجہ یہ نکلا کہ فوج میں غدر ہوا، اور سپاہیوں نے جیش پر ہجوم کر کے مطالبہ کیا کہ وہ حکومت سے برطرف ہو جائے اور اس کے چچا نصر کو اس کی جگہ حکمران بنایا جائے۔ جیش کے کاتب، یا جیسا کہ مسعودی نے لکھا ہے اُس کے وزیر، علی بن احمد المادرائی نے ایک دن کی مہلت مانگی۔ رات کو جیش نے نصر اور ایک اور چچا کو قتل کرا دیا، اور صبح کو جب فوج جواب کے لئے حاضر ہوئی تو ان کے سر یہ کہہ کر سپاہیوں کے سامنے پھینک دئے گئے کہ لو یہ تمہارے امیر ہیں۔ اس پر فوج نے یک بارگی دھاوا کر کے اُس کی والدہ کو قتل

---

[۲۴۰] طبری ج ۱۱۔ ص ۳۸۷ [۲۴۱] النجوم الزاہرہ ج ۲۔ ص ۹۸-۱۰۱

کر دیا، اس کا گھر لوٹ لیا اور جلا ڈالا، اور اُس کے بھائی ہارون کی حکومت کا اعلان کر دیا۔ پھر علی بن احمد الماورائی کی تلاش ہوئی، اور اُسے بھی قتل کیا گیا۔ جیش کی خلع کا واقعہ ۱۰ر جمادی الآخر ۲۸۳ھ کو پیش آیا۔ چند دن کے بعد جیش کو قید خانے میں قتل کیا گیا[۲۴۲]۔ اس کا زمانۂ ولایت ۹ مہینے اور بارہ دن ہے۔

۱۰ر جمادی الآخر ۲۸۳ھ کو ابوموسیٰ ہارون اپنے بھائی جیش کا جانشین ہوا۔ اس کی کوئی مخالفت نہیں کی گئی، بلکہ سب نے متفقہ طور پر اُسے حکمران تسلیم کیا، اور ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ فوج نے عطا کا مطالبہ نہیں کیا[۲۴۳]۔ اب اختلال ختم ہو کر پھر ایک مرتبہ ملک کو امن چین نصیب ہوا۔ ہارون بھی جیش کی طرح ناتجربہ کار تھا، اور تمام امور حکومت پر جعفر بن اُبالی (یا ابن اَبا) جو احمد اور خمارویہ کے زمانے میں بااختیار رہ چکا تھا، حاوی اور مستولی تھا۔ اس نے ربیعہ بن احمد بن طولون کو حکم دیا کہ وہ مع اپنے حرم اور اہل و عیال کے ساتھ اسکندریہ میں رہے۔ وہاں جند کے اس حصے نے جو ہارون کے خلاف تھا ربیعہ کو سمجھایا کہ حکومت دراصل اسی کا حق ہے، اور ربیعہ بھی ان کے کہنے میں آگیا۔ باوجود ذاتی تہور کے آخر وہ گرفتار ہوا، اور اُسے چابکوں کی سزا دی گئی جس سے جاں بر نہ ہو سکا۔ اب مصر میں امن و امان تھا۔ ہارون کی حکومت مستقل ہو گئی تھی۔ مگر مصر کے باہر حالات بدستور خراب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ دمشق میں طُغج بن جُف کی مخالفت جاری تھی۔ آخر ابن ابالی نے احمد بن طولون کے غلام بدر الحمامی

۲۴۲ه النجوم الزاہرہ ج ۲۔ ص ۹۸۔۱۰۱ + ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۸ + طبری ج ۱۱۔ ص ۹۴ + طبری اور ابوالفدا (ج ۲۔ ص ۵۷) نے بیان کیا ہے کہ اسی ہنگامے میں جیش قتل ہوا تھا۔ الکندی ص ۲۴۱، ۲۴۲ + مروج الذہب ج ۲۔ ص ۴۵۲ + جیش کی جانشینی سے اس کی موت تک حساب لگایا جائے تو پورے نو مہینے اور بارہ دن نہیں ہوتے۔ لیکن مورخ اس پر متفق ہیں کہ اس کی مدت حکومت اتنی ہی تھی۔

۲۴۳ه ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۹ + ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۱۰۶۔۱۱۸ + الکندی ص ۲۴۲ +

اور حسن بن احمد المادرائی کو وہاں بھیجا، اور انجام کار یہ تصفیہ ہوا کہ طغج بن جف کو بدستور دمشق کا حاکم رہنے دیا جائے۔ اس کے علاوہ ان دونوں نے دوسرے اعمال پر بھی ہارون کی طرف سے عامل مقرر کئے۔ لیکن اب مصر میں ابن ابالی کی وجہ سے فتنے شروع ہوئے۔ بدر الحمامی، فائق اور صافی تین امراء کو تشویش پیدا ہوئی، اور وہ ابن ابالی سے بیزار ہو کر ملک کے مختلف حصوں پر قابض اور متصرف ہو گئے۔ یہ تشویش اس وجہ سے اور بڑھی کہ ابن ابالی معمولی شکائیتیں کر کے ہارون کے درباریوں کو قتل کرا رہا تھا۔ بالآخر ایک معمولی درجے کے قائد کو ترقی دے کر اس نے اُسے بدر الحمامی کے برابر بنا دیا۔ اس واقعے سے یہ لوگ اور بھی ناراض ہو گئے، اور جب صافی کو مصر سے رملہ جلاوطن کیا گیا تو یہ ناراضگی بالکل مکمل اور پختہ ہو گئی۔[۲۴۴]

یہ واقعات ۲۸۴ھ کے ہیں، جب انھیں امراء کی ناراضگی کی وجہ سے ہارون برابر کمزور ہوتا جا رہا تھا اور مملکت میں اختلال واقع ہو رہا تھا۔[۲۴۵] طغج بن جف ہارون کی طرف سے ابھی تک دمشق کا والی تھا۔[۲۴۶] طرسوس کے حالات ہم بیان کر چکے ہیں کہ کس طرح وہاں برابر انقلاب برپا ہو رہے تھے۔ ۲۸۴ھ میں یہ کیفیت ہوئی کہ اہل طرسوس نے ہارون کے والی کو نکال دیا، اور یہ بھی دھمکی دی کہ جو کوئی والی ہارون کی طرف سے آئے گا اس کے ساتھ یہی سلوک ہوگا۔ ہارون نے چاہا کہ خمارویہ کی طرح وہ بھی تلطف اور مدارات سے انھیں زیر کر لے۔ مگر یہ بھی ممکن نہ ہوا، اور اسی سنہ میں اہل طرسوس نے حکومت (سلطان) کو لکھا کہ ان کے لئے کوئی والی مقرر کر دیا جائے۔ کیونکہ ان کے شہر میں کوئی والی نہیں ہے (ان بلدھم بغیر والی)۔ خلیفہ معتضد نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ۱۲ ربیع الاول ۲۸۵ھ کو اہل طرسوس کی یہ استدعا منظور کر کے ابن الاخشاذ کو وہاں کا والی مقرر کر دیا۔[۲۴۶] اس کا

---

۲۴۴ ابو الفداء ج ۲۔ ص ۵۸ ۲۴۵ ایضاً

۲۴۶ طبری ج ۱۱۔ ص ۳۵۳، ۳۶۲ +

مطلب یہ تھا کہ ثغور پر ہارون کا قبضہ نہیں رہا۔ اب ہارون کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ باضابطہ طور پر ثغور سے دست بردار ہو جائے۔ چنانچہ ۲۸۵ھ میں اُس نے وصیف قاطرمیز کی سرکردگی میں مصری قواد کا ایک وفد خلیفہ کی خدمت میں بھیجا اور درخواست کی کہ مصر وشام اُسے عطا کر دئے جائیں اور قنسرین، عواصم، دیار ربیعہ اور دیار مضر سے وہ دست بردار ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ بھی وہی مراعات برتی جائیں جو اُس کے باپ خمارویہ کے ساتھ مرعی رکھی گئی تھیں۔ یہ درخواست منظور کی گئی، اور ہارون نے وعدہ کیا وہ سالانہ چار لاکھ پچاس ہزار دینار بغداد کے خزانے میں ادا کرتا رہے گا۔ یہ شرائط طے کر ۲۸۶ھ میں خلیفہ کے خادم بدر القدامی اور عبد اللہ بن فتح مصر پہنچے۔ اسی سال ان کی تکمیل کی گئی اور ہارون کو خلعت عطا کی گئی۔ جمادی الاول میں یہ تمام باتیں تکمیل کو پہنچیں اور ۲۳ جمادی الآخر ۲۸۶ھ کو ان صوبہ جات کی حوالگی عمل میں آئی، اور انھیں خلیفہ کے عمال کے سپرد کیا گیا۔ معتضد نے اپنے بیٹے علی المکتفی کو ان علاقوں کا والی مقرر کیا۔[۲۴۷]

اب حالت یہ تھی کہ ۲۸۶ھ میں ہارون کی حکومت تو صرف مصر و شام تک محدود رہ گئی تھی، مگر سالانہ رقم ادا شدنی میں اضافہ کر دیا گیا تھا، اور خمارویہ کے زمانے کے برعکس اس نئی درخواست کو منظور کرتے وقت یہ کہیں ذکر نہیں کیا گیا تھا کہ آل طولون کی ولایت تیس برس یا اس سے کم عرصے کے لئے برقرار رکھی جائے گی۔ لہذا آل طولون کے لئے حالات اب بہت ہی مخدوش تھے کہ ۲۸۹ھ دو اہم واقعات پیش آئے۔ اس سال ربیع الآخر میں خلیفہ معتضد کا انتقال ہوا، اور علی المکتفی اس کا جانشین ہوا۔ اس سے بھی بڑا انقلاب یہ ہوا کہ ۲۸۹ھ ہی میں قرامطہ شام میں ظاہر ہوئے[۲۴۸]۔ ہارون کے والئ دمشق طغج بن جف نے

[۲۴۷] طبری ج ۱۱۔ ص ۳۶۳، ۳۶۴ + ابو الفداء ج ۲۔ ص ۵۸ + ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۶۲، ۱۶۳ + النجوم الزاہرہ ج ۲۔ ص ۱۲۵ +

[۲۴۸] ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۱۱۳، ۱۳۴۔۔۔۱۳۷ + ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۰۹ + ابو الفداء ج۔ ص ۵۹ + طبری ج ۱۱۔ ص ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۹۰ +

یہ غلطی کی کہ قرامطہ کے اس ظہور کو عربوں کا معمولی سا خروج سمجھ لیا، اور کافی تیاری کے بغیر ان کا مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔ ہارون نے فوراً بدر الحمامی اور ایک قائد کے ماتحت ایک زبردست فوج شام بھیجی۔ اس کو اتنی کامیابی ضرور ہوئی کہ انھوں نے قرمطی سردار کو قتل کر دیا لیکن فساد برابر جاری رہا، کیونکہ ان لوگوں نے مقتول سردار کی جگہ اُس کے بھائی کو اپنا سرگروہ بنا لیا۔ سنہ ۲۸۹ھ اور سنہ ۲۹۰ھ میں یہ جنگیں جاری رہیں، اور ہر موقع پر یحییٰ بن زکرویہ بن مہرویہ کے قرامطہ نے حکومت کی فوجوں کو شکست دی، بلکہ خود دمشق کا بھی محاصرہ کر لیا، اور طغج بن جف ان کا مقابلہ نہ کر سکا۔ بالآخر سنہ ۲۹۰ھ میں یحیی بن زکرویہ کو باب دمشق پر قتل کیا گیا۔[۲۴۹]

بالآخر جب حالات کسی طرح نہ سنبھلے تو سنہ ۲۹۰ھ میں مکتفی نے صاحب الجیش محمد بن سلیمان کو فوج دے کر شام بھیجا اور اس فوج نے قرامطہ کی شورش فرو کی۔ اس کے بعد سنہ ۲۹۱ھ ہی میں مکتفی نے محمد بن سلیمان اور قواد کی ایک جماعت کو خلعتیں عطا کر کے حکم دیا کہ وہ مصر و شام جائیں اور یہ اعمال ہارون سے لے لیں۔[۲۵۰] آل طولون کے خلاف حالات کے اس طرح پلٹا کھانے کی کوئی وجہ صریحاً بیان نہیں کی گئی لیکن اس کے مختلف اسباب قرار دئے جا سکتے ہیں۔ ابن الاثیر[۲۵۱] نے لکھا ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہارون قرامطہ کی شورش فرو کرنے سے عاجز رہا تھا۔ الیافعی[۲۵۲] نے بالکل صراحت سے بیان کیا ہے کہ "خرج صاحب مصر هارون بن خمارویه عن الطاعة"۔ خواہ قرامطہ کے خلاف اظہار عجز ہو یا خلیفہ کی اطاعت سے انحراف دونوں اسباب ایسے ہو سکتے تھے کہ جن کی بنا پر مکتفی مصر پر فوج کشی کر دے لیکن یہ بھی یاد

۲۴۹ے ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۱۱۳ +

۲۵۰ے ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۷۵ +

۲۵۱ے تاریخ کامل۔ ج ۷۔ ص ۱۷۵ +

۲۵۲ے مراٰۃ الجنان۔ ج ۲۔ ص ۲۲۰ +

رکھنا چاہیئے کہ خلفاء عباسیہ نہ بھولتے تھے اور نہ معاف کرتے تھے۔ معتمد کے زمانے سے آل طولون کے خلاف کاروائیاں جاری تھیں، مگر خلافت کے کارکنوں کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اب قرامطہ کے مقابلے میں ہارون کا عاجز رہنا کافی ثبوت تھا اس امر کا کہ انھیں برباد کردینا آسان ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ مصر میں درباری سازشیں، اور امراء کا مختلف گروہوں میں تقسیم ہوکر ان کی ہارون سے بے زاری بھی اس فوج کشی کا سبب ہوسکتی تھی۔ چنانچہ ابن الاثیر[۲۵۳] نے لکھا ہے کہ قرامطہ کا قلع قمع کرنے کے بعد محمد بن سلیمان شام سے عراق واپس ہونے کا ارادہ کررہا تھا کہ فائق اور بدر الحمامی کے خطوط اُسے ملے کہ وہ اگر بلاد مصر پر حملہ کرے تو وہ فتح میں اُسے مدد دیں گے۔ محمد بن سلیمان نے بغداد آکر خلیفہ کو اس کی اطلاع دی اور اُس نے فوراً اس سے فائدہ اُٹھایا۔

محمد بن سلیمان دیار مصر کے شہر رقہ کا رہنے والا تھا۔ جوانی کے زمانے میں تلاش معاش میں مصر آیا، اور چند روز سرگرداں رہنے کے بعد احمد بن طولون کے غلام لُولُو کا کاتب مقرر ہوا۔ احمد بن طولون نے بھی اُس پر احسان کیا۔ لیکن جب اُسے لُولُو پر شبہ ہوا تو اس نے نہ صرف محمد بن سلیمان بلکہ اُس کے اعزاء و اقرباء کا مال و اسباب ضبط کرلیا۔ محمد بن سلیمان جان کے خوف سے بغداد بھاگ آیا۔ یہاں اس کی ترقی مسدود نہیں ہوئی بلکہ اُس کی عزت و توقیر میں اضافہ ہوا۔ معتمد اور پھر معتضد کے زمانے میں اسے بڑی بڑی خدمتوں پر مامور کیا گیا، یہاں تک کہ وہ جیش کا کاتب مقرر ہوا، اور مکتفی کے زمانے میں "اعظم قواد" میں اُس کا شمار ہونے لگا۔ اس دوران میں وہ آل طولون کو نہیں بھولا، بلکہ مسلسل خلفاء کو اُن کی طرف متوجہ کرتا رہا۔ آخر ہارون کے زمانے میں اُسے موقع ملا اور اُس نے مکتفی کو آمادہ کرلیا کہ مصر پہ حملہ کیا جائے[۲۵۴]۔ چنانچہ رجب ۲۹۱ھ وہ بارہ ہزار فوج لے کر بلا تاخیر

---

[۲۵۳] تاریخ کامل ج ۷۔ ص ۱۷۶ +

[۲۵۴] ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۱۰ +

بسرعت تمام مصر روانہ ہو گیا۔ اور شام و فلسطین پر مستولی ہونے کے بعد محرم ۲۹۲ھ میں حدودِ مصر میں پہنچ گیا۔[۲۵۵] حملے کا انتظام اس طرح کیا گیا تھا کہ بری فوج محمد بن سلیمان کے ماتحت تھی، اور مازیار کے غلام امیر البحر دمیانہ کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ کشتیوں کے ذریعے دریائے نیل میں پہنچ کر مصر (فسطاط) کے سامان رسد (مواد) کے راستے مسدود کر دے۔ دمیانہ نے یہ فرض انجام دیا، اور اہل مصر اپنی زندگی سے تنگ آ گئے۔ فائق اور بدر الحمامی پہلے ہی محمد بن سلیمان کو مدد کی امید دلا چکے تھے۔ اب اس نے پھر اُن لوگوں سے خط و کتابت کی، اور بدر الحمامی پہلا مصری امیر تھا جو اس سے مل گیا۔ اس شخص کے اس طرح محمد بن سلیمان کے ساتھ شریک ہو جانے سے اہل مصر کی رہی سہی اُمید بھی جاتی رہی، اور باقی ماندہ قواد بھی امان لے لے کر محمد بن سلیمان کے ساتھ شریک ہونے لگے۔ یہ حالات دیکھ ہارون بھی یکم ذی الحجہ ۲۹۱ھ کو اپنی باقی ماندہ فوج لے کر فسطاط سے نکلا، اور مصر و شام کے سرحدی شہر عباسہ میں قیام کیا۔ یہاں سے اُس نے فائق اور بدر کو لکھا کہ وہ اس کے وفادار رہیں اور وصیف قاطرمیز کو خصیب البربری اور حماد الخیشی کے ساتھ جنگی جہاز دے کر حکم دیا کہ وہ دریائے نیل میں دمیانہ کو روکیں۔ تنیس میں وصیف قاطرمیز کا مقابلہ دمیانہ سے ہوا، جس میں ہارون کے امیر البحر کو شکست ہوئی اور دمیانہ نے تنیس میں داخل ہو کر اہل شہر کو امان دی اور سکون پیدا کیا۔[۲۵۶]

ایک طرف یہ ہو رہا تھا، اور دوسری طرف ہارون اپنے اعمام اور اہل و عیال کو لئے عباسہ میں مقیم تھا۔ لیکن بیکاری کی وجہ سے فوج کے سپاہی روز بروز بددل ہوتے جا رہے تھے، اور لازمی طور پر شر و فساد کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ اس کے علاوہ فوج کی تعداد

۲۵۵ھ ابن الاثیر ج ۷ ص ۱۷۵ + ابن خلدون ج ۴ ص ۳۱۰ + الکندی ۲۴۲ +

۲۵۶ھ ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۷۶ + ابن خلدون ج ۴ ص ۳۱۰ + ابن تغری بردی ج ۲ ص ۱۱۶ + الکندی ص ۲۴۴۔۲۴۶ +

میں بھی برابر کمی ہوتی جارہی تھی۔ لیکن ہارون دنیا وما فیہا سے غافل لہو و لعب میں مشغول تھا۔ اب یہاں ابن تغری بردی[257] نے تین روایتیں بیان کی ہیں۔ ہارون کے اعمام کو اپنی اپنی جان کا خوف تھا[258]۔ آخر عدی اور شیبان ابناء احمد بن طولون نے اُس کے قتل کا فیصلہ کیا، اور ۱۹ صفر ۲۹۲ھ کو اُسے مدہوشی کی حالت میں قتل کر دیا۔ ایک اور روایت سبط بن الجوزی کی کتاب سے نقل کی گئی ہے کہ جو فوج اب ہارون کے پاس باقی رہ گئی تھی اس کے سپاہیوں میں عصبیت کی وجہ سے مختلف اقوام کے گروہوں میں فساد اور جنگ تک نوبت پہنچی۔ ہارون بذات خود اس شورش کو فرو کرنے کے لئے نکلا اور مغاربہ کے ایک سپاہی کے تیر سے قتل ہوا۔ تیسری روایت یہ ہے کہ مصر کے قریب پہنچ کر محمد بن سلیمان نے ہارون کو لکھا کہ خلیفہ مکتفی نے اسے مصر کا حاکم مقرر کیا ہے۔ اور ہارون کو دربار خلافت میں حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔ ہارون جنگ کا فیصلہ کر چکا تھا، مگر قواد کو یہ شبہ ہوا کہ وہ آخر میں خیانت کرکے انھیں چھوڑ دے گا۔ اس لئے ایک خادم نے اُسے قتل کر دیا۔

۲۰ صفر ۲۹۲ھ کو ابو المقانب شیبان بن احمد بن طولون ہارون کا جانشین ہوا، اور ۲۳ کو واپس فسطاط پہنچا۔ لیکن خمارویہ کے ان قواد کو جو اب تک باقی رہ گئے تھے، اور جن میں طغج بن جف بھی شریک تھا، ہارون کا قتل ناگوار گزرا۔ انھوں نے حسین بن حمدان بن حمدون کو، جو محمد بن سلیمان کے ممتاز مشیروں میں تھا، لکھا کہ ان کے لئے امان حاصل کرے، اور اُسے فسطاط آنے پر آمادہ کرے۔ اب محمد بن سلیمان کے لئے راستہ بالکل صاف تھا۔ ایک طرف سے تو وہ فسطاط کی طرف بڑھا اور دوسری طرف سلخ صفر ۲۹۲ھ کو دمیانہ دریائے نیل کے راستے سے فسطاط پہنچا۔ یکم ربیع الاول کو شیبان نے آخری جد و جہد کے لئے عین شمس میں

---

۲۵۷ النجوم الزاہرہ۔ ج ۳ ص ۱۱۶۔ ۱۱۹ + ۱۴۱۔

۲۵۸ الکندی ص ۲۴۶ +

اپنی چھاؤنی قائم کی۔ لیکن اب لوگ عام طور پر امان حاصل کرکے محمد بن سلیمان کے ساتھ شریک ہوتے جارہے تھے۔ شیبان نے مقابلہ بے سود جان کر اپنے اور اپنے بھائیوں کے لئے امان طلب کی اور جمعرات کے دن یکم ربیع الاول ۲۹۲ھ کو محمد بن سلیمان فسطاط میں داخل ہوا۔[۲۵۹] شیبان کی مدت حکومت صرف بارہ دن ہے۔

فسطاط میں داخلے کے بعد محمد بن سلیمان کی فوج میں جو خراسانی عرب شریک تھے انھوں نے عوام الناس کے گھروں میں گھس کر انھیں لوٹا، اور ہر قسم کے جرائم و معاصی کے مرتکب ہوئے جو قیاس میں آسکتے ہیں: "وفعلوا فی مصر مالا یحل اللہ من ارتکاب المأثم"۔[۲۶۰] فتح کی خبر جب بغداد پہنچی تو وہاں سے حکم آیا کہ تمام آل طولون کو گرفتار کرلیا جائے۔ ان کی تعداد دس سے بیس تک بیان کی گئی ہے۔ انھیں بغداد لایا گیا اور ابن صاعد کے گھر میں قید کردیا گیا۔ صرف اسی پر اکتفا نہ کرکے احمد بن طولون کا عظیم الشان میدان جلا دیا گیا۔ بدر الحمامی کو دمشق کا والی مقرر کیا گیا، اور ابن ابالی کو گرفتار کرکے محمد بن سلیمان نے اس سے پانچ لاکھ دینار وصول کئے۔ لیکن آل طولون —— لم یبق بمصر منھم احد یذکر فخلت منھم الدیار وعفت منھم الآثار وتعطلت منھم المنازل وحل بھم الذل بعد العز والتطرید والتشرید بعد اجتماع الشمل ونضرۃ الملك ومساعدۃ الایام

فاصبحوا لاتری الامساکنھم کانھا من زمان غابر ذھبا[۲۶۱]

---

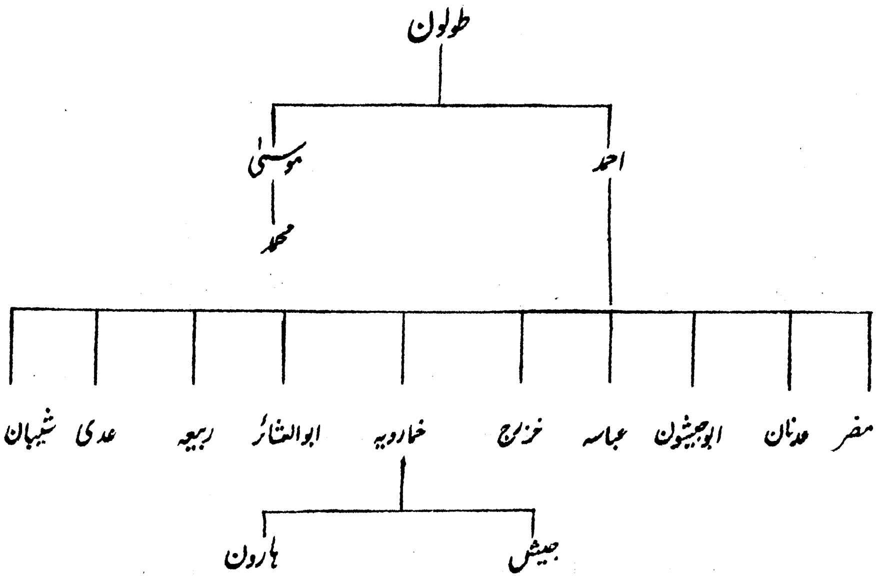
[۲۵۹] الکندی ص ۲۴۶، ۲۴۷ + کتاب التنبیہ والاشراف ص ۳۷۳ +

[۲۶۰] ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۱۴۵ +

[۲۶۱] ابن الاثیر ج ۷۔ ص ۱۷۶ + ابن خلدون ج ۴۔ ص ۳۱۰ + ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۲۴۸ - ۲۴۹ + طبری ج ۱۱۔ ص ۳۹۲ +

اس طرح سینتالیس سال اور چند مہینے کی ولایت کے بعد آل طولون کا یہ عبرتناک انجام ہوا۔ بیکر[262] نے تعجب ظاہر کیا ہے۔ اور اس کے لئے یہ سیاسی مظہر ناقابل فہم ہے کہ کس طرح خلافت عباسیہ کی تباہی کے بغیر طولونی سلطنت قائم ہوگئی۔ لیکن اوپر کے صفحات میں ہم نے دیکھا ہے کہ طولونی "سلطنت" کبھی قائم ہی نہیں ہوئی، اور باوجود خلافت کی ابتر حالت کے قانون اور سیاسی دستور برابر اپنا کام کر رہے تھے، اور آل طولون خلیفہ کے مقرر کئے ہوئے والیان مصر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ ہر فریق خلاف قانون قدم اٹھانے سے محترز تھا، اور آل طولون میں خودمختاری کا شائبہ تک نہیں تھا۔ خلافت و سلطنت کا سوال کم از کم مصر میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ ایسی حالت میں سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم بیکر جیسے عالم کے تعجب پر تعجب کا اظہار کریں۔

آل طولون کا شجرۂ نسب



---

[262] بائی ژانگ ص ۱۸۹ +

لٹریچر:

ابن الاثیر، ابوالحسن علی بن عبدالکرم محمد بن عبدالکریم بن عبدالواحد الشیبانی المعروف بہ ابن الاثیر الجزری الملقب بعزالدین: تاریخ کامل۔ ج ۷۔ مطبوعہ مصر۔

ابن تغری بردی، جمال الدین ابی المحاسن یوسف ابن تغری بردی الاتابکی: النجوم الزاہرہ فی ملوک مصر والقاہرہ۔ لیدن ۱۸۵۵ء۔ ج ۱، ۲ +

ابن ایاس، محمد بن احمد بن ایاس الحنفی المصری: بدائع الزہور فی وقائع الدہور جلد اول بولاق ۱۳۱۱ھ۔

ابن عساکر، ابوالقاسم علی بن حسین بن ہبۃ اللہ بن عبداللہ بن الحسین ابن عساکر الشافعی: تاریخ الکبیر ج ۲، ۴، ۵۔ دمشق ۱۳۳۲ھ۔

ابن خلدون، عبدالرحمٰن بن خلدون المغربی: کتاب العبر و دیوان المبتدأ والخبر۔ طبع بولاق۔ ج ۳، ۴۔

ابن الطقطقیٰ، محمد بن علی بن طباطبا المعروف بہ ابن الطقطقیٰ: الفخری۔ مصر ۱۳۳۹ھ۔

ابن خلکان، قاضی احمد الشہیر بہ ابن خلکان: وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان۔ ج ۱۔ مصر ۱۳۱۰ھ۔

ابن حوقل، ابوالقاسم ابن حوقل: کتاب المسالک والممالک۔ لیدن ۱۸۷۲ء۔

ابن جبیر: رحلۃ۔ مصحح ولیم رائٹ (اوقاف گب)

ابوالفداء، عمادالدین اسماعیل ابی الفداء: کتاب المختصر فی اخبار البشر۔ ۴ جلدین۔ مصر ۱۳۲۵ھ۔

السیوطی: جلال الدین السیوطی الشافعی: تاریخ الخلفاء۔ مصر ۱۳۵۱ھ۔

———— حسن المحاضرة فی اخبار مصر والقاہرہ۔ جلد اول ودوم مصر ۱۳۲۱ھ۔

الشریف الادریسی: صفة المغرب وارض سودان ومصر والاندلس۔ لیدن ۱۸۶۶ء۔

الطباخ الحلبی، محمد راغب بن محمود بن ہاشم الطباخ الحلبی: اعلام النبلاء بتاریخ حلب الشہباء۔ جلد اول حلب ۱۳۴۲ھ۔

الطبری، ابو جعفر محمد بن جریر الطبری: تاریخ الرسل والملوک۔ ج ۱۱ مطبوعہ مصر۔ الطبعة الاولیٰ۔

القلقشندی، ابو العباس احمد القلقشندی: صبح الاعشیٰ۔ جلد ۳۔ قاہرہ ۱۳۳۲ھ۔

الکندی، ابو عمر محمد بن یوسف الکندی المصری: کتاب الولاة (اوقاف گب) بیروت ۱۹۰۸ء۔

محمد کرد علی: خطط الشام۔ جلد اول۔ دمشق ۱۳۴۳ھ۔

المسعودی: ابو الحسن علی بن الحسین بن علی المسعودی: کتاب التنبیہ والاشراف۔ لیدن ۱۸۹۴ء

———— : مروج الذہب ومعادن الجوہر۔ مصر ۱۳۰۳ھ۔

المقدسی، شمس الدین ابی عبد اللہ محمد بن احمد بن ابی بکر البنّار الشامی المقدسی۔ المعروف بالبشاری: احسن التقاسیم فی معرفة الاقالیم۔ لیدن ۱۸۷۷ء۔

المقریزی، تقی الدین احمد بن علی عبد القادر بن محمد المعروف بالمقریزی:

کتاب الخطط والآثار ۔ ۲ ۔ جلدیں بولاق ۱۲۷۰ھ ۔

ناصر خسرو : سفر نامہ ۔ مطبعۂ کاویانی ۔ برلین ۱۳۴۱ھ ۔

الیافعی، ابو عبداللہ بن اسعد بن علی بن سلیمان عفیف الدین الیافعی
مرأة الجنان وعبرة الیقظان ۔ چار جلدیں حیدر آباد دکن ۱۳۳۷ھ

الیعقوبی، احمد بن ابی ایوب جعفر بن وھب ابن واضح الکاتب العباسی
المعروف بالیعقوبی : تاریخ یعقوبی ۔ ج ۲ ۔ لیدن ۱۸۸۳ء ۔

Becker, Carl H., Beitrage zur Geschichte Agyptens unter den Islam. Strassburg, 1903. (Die Stellung der Tuluniden).

Creswell, K.A.C., Early Muslim Architecture (Umayyads, Early Abbasids, and Tulunids). Part II. Oxford, 1940.

Goldziher, Ignaz, Muhammedanisohe Studien, 2 Vols. Halle, 1890.

Lane-poole, Shanely, History of Egypt in the Middle Ages. London, 1914.

Le Strange. Guy. Palestine under the Muslims. London, 1890.

Weil, Gustao, Geschichte der Chaliphen, vol. II. Mannheim, 1848.

جمہور کا زمانہ

از

جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب، پرنسپل جامعہ ملیہ، دہلی

(یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو سے ۲۲ر جنوری ۱۹۴۲ء کو نشر کی گئی تھی)

آدمی نے اس دنیا میں جب سے قدم رکھا ہے پیٹ کی چاکری سے فرصت کبھی نہیں ملی۔ اس کی خاطر ہمیشہ طرح طرح کے جتن کرنے پڑے ہیں۔ بعض لوگ تو کہتے ہیں کہ اسی جتن کرنے سے اس کی زندگی کا کوئی خاص رنگ بنتا ہے۔ اسی سے اس کی سماج کا کوئی خاص ڈھنگ قایم ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ اسے نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ زندگی کی شکل آدمی کے خیالوں سے بنتی ہے۔ اس کے ارمانوں اور آرزوؤں سے بنتی ہے۔ یہ پیٹ کی فکر چاکر ہے۔ زندگی آقا ہے۔ وہ غمِ روزگار سے غمِ عشق کو اونچا درجہ دیتے ہیں۔ لیکن پھر بھی غم روزگار سے آزاد کون ہے۔ یہ پیٹ کا چکر، یہ رہنا سہنا، یہ کھانا پینا، خادم ہو کہ آقا سبب ہو کہ نتیجہ، رہیں اس کے چکر میں سب۔ ہاں اس کا انداز کبھی کچھ ہوتا ہے کبھی کچھ۔ اور اس میں عام انسانوں کے میلانوں، ان کے ارادوں، ان کی عادتوں ان کی فکروں اور بے فکریوں، ان کی طبیعت کے جمود اور ان کے مزاج کی طغیانیوں کا بڑا اثر ہوتا ہے۔

مثلاً دنیا کی تاریخ میں چند آخری صدیوں کو چھوڑ دیجئے اور سرمایہ داری سے پہلے کے دور پر نظر ڈالیئے تو آدمی کی ساری معاشی زندگی میں باوجود اس کی رنگارنگی کے ایک بات برابر نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ آدمی ابھی قدرتی آدمی ہے۔ ایسا جیسا کہ خدا نے اسے

بنایا تھا۔ ابھی اپنے کو اپنے سر پر نہیں سادھتا۔ نہ دونوں ہاتھوں سے دوڑتا یا اڑتا ہے۔ بلکہ اپنے پیروں پر جم کر کھڑا ہوتا ہے اور ابھی انھیں سے چلتا پھرتا ہے۔ بیشک یہ بھی پیٹ کے چکر میں گھرا ہوا ہے۔ مگر اس چکر کا مرکز ابھی یہ خود ہی ہے۔ اس کے معاشی آرتھک کاموں کا تعلق ابھی اسی کی ضرورتوں اور احتیاجوں سے ہے۔ کوئی پوچھے کہ احتیاج کی بھلا حد کیا۔ سو یہ قدرتی انسان اسی کی حد بھی یوں مقرر کر لیتا ہے کہ ہر فرقہ اِن احتیاجات کا یقین نہیں کرتا بلکہ زمانے کے ساتھ وہ گروہ کر دیتا ہے جس میں اسے زندگی کاٹنی ہے۔ بس ہم چشموں کی طرح زندگی گزر جائے۔ یہ اس کا ارمان ہے۔ بیشک مختلف گروہوں کا طور طریقہ، رہن سہن الگ الگ ہے۔ امیر کا اور ہے، اور شریف کا اور۔ تاجر کا اور۔ دستکار کا اور، کسان کا اور۔ مگر سب کو اپنے اپنے گروہ کا معیار بھاتا ہے۔ جسے اس سے زیادہ کا لالچ ہو وہ عام کاروبار کو اس کے لئے کام میں نہیں لاتا۔ اِس فالتو دولت کی تلاش کاروبار سے باہر ہی کی جاتی ہے۔ کوئی گڑے خزانوں کے کھوج میں لگ جاتا ہے۔ کوئی جادو طلسمات اوراد و وظائف کی مدد سے دولت پانے کی راہیں نکالتا ہے۔ کوئی کیمیا بنانے لگتا ہے۔ کاروبار سے بس وہی حیثیت کے مطابق زندگی گزارنا مقصود ہے۔ کام چونکہ بس اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہے۔ اس بے حساب کتاب کا بھی کچھ بہت زور نہیں۔ بس تقریباً یہ کام چل جاتا ہے۔ کام کی رفتار میں کچھ بدحواسی نہیں۔ مزے مزے میں آہستہ آہستہ جلدی کا کام شیطان کا۔ چھٹی کا ذرا بہانا ملا۔ اور چھٹی۔ کام چونکہ شخصیت کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس لئے شخصی تجربہ اور روایت پر مبنی ہے۔ جیسے اوروں کو کرتے دیکھتے ہیں۔ اسی طرح کرتے ہیں جیسا بزرگوں سے ہوتا چلا آیا ہے، ویسا ہی برابر ہوتا ہے یہ نہیں کہ ضرورت بے ضرورت عقل پر زور دے دے کر نئی نئی تدبیریں سوچی جائیں۔ زندگی باوجود ساری تبدیلیوں کے ابھی قدرتی انسانی زندگی ہے۔ بوجھل، باوقار، پر سکون۔

لیکن انسانی دنیا میں اگر ساحل کا سا سکون ممکن ہے تو سمندر کا سا طوفان بھی

اس میں آسکتا ہے۔ نہ جانے کیا کیا اسباب ملے کہ معاشی زندگی کا یہ سکون بے تابی میں بدلا۔ جماعت ٹوٹی۔ اور فرد فرد ہوگئی۔ ضرورت کی جگہ نفع کا بھوت انسان کے سر پر سوار ہوگیا۔ چنگاریاں تو ظاہر ہے پہلے سے موجود ہونگی۔ مگر نہ جانے کیا ہوا چلی کہ یہ بھڑک اٹھیں روپئے کا لالچ۔ خالص روپئے کی آرزو۔ حوصلہ مندی، نئی نئی ایجادوں کا ولولہ، حساب کتاب پر زور، عقل کی فرمانروائی، سب نے مل کر وہ ذہنیت عام کردی، جس نے سرمایہ داری کے نفع پرست نظام کی بنا ڈالی۔ اور اسے دیکھتے دیکھتے سفری دنیا پر مسلط کردیا۔ روایت کی جگہ عقل نے لی۔ صنعت بھی عقلی بنی اور کام کرنے کے طریقوں میں ایک انقلاب برپا ہوگیا۔ نئی نئی کلیں نئے نئے اسلوب کار ایجاد ہوئے۔ زندہ فطرت چونکہ نامی قانونوں کی پابند ہے۔ اس پر وقت اور جگہ کی جو پابندیاں ہیں وہ اس نئی ہر آن منقلب صنعت پر گراں گزریں تو اس نے بیل اونٹ اور گھوڑے کی جگہ بھاپ اور بجلی سے کام لیا۔ لکڑی گئی۔ کوئلہ اور لوہا آیا۔ سرسوں کے تیل کی جگہ مٹی کے تیل نے لی۔ پھولوں کی جگہ عطر کوئلے سے نکلنے لگے۔ جہاں تک ہوسکا اس صنعت نے زندگی کو چھوڑ کر مردہ چیزوں سے رشتہ جوڑا۔ نفع طلبی کی ذہنیت اور اس انقلابی عقلی، غیر نامی صنعت نے ملکر دنیا کی کایا پلٹ دی۔ لاکھوں کروڑوں برس کی پونجی جو دنیا نے اپنے سینے میں چھپا رکھی تھی وہ اس نے کھود نکالی اور ساری دنیا میں بکھیر دی۔ آدمیوں کی تعداد میں اتنا اضافہ ہوا کہ یقین نہیں آتا۔ تجارت کو وہ فروغ ہوا کہ عقل حیران ہے۔ پہاڑ کٹے سمندر نپ گئے، ہوا پر قبضہ جم گیا۔ نفع کمانے کے لیے جس انہماک سے تریاق بیچا گیا اسی سے زہر۔ جیسے بیماروں کو تندرست بنانے کا سامان بنا۔ اسی طرح زندوں کو مارنے کے لیے اسلحہ۔ پھر اس خیال سے کہیں انسانیت کو اپنے اس جنون کا احساس نہ ہو جائے علم نے زندگی کے اس بحران کا ساتھ دیا اور تھپکی دی کہ جس طرح عالم افلاک میں سیارے اپنی راہ پر بلا روک ٹوک چلتے ہیں اور کوئی کسی سے ٹکراتا نہیں، اسی طرح انسانوں پر سے سب پابندیاں اٹھ جائیں۔ اور یہ سب اپنے اپنے نفع اور اپنی اپنی غرض کے پیچھے ہولیں تو

سب کی اس انفرادی خود غرضی سے ہی کل جماعت کی صلاح کا سامان ہو جائے گا۔ بے وقوف اور ناداں انسان کی مداخلتیں ہی اس قدرتی ہم آہنگی میں خلل ڈالتی ہیں۔ چنانچہ اپنے اپنے نفع کی فکر میں افراد، امیر اور غریب سب جماعتی بہبود سے بے فکر ہو گئے۔ اور سب نے اپنے بس بھر معاشی زندگی کے اس قمارخانے میں اپنی اپنی بازی لگائی۔

مگر یہ صورت زیادہ دن کیسے چل سکتی تھی جس نے کچھ کھویا اسی کو ہوش آیا۔ عوام کو جلد ہی اس کی خرابیاں بھی دکھائی دینے لگیں۔ ترقی کے ساتھ فلاکت نے بھی اپنا منہ دکھایا۔ اور اس ہم آہنگی میں مخالفتوں کی رگڑ بھی سنائی دینے لگی۔ انیسویں صدی کے وسط ہی میں یہ خیال عام ہو چلا تھا کہ سرمایہ داری کا یہ دیو اگر اسی طرح بے روک ٹوک اپنی تباہ کاریاں جاری رکھ سکا تو قیامت ہو جائے گی۔ نفع طلبی کے چکر میں پھنسنے تو پہلے ہی سب قسم کے لوگ تھے مگر ہوتے ہوتے سرمایہ داروں اور مزدوروں کی دو الگ صفیں ہو گئیں۔ دولت پیدا کرنے کا سازوسامان چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں جمع ہو گیا۔ کم سرمایہ کے کاروبار برباد ہو گئے اور خود مختار دستکار اور کسان بڑے سرمایہ داروں کے دست نگر ہو گئے۔ مختار تھوڑے سے رہ گئے، مجبور بے شمار ہو گئے۔ سستی مزدوری کے لیے عورتیں اور بچے بھی مشینوں پر لگائے گئے۔ گھر ٹوٹے، عزیز چھوٹے، بد اخلاقیوں کا ہجوم آدمیوں کے ہجوم کے ساتھ ساتھ بڑھا۔ یہ مصیبتیں تو تھیں ہی۔ اس عقل و فراست کے نظام کی بے عقلیاں بھی سامنے آنے لگیں۔ بازاروں کا چڑھنا اترنا، تجارتی بحرانوں کا تھوڑے تھوڑے عرصے بعد رونما ہونا۔ امیر اور غریب دونوں کی معاشی بنیادوں کو ہلا ہلا دیتا تھا۔ کاروبار کی دنیا گھڑی گھڑی اجڑتی اور پھر نئے سرے بستی تھی۔ ان عیبوں پر نظر پہنچی تو عوام نے اصلاح کی تدبیریں بھی شروع کیں۔ مزدوروں کی انجمنیں بنیں کہ وہ سرمایہ دار کے مقابلے میں بے بس نہ ہوں۔ اتحاد باہمی کی تحریک اٹھی اور اس نے بہت مفید کام انجام دیے۔ لیکن یہ سب جزوی تحریکیں تھیں۔ پورا مقابلہ نہ کر سکتی تھیں۔ کل مرض کے علاج کے طور پر اشتراکیت کا نسخہ تجویز ہوا۔ شروع میں

وعظ و تلقین و تبلیغ سے خیالات کے سدھار کی تدبیر ہوئی۔ مگر مثل ہے "لاتوں کے بھوت باتوں سے کب مانتے ہیں" ہوتے ہوتے اس تحریک نے خصوصاً کارل مارکس کے زیر اثر امیر و غریب، مزدور و سرمایہ دار کے پرے باندھ دئے۔ یہ تحریک چلی تو سب ملکوں میں لیکن بڑے پیمانے پر عملی تجربے کا موقع اسے انقلاب کے بعد روس میں ملا۔ اس تجربے کی خوبیوں اور خرابیوں کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ یہاں صرف اتنا جتانا ہے کہ سرمایہ داری نظام سے عوام کی بیزاری نے ایک بہت بڑے ملک میں ایک دوسرے نظام کی بنیاد ڈال دی۔ اس عملی تجربے کے نتایج کا صحیح اندازہ تو موافقوں اور مخالفوں کے مبالغے کی وجہ سے ورا دشوار ہے مگر ایک بات تو صاف سامنے ہے کہ اس نظام کے ماتحت بیس سال سے کم میں روس نے اپنے کو ایسا بنا لیا کہ آج جرمنی کی مہیب قوت کا نہایت بہادری سے مقابلہ کر رہا ہے۔ جرمنی کی بڑھتی ہوئی فوجوں کے سامنے یہ قوم جس طرح آہنی دیوار بن کر سینہ سپر ہوئی ہے، جس طرح اس سخت مصیبت میں بھی اس کے اندر ایک غدار (کوئزلنگ) پیدا نہیں ہوا، جس طرح وہ بیس سال سے بے روزگاری کی لعنت سے محفوظ رہی، جس طرح آج بھی اسے فاقے کی دھمکی نہیں دی جا سکتی، جس طرح ایک ابتدائی معاشی حالت سے اس نے اپنے کو زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ صنعتی ملکوں کا ہمسر بنا لیا، ان سب باتوں سے کم سے کم یہ تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کرنے اور کامیاب زندگی کرنے کا بس ایک ہی اسلوب سرمایہ داری نہیں ہے۔ بلکہ اگر کوئی جماعت اپنی ضروریات فراہم کرنے کے اصول پر اپنے کو منظم کرنا چاہے اور جدید صنعت کی مدد سے اس مقصد کی تکمیل کے درپے ہو تو وہ سرمایہ داری کی طبقہ واری تقسیم، اس کی افراتفری، اس کی بے ترتیبی اور بے نظمی اور اس کے آئے دن کے بحرانوں سے الگ رہ کر ایک مضبوط معاشی زندگی کی ایسی تنظیم کر سکتی ہے جو اپنے کو اس قابل جانے کہ اس کی حفاظت کے لیے سخت سے سخت دشمن کے مقابلے میں اس کا ہر مرد عورت اس کا بچہ بچہ اپنی جان کی بازی لگا دے۔

سرمایہ داری کے بنیادی اصولوں پر تنقید اشتراکی خیالات کی ترویج اور پھر انقلاب

روس کے بعد اشتراکیت کے عملی تجربے نے جنگ سے پہلے ہی بہت سے ملکوں کو اپنی معاشی زندگی میں اصلاح کی طرف متوجہ کیا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ کوئی ملک اس پر آمادہ نہ تھا۔ کہ اس نئی زندگی کے لئے اپنی بنی بنائی معاشی زندگی کو پہلے بالکل تباہ و برباد کردے۔ لیکن سب اس طرف مایل تھے۔ انقلاب بغیر مرکزی سیاسی قوت معاشی زندگی کو اپنے قابو میں لے اور عوام کے فائدے کو مدنظر رکھ کر اس زندگی کی سمت بدلے۔ جرمنی میں یہی ہوا، اٹلی میں یہی ہوا، ریاستہائے متحدہ امریکہ میں یہی ہوا۔ دوسرے ملکوں میں بھی قانون سازی کے ذریعے سرمایہ داری کی سختیوں کو زمانہ کی کوشش مدت سے جاری تھی۔ اور اس دبو کو طرح طرح سے جکڑنے کی صورتیں نکالی جا رہی تھیں۔ یہ ہو ہی رہا تھا کہ وہ تصادم شروع ہو گیا جس کے دھماکے آج خود ہمارے ملک کے دروازے کے پاس سنائی دیتے ہیں۔ سرمایہ داری کا نظام ایک حد تک خود اس تصادم کا بھی باعث ہے کہ اس کی بے حساب توسیع کے لئے کسی کو خام اجناس درکار ہیں، کسی کو تیار مال کے لئے نئی نئی منڈیاں، کسی کو اپنا سرمایہ لگانے اور نفع کمانے کے لیے میدان۔ لیکن ایک بات اب روز روشن کی طرح ظاہر ہے اور وہ یہ کہ اب انسانیت کی آرزو اس باب میں ایک خاص شکل اختیار کر چکی ہے۔ وہ اب یہ نہیں گوارا کر سکتی کہ دنیا کی دولت آفریں قوت تو بڑھے مگر وہ بھوکی مرے۔ ایک طرف تو امیر ہوں۔ جو یہ نہ سمجھیں کہ اپنی دولت کو آخر کیسے صرف کریں۔ دوسری طرف غریب زندگی کی کمترین ضرورتوں کو ترسیں۔ زمین روز بہ روز زیادہ غلہ اگلے اور انسان بھوکوں مرے۔ کارخانے روز بہ روز زیادہ کپڑا بنا سکیں اور آدمی ننگے پھریں۔ اینٹ چونے سیمنٹ اور لوہے کے خریدار نہ ملیں۔ مگر آدمی بے گھر بے در سرگرداں و پریشان ہو۔ انسانیت یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ کبھی کھانے کو ملے بھی تو بھوک کا ڈر برابر سر پہ منڈلاتا رہے۔ وہ سمجھنے لگی ہے کہ کام سے زندگی بنتی اور سنورتی بھی ہے۔ اس کا خلا پر ہوتا ہے۔ اِس لئے وہ یہ گوارا نہیں کرتی کہ کام اس کے لئے بس ہمیشہ وبال اور جان کا جنجال ہی ہو۔ غیر دلچسپ بے مقصد اور جہاں تک کام کرنے والے کی نظر میں کام کا براہ راست اس سے تعلق ہے۔ بے نتیجہ۔ وہ یہ گوارا نہیں کر سکتی۔ کہ اس کے

گنتی کے افراد دولت آفرینی کے ذریعوں پر قبضہ حاصل کر کے اسے فوج در فوج اپنا غلام بنا لیں۔ اور ستم ظریفی یہ کہ یہ سب آزادی معاہدہ کی آڑ میں ہو۔ وہ یہ نہیں گوارا کر سکتی کہ وہ کام کو آمادہ ہو اور کام نہ کر سکے۔ وہ نہیں چاہتی کہ خود غرض نفع طلبوں کی غلط اندازیوں کا خمیازہ اسے بیروزگاری اور کساد بازاری کی شکل میں بھگتنا پڑے۔ وہ پھر معشیت کا مرکز انسانی ضرورتوں کو بنانا چاہتی ہے۔ وہ پھر تخیل کی بے نہایتی سے بھاگ کر زندگی کی حدود میں آنا چاہتی ہے۔ وہ پھر نفع طلبی کے قمار خانے سے نکل کر خاندان، گاؤں، شہر، ملک اور انسانیت کی جماعتوں کو بامعنی تعلقات کی دنیا بنانا چاہتی ہے۔ وہ امید کرتی ہے کہ دولت پیدا کرنے کے اہم وسائل اس طرح اور اس پیمانے پر افراد کے قبضے میں نہ رہیں گے کہ وہ دوسروں کی زندگیوں کے مالک بن جائیں۔ وہ چاہتی ہے کہ ان وسایل پر فی الجملہ ہیئت اجتماعی کا قبضہ ہو۔ بے حساب دولت اگر ہو تو بس جماعتی بیت المال میں ہو۔ ہر شخص کو اس کی ضرورت کے لائق ملے۔ اور فی السماء رزقکم کا الٰہی وعدہ دنیا میں نائب الٰہی حکومت کی طرف سے پورا کیا جائے۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ جدید صنعت اور انفرادی نفع طلبی کے میل سے انسانیت اس درجہ اکتا گئی ہے کہ اگر کوئی صورت اصلاح کی نہ بن پڑی تو یہ اس جدید صنعت سے ہاتھ دھو کر چھوٹی چھوٹی غیر مرکزی بستیوں میں ابتدائی قسم کی زندگی گزارنے پر راضی بلکہ آمادہ ہو جائے گی۔ اگر کلوں سے کپڑا بنانے اور ٹریکٹر سے زمین جوتنے اور لوہے سے مکان بنانے کی صورت بس اسی طرح ممکن ہے کہ کچھ ننگے رہیں، کچھ ننگے رہیں، کچھ کھائیں کچھ بھوکے رہیں، کچھ محلوں میں رہیں اور کچھ کے سر پر بس آسمان کی نیلی چھت ہو تو وہ ان کلوں پر اپنے پرانے چرخوں اور کرگھوں کو، ان ٹریکٹروں پر اپنے لکڑی کے ہل کو، ان لوہے اور سیمنٹ کے قلعوں پر اپنی پھوس کی جھونپڑیوں کو پھر ترجیح دینا سیکھ لیں گے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ آج دنیا اس قسم کی خاص قومی تحریکوں سے خالی نہیں ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انسانیت اپنی ذہنی فتحمندیوں کو جو صنعت جدید سے عبارت ہیں ترک کیے بغیر افلاس سے بچنے، جماعت کی مستقل طبقاتی تقسیم کو بنانے کا ہر فرد کے لیے دلچسپ

اور باسعنی اور فرصت کو خوشگوار بنانے کی تدبیر نکال سکتی ہے۔ اس لئے کہ بہرحال یہ صنعت ایک خادم ہے۔ اس سے کام لینے والے تو انسان ہی ہیں۔ اگر ان کا ارادہ واضح ہو جائے اور مؤثر بن جائے تو جماعتی قابو میں آکر یہی صنعت انسان کی سب سے بڑی مددگار بن سکتی ہے۔ آج عوام کی معاشی آرزوؤں کو جہاں تک میں سمجھ سکتا ہوں اُن کا رخ یہی معلوم ہوتا ہے اور اس لئے میرا گمان ہے کہ اس جنگ کے خاتمے کے ساتھ ساتھ دنیا میں ملکیت شخصی کے تصور اور تصرف میں ایک بنیادی تبدیلی رونما ہوگی۔ معاشی زندگی میں امداد باہمی کے اصول کو اور مرکزی ریاستی کاروبار کو بہت فروغ ہوگا اور شاید بیسویں صدی میں معاشی زندگی کی یہی خصوصیت قرار پائے گی۔

کینیڈا میں ذمہ دار حکومت کا ارتقاء

از

پروفیسر شاہ عبدالرشید صاحب۔ ایم اے، ال ال بی، شعبۂ تاریخ
و سیاسیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

اس مضمون کا مقصد کینیڈا میں ذمہ دار حکومت کے تاریخی نشو و نما کا تجزیہ کرنا اور یہ بتلانا ہے کہ اس نو آبادی میں ذمہ دار حکومت کے اصول کس طرح تدریجی طور پر اور کم و بیش غیر محسوس طریقے سے کارفرما رہے۔

کینیڈا ۱۷۵۹ء میں انگریزوں کے ہاتھ آیا۔ اور ابتدائی چند سالوں تک اُس کے نظم و نسق کو جنرل مُرے نے فوجی طریقہ پر چلایا۔ ۱۷۵۹ء کے اندازہ کے مطابق وہاں کی کل آبادی ستر ہزار باشندوں پر مشتمل تھی۔ یہ سب کے سب فرانسیسی تھے، جو دریائے سینٹ لارنس کے کنارے بہت ہی قلیل تعداد میں بس گئے تھے۔ اور اُن میں سے زیادہ تر کیوبک اور مانٹریل کے بیچ کے علاقہ میں رہتے تھے۔ ۱۷۶۳ء کے عہد نامۂ پیرس کی رو سے یہ ملک انگریزوں ہی کے قبضہ میں رہا مگر جو لوگ فرانس جانا چاہتے تھے انھیں اس کی آزادی دے دی گئی۔ چنانچہ سرکاری عہدہ دار تو واپس چلے گئے لیکن وہاں بس جانے والوں میں سے بہت تھوڑوں نے اُن کی تقلید کی۔ انگریزوں کی کثیر تعداد میں آمد کی وجہ سے وہاں کی آبادی تیزی سے بڑھنے لگی۔ یہ انگریز زیادہ تر امریکی نو آبادیات ہی سے آئے تھے۔ اس سیلاب کی وجہ سے ایک طرح کی افراتفری پیدا ہوگئی۔ بات یہ تھی کہ فرانسیسی آبادکار سب کے سب

رومن کیتھولک تھے اور نئے بسنے والے انگریز زیادہ تر پروٹسٹنٹ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ زبان، قانون، اور تہذیب کے اختلافات بھی وہاں کی آبادی میں ابھرنے لگے جن سے آنے والے جھگڑوں اور الجھنوں کے اسباب فراہم ہو گئے۔

وہاں کے نظم ونسق کی تنظیم سے متعلق برطانوی پارلیمنٹ کا پہلا قانون ۱۷۷۴ء میں نافذ ہوا۔ قانون کیوبک کی رو سے گورنر کے لئے یہ لازمی قرار دیا گیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ۲۳ اشخاص کی ایک نامزد کردہ کونسل کی مدد سے حکومت کرے۔ اور ان اشخاص کا صوبہ ہی کے باشندے ہونا ضروری تھا۔ صوبہ کی سرحدیں بھی بڑھا دی گئیں۔ اب تک کینیڈا دریائے سینٹ لارنس کے جنوبی جانب تقریباً پچاس میل، اور شمالی جانب قریب ایک سو میل کے چوڑے علاقہ پر پھیلا ہوا تھا۔ اس قانون کی رو سے گریٹ لیکس[1] کا پورا رقبہ اور جنوب میں مسی سپی اور اوہیو کی طرف کا وسیع علاقہ کینیڈا کی حکومت میں شامل کر دیا گیا۔ ولیم سن لکھتا ہے:-

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ نے آنے والے امریکی نوآبادیوں کی قیادت کا اندازہ کر لیا تھا کیونکہ اس فیصلہ سے شمالی نوآبادیات کو شمال کی جانب پھیلنے سے روک دیا گیا تھا۔"

جنگ امریکہ ۱۷۷۵ء۔ ۱۷۸۱ء کے دوران میں کانگریس نے کینیڈا کے تسخیر کی کوشش کی تھی لیکن وہ ناکام رہی۔ بہ حیثیت مجموعی کینیڈا کی آبادی برطانوی تاج کی وفادار اور منحرف نوآبادیات کے اُن مہاجرین کی توجہ کا مرکز بنی رہی، جنھوں نے برطانوی دولت عامہ کے شہریوں کی حیثیت سے اپنے مرتبہ کی قربانی کے مقابلہ میں جلاوطنی کو ترجیح دی تھی۔ جنگ کے ختم ہونے پر سلطنت متحدہ کے وفاداروں کی ایک کثیر تعداد شمال کی طرف ہٹ گئی اور کینیڈا کے تقریباً غیر آباد صوبوں کو بسایا۔ اس طرح جو نقصان امریکہ کو ہوا اس سے کینیڈا کو فائدہ پہنچا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ کم سے کم ۴۰ تا ۶۰ ہزار باشندے

---

[1] Great Lakes ۔۲

ریاستوں سے برطانوی شمالی امریکہ میں داخل ہوئے اور انھوں نے ابتدائی نوآبادی کے مغرب میں شمالی کینیڈا کی ایک نئی برطانوی نوآبادی قایم کی۔ اس توطن پذیری کی وجہ سے نووا اسکوشیا اور نیو برنزوک کے علاقے بھی آباد ہو گئے۔

انگریزوں کی اتنی کثیر تعداد میں آبادکاری نے ذمہ دار حکومت کے مطالبہ کو بھی کھڑا کردیا۔ چنانچہ پارلیمنٹ سے اِس مطلب کی کئی ایک گزارشیں کی گئیں۔ تاہم کینیڈا کا مسئلہ دو نسلوں کا مسئلہ تھا۔ "ایک حصہ کو حق رائے دہی سے محروم رکھتے ہوئے دوسرے حصہ کو اس کا حق دینا بہت ہی خطرناک تھا۔ اور دونوں کو ایک ہی نیابتی مجلس میں شرکت کی اجازت دینے کے یہ معنی تھے کہ برطانوی اقلیت کو ہمیشہ کے لیے فرانسیسی اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے"۔ پٹ نے اس گتھی کو سلجھانے کے لئے کینیڈا کو دو حصوں میں تقسیم کردیا اور ہر ایک حصہ کو اپنی اپنی نیابتی اسمبلی کے قیام کا حق دے دیا۔ کینیڈا کا دستوری قانون ۱۷۹۱ء میں منظور ہوا۔ اس کی رو سے بالائی اور زیرین کینیڈا کے دو صوبے کردئے گئے اور ہر ایک میں تاج کی نامزد کردہ ایک ایک کونسل اور باشندوں کی منتخب کردہ ایک ایک اسمبلی قائم کی گئی۔ یہ بھی قرار پایا کہ ایک لفٹنٹ گورنر نامزد شدہ مجلس عاملہ کے ساتھ ہر صوبہ پر، اور ایک گورنر اِن چیف پورے ملک پر حکومت کرے گا۔ اسمبلیوں کو محصول بندی کا اہم اختیار تو عطا کیا گیا تاہم انھیں عاملہ کو متاثر کرنے یا اُسے برطرف کرنے کے کسی راست اختیار سے محروم رکھا گیا۔ اس قانون کے تحت کینیڈا میں تقریباً پچاس سال تک حکومت ہوتی رہی۔ ابتدا میں تو قانون پر کوئی بُری طرح عمل نہیں ہوا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد مشکلات شروع ہوگئیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خود قانون کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ دشواریوں اور جھگڑوں کا پیدا ہونا لازمی تھا۔

سب سے پہلے تو یہ کہ دو صوبوں میں کینیڈا کی تقسیم کی وجہ سے عداوت اور غیر صحت بخش رقابت کا ایک جذبہ پیدا ہوگیا۔ شمالی کینیڈا کی تقریباً تمام خارجی تجارت کو جنوبی صوبہ سے گزرنا پڑتا تھا اور اس سلسلہ میں مستقل جھگڑے ہوا کرتے تھے۔ گو سمجھوتہ کی متعدد بار کوشش

کی گئی لیکن اس وقت تک کچھ نہ ہو سکا جب تک کہ شہنشاہی پارلیمنٹ کے ایک قانون، قانون تجارت کینیڈا ۱۸۲۲ء کے ذریعہ اس کو طے نہ کر دیا گیا۔ اس جھگڑے کی دوسری وجہ جنوبی کینیڈا میں قابل لحاظ برطانوی عنصر کی موجودگی تھی۔ انگریز اس کو ایک مسلمہ بات سمجھتے تھے کہ جنوبی کینیڈا کی حکومت میں صرف ان ہی کا مفاد سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ابتدا میں تو اس طرز عمل سے زیادہ دشواری نہیں پیدا ہوئی کیونکہ فرانسیسیوں کو اپنے سیاسی مراعات سے بہت ہی کم دلچسپی تھی۔ لیکن جیسے جیسے معاشی مفاد بڑھتا گیا ویسے ویسے دونوں فرقوں کی مخالفت اور عداوت بھی نمایاں ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۸۱۰ء میں اس بنا پر گورنر ان چیف کو ایک فرانسیسی اخبار "لے کنا دیاں" بند کر دینا پڑا۔ شمالی کینیڈا میں امن اور سلامتی نسبتاً زیادہ تھی لیکن وہاں بھی اراضی کے متعلق ناقص حکمت عملی کی وجہ سے تھوڑی بہت بے چینی ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ تھا کہ رشوت ستانون کو اُن سے کہیں زیادہ زمینوں پر قبضہ کر لینے کا موقعہ مل جاتا تھا جنھیں وہ واقعی ترقی دے سکتے ہیں۔ ۱۸۱۵ء کے بعد شمالی کینیڈا میں ایک طرح کی نسلی فرقہ بندی پیدا ہو گئی اور اس میں سلطنت متحدہ کے وہ وفادار، جنھیں اپنے مصائب کا احساس اور اپنی خدمات پر فخر تھا اور وہ نئے مہاجر جو نپولیانی جنگوں کے بعد بہت بڑی تعداد میں انگلستان سے آ گئے تھے، مبتلا ہو گئے۔ نیز عاملہ کی غیر ذمہ داری کی وجہ سے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک مستقل چند سری راج نے ناجائز اثر اور اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا، مقننہ میں بغض وحسد کا پیدا ہو جانا لازمی تھا۔ شمالی اور جنوبی دونوں کینیڈاؤں میں عاملہ اور اسمبلی کے درمیان تعطل تو عام بات ہو گئی تھی۔ اور اُسے دور کرنے کے لیے عارضی چارہ کار اختیار کرنا پڑتا تھا مثلاً جن رقومات کو اسمبلی نے رد کر دیا ہو انھیں شہنشاہی فنڈ سے ادا کیا جاتا تھا۔ ۱۸۳۱ء میں ایک قانون کے ذریعہ مصالحت کی کوشش کی گئی جس کی رو سے تاج کی آمدنی کے بعض ذرائع پر کینیڈا کی مقننہ کو اسی امید پہ اختیار دیا گیا تھا کہ اس کے بعد سیول لسٹ بھی فراہم کی جائے گی۔ لیکن یہ کوشش بالکل ناکام رہی۔ جنوبی کینیڈا میں سیول لسٹ سے قطعی طور پر

انکار کر دیا گیا اور ۱۸۳۴ء میں پاپینیو کے زیرِ ہدایت اسمبلی نے ۹۲ قرار دادیں منظور کیں جن میں اپنی شکایات پیش کی گئی تھیں اور ان کے دور کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ان شکایات کو ٹھکرا دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاپینیو اور اس کے حامیوں نے بغاوت کر دی۔ اسی طرح شمالی کینیڈا میں بھی میکنزی کی قیادت میں مصلحین کی ایک جماعت اسمبلی میں منظم کی گئی اور اس نے اس کا مطالبہ شروع کیا کہ عاملہ کے وزرا کو اسمبلی کے سامنے ذمہ دار قرار دیا جائے۔ اس وقت حکومت کے حقیقی اقتدار پر سیاست کاروں کی ایک چھوٹی سی متحد جماعت قابض تھی۔ اور ان سیاست کاروں نے عاملہ اور قانون ساز مجالس کی نشستوں کا تقریباً اجارہ لے رکھا تھا۔ اسی وجہ سے یہ جماعت ایک خاندان کے لقب سے مشہور تھی۔ اُس کے مفادات لازمی طور پر رجعت پسند تھے۔ چنانچہ جب اُس نے اصلاحی جماعت کے مطالبات کی مخالفت کی تو نتیجہ آخر کار ۱۸۳۷ء میں ایک اصلاحی بغاوت کی صورت میں نمودار ہوا۔

اس طرح ۱۸۳۷ء میں شمالی اور جنوبی دونوں کینیڈا میں بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔ فوجی کوشش کے اعتبار سے تو یہ شورشیں نہایت ہی کمزور تھیں۔ جنوبی کینیڈا میں وہ ایک مہینے کے اندر اندر ختم ہو گئیں اور شمالی کینیڈا میں تو وہ ایک ہفتہ سے کچھ ہی زیادہ چل سکیں تاہم سیاسی مظاہروں کی حیثیت سے یہ بغاوتیں موثر اور کارگر ثابت ہوئیں۔ کیونکہ ان کی وجہ سے نو آبادیاتی حکمت عملی کا مسئلہ انگلستان کے مدبروں کے لئے اہم ترین بن گیا۔ ملبورن وزارت کے جوشیلے رکن لارڈ جان رسل نے کینیڈا کے مسئلہ کی مکمل تحقیقات کی ضرورت محسوس کی اور خوش قسمتی یہ تھی کہ اُس نے انجمن آبادکاری کے ارکان کو اس طرف متوجہ کر لیا جو ویکفیلڈ، جیمس مِل، ٹورنس، بُلر، مولسورتھ، وہسٹلے اور لیمٹن (جو بعد میں پہلا ارل آف ڈرہم ہوا) جیسے اشخاص پر مشتمل تھی۔ لارڈ ڈرہم کینیڈا کا ہائی کمشنر اور گورنر اِن چیف مقرر کیا گیا اور اس ہدایت کے ساتھ بھیجا گیا کہ وہ برطانوی شمالی امریکہ کی صورت حال کے متعلق ایک رپورٹ پیش کرے۔

کینیڈا کو لارڈ ڈرہم کا مشن غالباً تنہا واقعہ ہے جو برطانوی شہنشاہی کی تاریخ میں

سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ہم نے اُسے "مشن" اس لئے کہا ہے کہ لارڈ ڈرہم نوآبادی کے گورنر کی حیثیت سے گیا بھی تھا تو اُس کے فرایض کا یہ پہلو شمالی اور جنوبی کینیڈا کی بےچینی کے متعلق رپورٹ پیش کرنے اور اُس بےچینی کو دور کرنے کے اہم کام کے مقابلہ میں کم اہمیت رکھتا تھا۔ پھر یہ کہ لارڈ ڈرہم صرف تنہا نہیں گیا بلکہ اس کے ساتھ انجمن آبادکاری کے دو اور ساتھی بھی تھے ــــــ ویکفیلڈ اُس کی مجلس عاملہ کے رکن کی حیثیت سے اور بُلر اس کے پرائیوٹ سکریٹری کی حیثیت سے لارڈ ڈرہم کے مشن کے نتایج دوررس ثابت ہوئے۔ درحقیقت اسے قلمروؤں میں ذمہ دار حکومت کے نشو و نما کا نقطہ آغاز کہا جاسکتا ہے۔ لارڈ ڈرہم کا زمانہ حکومت کامیاب نہیں رہا۔ ایک جماعتی سازش کی وجہ سے جو اُس کے شخصی دشمن لارڈ برہم نے شروع کی تھی، اُسے سال کے ختم ہونے سے پہلے ہی مستعفی ہو جانا پڑا۔ تاہم وہ کینیڈا میں اتنا عرصہ گزار چکا تھا جو اُس کی مشہور رپورٹ کے مرتب کرنے کے لیے کافی تھا۔ اور اُسے ڈرہم نے "حکومت کو مشتبہ پاکر جس سے رپورٹ پیش کرنے کے معاملہ میں جھگڑا ہو گیا تھا" انگلستان جاتے ہی چھپوا دیا۔

اکثر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ڈرہم رپورٹ نے کینیڈا کے لیے مکمل ذمہ دار حکومت کی سفارش کی تھی۔ اس لئے یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ مفروضہ صرف جزوی طور پر درست ہے۔ لارڈ ڈرہم اور اس کا سکریٹری چارلس بُلر دونوں کینیڈائی مسئلہ کو ایک بنیادی مفروضہ پر جانچ رہے تھے۔ وہ یہ کہ "نوآبادیاتی حکومت اصل میں بلدی حکومت ہے یعنی وہ مقامی نظم و نسق کی ایک توسیع یافتہ شکل ہے۔" نوآبادیاتی رتبہ کا یہ تصور درحقیقت انجمن آبادکاری کے جملہ نمایندوں کی تحریروں سے اکثر وبیشتر ظاہر ہوتا رہا ہے۔ یہ غلط تصور اُس زمانے میں ایک حد تک واقعی حق بجانب بھی تھا۔ کیونکہ اس وقت کینیڈا میں کوئی قومی جذبہ اور سیاسی بیداری کا کوئی ایسا تصور بیدار نہ تھا جس کی بنا پر سیاسی تنظیم کی کسی نمایاں اسکیم میں شرکت کا مطالبہ کیا جاتا۔ ایک عرصہ کے بعد تو یہ بلدی مماثلت بلاشبہ غلط اور ناکافی

ثابت ہوئی لیکن اس وقت کینیڈا کے لیڈروں کے مطالبات بھی صوبائی خود اختیاری کی ایک معین شکل تک ہی محدود تھے اور مستقبل کے نشو ونما کا اندازہ بالکل نہیں کیا گیا تھا۔ لارڈ جان رسل کی نظر بے شک دور رس تھی۔ تب ہی اس کا یہ ادعا تھا کہ شہنشاہی اقتدار اعلیٰ صرف اسی صورت میں محفوظ رہ سکتا ہے جب کہ جملہ اختیارات کا مرکز پارلیمنٹ ہو۔ ورنہ "ایسے ملک کو ایک دفعہ خود اختیاری دے دینے کے بعد جو اس قدر دور ہو کہ اس پر موثر پابندی عاید نہ کی جا سکتی ہو، وہ قومی آزادی ہی کی شکل اختیار کرے گی"۔ ڈزرائیلی کی بھی، جو ایک بے تخیل ملک کا صاحب تخیل مدبر تھا یہی رائے تھی۔ اس نے ۱۸۵۱ء میں لارڈ ڈربی کو ایک خط میں لکھا تھا کہ نوآبادیاتی مصلحین

"صرف بلدی اصول میں منہمک ہیں اور ایک امپائر کا اس غلط فہمی میں خاتمہ کر رہے ہیں۔ جسے وہ مقامی حکومت کہتے ہیں"۔

واقعہ یہ ہے کہ برطانوی شہنشاہی کے کسی تابع[1] میں بھی ذمہ دار حکومت کے قیام کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اس سے دوہرے تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک تو گورنر اور نوآبادیاتی وزرات اور پارلیمنٹ کا تعلق، دوسرے بہ مجموعی طور پر نوآبادیاتی حکومت اور برطانوی حکومت کا تعلق۔ لارڈ ڈرہم نے اپنے آپ کو صرف پہلے ہی تعلق کے غور و خوض اور اس کے متعلق سفارشات پیش کرنے تک محدود رکھا تھا اور دوسرے پہلو پر اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔

جب تک گورنر کو اپنے دور حکومت کی پالیسی پر قابو رہا، اس وقت تک نوآبادیاتی اختیارات کا عام سوال اپنی انتہائی شکل میں شاذ و نادر ہی پیدا ہوا کیا۔ مگر جب گورنر نے اسمبلی کے مطالبات کی مخالفت کی تو ـــــ بجائے نوآبادیاتی محکمہ کے ـــــ اس پر حملے

---

[1] Dependency

شروع ہو گئے۔ حالانکہ اُسے اُن کے مطالبات کو تسلیم کر لینے کا کوئی حقیقی اختیار حاصل ہی نہ تھا۔ اگر وہ اسمبلی کو اس دائرہ میں قدم رکھنے کی اجازت دیتا جو شہنشاہی فیصلہ کے لیے مختص تھا، تو اُسے فوراً واپس بلا لیا جاتا۔ اس طریقہ کو ختم کر دینے کے لیے لارڈ ڈرہم نے سفارش کی تھی کہ گورنر کو یہ ہدایت کی جائے کہ وہ ایسے وزراء کو چُنے جن پر نو آبادیات کی اسمبلی کو اعتماد ہو اور اپنی حکمت عملی میں اسمبلی کا تعاون حاصل کرے"۔ اس طریقہ کے خاتمہ نے نئے مسائل پیدا کر دئے۔ جب پالیسی کے تعین کا حق گورنر سے وزراء کے ہاتھ میں چلا گیا تو انھوں نے گورنر کی بجائے اسمبلی کی تائید اور منظوری کو مقدم قرار دیا اور اس کے بعد تو اُن امور پر بھی یکے بعد دیگرے حملے شروع ہو گئے جو شہنشاہی حکومت کے لئے مختص تھے۔ نو آبادیات آہستہ آہستہ قومیں بننے لگیں اور قومی اقتدار و اختیارات کا مطالبہ شروع کر دیا۔

اپنی رپورٹ کے تیار کرنے میں ڈرہم نہ صرف اس دوسرے تعلق کو سمجھنے سے قاصر رہا بلکہ پہلے تعلق کے متعلق بھی اس کی بصیرت ادھوری اور غیر سائنٹفک تھی۔ اس کی یہ سفارش بہت ہی عام اور غیر معین تھی کہ اسمبلی کے ساتھ گورنر کا تعلق ویسا ہی ہونا چاہئے جیسا برطانیہ عظمیٰ میں تاج کا پارلیمنٹ کے ساتھ ہے لیکن انگلستان میں پارلیمنٹ سے تاج کا تعلق ہر زمانے میں بدلتا رہا ہے۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ تاج کو غیر واضح حالات میں حکومت کو برطرف کر دینے کا اختیار ہے لیکن اب اُسے ایسا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے اس کے علاوہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ڈرہم کے پیش نظر انگریزی نمونہ کی "متحدہ" کابینہ" نہیں بلکہ ایک ایسی وزارت کا تصور تھا جو سر رشتوں کے ذمہ دار حکام پر مشتمل ہو۔ انگلستان کے موجودہ کابینی طریقہ حکومت کے مقابلہ میں گورنر کو سر رشتوں کے اعلیٰ حکام کی ایک ایسی کمیٹی میں زیادہ مواقع حاصل تھے جس کا ہر رکن اپنے فرایض کی انجام دہی کے لئے اسمبلی کے آگے جوابدہ تو ہو مگر اُس مشترکہ ذمہ داری کا پابند نہ ہو، جو صرف روکنگھم اور پٹ ثانی کے زمانے سے شروع ہوئی تھی۔

لارڈ ڈرہم نے وزارتوں کی تشکیل میں جماعت واری تنظیم کی صحیح اہمیت کا اندازہ نہیں لگایا یہ درست ہے کہ جب ڈرہم نے اپنی رپورٹ لکھی تھی اُس وقت اور اُس کے بعد بھی چند سالوں تک کینیڈا کی پارٹیوں کا ارتقا، پورے طور پر عمل میں نہیں آیا تھا، تاہم ڈرہم کے منشار کے متعلق لارڈ جان رسل کی یہ تعبیر ناواجب نہیں معلوم ہوتی کہ وہ گورنر سے، جو اسمبلی کے پسندیدہ وزرار کو خود منتخب کرتا اور ان کے ذریعہ حکومت کرتا ہو، یہ توقع رکھتا تھا کہ اُس کے طرزِ عمل میں مصلحت آمیز غیر جانبداری زیادہ شامل رہے گی۔

بہرحال ڈرہم کی رپورٹ غیر معمولی اہمیت کا ایک وستاویز ہے۔ یہ اُس اصول کا پہلا اور مکمل اظہار ہے جو مختلف ترقی پسند لوگوں کے دماغ میں بہت ہی موہوم طور پر کام کر رہا تھا۔ یہ واضح رہے کہ ڈرہم نے اپنی کوئی ذاتی سفارشات پیش نہیں کیں۔ دونوں صوبوں کے اتحاد کی تجویز ۱۸۲۲ء ہی میں ڈیوک آف کینٹ نے پیش کی تھی۔ نوآبادیات میں ذمہ دار حکومت کا ایک زمانے سے مطالبہ ہو رہا تھا اور کئی سال سے ویکفیلڈ مصلحین اس کی حمایت کر رہے تھے۔ ڈرہم کا سب سے بڑا کارنامہ اُن تجاویز کو صرف عملی سیاست کے میدان میں لانا تھا جنھیں "پہلے ناعاقبت اندیش زعیموں کے بے ربط اور غیر ممکن خیالات سمجھا جاتا تھا"۔ اس تبدیلی کی اہمیت کا اندازہ صرف اُن اعترافوں کے مطالعہ سے کیا جاسکتا ہے جو لارڈ ڈرہم کی رپورٹ پر اس وقت کے ذمہ دار لوگوں اور اخباروں نے کئے تھے۔ کوارٹرلی ریویو نے "اس کے بر خود غلط مہملات"، اس کی طفلانہ نظریہ پرستی، اس کے مسخ شدہ واقعات، غلط استدلال اور لغو تناقضات" پر روشنی ڈالی تھی۔ جان بل نے اُسے "ڈرہم کی حماقت" کا لقب دیا تھا۔ یہاں تک کہ ٹائمز بھی اس عام لے دے میں شریک تھا۔ صرف انتہا پسند[۱] طبقہ نے رپورٹ پر اچھی رائے کا اظہار کیا تھا۔

آج ہم بھی ڈرہم رپورٹ پر تنقید کرتے ہیں لیکن اس کے وجوہ دوسرے ہی ہیں۔ ہم اس پر اظہار افسوس کرتے ہیں کہ اس رپورٹ میں فرانسیسی آباد کاروں کی بُری طرح مذمت کی گئی ہے

[۱] Radical

ہیں شہنشاہی اور نوآبادیاتی دائرہ عمل کی اس تقسیم سے بھی اختلاف ہے جو ڈرہم نے تجویز کی ہے۔ اس وجہ سے کہ "عملاً ایک دفعہ کامل ذمہ دار حکومت کے عطا کردئے جانے پر، نوآبادی کے باشندوں نے بتدریج متعلقہ امور کو بھی اپنے قبضہ میں کر لیا اور برطانیہ عظمیٰ کی حیثیت ایک مقتدر طاقت سے گھٹ کر ایک مساوی حصہ دار کی ہو گئی"۔ لیکن اس وقت جھگڑا یہ تھا کہ آیا نوآبادیات پر جو کہ ہر لحاظ سے ماتحت ریاستیں تھیں، ذمہ دار حکومت کے نظریہ کے اطلاق کی گفتگو مناسب ہے یا نہیں۔ لارڈ جان رسل نے لکھا ہے کہ

"انگلستان کا دستور ایک طویل جدوجہد اور بنیادی کامیابی کے بعد ایک ایسی طرز حکومت اختیار کر چکا ہے جس میں تاج کا خصوصی اختیار مسلمہ ہے گو وہ بغیر شورہ کے کہیں استعمال نہیں ہوتا۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اگر ہم ایسے رواج کا اطلاق ایک نوآبادی پر کرنا چاہیں تو یہ ہماری غلطی ہو گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہو سکتا ہے کہ گورنر کو ملکہ اور مجلس عاملہ سے جو کہ ایک دوسرے سے کلیتاً اختلاف رکھتے ہیں، ایک ہی وقت میں ہدایتیں اور مشورہ ملے۔ اگر وہ انگلستان سے آنے والی ہدایتوں کی تعمیل کرے تو دستوری ذمہ داری کی مماثلت ختم ہو جاتی ہے اور اگر برخلاف اس کے، وہ اپنی کونسل کے مشورہ پر چلے تو پھر وہ ماتحت افسر نہیں رہتا بلکہ ایک آزاد مقتدر حاکم ہو جاتا ہے۔"

اس کے باوجود ڈرہم کے نتایج کو تسلیم کر لیا گیا اگرچہ کہ باقاعدہ طور پر اور فوراً تسلیم نہیں کیا گیا۔ پہلا قدم لارڈ سڈنہم نے اٹھایا جسے لارڈ ڈرہم کے استعفیٰ پر کینیڈا کا گورنر جنرل بنایا گیا تھا۔ فروری ۱۸۴۱ء میں شمالی کینیڈا کی اسمبلی نے ذمہ دار حکومت کا سوال کھڑا کر دیا۔ گورنر جنرل ایسے وقت عوام کے نمایندوں سے ایک طویل بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا جو کہ پچھلے ہنگاموں کے باعث بہت ہی نازک ہو گیا تھا۔ اس لئے اس نے ایک مبہم اور عام جواب یہ دے دیا کہ

"اُسے ملک معظم کے یہ احکام ملے ہیں کہ ان صوبوں کی حکومت کو عوام کی نیک خواہشات اور مفادات کے مطابق چلائے اور جو احساسات اُن کے نمایندوں کے توسط سے ظاہر

کیے جائیں ان کا وہی احترام کرے جن کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں"۔

اس میں ۱۶ اکتوبر والے لارڈ جان رسل کے ایک مراسلہ سے اور اضافہ ہوا جس سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ اگر عاملہ کو اسمبلی کی اکثریت سے ہمدردی نہ ہو تو وزراء میں تبدیلی کی جائے گی۔ ۳ ستمبر ۱۸۴۱ء کو کینیڈائی حکومت سے متعلقہ پالیسی کو ایک اور باقاعدہ شکل عطا کی گئی۔ اس دن رابرٹ بالڈون نے اس موضوع پر غور و خوض کے لیے اسمبلی کے سامنے کئی ایک قرار دادیں پیش کیں جن میں پورے اور واضح طور پر نو آبادیاتی حکومت خود اختیاری کے نظریہ کی وکالت کی گئی تھی۔ یہ قرار دادیں ان حدود سے بہت آگے نکل گئی تھیں جہاں تک گورنر جنرل یا شہنشاہی حکومت جانا چاہتی تھی۔ چنانچہ لارڈ سڈنہم نے مسٹر جے ہیرسن کو ہدایت کی کہ کونسل میں قرار دادوں کے ایک اور سلسلہ کے ذریعہ ان قرار دادوں میں ترمیم پیش کرے۔ یہ قرار دادیں بہ اتفاق آراء منظور ہوئیں۔ اور وہ یہ تھیں :-

"۱۔ یہ کہ صوبہ کی عاملانہ حکومت کا صدر اپنی حکومت کی حدود میں بادشاہ کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے صرف شہنشاہی اقتدار کے آگے ذمہ دار ہے۔ تاہم ہمارے مقامی معاملات کو وہ صوبہ کے ماتحت عہدہ داروں کے توسط اور مدد، مشورہ اور اطلاع ہی سے چلا سکتا ہے"۔

"۲۔ یہ کہ صوبائی پارلیمنٹ کے مختلف شعبوں کے درمیان اس ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کی غرض سے جو صوبہ کے امن، بہبودی اور اچھی حکومت کے لئے ناگزیر ہے، بادشاہ کے نمائندوں کے وہ اعلیٰ مشیر جن سے بادشاہ کے ماتحت صوبائی حکومت کی تشکیل ہونی ہے، ایسے اشخاص ہونے چاہئیں جنھیں عوام کے نمائندوں کا اعتماد حاصل ہو۔ اس طرح اس کا یقین ہو جائے کہ عوام کی ان خواہشات اور مفادات کی جن کا ہمارے مہربان بادشاہ نے اعلان کیا ہے، ہر موقعہ پر دیانت داری کے ساتھ نیابت اور وکالت ہوتی رہے گی"۔

"۳۔ یہ کہ اس صوبہ کے باشندوں کو صوبائی حکومت سے یہ توقع رکھنے کا حق ہے کہ وہ شہنشاہی اقتدار کو دستوری حدود کے اندر اور اُن کی نیک خواہشات اور مفادات کے عین مطابق استعمال کرنے کی پوری کوشش کرے گی"۔

پھر بھی یہ تجاویز بہت مبہم اور غیر واضح تھیں۔ اسی وجہ سے وہ آیندہ بھی ایک حد تک نزاع کا باعث بنی رہیں۔ اُن کی تعبیر جہاں لارڈ سڈنہم کے جانشین سر چارلس بیگٹ نے یہ کی کہ وہ حقیقی ذمہ دار حکومت کے نشو و نما کی اجازت دیتی ہیں وہیں خود سر چارلس بیگٹ کے جانشین سر چارلس مٹکاف نے انھیں رجعت پسندی اور جمود کی حکمت عملی کا آلۂ کار بنا دیا۔ مثلاً جب ۱۸۴۲ء میں اسمبلی کی اکثریت مسٹر ڈریپر کی قدامت پسند اخلاقی حکومت کی مخالف ہو گئی تو سر چارلس بیگٹ نے ان تجاویز کی شرائط کی رو سے اپنا یہ فریضہ سمجھا کہ مخالف گروہ کو حکومت سنبھالنے کی دعوت دے حالانکہ وہ شخصی طور پر اس کی پالیسی کا حامی نہ تھا۔ اُس نے اپنی کونسل کے اجلاسوں کی صدارت تک چھوڑ دی اور وزراء کو کلیتاً اس کا اختیار دے دیا کہ وہ معاملات کو خود اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ لیکن جب ۱۸۴۳ء میں سر چارلس مٹکاف گورنر جنرل مقرر ہوا تو اُس نے فوراً ہی وزراء کے دعوؤں کی تردید شروع کر دی۔ اس کی دلیل تھی کہ لارڈ سڈنہم کا منشاء ہرگز یہ نہ تھا کہ حکومت کو مجلس عاملہ کے قبضہ میں دے دیا جائے اور یہ کہ عمومیت اپنی پوری اور مکمل شکل میں انگلستان میں تو بالکل درست ہے لیکن ایک نوآبادی میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اُس نے اپنی پسند کے مطابق تمام پارٹیوں کے بعض لوگوں کی ایک کونسل ترتیب دیدی لیکن اس تجربہ کا نتیجہ خوش گوار نہ نکلا۔ ستمبر ۱۸۴۴ء میں جوں ہی اسمبلی کا اجلاس ہوا، کونسل اور اسمبلی کے تصادم کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ سوائے ایک کے جملہ ارکان کونسل یکے بعد دیگرے مستعفی ہو گئے۔ گورنر جنرل نے اس کی انتہائی کوشش کی کہ اپنی شرائط پر کوئی عمومی وزارت قایم کی جائے لیکن وہ ناکام رہا اور دو سال کے صبر آزما اور نازک دور کے بعد وہ بالآخر دسمبر ۱۸۴۵ء میں کینیڈا سے چلا گیا۔

مٹکاف کے بعد لارڈ کارٹ ہارٹ کے تحت ایک سال تک آمرانہ حکومت کا دور دورہ رہا اس کی وجہ کینیڈا اور ممالک متحدہ کے درمیان تعلقات کی غیر معمولی کشیدگی تھی۔ لیکن جب حالات درست ہوئے تو انگلستان میں یہ محسوس کیا جانے لگا کہ کینیڈا کی حکومت کو "ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں دینے کی ضرورت ہے جسے اس ملک کے دستور کے اصول اور علم کا گہرا علم، عمومی مجالس کا کچھ تجربہ اور اس وقت کے سیاسی مسائل سے کافی آگاہی ہو"۔ ایسا شخص لارڈ ایلجن کی ذات میں دستیاب ہو گیا۔ جسے ۱۸۴۷ء کے اوائل میں گورنر جنرل بنا دیا گیا۔ خوش قسمتی سے، انگلستان میں قدامت پسندوں[1] کا اقتدار اسی زمانے میں ختم ہو گیا تھا اور دھگ وزارت کے تحت لارڈ گرے نو آبادیاتی امور کا صدر مقرر ہوا تھا۔ اول گرے پہلا انگریز مدبر تھا جسے شہنشاہیت پر سچا اعتقاد تھا۔ اُسی کی رہنمائی میں لارڈ ایلجن اپنے پیشرو کے ہنگامہ خیز دار کے بعد کینیڈا میں" لارڈ ڈرہم کی تجاویز کو مکمل طور پر" بروئے عمل لایا۔

لارڈ ایلجن کے نزدیک ذمہ دار حکومت کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ" وزرا قوم کی مرضی کے مطابق مخالف گروہ سے نکل کر حکومت کے دائرہ میں شریک ہوتے جائیں"۔ اس معاملہ میں اُسے نو آبادیات کے وزیر کی پوری تائید حاصل تھی جس نے خود اپنے ایک مراسلہ میں اس کا اس طرح اظہار کیا تھا۔"

> "اس طریقۂ کار کی سفارش اس غرض سے کر رہا ہوں کہ تم پر یہ واضح ہو جائے کہ صوبہ میں جو بھی اقتدار ایک پارٹی سے دوسری پارٹی کے ہاتھ میں منتقل ہو گا وہ تمہاری کسی کارروائی کا نہیں بلکہ خود لوگوں کی خواہشات کا نتیجہ ہو گا۔ جیسا کہ اُس دشواری سے پتہ چلتا ہے جس کا تجربہ جاننے والی پارٹی کو دستور کی شکل و صورت کے مطابق صوبہ کی حکومت چلانے میں ہوا تھا اس کی میرے پاس بڑی اہمیت ہے۔ اس لئے میں تمہیں ہدایت کرتا ہوں ......"۔

---

(1) Tories

اس اصول کو بروئے عمل لانے کا پورا پورا موقعہ لارڈ ایلجن کو دیا گیا۔ برسر عہدہ آتے ہی اُس نے اس بات کی کوشش کی کہ موجودہ وزارت کو مختلف اضافوں اور تبدیلیوں کے ذریعہ مستحکم کرے لیکن جب اس میں ناکامی ہوئی تو اس نے بالآخر اسمبلی ہی کو برخاست کر دیا۔ آئندہ انتخابات میں حکومت کو شکست ہوئی اور جب ایوان کا اجلاس ہوا تو عدم اعتمادی کا ووٹ منظور ہو گیا۔ اور اس طرح پرانی وزارت کو مستعفی ہونا پڑا۔ لارڈ ایلجن نے مخالف گروہ کے قائدوں کو طلب کیا اور نئی وزارت تشکیل دینے کی خواہش کی اور کہا کہ "اگر وہ اعتدال اور استحکام سے کام لیں تو ایسی حکومت تشکیل دینے کے اچھے امکانات ہیں جس پر پارلیمنٹ کو اعتماد ہو، اور یہ کہ وہ اس سے ہر مناسب امداد اور تعاون کی توقع رکھ سکتے ہیں" غرض اس طریقے سے کینیڈا کی سیاست میں ذمہ دار حکومت کا اصول مکمل طور پر ظاہر ہوا۔

ذمہ دار حکومت فوراً ہی نہیں مل گئی۔ نوآبادی کے باشندے ایک عرصہ سے برابر سرگرمی کے ساتھ اس کا مطالبہ کر رہے تھے کہ داخلی معاملات میں انھیں پورا اختیار دیدیا جائے۔ قابل ذکر اور دلچسپ بات تو یہ ہے کہ یہ اہم تبدیلی ــــ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تبدیلی نہایت اہم تھی ــــ خاموشی کے ساتھ اور بغیر کسی قانون سازی کے عمل میں آئی۔ ذمہ دار حکومت سرکاری طور پر کبھی عطا نہیں کی گئی۔ اور جیسا کہ پروفیسر کیتھ نے اپنی کتاب "قلمرو میں ذمہ دار حکومت" میں بیان کیا ہے، اس کا انحصار محض رواج اور عمل پر رہا، اس کی محرک قوت گورنر کا طریقۂ کار تھا۔ اور گورنر کی حد تک بے شک اس کا امکان تھا کہ ایک طرف تو شہنشاہی حکومت اُس کو واپس بلالے اور دوسری طرف یہ بھی ممکن تھا کہ مقننہ کے اس کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دینے کی وجہ سے اس کی حیثیت غیر مستحکم ہو جائے۔

بہرحال ذمہ دار حکومت کو تسلیم کر لینے سے اصول کا تصفیہ تو ہو گیا لیکن اس کے گوناگوں مضمرات کو عملی جامہ پہنانا ابھی باقی تھا۔ خوش قسمتی سے لارڈ ایلجن کینیڈا میں اتنا عرصہ رہ سکا تھا جو اس نئے نظام کو ایک مضبوط بنیاد پر قایم کرنے کے لیے کافی تھا۔

ذمہ دار حکومت کے اصول کا نشا سب سے پہلے گورنر کے مرتبہ میں تبدیلی سے ظاہر ہوا۔ ذمہ دار نظام حکومت کے تحت گورنر نہ تو حکومت کا حقیقی صدر رہ سکتا تھا اور نہ سرپرستی کا ذریعہ بن سکتا تھا جیسا کہ وہ اب تک تھا۔ حالانکہ آپ سے اس بنیادی رعب داب میں مبتلا ہونے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لارڈ ایلجن نے اس کو اچھی طرح محسوس کر لیا۔ اس لئے وہ چاہتا تھا کہ "صوبہ میں ایک اخلاقی اثر ایسا پیدا کیا جائے جو اس اقتدار کے نکل جانے کی تلافی کر دے جسے مقامی پارلیمنٹ کے آگے ذمہ دار عاملہ کے حوالے کر دینا پڑا تھا۔" وہ ایک حد تک اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔ اس نے یہ اخلاقی اثر "پارٹیوں کے جھگڑوں سے بلند ہو کر ـــــ ایک ایسے عہدہ کی وجہ سے جو اس کے وزراء کے مقابلہ میں زیادہ مستقل تھا۔ اور ان لوگوں کے مفاد کے سوا جن کے معاملات کے انصرام کی غرض سے وہ مامور کیا گیا تھا جملہ سیاسی اغراض سے بے نیاز ہو کر حاصل کیا۔ اس نے آئندہ کے گورنر کے لئے راستہ صاف کر دیا جس کی حیثیت مادر وطن اور نو آبادی کے درمیان زیادہ تر ایک واسطہ کی بنتی جا رہی تھی اور جو ملک کے حقیقی حکمران کی بجائے نو آبادی کی حکومت کا ایک بلند مرتبت مشیر بننا چاہتا تھا۔

ملک کی حقیقی حکومت ان وزراء کے ہاتھوں میں آ گئی جنہیں اسمبلی میں اکثریت کی تائید حاصل تھی۔ اس کا اظہار پوری طرح ان واقعات سے ہوتا ہے جو ۱۸۴۸ء ۱۸۴۹ء کے مسودہ نقصانات بغاوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن وفادار باشندوں کو شمالی کینیڈا کی ۱۸۳۷ء والی بغاوت سے نقصان پہنچا تھا ان میں پچھلی حکومتوں نے اس کا معاوضہ دلوایا تھا۔ چنانچہ موجودہ حکومت نے بھی یہ مناسب سمجھا کہ جنوبی کینیڈا کے وفاداروں کو جن کی آبادی زیادہ تر فرانسیسی تھی" اسی قسم کا معاوضہ دلایا جائے۔ مسودۂ نقصانات بغاوت میں بطور معاوضہ ۹ ہزار پونڈ کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ یہ رقم دونوں ایوانوں میں بڑی اکثریت کی تائید سے منظور ہو گئی۔ لیکن ٹوریوں نے مسودہ کی شدت کے ساتھ مخالفت شروع کر دی۔ اور برابر اپنے آپ کو کینیڈا میں انگریزی راج کے خاص حامی ظاہر کرتے رہے۔ اسی بناء پر

وہ گورنر سے ہمیشہ اس بات کی توقع رکھتے تھے کہ وہ اس کے معاوضہ میں اُن کے ساتھ خاص سلوک روا رکھے گا۔ انھوں نے لارڈ ایلجن سے دیوانہ وار یہ درخواست کی کہ وہ یا تو مسودہ کو منظور کرنے سے انکار کردے یا اُسے ڈال رکھے۔ لیکن لارڈ ایلجن کا اندازہ زیادہ صحیح تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے وہ وزراء جنھوں نے مسودہ پیش کیا تھا اپنے جملہ اعمال کے لئے عوام کے سامنے ذمہ دار اور جوابدہ ہیں اور چونکہ یہ معاملہ خالص کینیڈائی معاملہ تھا اس لئے اس نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ اُس کے فیصلہ کا بار شہنشاہی پارلیمنٹ پر ڈالا جائے۔ چنانچہ اُس نے مسودہ منظور کرلیا۔ ٹوری غصہ سے بے قابو ہو گئے۔ اور تشدد کا نہایت ہی شرمناک مظاہرہ کیا۔ انھوں نے پارلیمنٹ کی عمارت لوٹ لی اور خود گورنر پر حملہ کرکے اُس کی توہین کی لیکن اس دوران میں لارڈ ایلجن خاموش ہی رہا۔ اور یہ اُبال بھی آہستہ آہستہ اُتر گیا۔

اس واقعہ کے نتایج بڑے اہم نکلے۔ اس کی وجہ سے مستقل اور قطعی طور پر یہ اصول مسلم ہوگیا کہ گورنر پر لازم ہے کہ وہ اپنے ذمہ دار وزراء کے مشورہ کو قبول کرے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ پارلیمانی اکثریت کی وہ آواز، جو ذمہ دار وزراء کی حمایت میں ہو، با اثر وفاداروں کی بیرونی جماعت سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اور یہ کہ آیندہ سے نظم ونسق کو متاثر کرنے یا اس پر نگرانی رکھنے کا فیصلہ کن ذریعہ عوام کی منتخب شدہ مقننہ ہی ہوا کرے گی۔ ضمناً اس واقعہ کا بہت ہی اہم نتیجہ یہ نکلا کہ پُرانی دنیا کا تنفر اور فرقہ داری بندھنیں ٹوٹ گئیں اور کینیڈا میں صحت بخش قومی سیاسی جماعتوں کے ارتقاء میں مدد ملی۔ حکومت کے روایتی طریقہ کے تحت "گورنر" با اثر لوگوں کو پارٹی کے اہم حصہ سے علحدہ رکھتے اور انھیں ایک وفادار ٹوری پارٹی سے وابستہ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔" اور اس پارٹی نے واقعی ایک خاندان کی حیثیت اختیار کرلی تھی اس طرح کہ یہ انتہا پسند ٹوری ہر معاملہ میں گورنر کی تائید کرتے اور گورنر اس کے بدلے انھیں ایک مستقل ذی اثر مرتبہ اور اقتدار کا اجارہ دیا کرتا تھا۔ اس واقعہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ انتہا پسند ٹوری صرف اسی وقت تک گورنر کی

حمایت کا دم بھرتے رہے جب تک کہ پورے صوبہ کا اثر و اقتدار ان کے اختیار میں رہا۔ اس واقعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ خاندان سیاسی اعتبار سے مفقود ہوتا چلا گیا اور اس کے خاتمہ نے صحت بخش قومیت کی ترقی کی راہ کھول دی جس میں فرانسیسی اور انگریز دونوں شریک تھے اور اُس سے زیادہ فطری بنیاد پر جو پہلے کبھی ممکن تھی، سیاسی پارٹیوں کے نشو و نما کے ذرائع مہیا ہو گئے۔ بالواسطہ یہ واقعہ مادر وطن اور نو آبادی کے تعلقات میں ایک نئے انداز کے آغاز کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ٹوری مخالفت اور لارڈ ایلجن کی منظوری کے پورے معاملہ کو شہنشاہی پارلیمنٹ میں زیر بحث لایا گیا۔ لارڈ رسل نے دارالعوام میں اور ارل گرے نے دارالامراء میں ایلجن کی پالیسی کی پُرزور تائید کی اور اس معاملہ میں کینیڈا کے حق قانون سازی کو تسلیم کر لیا۔

ذمہ دار حکومت کے اصول کی ترقی کا دوسرا دور سنہ ۱۸۴۷ء میں شروع ہوا۔ اور سنہ ۱۸۵۹ء تک بالکل نمایاں ہو گیا۔ کینیڈا کے قانون غلہ ۱۸۴۳ء کی رو سے وہاں کے گیہوں کو برطانوی مارکٹ میں ترجیح حاصل ہونے کے تین سال بعد یعنی ۱۸۴۶ء میں برطانیہ عظمیٰ نے آزاد تجارت کا فیصلہ کیا۔ اہل کینیڈا نے گیہوں کی برطانوی طلب کو پورا کرنے کی غرض سے مشینری کی فراہمی پر پہلے ہی سے کافی رقم صرف کر دی تھی۔ لیکن اپیل کے ۱۸۴۶ء والے آزاد تجارت کے موازنہ نے کینیڈا کی تجارت کو تباہ کر دیا۔ کیونکہ کینیڈا ممالک متحدہ سے مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کینیڈا کو بڑے معاشی مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ اور اس کے بعد برطانیہ کے خلاف عام بے اعتمادی کی لہر دوڑ گئی۔ یہاں تک کہ ممالک متحدہ سے الحاق کی ایک پُرزور تحریک شروع ہو گئی۔ اس تحریک کے خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے گورنر نے شہنشاہی حکومت کو مشورہ دیا کہ کینیڈا کی تجارت کو بحال کرنے کی غرض سے دو تجاویز اختیار کرے۔ ایک تو ۱۸۴۹ء کے قانون جہازرانی کی تنسیخ، دوسرے سنہ ۱۸۵۴ء میں ممالک متحدہ سے تجارتی لین دین کے معاہدہ کی تکمیل۔ ان کارروائیوں سے یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ برطانوی پارلیمنٹ اگر واقعی شہنشاہیت کی پناہ چاہتی ہے تو اب وہ اپنی پالیسی سے نو آبادیات کے معاشی مفادات کو

خارج یا نظر انداز نہیں کر سکتی۔

لارڈ ڈرہم نے خارجی تجارت کی نگرانی کو صریحاً شہنشاہی حکومت کا حق قرار دیا تھا۔ اس بنا پر کہ کروڑ گیری کا معاملہ صوبہ جاتی نہیں بلکہ قومی معاملہ ہے اور نو آبادیات کو زیادہ سے زیادہ صوبے کہا جا سکتا ہے۔" لیکن حالات کے تقاضہ نے شہنشاہی حکومت کے اس اجارہ کو ختم کر دیا۔ ابتداء میں تو کینیڈا نے اصولاً اس کو تسلیم کر لیا کہ شہنشاہی حکومت ہی شہنشاہیت کی کروڑ گیری کا انتظام کرے۔ لیکن اب بحری تجارت اور ممالک متحدہ سے داخلی تجارت میں فرق کیا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ یہ محسوس کیا گیا کہ کینیڈا کی خوش حالی کا دارو مدار تا مینی کروڑ گیری ہی پر ہے۔ اور چاہے انگلستان کی مالی پالیسی کچھ ہی ہو اُسے چاہیئے کہ اپنے مفادات کے پیش نظر اپنی مالی پالیسی کا تعین خود ہی کرے۔ چنانچہ ۱۸۵۹ء میں باوجود اس کے کہ انگلستان آزاد تجارت کا قطعی طور پر وعدہ کر چکا تھا، کینیڈا کے وزیر مالیہ الکزنڈر گالٹ نے صنعتی اشیا پر محصول بڑھا دیا جس کی وجہ سے برطانوی کاروبار پر بھی بُری طرح اثر پڑا۔ ایوان تجارت اور شفیلڈ کے صناعوں نے وزیر نو آبادیات سے احتجاج کیا۔ اور وزیر نو آبادیات نے اہل کینیڈا سے ان کی غیر دانشمندانہ پالیسی کی شکایت کی۔ اس شکایت کے جواب میں کینیڈا کے وزیر نے ایک یادداشت بھی تیار کروائی جس میں اُس نے اپنی حکومت کی حکمت عملی کی پُرزور حمایت کی تھی۔ اس میں لکھا تھا

"۔ ۔ ۔ ۔ لیکن کینیڈا کی حکومت، جو کینیڈا کی مقننہ اور اُس کے باشندوں کی جانب سے کام کر رہی ہو، احترام کے اُن احساسات کے باوجود جو شہنشاہی ارباب اقتدار کے لئے وہ رکھتی ہے، کسی طرح بھی محصول بندی کی نوعیت اور اس کی حدود، دونوں کے متعلق کینیڈا والوں کے اپنے آپ تصفیہ کرنے کے حق سے نہ تو دست بردار ہو سکتی ہے اور نہ اُسے گھٹا سکتی ہے۔ صوبہ کی وزارت مقننہ کے طرز عمل کے اسباب بتلانے کے لئے ہر وقت تیار ہے کیونکہ وہ بھی اس میں شریک ہے۔ تاہم ملکہ معظمہ سے

متعلق اپنے فرض اور وفاداری کے تابع اس کو پالیسی کے جملہ عام مسائل میں صوبہ ہی کی حکومت کے سامنے ذمہ دار ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اسی کے اعتما کی بنا پر وہ ملک کے معاملات کا انتظام کرتی ہے۔ اور محصولات کے عاید کرنے میں تو حکومت اور عوام کا اس بات پر متفق ہونا نہایت ضروری ہے کہ اول الذکر مقامی مقننہ کے دائرہ سے ہٹ کر نہ تو ذمہ داری قبول کرے اور نہ منظوری کی طالب ہو۔ اگر شہنشاہی حکومت کی رائے کو اہل کینیڈا کی رائے پر ترجیح دی جائے تو حکومت خود اختیاری خاک میں مل جائے گی۔ اس لئے مقننہ کینیڈا کے اس حق کی صریح طور پر تائید کرنا موجودہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ عوام کے محصولات کا انتظام، جس طرح مناسب سمجھے کرسکتی ہے۔ وزارت کی برہمی ہی کیوں نہ مول لینا پڑے۔ ملکہ معظمہ کو ایسی کارروائیوں کے نامنظور کرنے کا مشورہ نہیں دیا جاسکتا۔ تاوقتیکہ ان کے مشیر نوآبادی کے باشندوں کی خواہشات کا لحاظ کئے بغیر وہاں کے معاملات کے نظم ونسق کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے تیار نہ ہوں۔ کینیڈا کے قرضوں اور اقرارناموں کے لئے شہنشاہی حکومت ذمہ دار نہیں ہے۔ اور نہ وہ اس کی عدالتی، تعلیمی اور سیول خدمات کے مصارف برداشت کرتی ہے۔ ملک کی داخلی حکومت میں وہ کوئی مدد نہیں کرتی۔ ان تمام ضروریات کا انتظام صوبائی مقننہ ہی کو ایک وزارت کے توسط سے کرنا پڑتا ہے جو راست اس کے سامنے ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا یہ دعویٰ لازمی ہے کہ لوگوں پر جو بار عائد ہو اس کی نوعیت اور وسعت میں اُسے پورا اختیار حاصل رہے۔"

اس غیر معمولی دستاویز میں جو دعوے کئے گئے ہیں ان سے شہنشاہی حکومت نے کبھی انکار نہیں کیا۔ اور نوآبادی کی تجارتی مشاغل پر قبضہ کی جملہ مزید کوششیں ترک کردی گئیں۔

یہ واضح رہے کہ صرف کروڑگیری کا اختیار ہی ایک ایسا معاملہ نہ تھا جسے لارڈ ڈرہم نے

شہنشاہی حکومت کے لئے مختص کر دیا تھا۔ اس کی پوری تجویز "آزادی نہیں بلکہ خود اختیاری" کی تھی۔ اس لئے اُس نے "دستور کی تبدیلی، امور خارجہ، دفاع، خارجی تجارت، اور تاج کی اراضیات کے انتظام" کے اختیار کو قطعی طور پر شہنشاہی حکومت کے لئے محفوظ کر دیا تھا۔ ان محفوظات کا تذکرہ ڈرہم رپورٹ میں کہیں کہیں مبہم طور پر اور بغیر کسی تفصیل کے کیا گیا ہے لیکن بُلّر نے اپنی کتاب "نو آبادیات کے لئے ذمہ دار حکومت" میں انھیں صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان کی پوری طرح تعریف کی ہے۔ مگر یہ تمام پابندیاں ذمہ دار حکومت کے تجربہ کے ابتدائی دور ہی میں ختم ہو گئیں۔ ان میں سے ایک یعنی شہنشاہی بندوبست اراضی کے اغراض کے لئے پبلک اراضیات پر شہنشاہی نگرانی تو رپورٹ ہی میں دم توڑنے لگی۔ وہ تو ذمہ دار حکومت کے ابتدائی اصولوں ہی کے مغائر تھی۔ دوسری پابندیاں نسبتاً بعد میں اُٹھنی گئیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ۱۸۵۹ء ہی میں تجارت پر شہنشاہی حکومت کی نگرانی ختم ہو چکی تھی۔ یہ دراصل اس تجارتی نظریہ کا ایک لازمی جز تھا جس پر انیسویں صدی کی ابتدا میں برطانوی حکومت کار بند تھی۔ خارجی پالیسی اور دفاع پر شہنشاہی اختیار کو ٹرنٹ کے واقعہ کی وجہ سے سخت دھکہ پہنچا۔ اور بعد میں تو یہ اختیار بھی اپنی فطری موت مر گیا۔ سب سے آخری تحفظ یعنی کینیڈا کے دستور کی نوعیت کے متعلق، یہ کہا جا سکتا ہے کہ گو وہ اصولاً ۱۹۳۱ء کے قانون وسٹ منسٹر کی منظوری تک قائم رہا، تاہم تجربہ میں آ کر وہ بھی مقامی اختیار کے تابع ہو گیا۔

ذمہ دار حکومت کے آغاز ہی سے کینیڈا کے تمام دستوری قواعد کی تشکیل میں کینیڈا کی آواز پوری آزادی کے ساتھ بلند ہوتی اور اپنا کام کرتی رہی ہے سچ تو یہ ہے کہ دستور کینیڈا کے تحریری عناصر، اکثر اوقات کینیڈا کے احساسات ہی سے بنتے رہے ہے حالانکہ اُن کی تشکیل زیادہ تر شہنشاہی پارلیمنٹ ہی میں ہوئی تھی ۱۸۴۰ء کے قانون اتحاد کا مسودہ دراصل جنوبی کینیڈا کے چیف جسٹس اسٹورٹ ہی کا تیار کردہ تھا۔

جسے شمالی کینیڈا کے رائے دہندوں کی تائید سے لندن بھیجا گیا تھا۔ ۱۸۶۷ء کے برطانوی شمالی امریکہ کے قانون کی شرائط تقریباً پوری طرح کینیڈائی تدبر کا نتیجہ تھیں اور اُس کی تمام ترمیمات (یعنی ۱۸۷۱، ۱۸۷۵، ۱۸۸۶، ۱۹۰۷ اور ۱۹۰۵ کی ترمیمات) اوٹاوا ہی میں تیار ہوئی تھیں اور شہنشاہی پارلیمنٹ سے برائے نام اس طرح منظور ہوئی تھیں کہ انھیں بجا طور پر مقامی قانون سازی ہی کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

۱۸۶۷ء کے برطانوی شمالی کینیڈا کے قانون کی منظوری کے طریقۂ کارروائی کا یہاں پر مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔ ۱۸۴۰ء کا قانون اتحاد تجربہ سے کارآمد ثابت نہیں ہوا۔ اس نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کے نسلی شعور کو بیدار کر دیا اور نسلی رقابت اور اغراض کے تصادم کا باعث بنا۔ اسمبلی میں اِن دونوں قومیتوں کی نظریں ایک دوسرے پر جمی رہیں اور کسی ایک صوبہ میں پبلک کاموں پر ضروری مصارف کی تلافی کے لئے دوسرے صوبہ میں بھی اسی قسم کے مصارف برداشت کرنے پڑے، چاہے وہ ضروری ہوں یا نہ ہوں۔ اس کا تنہا علاج یہ محسوس کیا گیا کہ عہدیہ (کنفیڈریشن) جیسا زیادہ آزاد اور غیر پابند اتحاد قایم کیا جائے۔ جس میں قومی اغراض کے لئے تو تعاون ہو لیکن مقامی معاملات کے لئے صوبائی علٰحدگی پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ اسی ضرورت کے باعث عہدیہ کی تحریک بڑی سرعت سے پھیلنے لگی۔ آزاد اور قدامت پسند پارٹیوں کے لیڈر جو ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے، اس معاملہ میں ساتھ ہو گئے۔ انھوں نے ایک مشترک وزارت تشکیل دی اور ۱۸۶۴ء میں عہدیہ کے مسئلہ پر غور کرنے کی غرض سے ایک کانفرنس طلب کی۔ اس کے بعد کینیڈا کے ساحلی صوبوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اور انھیں تعاون عمل کی دعوت دی۔ یہاں مقامی وفاق کی تحریک پہلے ہی سے موجود تھی۔ انھوں نے اپنی کانفرنس کو ملتوی کر کے اپنے نمائندے کیوبک کے جلسہ میں روانہ کئے۔ بڑے مباحثہ کے بعد کیوبک کانفرنس

نے ۷۲ قرار دادیں منظور کیں جن میں اس تجویز کا خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ اور بالآخر یہ تجویز یکم جولائی ۱۸۶۷ء کو برطانوی شمالی کینیڈا کے قانون کی شکل میں برطانوی پارلیمینٹ سے منظور ہو گئی۔ کینیڈا والوں نے اس کا جو مسودہ پیش کیا تھا اس میں سوائے اس کے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی کہ مجوزہ الفاظ "سلطنت کینیڈا" کو "قلمرو کینیڈا" سے بدل دیا گیا۔

وفاق کینیڈا نے برطانوی سلطنت میں ایک نئے عنصر کو داخل کر دیا جس میں ذمہ دار حکومت کا وہ تصور شامل تھا جو برطانوی شہنشاہیت کے دوسرے ملکوں کے دستوری ارتقاء کو آگے بڑھا سکتا تھا۔ وفاق کا مقصد یہی ہے کہ مرکزی حکومت اور صوبوں کے کاموں میں تفریق اور اُن کے باہمی تعلقات میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ صوبائی حکومتیں، مقامی صوبہ جاتی قانون سازی کے ایسے محدود اختیار کے ساتھ قائم رہیں جس کا تعلق صوبائی ملکیت، صوبائی اراضیات، صوبائی اغراض کے لئے قرضہ جات، راست صوبائی محصول بندی، صوبائی کمیٹیوں کی تشکیل اور پبلک اداروں کی دیکھ بھال سے تھا۔ قلمروی اہمیت کے جملہ امور قلمروی حکومت کے تفویض کر دیے گئے۔ مثلاً قرضہ عامہ، کرُوڑگیری اور آبکاری، تجارت، ریلوے، بحری، فوجی اور سیول خدمات کا انضباط، قانون فوجداری، شادی اور طلاق کی نگرانی، زر بنک، کرنسی اور دیوالیہ کا انضباط نیز بقیہ اختیارات یعنی ایسے جملہ اختیارات جنھیں صراحت کے ساتھ صوبائی حکومتوں کے لئے مختص نہ کیا گیا ہو، قومی حکومت کے قبضہ میں رہے۔ پہلے کی طرح مرکزی اور صوبہ جاتی حکومتوں کا خاکہ، برطانوی نمونہ ہی پر تیار کیا گیا۔ قلمرو کو ایک گورنر جنرل کے زیر حکومت کر دیا گیا، جو تاج کی طرف سے مامور ہوتا تھا۔ اور یہ گورنر جنرل قلمرو کے مختلف صوبوں کے لئے لفٹننٹ گورنر مقرر کرتا تھا۔ اُس کے مشورہ اور امداد کے لئے ایک پریوی کونسل ہوتی تھی جو قلمروی حکومت کے ایسے ارکان پر مشتمل ہوتی تھی جنھیں قلمرو کی مقننہ میں پارلیمانی اکثریت حاصل ہوتی تھی۔ قلمروی مقننہ کے دو ایوان ہوتے تھے۔ ایک سینات، جس میں صوبوں کے ارکان

ہوتے، دوسرے ایوان عام جو اُن ارکان پر مشتمل ہوتا تھا جنھیں عوام، آبادی کے لحاظ سے مقررہ حلقوں سے منتخب کرتے تھے۔ ایوان عام انگلستان کی طرح یہاں بھی جملہ امور میں زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ گورنر جنرل کی طرح صوبہ کے لفٹنٹ گورنر کو بھی ایک ایسی مجلس وزراء مشورہ دیتی تھی جو صوبائی مقننہ میں پارلیمانی اکثریت رکھتی ہو۔ یہ امر صوبوں کے صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ چاہے وہ ایک ایوانی مقننہ قائم کرے یا دو ایوانی۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ برطانوی شمالی کینیڈا کے قانون کے ذریعہ ذمہ دار حکومت کے بنیادی اصول کا تحفظ، خاص برطانوی طریقہ پر عمل میں آیا تھا۔ ذمہ دار حکومت کے دائرہ کے تعین کی کوشش نہیں کی گئی۔ یقیناً یہ تعجب کی بات ہے۔ ۱۸۳۹ء میں ذمہ دار حکومت کی تعریف اس لئے نہیں کی گئی تھی کہ اس وقت اس کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ اس وقت سے بتدریج اور باقاعدہ طور پر، مگر بحث و حجت کی ایک طویل جنگ کے بعد، ذمہ دار حکومت کا دائرہ بلاشبہ وسیع ہوتا گیا۔ لیکن اس کے باوجود آئندہ کے امکان کو برطانوی شمالی کینیڈا کے قانون میں بغیر تعین و تحدید ہی کے چھوڑ دیا گیا۔ کینیڈا میں ذمہ دار حکومت کی بنیادی طور پر یہ "غیر تحریری" خصوصیت، جسے برطانوی شمالی کینیڈا کے قانون میں بحال رکھا گیا، یقیناً غیر معمولی ہے۔ اُسے لارڈ ڈرہم کی پیش آگاہیوں کے جواز کے طور پر پیش کیا گیا۔ لارڈ ڈرہم نے اسی امکان کے تصور کا ذکر اپنی رپورٹ میں اس طرح کیا ہے۔

"علاج کے لئے نہ تو اس کی ضرورت ہے کہ اصول حکومت میں کوئی تبدیلی کی جائے اور نہ اس کی کہ کوئی نیا دستوری نظریہ ایجاد کیا جائے۔ . . . . یہ تبدیلی محض ایک مراسلہ کے ذریعہ جس میں یہ ہدایتیں موجود ہوں، عمل میں لائی جانی چاہیئے"۔

رفتار عالم

یورپ پچھلے مہینوں میں سردی کے موسم کے سبب سے خیال تھا کہ روس میں جنگی سرگرمیاں ذرا ٹھنڈی رہیں گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ روسیوں نے بڑی بہادری اور جرأت سے جرمنوں کے سیلاب کو پیچھے ڈھکیلنے کی کوشش کی اور بڑی حد تک اس میں کامیابی بھی حاصل کی۔ اب اس وقت بھی اسمولینسک کے قریب بڑی غضبناک لڑائی ہو رہی ہے۔ اس زمانہ میں برف پگھلنے کی وجہ سے روس کے میدانوں میں اتنی کیچڑ ہو جاتی ہے کہ کوئی بڑا جنگی اقدام کرنا دشوار ہے۔ چنانچہ جرمنوں کا اقدام تو رُک گیا لیکن موسم کی خرابی روسیوں کی جنگی سرگرمی میں کوئی خلل نہیں ڈال سکی۔ اگر آئندہ تین چار ماہ میں روسی اپنے حریف کو روکے رہے تو اس کا بڑا دور اس اثر ہوگا۔ ممکن ہے کہ مغربی سرحد پر انگلستان دوسرا محاذ قائم کردے اور جس خطرہ سے جرمنی بچنا چاہتا تھا وہ پیدا ہو جائے۔ یورپ کی جنگ ہماری رائے میں فیصلہ کن صورت اسی وقت اختیار کرسکے گی جبکہ جرمنی کو مغربی محاذ پر بھی مصروف کرلیا جائے گا۔ اور ایسا ہونا جلد ضروری ہے تاکہ روس کی موجودہ صورت حال سے پورا فائدہ اُٹھایا جاسکے۔

جرمن لوگ بھی مغربی محاذ کے خطرہ کی پیش بندی کر رہے ہیں۔ چنانچہ پچھلے ہفتہ میں فرانس میں جو صورت حالات پیدا ہوئی ہے وہ اسی کے ضمن میں ہے۔ موسیو لاوال کے فرانسیسی کابینہ میں آجانے سے حکومت فرانس اور بھی زیادہ جرمن اثر میں آگئی ہے۔ چنانچہ یہ خبریں بھی موصول ہوئی ہیں کہ فرانس نے اپنا بحریہ جرمنی کے حوالہ کرنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ اگر ان میں کچھ صداقت ہے تو یہ خبریں بڑی تشویش ناک ہیں۔ فرانسیسی جہازوں کی بدولت بحر روم میں بحری

قوت کے توازن پر زبردست اثر پڑے گا۔ عام طور پر یہ بھی خیال کیا جا رہا ہے کہ شمالی افریقہ میں روملؔ کو جو مدد مل رہی ہے وہ فرانس اور اس کی نوآبادیوں کے توسط سے مل رہی ہے۔ فرانس کی مشرقی ریلوے لائن بھی اس وقت کم و بیش جرمنوں کے تصرف میں ہے جس کو فوجی نقل و حرکت کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اگر انگریزوں نے جرمنی کے خلاف اپنا مغربی محاذ فرانس میں قائم کیا تو اس کا بھی اندیشہ ہے کہ کہیں فرانسیسی فوجیں جرمنوں کے دوش بدوش فرانس کی مدافعت کے بہانہ سے نہ لڑیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام خطرے برطانوی مدبروں کے سامنے ہیں جن کے باعث وہ مغرب میں دوسرا محاذ قائم کرنے میں ابتک تامل کرتے رہے ہیں۔ اگر انگریزوں کو یہ قوی اندیشہ ہوا کہ فرانس کلیتہً جرمنی کا ساتھ دے گا تو ممکن ہے وہ ناروے میں دوسرا محاذ قائم کریں اگرچہ اس میں ان کے لئے فاصلہ کی دشواریاں ضرور ہیں۔ اور اگر یہ دیکھا گیا کہ فرانس پہلے ہی سے جرمنی کے ساتھ پوری طرح تعاون کر رہا ہے اور برطانوی مفاد و مقاصد کو جو نقصان پہونچا رہا ہے اس سے زیادہ نقصان پہونچا ناممکن نہیں تو ممکن ہے فرانس ہی میں دوسرا محاذ قائم کیا جائے جیسا کہ سینٹ نازیر اور بولونین پر حال میں فوجیں اتارنے سے مستقبل کے متعلق کچھ اشارہ ملتا ہے۔ حال ہی میں ہٹلر نے جنرل رنس ٹڈ کو جو فرانس بھیجا ہے اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جرمنی برطانوی اقدام کے خلاف روک تھام کرنا چاہتا ہے اور اس کی پوری کوشش یہ ہو گی کہ اہل فرانس کو انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے آمادہ کرے۔ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ہٹلر ایک پرانے جواری کی طرح اپنا آخری پانسہ پھینکنے کی تیاری کر رہا ہے یعنی جون یا جولائی میں وہ انگلستان سے فیصلہ کن قسمت آزمائی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ ایسی حالت میں کامیابی کے ساتھ انگلستان پر حملہ کر سکے گا جبکہ اس کی فوج کا بہت بڑا حصہ روس میں پھنسا ہوا ہے اور اس طور پر پھنسا ہوا ہے جیسے سانپ کے منہ میں چھچھوندر کہ جسے نہ وہ نگل سکتا ہے اور نہ باہر نکال سکتا ہے۔ لیکن اس سے کوئی بات بھی بعید نہیں ہے۔ انگلستان کے ارباب حل و عقد یہ جانتے ہیں اور اسی لئے ہر ناگہانی صورت

کے لئے تیار ہیں۔

ہندوستان سر اسٹیفورڈ کرپس برطانوی کابینہ کی تجاویز ہندوستان لے کر آئے اور تین ہفتے نئی دہلی میں رہکر انگلستان واپس جا چکے ہیں۔ ان تین ہفتوں میں نئی دہلی تمام دنیا کی نگاہوں کا مرکز بن گئی تھی۔ وجہ ظاہر ہے۔ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ اب تمام دنیا کے لئے اہمیت رکھنے لگا ہے۔ اور بڑی حد تک یہ کہنا درست ہوگا کہ مشرق کی جنگ کا فیصلہ ہندوستان کے تعاون عمل پر منحصر ہے۔ ہمیں ابھی حال میں ملایا اور برما میں جاپان کو جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کو ان ملکوں کے باشندوں کا عملی تعاون نہ حاصل ہونے کے سبب سے بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لہٰذا جاپان کے خلاف جنگ جیتنے کے لئے لابدی ہے کہ حکومت ہند اور ہندوستان کے باشندوں میں پوری طرح تعاون عمل کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہو۔ روس اور چین کے تجربوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اب جنگ صرف پیشہ ور سپاہ کی مدد ہی سے نہیں لڑی جاتی بلکہ عوام الناس بھی اس میں براہ راست حصہ لے سکتے ہیں۔

سر اسٹیفورڈ کرپس کی تجاویز کا مقصد بھی یہی تھا کہ فی الحال ایک عارضی سمجھوتہ کے ذریعے ہندوستان میں ایسی سیاسی صورت حال پیدا کر دی جائے کہ اہل ہند موجودہ جنگ میں محض کرایہ کے ٹٹو کی حیثیت سے حصہ نہ لیں بلکہ اپنے قومی وقار اور قومی آزادی کی خاطر جوش اور تندہی سے اس میں شرکت کریں۔ سر اسٹیفورڈ کی تجاویز دو حصوں پر مشتمل تھیں۔ ایک وہ حصہ جس کا تعلق جنگ کے بعد کے حالات سے ہوگا۔ یعنی یہ کہ جنگ کے ختم پر ہندوستان کو قلمروئی نوعیت کی مکمل آزادی حاصل ہو جائے گی اور اس کو یہ حق بھی ہوگا کہ چاہے تو برطانوی دولت مشترکہ سے علیحدہ ہو جائے۔ ہندوستان کا آئندہ دستور خود اہل ہند اپنے منتخب شدہ نمائندوں کے ذریعہ سے وضع کریں گے۔ اس کا امکان بھی ہوگا کہ مختلف علاقہ جاتی وحدتیں یا منطقے اپنے یونین الگ الگ قائم کر لیں۔ اس طرح ہندوستان میں دو یا اس سے زائد یونین

قائم ہو سکیں گے جو اپنے تمام اندرونی اور بیرونی معاملات میں آزاد ہوں گے۔

برطانوی کابینہ کی تجاویز کا دوسرا حصہ موجودہ انتظامات کے متعلق تھا۔ چونکہ جنگ کے سبب سے اس وقت کوئی بنیادی دستوری تبدیلی ممکن نہیں تھی اس لئے توقع کی گئی تھی کہ مرکز میں ایک قومی حکومت قائم ہو جائے گی جو اس ملک کے مختلف سیاسی عناصر پر مشتمل ہو گی تاکہ جنگ کے انتظام میں پبلک کا زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل ہو سکے۔ یہ قومی حکومت وائسرائے کے آگے جوابدہ ہوگی۔ رکن دفاع کے اختیارات محدود ہوں گے تاکہ کمانڈر ان چیف متحدہ اقوام کی جنگی تدابیر کے بموجب ہندوستان کی مدافعت کر سکے۔ انگلستان کی جنگی کابینہ میں ایک ہندوستانی ذمہ دار رکن شرکت کرے گا تاکہ ہندوستان اور برطانیہ کے جنگی مقاصد میں اس کے توسط سے ہم آہنگی ممکن ہو سکے۔

سر اسٹیفورڈ نے ان تجاویز کے متعلق ملک کی تمام سیاسی جماعتوں سے گفت وشنید کی اور آخر تک کچھ ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ مفاہمت کی کوئی نہ کوئی شکل ضرور نکل آئے گی۔ لیکن بعض بنیادی اختلافات کے سبب سے یہ صورت نہ نکل سکی۔ گفتگو کی طوالت اور بعد میں ناکامی کا سبب یہ تھا کہ کانگریس ملکی دفاع کو پوری طرح نمائندہ ہندوستانیوں کے تحت کرنا چاہتی تھی اور مرکز میں قومی حکومت کے قیام پر وہ بہت زور دے رہی تھی تاکہ وائسرائے منتخب شدہ نمائندوں کی کابینہ کے سامنے جوابدہ ہو جائے۔ دراصل ملکی دفاع کو کلیتہً منتخب شدہ ہندوستانیوں کے تحت اسی وقت کرنا ممکن ہوگا جبکہ مرکز میں قومی حکومت قائم ہو جائے۔ لیکن ایسا کرنا اس وقت تک کیسے ممکن ہے جب تک کہ بنیادی دستوری تبدیلی نہ کی جائے۔ دستوری تبدیلی کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان کے مختلف سیاسی عناصر اس امر کے متعلق کوئی مفاہمت کر لیں کہ انگریزوں سے ہندوستانیوں کو جو اختیارات منتقل ہوں گے انھیں وہ آپس میں کس طرح سے تقسیم کریں گے تاکہ ایسی دستوری صورت حالات پیدا ہو جائے کہ کوئی ایک گروہ یا فریق دوسرے پر ظلم و زیادتی نہ کر سکے۔ کیا یہ صورت حالات محض نئی دستوری روایات کے ذریعہ سے وجود میں

آسکتی ہے جیساکہ کانگریسی لیڈروں کا خیال ہے؟ دراصل ہندوستان کا دستوری مسئلہ اس وقت تک قابل اطمینان طور پر حل نہیں ہوسکتا جب تک کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں کوئی باعزت سمجھوتہ نہیں ہوجاتا۔ اس کے علاوہ ہندوستانی ریاستوں کی حیثیت بھی خود ان والیان ریاست کے مشورہ اور مرضی سے متعین ہوجانی چاہئے۔ غرضکہ یہ سب مسائل بہت بحث و مباحثہ چاہتے ہیں۔ اس وقت جبکہ جاپان کے ہوائی حملے ہندوستان پر شروع ہوچکے ہیں ان دستوری مباحث میں قومی وقت کو ضائع نہیں کیا جاسکتا۔

سراسٹیفورڈ کی لائی ہوئی برطانوی پیشکش کو ہندوستان کی سب اہم سیاسی جماعتوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا ہے لیکن ان سب کے ایسا کرنے کی وجوہ مختلف ہیں۔ کانگریس نے ان تجاویز کو اس واسطے مسترد کیا کہ ہندوستان میں زمانہ جنگ میں قومی کابینی حکومت کا قیام ممکن نہ تھا۔ مسلم لیگ نے اس وجہ سے ان تجاویز کو مسترد کیا کہ پاکستان کے حق کو غیر مبہم اور واضح الفاظ میں برطانوی حکومت نے تسلیم نہیں کیا اگرچہ مستقبل میں متعدد یونین قائم کرنے کے امکان سے ایک حد تک پاکستان کا مطالبہ پورا ہوجاتا ہے۔ لیکن مختلف یونین قائم کرنے کی جو تدابیر پیش کی گئی ہیں ان کے باعث عملی اعتبار سے ان کا وجود ممکن نہ ہوگا۔ برطانوی تجاویز کو مسلم لیگ نے اس واسطے غیر تشفی بخش قرار دیا کہ ان کے بموجب مسلمانوں کو اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرنے کا حق نہیں ملتا۔ ہندوستان کا مسئلہ بین اقوامی مسئلہ ہے۔ اس براعظم کے مختلف گروہوں میں اتنے اختلافات پائے جاتے ہیں کہ نہ ان پر پردہ ڈالا جاسکتا ہے اور نہ انھیں دوسری تنقیحات کے ساتھ خلط ملط کیا جاسکتا ہے لیکن مسلم لیگ دوران جنگ کے لئے کسی ایسے عارضی سمجھوتہ کے لئے تیار ہے جس کی بدولت آئندہ پاکستان کے حق کو متاثر نہ کیا جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ سراسٹیفورڈ کرپس اور ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کی گفت و شنید کی ناکامی کے بعد کیا ہوگا؟ خود کانگریس کے لیڈر اس وقت چہ کنم میں ہیں۔ انگریزی حکومت سے زمانہ سابق کی بے اعتباریوں کے باعث ان کا سمجھوتہ بہت دشوار معلوم

ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ نازی اور فاشتی فلسفۂ حیات کے سخت مخالف ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو اور راجگوپال چاری نے گزشتہ ہفتہ اپنی تقریروں اور بیانات میں اہل ہند کو شکست پسندی کے خیالات اپنے دلوں سے نکال دینے اور حملہ آور کا مقابلہ کرنے کی پرزور دعوت دی ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ ممکن ہے مسٹر جانس کے ذریعہ مسٹر روزولٹ کو پنچ مقرر کیا جائے گا تا کہ وہ انگلستان اور ہندوستان اور خود ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں میں کوئی سمجھوتہ کرا دیں۔ مسٹر جانس نے اہل امریکہ کی طرف سے ہندوستانیوں سے تعاون کی توقع ظاہر کی ہے تا کہ امریکہ اس وقت ہندوستان کو جو مدد دے وہ بیکار نہ جائے۔ اُمید ہے کہ اس ضمن میں عنقریب کوئی نئی صورت پیدا ہوگی تا کہ ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کے جوش عمل کو انصرام جنگ کے لئے باعزت طور پر استعمال کیا جا سکے۔

ملایا، برما اور جزائر شرق الہند پر قبضہ ہو جانے سے جاپان اس وقت چاہے تو فوجی پیش قدمی کا رخ آسٹریلیا کی طرف پھیر دے اور چاہے تو ہندوستان کی طرف پھیر دے۔ ہندوستان پر ہوائی حملے شروع ہو چکے ہیں۔ مشرقی ساحل پر کسی وقت بھی جاپانی فوجیں اتر سکتی ہیں۔ ان حالات میں اہل ہند کا فرض ہے کہ وہ مقاومت کے لئے تیار رہیں اور اگر دشمن سے مقابلہ کی نوبت آئے تو نہایت اطمینان، سکون قلب اور جرأت کے ساتھ اپنے وطن کی حفاظت کریں اور شکست خوردگی کی ذہنیت کو اپنے پاس پھٹکنے تک نہ دیں۔

دوسرے رسائل

The Indian Journal of Political Science بابتہ جنوری۔ مارچ ۱۹۴۲ء۔ اس اشاعت کے خاص مضامین یہ ہیں۔ (۱) بعض اسلامی منفکرین کے سیاسی نظریات"۔ اس مضمون میں جب پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی نے ابن فارابی، ابن رشد، ابن طفیل، غزالی اور ماوردی کے سیاسی نظریات کی تشریح کی ہے اور بتایا ہے کہ ان منفکرین کے خیالات سے اب تک کس قدر لاپروائی برتی گئی ہے اس ضمن میں مملکت کے آغاز، مملکت کی ساخت، اقتدار اعلیٰ، بین اقوامیت غرضکہ نہایت اہم سیاسی مسائل کی نسبت ان اسلامی منفکرین کے جو تصورات تھے انھیں پروفیسر شروانی صاحب نے نہایت وضاحت سے پیش کردیا ہے۔

(۲) مسٹر ای اشیرواتھم نے اپنے مضمون "زمانہ جنگ میں فرد کی آزادی" میں بعض بنیادی مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ موصوف کا خیال ہے اور صحیح ہے کہ جنگ کے زمانہ میں آزاد سے آزاد ملک میں بھی انفرادی آزادی پر حدود قائم کرنی پڑتی ہیں۔ چنانچہ انگلستان میں جنگ شروع ہونے سے قبل پارلیمنٹ نے اگست ۱۹۳۹ء میں "ایمرجنسی پاورس ایکٹ" منظور کیا تھا جس کی روسے عاملہ کو نہایت وسیع اختیارات حاصل ہوگئے۔ ہوم سکریٹری کو اس قانون کے بموجب اختیار حاصل ہے کہ ایسے ضوابط نافذ کرے جو پارلیمنٹ میں پیش ہونے سے قبل ہی وہی حکم رکھیں گے جو پارلیمنٹ میں منظور شدہ قانون کی نوعیت ہوا کرتی ہے۔ پارلیمنٹ زیادہ سے زیادہ ہوم سکریٹری سے درخواست کرسکتی ہے کہ وہ ان ضوابط میں سے کسی کا مسودہ دوبارہ تیار کرے۔ اس قانون کے تحت ہر قسم کا پروپگنڈا اور ہر قسم کے جلسے ممنوع قرار دئے جاسکتے ہیں۔ مئی ۱۹۴۱ء میں جنگ کے سلسلہ میں پارلیمنٹ میں ایک قانون منظور ہوا جس کے بموجب حکومت کو یہ اختیار

حاصل ہوگیا ہے کہ جس شخص سے چاہے اپنی مرضی کے مطابق کوئی کام کرنے کو کہے اور اپنے حسب صوابدید اس کو تنخواہ دے۔ افراد کی تمام ملکیت پر حکومت اگر ضروری سمجھے تو تصرف حاصل کرے صنعتی اداروں پر حکومت قبضہ کرسکتی ہے اور مزدوری اور منافع متعین کرسکتی ہے یا ملکی مالیات کو جس میں بنک بھی شامل ہیں اپنی نگرانی میں لے سکتی ہے۔

غرضکہ موجودہ جنگ ہمہ گیر نوعیت رکھتی ہے۔ اجتماعی مفاد کے مدنظر افراد کو اپنی آزادی قربان کرنی پڑتی ہے کہ بغیر اس کے جنگ کامیابی کے ساتھ نہیں چلائی جا سکتی۔

تنقید و تبصرہ

World Economic Survey 1939-41 } لیگ آف نیشنز جنیوا۔ ہندوستان میں ملنے کا ۸۰ کرزن
ضخامت ۲۷۵ صفحات قیمت سوا پانچ روپئے۔

عوام تو کیا خاصے پڑھے لکھے حلقوں میں یہ یقین کیا جا چکا ہے کہ مجلس اقوام ختم ہو گئی۔ لیکن تذکرہ بالا کتاب دیکھ کر یہ پتہ چلتا ہے کہ لیگ ختم نہیں ہوئی بلکہ اس سے بڑھ کر حیرانی یہ ہوتی ہے کہ لیگ نہ صرف قائم ہی ہے بلکہ کچھ نہ کچھ کام بھی کر رہی ہے۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ سیاسی حیثیت سے لیگ کا خاتمہ ہو چکا ہے اور صحیح معنوں میں تو یہ خاتمہ اس وقت ہی ہو گیا تھا جب لیگ نے منچوریا کے معاملہ میں جاپان کے سامنے ہتھیار ڈال دئے تھے اور کاری ضرب اس پر اس وقت لگی تھی جب ایبے سینیا کے معاملہ میں لیگ کے اراکین کے خوشنما اور دلفریب وعدوں کا پول کھل گیا۔ لیکن باوجود اس سیاسی خودکشی کے اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ بطور ایک ثالثی ادارے کے لیگ کا کام نہایت قابل قدر رہا ہے اور اس جنگ کے زمانہ میں ایسے بین اقوامی ادارہ کی ضرورت تو اور بھی شدت سے محسوس ہو رہی ہے جنگ چھڑنے کے بعد لیگ کو اکثر شعبے مجبوراً بند کرنے پڑے لیکن یہ نہایت مسرت کا مقام ہے کہ شعبۂ معاشیات اور مالیات بند نہیں کیا گیا اور اس نے اپنا مفید کام جاری رکھا۔ ۱۹۳۲ سے یہ شعبہ ہر سال کے اہم معاشی واقعات پر تبصرہ کی صورت میں ایک کتاب شائع کرتا ہے اور یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی نویں جلد ہے۔ البتہ یہ بجائے سالانہ تبصرہ کے دو سالہ تبصرہ ہے اس کتاب کے دس ابواب میں پہلے باب میں یہ بتلایا گیا ہے کہ کسی طرح امن کے زمانہ سے معیشت کو جنگ کے زمانہ کی طرف آنا پڑا۔ اس دور کی اہم تبدیلیاں کیا تھیں اور کن

مسایل کا سامنا کرنا پڑا۔ اس دور کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ معاشیات کے وہ تمام اصول جو آزاد تجارت اور انفرادی آزادی کے کاروبار پر مبنی تھے ان پر گرہن چھا گیا اور معیشت کو بجائے انفرادی منافع کے اصول کے حکومت کی ضروریات کے اصول پر چلانا پڑا۔ اس اصول کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پیدایش دولت پر حکومت کی نگرانی اور جہاں نگرانی سے کام نہ چلے حکومت کا قابو رکھا جائے۔ چنانچہ کتاب کے دوسرے باب میں تبلایا گیا ہے کہ کس طرح (صنعت) تجارت۔ زراعت اور محنت پر حکومت کا تصرف اور دباؤ رہا جب تجارت انفرادی نفع کی خاطر نہ ہو اور بازاری قیمتیں طلب و رسد کے قانون کے تحت نہیں بلکہ حکومتوں کے فرمانوں کے تحت مقرر ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ جو چیزیں چاہیں وہ نہیں خرید سکتے۔ پیدایش دولت پر حکومت کے قابو رکھنے کی وجہ سے صرف کی رسد بندی بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ کتاب کے تیسرے باب میں یہ بتلایا گیا ہے کہ کس طرح مختلف ممالک میں رسد بندی کی گئی اور اس کا معیار رہایش پر کیا اثر پڑا؟ ہندوستان میں اس وقت صرف پٹرول کی بڑے پیمانہ پر رسد بندی کی گئی ہے اور کم و بیش ہر شخص اس سے غیر مطمئن نظر آتا ہے اگرچہ جنگ کے زمانہ میں ایثار کرنے کی ضرورت کی وجہ سے اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی جا سکتی۔ جب ہندوستان میں صرف ایک شئے کی رسد بندی پر صارفین یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے حقوق پر چھاپا مارا گیا ہے تو ان ممالک میں صارفین کی کیا حالت ہوگی جہاں زندگی کی کم و بیش ہر ضرورت پر کڑی رسد بندی کی گئی ہے۔ محوری ممالک میں رسد بندی کا سلسلہ ۱۹۳۲/۱۹۳۳ کے زمانہ سے شروع ہے اور وہ لوگ قریباً اس کے عادی ہو چکے ہیں اس لئے ان ممالک کو امن کے زمانہ سے جنگ کے زمانہ میں داخل ہونے میں اتنی دشواریاں پیش نہیں آتیں جتنی کہ جمہوری ممالک کو پیش آئی ہیں۔

جنگ کا دوسرا اہم اثر یہ پڑا ہے کہ حکومتوں کے اخراجات بھی بڑھ گئے ہیں۔ جنگ کے شروع میں حکومت انگلستان کا روزانہ خرچ قریباً آٹھ کروڑ روپیے تھا اس وقت یہ خرچ قریباً

سولہ کروڑ روپیہ ہوگیا ہے اور شیطان کی آنت کی طرح بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ چوتھے باب میں یہ بتلایا گیا ہے کہ مختلف ممالک میں حکومتوں کا خرچ کتنا بڑھا ہے۔ ان بڑھتے ہوئے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے کیا کیا محاصل عاید کئے گئے اور جب محاصل عاید کرنے سے بھی کام نہ چلا تو پھر کس طرح لوگوں سے قرضے حاصل کئے گئے۔ سود کی شرحوں اور قیمتوں کا کیا حال رہا اور قیمتوں پر قابو حاصل کرنے کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کی گئیں۔ کتاب کے باقی چھ ابواب میں اسی قسم کے دوسرے اہم مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہم اس کتاب کے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتے ہیں

ا۔ ا۔ ق

Review of the Co-operative Movement in India, 1939-40 — صفحات ۹۲ قیمت بارہ آنہ ملنے کا پتہ ریزرو بنک آف انڈیا بمبئی۔

یہ رپورٹ مختصر مگر بہت مفید ہے جو حضرات ہندوستان میں اس تحریک کی موجودہ حالت کا پتہ چلانا چاہیں اور ان کے پاس وقت کم ہو ان کو اس رپورٹ کا خاص طور پر مطالعہ کرنا چاہیے یہ رپورٹ ہمارے طلباء کے لئے بھی بہت مفید ہو سکتی ہے۔ اس وقت ہندوستان میں انجمن ہائے امداد باہمی کی جملہ تعداد ایک لاکھ نتیس ہزار ہے اراکین کی تعداد ساٹھ لاکھ اور جملہ کاروباری سرمایہ ایک سو سات (۱۰۷) کروڑ ہے لیکن اس وقت اس تحریک کی مالی حالت تسلی بخش نہیں۔ ۱۹۴۰ کے اخیر میں انجمنوں کے دیئے ہوئے قرضوں کی مقدار تیئیس کروڑ سے کچھ زاید تھی لیکن ان میں سے دس کرڑور کے قرضے ایسے تھے جو وقت پر ادا نہیں کئے گئے تھے، بعض صوبوں میں مثلاً بنگال۔ بہار۔ اڑیسہ اور برار میں تو یہ تحریک قریبًا ناکام ثابت ہو چکی ہے۔ ریزرو بنک نے ان انجمنوں کی حالت کو درست کرنے کے لئے جو تجاویز پیش کی ہیں ان کا بہ غور مطالعہ ہر امداد باہمی کی تحریک کے ہمدرد کو کرنا چاہیے

میں تو اب اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ لوگ جن کی معاشی حالت پست ہے اُن کے لئے "اتحاد باہمی" زیادہ مفید نہیں حالانکہ ہندوستان میں جو شاہی زرعی کمیشن قائم ہوا تھا اس نے تو کہا تھا کہ اگر ہندوستان میں امداد باہمی کی تحریک ناکام رہی تو پھر ہندوستان کی تمام امیدوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اتحادی حلقوں میں میرے اس بیان پر بہت نے ناک بھوں چڑھائی ہے۔ اور میرے اس بیان کو بالکل مہمل اور بے معنی خیال کیا جا رہا ہے۔ لیکن آج سے آٹھ سال قبل جب میں نے غیر محدود ذمہ داری کے متعلق لکھا تھا تو بھی مجھ پر اس قسم کے حملے کئے گئے تھے لیکن آج اکثر اتحادی حلقے اس پر متحد ہو گئے ہیں کہ غیر محدود ذمہ داری سے اس تحریک کو بہت نقصان پہنچا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ دن دور نہیں جب میرے اس بیان کو کہ "اتحادی باہمی کی تحریک معاشی پستی والے ملکوں کے لئے چنداں مفید نہیں" زیادہ حقیقت کے قریب سمجھا جائے گا۔ اسی رپورٹ کے بعض حصوں میں اجمالاً اس کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ پست معاشی حالت والے ملکوں کے لئے تو صرف حکومت کی طرف سے پیدائش دولت کی طرف تیزی اور شدت سے حصہ لینے سے ان کی مشکلات دور ہو سکتی ہیں۔

(ا۔ ا۔ ق)

Report of the Committee on Co-operation in Madras, 1939-40 — مہتمم گورنمنٹ پریس مدراس ضخامت ۵۲۳ صفحات قیمت دو روپیہ بارہ آنے

امداد باہمی کی جتنی رپورٹیں اس وقت تک میری نظر سے گذری ہیں یہ رپورٹ ان میں سے بہترین اور بدترین رپورٹ ہے۔ اب حیران ہونگے کہ اس متضاد بیان سے کیا مطلب ہے۔ ایک رپورٹ بہ یک وقت بہترین اور بدترین کیسے ہو سکتی ہے اسی کا جواب کمیٹی کی ہیئت ترکیبی دیکھنے سے ملتا ہے۔ کو آپریشن ایک مخصوص مسئلہ ہے اور

اس پر غور و فکر کرنے کے لئے چند چیدہ مخصوص قابلیت کے افراد کی ضرورت تھی لیکن اس کمیٹی کے اراکین کی تعداد اکیس تھی جس میں سب ہی قسم کے لوگ شامل تھے۔ اس گنگا جمنی کمیٹی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بجائے کوئی ایک متفقہ رپورٹ پیش کرنے کے کمیٹی کے چار اراکین نے چار علیحدہ علیحدہ اختلافی نوٹ لکھے ہیں اور پانچ ممبروں نے مزید تشریحی نوٹ لکھے ہیں۔

کمیٹی کی رپورٹ میں جو چیز مجھے سب سے زیادہ قابل افسوس نظر آتی ہے وہ معاشیات میں سیاسیات کا دخل ہے۔ ہندوستان میں سیاسی طور پر پاکستان کا اعلان کرنے پر تو ہر ہندو چیں بہ جبیں نظر آتا ہے۔ لیکن مجھے اس رپورٹ میں یہ پڑھ کر سخت حیرانی ہوئی کہ کواپریشن میں بنک کاری کی حد تک صوبۂ مدراس میں وہی پاکستان والا اصول جھلک دکھا رہا ہے۔ آندھرا کے حصہ کے لئے ایک الگ یونین اور ایک الگ بنک کا مطالبہ کیا جا رہا ہے حالانکہ تجربہ بتاتا ہے کہ بنک کاری کے ادارے جتنے بڑے اور مضبوط ہوں اتنی ہی مالی حالت بہتر رہتی ہے اور وہ ملک کی زیادہ خدمت کر سکتے ہیں۔

جہاں تک مدراس میں کواپریشن کی ترقی اور نشوونما کا تعلق ہے اس رپورٹ میں اس کا نہایت عمدہ خاکہ کھینچا گیا ہے لیکن تعمیری پہلوؤں کی حد تک اراکین کمیٹی میں شدید اختلاف نظر آتا ہے ایک گروہ تو وہی قدیم اصولوں کی پیروی کی رٹ لگا رہا ہے اور دوسرے گروہ کے بعض اراکین نے زیادہ حقیقت شناسی سے کام لیا ہے۔

آیا امداد باہمی کی انجمنوں کی ذمہ داری محدود ہو یا غیر محدود یہ مسئلہ اتحادی حلقوں میں آج کل خاصی دلچسپی کا موضوع بنا ہوا ہے۔ ہندوستان میں غالباً سب سے پہلے میں نے باضابطہ طور پر اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ امداد باہمی کی انجمنوں کی ذمہ داری غیر محدود نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ اس کی وجہ سے ذی حیثیت لوگ اس میں شامل نہیں ہوتے۔ دوسرے جہاں تک عملی ذمہ داری کا تعلق ہے غیر محدود ذمہ داری کا نفاذ بڑے پیمانہ پر عملاً نہیں کیا جا سکتا چنانچہ برما۔ بہار۔ اڑیسہ اور برار کا تجربہ میرے بیان کی تصدیق کرتا ہے۔ مجھے اس امر سے بہت مسرت ہوئی کہ کمیٹی کے ایک گروہ نے بھی یہی زاویۂ نگاہ پیش کیا ہے۔

(ا-ا-ق)

مفید درسی کتابیں کوڑیوں کے مول

جدید جغرافیہ دنیا۔ مکمل مع نقشہ جات ضخامت ۳۲۰ صفحے۔ یہ جغرافیہ پانچویں سے لیکر آٹھویں جماعت تک کام دے سکتا ہے۔ اصلی قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ۔ رعایتی قیمت صرف پانچ آنہ۔

تاریخ ہند۔ مکمل مع نقشہ جات ضخامت ۳۸۰ صفحے۔ طالب علموں کے لئے یہ بہت کارآمد کتاب ہے۔ اصلی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ رعایتی قیمت صرف چار آنہ سکہ عثمانیہ۔

جغرافیہ ملک سرکار عالی۔ مع رنگین نقشہ جات و تصاویر۔ یہ جغرافیہ تیسری اور چوتھی جماعتوں کے لئے لکھا گیا ہے۔ رعایتی قیمت صرف دو آنہ سکہ عثمانیہ۔

سلیس جغرافیہ دکن۔ رعایتی قیمت صرف ایک آنہ سکہ عثمانیہ۔

اصول حفظان صحت۔ مع تصاویر۔ بہت دلچسپ انداز میں حفظان صحت کے جملہ اُصول لکھے گئے ہیں۔ قیمت دو آنہ چار پائی سکہ عثمانیہ۔

المشتہر سید عبدالقادر اینڈ سنس تاجران کتب و پبلشرز مالک اعظم اسٹیم پریس
گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد (دکن)

کارنامہ حیدری۔ رائٹ آنریبل نواب سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم مملکت آصفیہ کی مکمل سوانح حیات مع خدمات و پیامات قلمبند کئے گئے ہیں جس میں متعدد تصاویر کاغذ اور چھپائی نفیس۔ قیمت مجلد (۲ ے ر)

مشاہیر ہند۔ اس کتاب میں چھ مشاہیر ہندوستانی یعنی آغا خاں۔ اقبالؔ۔ سر اکبر حیدری۔ بوس ٹیگور اور جواہر لعل نہرو کے سبق آموز سوانح حیات اور ان کی علمی ادبی کارناموں پر تبصرے قوم پرستی کے کارنامے اور ان کے پیغامات کو بہترین پیرایہ میں درج کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد (۱۰ ر)

المشتہر عبدالقادر اینڈ سنس تاجران کتب و پبلشرز مالک اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز

مالیات عامہ اور ہندوستانی مالیات

از

جناب ڈاکٹر جعفر حسن صاحب پی، ایچ، ڈی صدر شعبۂ عمرانیات
(جامعہ عثمانیہ سرکار عالی)

دیسی ریاستوں کی آمدنی ہندوستان میں چھوٹی بڑی تقریباً ۶ سو دیسی ریاستیں قائم ہیں جو پرانے زمانے کی یادگار یا برطانوی حکومت کی پروردہ ہیں ان ریاستوں کو مختلف درجوں کی اہمیت اور خود مختاری حاصل ہے، مالیات کے نقطۂ نظر سے بعض ریاستیں برطانوی صوبوں سے زیادہ اہم ہیں، مثلاً بھاؤنگر کی آمدنی سرحدی صوبے یا اڑیسہ سے زیادہ ہے. کشمیر کی آمدنی آسام سے زیادہ ہے. میسور کو سندھ سے زیادہ ملتا ہے اور حیدرآباد کی آمدنی متوسط صوبے یا بہار کی آمدنی سے ڈیوڑھی ہے.

آمدنی کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہم ریاستیں یہ ہیں۔

۱۔ حیدرآباد (سالانہ آمدنی کا معتبر اندازہ) ۸،۵۰،۰۰،۰۰۰

۲۔ میسور (" " ") ۳،۷۵،۰۰،۰۰۰

۳۔ جموں، کشمیر (" " ") ۲،۰۰،۰۰،۰۰۰

۴، ۵، ۶۔ گوالیار، بڑودہ، ٹراونکور (ہر ایک کی آمدنی) ۲،۵۰،۰۰،۰۰۰

۷۔ بھاؤنگر ۲،۰۰،۰۰،۰۰۰

۸، ۹۔ جودھپور، پٹیالہ (" ") ۱،۵۰،۰۰،۰۰۰

۱۰، ۱۱۔ جے پور، بیکانیر (ہر ایک کی آمدنی) ۱،۲۵،۰۰،۰۰۰

۱۲- اندور ۱،۱۵،۰۰،۰۰۰

ایک کروڑ اور پچاس لاکھ کے درمیان (گھٹتی ہوئی نسبت سے) آمدنی ناؤنگر، جوناگڈھ، بھوپال، کوچین، اودے پور، کولھاپور، موروی، ریوا اور گنڈول کی ہے۔

۵۴ ریاستیں مثلاً رام پور، الور، کپورتھلہ، نابھا، کوچ بہار، ٹونک، دتیا، راجکوٹ وغیرہ ایسی ہیں جن کی سالانہ آمدنی ۵۰ لاکھ سے کم اور دس لاکھ سے زیادہ ہے گویا ۶۰۰ ریاستوں میں سے

۲۵ ریاستوں کی آمدنی نصف کروڑ سے زیادہ ہے۔

۴۵ " " پچاس لاکھ اور دس لاکھ کے درمیان ہے بقیہ ریاستوں کی آمدنی دس لاکھ بھی نہیں۔

دس لاکھ اور ایک لاکھ کے درمیان آمدنی پانیوالی ریاستیں ۴۵، ہیں بقیہ ۳۷۵ ریاستوں کی آمدنی ایک لاکھ سے بھی کم ہے۔ یہ ریاستیں صرف نام کی ریاستیں ہیں۔ ان کا درجہ اور مرتبہ درحقیقت مثل جاگیرداروں کے ہے اُن میں سے دوسو نام نہاد "ریاستیں" ایسی ہیں جن کی آمدنی دس ہزار روپیہ سالانہ سے کم ہوتے ہوتے چند سو رہ جاتی ہے۔ دو ریاستیں نہارا اور ربلیری تو ایسی ہیں جنھیں سالانہ سَو روپیہ بھی نہیں ملتے!!

بیسیوں "ریاستیں" ہیں جن کا رقبہ ایک مربع میل بھی نہیں۔ اور کئی ریاستیں ایسی ہیں جن کی آبادی سو سے کم ہے!! ان مضحکہ انگیز ریاستوں سے لے کر چھوٹی بڑی تمام ریاستوں کی سالانہ آمدنی کا مُعتبر اندازہ بچپن کروڑ سے کم اور پچاس کروڑ سے زیادہ کیا جانا چاہیئے۔

آٹھ دس برس ہوئے سر ولیم بارٹن سابق رزیڈنٹ حیدرآباد نے تمام ریاستون کی آمدنی کا اندازہ ۴۸ کروڑ کیا تھا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ موجودہ زمانے میں تمام دیسی ریاستوں کی آمدنی پچاس یا بچپن کروڑ ہوگی۔

دیسی ریاستوں کے ذرائع آمدنی میں سب سے زیادہ اہم مالگزاری ہے۔ اس کے بعد آبکاری، کروڑگیری، ریل، جنگل، سود وغیرہ کو اہمیت حاصل ہے۔

بعض بعض ریاستوں کے خصوصی ذرائع آمدنی ہیں مثلاً بڑودہ اگرچہ خود دیسی ریاست اور برطانوی حکومت کی باج گذار ہے مگر اسے دوسری ریاستوں سے (جو کسی زمانہ میں بڑودہ کے تحت تھیں یا اس سے متعلق ہوگئی تھیں) چھ سات لاکھ روپیہ سالانہ خراج ملتا ہے۔ گویا بڑودہ خراج کی لین دار بھی ہے اور دین دار بھی۔

میسور کا شمار بلاشبہ ہندوستان کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ریاستوں میں ہوتا ہے۔ اس نے صنعت کو فروغ دیکر اپنی آمدنی میں خاصہ اضافہ کرلیا ہے۔ میسور کا ریشم، سونا، صندل، ہاتھی، اور جل بجلی سارے ہندوستان کے لیے قابل قدر اور قابل رشک ہے۔ سونے کی کان ہے تو میسور میں مگر اس سے زیادہ تر انگریزی کمپنی متفید ہوتی ہے ریاست کو البتہ خالص آمدنی کا ایک جزو ملتا ہے۔ تقریباً ۲۰ لاکھ سالانہ۔

حیدرآباد کو سکّے بنانے اور کاغذی روپیہ جاری کرنے کی وجہ سے پندرہ بیس لاکھ سالانہ ملتے ہیں۔ بعض ساحلی دیسی ریاستوں کو نمک سے بھی منافع ہوتا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہے کہ ریاستوں کے ان خصوصی ذرائع کو نظرانداز کرتے ہوئے عام ذرائع آمدنی وہی ہیں جو بقیہ صوبائی ہندوستان کے ہیں۔ بطور مثال ہم سب سے بڑی دیسی ریاست حیدرآباد اور راجپوتانے کی مشہور ریاست جودھپور کی آمدنی کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ کرتے ہیں۔

حیدرآبادی مالیات حیدرآباد کی ریاست میں آمدنی کے ذریعے اور ان سے حاصل کی ہوئی آمدنی کے جدید ترین اعداد یہ ہیں۔

	سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء (سنہ ۱۳۴۸ف) کی حقیقی آمدنی	سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء (سنہ ۱۳۵۰ف) کی متوقع آمدنی
مالگزاری	۲،۹۵،۳۵،۰۰۰	۳،۱۰،۰۰،۰۰۰

آبکاری گانجہ، افیون	۱،۸۲،۰۵،۰۰۰	۱،۸۸،۵۰،۰۰۰
ریلیں	۱،۴۱،۲۲،۰۰۰	۱،۳۵،۰۰،۰۰۰
کروڑگیری	۱،۱۱،۲۶،۰۰۰	۱،۲۰،۰۰،۰۰۰
سود	۳۰،۵۴،۰۰۰	۳۱،۰۰،۰۰۰
برار کا معاوضہ	۲۹،۱۷،۰۰۰	۲۹،۱۷،۰۰۰
سکہ سازی، کاغذی زر اور تبادلہ	۲۳،۲۱،۰۰۰	۲۷،۶۷،۰۰۰
پٹرول محصول، سواری محصول، شکر محصول، سگریٹ محصول	۲۱،۳۱،۰۰۰	۲۹،۹۰،۰۰۰
اسٹامپ	۱۷،۳۸،۰۰۰	۱۷،۵۰،۰۰۰
پٹہ خانہ (ڈاک)	۱۴،۰۵،۰۰۰	۱۴،۵۰،۰۰۰
جنگل	۱۳،۱۲،۰۰۰	۱۳،۱۰،۰۰۰
کان کنی (معدنی ذخیروں کی آمدنی)	۵،۳۸،۰۰۰	۵،۵۰،۰۰۰
بجلی	۳،۰۳،۰۰۰	۵۰،۰۰۰
رجسٹریشن	۲،۵۸،۰۰۰	۲،۵۰،۰۰۰

یہ اعداد ۱۳۵۱ف (فصلی) کے انگریزی بجٹ نوٹ سے لیئے گئے ہیں۔ حیدرآباد کا سرکاری سنہ فصلی کہلاتا ہے۔ فصلی سال کا آغاز ۶ اکتوبر کو ہوتا ہے۔ ۱۳۴۸ف کی حقیقی آمدنی ۶ اکتوبر ۱۹۳۸ء اور ۵ اکتوبر ۱۹۳۹ء کے درمیانی سال کی ہے فصلی اور عیسوی سنوں کے رواج کی وجہ سے کئی مرتبہ پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ عیسوی سنہ بین اقوامی اہمیت رکھتا ہے اور کل ہند اہمیت حاصل کر چکا ہے کیا اچھا ہو کہ حیدرآباد میں بھی اسی سنہ کو اختیار کیا جائے۔

متفرق	۲،۵۳،۰۰۰	۱،۵۰،۰۰۰
آب پاشی	۴۷،۰۰۰	۵۰،۰۰۰
حقیقی آمدنی ۳۹-۱۹۳۸ء (۱۳۴۸ف)	۸،۹۲،۶۴،۰۰۰	۹،۲۶،۸۵،۰۰۰
صنعتی محفوظ، قحط فنڈ اور ریلوے سے	۲۲،۰۸،۰۰۰ ن	۴۱،۹۵،۰۰۰
ٹیلیفون خسارہ		۳۴،۰۰۰ -
عثمانیہ سکے میں ۳۹-۱۹۳۸ء کی کل آمدنی	۹،۱۴،۷۲،۰۰۰	۹،۶۸،۴۶،۰۰۰ حالی
برطانوی سکے میں ۳۹-۱۹۳۸ء کی کل آمدنی	۷،۸۵،۰۰،۰۰۰	۸،۳۰،۰۰،۰۰۰ کلدار

گذشتہ چند سال میں حیدرآبادی ریاست کی آمدنی یہ تھی۔

کیفیت موازنہ

۱۳۴۰ف ۳۱-۱۹۳۰ء کل آمدنی	
۱۳۴۱ف ۳۲-۱۹۳۱ء " "	
۱۳۴۲ف ۳۳-۱۹۳۲ء " "	۸،۰۶،۱۸،۰۰۰
۱۳۴۳ف ۳۴-۱۹۳۳ء " "	۷،۹۵،۲۷،۰۰۰
۱۳۴۴ف ۳۵-۱۹۳۴ء " "	۸،۵۳،۲۱،۰۰۰
۱۳۴۵ف ۳۶-۱۹۳۵ء " "	۹،۰۵،۶۱،۰۰۰
۱۳۴۶ف ۳۷-۱۹۳۶ء " "	۹،۴۳،۳۲،۰۰۰
۱۳۴۷ف ۳۸-۱۹۳۷ء " "	۹،۳۹،۹۶،۰۰۰
۱۳۴۸ف ۳۹-۱۹۳۸ء حقیقی کل آمدنی	۹،۱۴،۷۲،۰۰۰

۱۳۴۹ف سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء۔ متوقع آمدنی ۹،۱۴،۰۴،۰۰۰

۱۳۵۰ف سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء۔ بجٹ کے مطابق متوقع آمدنی ۹،۶۸،۴۶،۰۰۰

اِن اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد ریاست کی سالانہ آمدنی نو کروڑ ہے اور کلدار کے مطابق پونے آٹھ کروڑ ۷،۷۵،۰۰،۰۰۰۔

حیدرآبادی مالیات کے متعلق چند باتیں قابل لحاظ ہیں:۔

(۱) سب سے پہلے یہ کہ حیدرآبادی ریاست کا ذاتی روپیہ ہے۔ جسے حالی سکّہ یا موجودہ تاجدار کے نام نامی سے عثمانیہ سکّہ کہتے ہیں۔ برطانوی ہند کے روپیہ کو حیدرآباد میں کلدار روپیہ کہتے ہیں۔ حالی سکّہ کی قدر وقیمت برطانوی ہند کے سکّہ کے مقابلہ میں ہمیشہ کم رہتی ہے۔ کلدار حالی اور حالی کلدار کی شرح تبادلہ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ حالی کلدار شرح تبادلہ کی انتہائی شرحیں (۱۱۵/۱۰) اور (۱۱۸/۱۲) فی سو روپیہ کلدار مقرر کی گئی ہیں[له]۔ یعنی سرکار نے ایسا انتظام کیا ہے کہ حالی کلدار کا بھاؤ (۱۱۵/۱۰) اور (۱۱۸/۱۲) کے درمیان رہے گا۔ فی سو روپیہ کلدار کم سے کم (۱۱۵/۱۰) یا زیادہ سے زیادہ (۱۱۸/۱۲) ملیں گے۔

سرکاری (منتقل) شرح تبادلہ (۱۱۶/۱۰/۸) فی سو کلدار ہے۔ اِس شرح کے مطابق چھ کلدار کے سات حالی ہوتے ہیں لہٰذا ۶،۰۰،۰۰،۰۰۰ کلدار کے ۷،۰۰،۰۰،۰۰۰ حالی ہوں گے۔ اور ۷ کروڑ حالی کے اِسی شرح سے صرف ۶ کروڑ کلدار ہوں گے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ حیدرآبادی سکّہ یعنی حالی روپیوں میں سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء کی آمدنی اگرچہ نو کروڑ ۱۵ لاکھ تھی مگر برطانوی روپیہ کے مطابق صرف سات کروڑ ۸۵ لاکھ ہوتی ہے۔ کئی لوگوں نے حیدرآباد کے موازنہ کا مقابلہ کسی اور ریاست یا برطانوی ہند کے

له The Economic life of Hyderabad صفحہ ۱۳۲۔ نیم سرکاری اشاعت ۱۹۳۶ء

کسی صوبے سے کرتے وقت یہ غلطی کی ہے کہ حیدرآباد کے سکہ کی قدر و قیمت کا لحاظ نہیں رکھا، چونکہ علمی کتابوں اور تحقیقی مقالوں میں بھی یہی ہوتا ہے اور دو مختلف قدر و قیمت کے سکوں کا باہمی تقابل کیا جاتا ہے لہٰذا اس غلطی کی طرف خاص طور پر توجہ مبذول کرائی جاتی ہے۔ غرض یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ حیدرآبادی مالیات کے متعلق تمام حوالے حیدرآبادی روپیوں میں ہوتے ہیں اور خاص کر بیرون حیدرآباد سے مقابلہ کرتے وقت اس فرق کا لحاظ رکھا جانا لازمی ہے چونکہ تمام اعداد کا برطانوی ہند کے روپیہ میں منتقل کرنا طول عمل اور دردسری کا باعث ہوتا لہٰذا سہولت کی خاطر میں نے بھی تمام اعداد حیدرآبادی روپیوں میں دیئے ہیں البتہ میزان کو کلدار میں بھی ظاہر کیا ہے۔

حیدرآباد کی مالیات کے متعلق دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ ریاست کی آمدنی کے اہم ترین ذرائع اگرچہ مالگذاری اور آبکاری ہیں مگر کل ریاست میں جس قدر مالگذاری اور آبکاری وصول کی جاتی ہے وہ صرف ریاست کو نہیں ملتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مالگذاری اور حق ملکیت کے نقطہ نظر سے ریاست کئی حصوں میں منقسم ہے جنھیں دیوانی، صرفخاص، سمستان اور جاگیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جو علاقے براہ راست ریاست کے تحت ہوں اور کلیتاً ریاست کے قبضہ میں ہوں انہیں محض "دیوانی" یا "دیوانی علاقہ" یا "خالصہ" کہتے ہیں۔ ریاست کا تقریباً ۵۵ فیصد رقبہ دیوانی ہے۔

جو علاقے اعلیٰحضرت حضور نظام کی ملکیت میں ہیں انہیں "صرفخاص" کہا جاتا ہے یعنے وہ علاقے جن کی آمدنی "صرف خاص" کے لیے مقرر کر دی گئی ہو۔ "صرفخاص" کے علاقوں سے جتنی آمدنی (زیادہ تر مالگذاری اور آبکاری) وصول ہوتی ہے وہ کلیتاً اعلیٰحضرت حضور نظام کی ہوتی ہے۔ صرفخاص کی اہمیت کے مد نظر اس کا انتظام ریاستی انتظام سے علیحدہ طور پر کیا جاتا ہے۔ موزونیت اور ضرورت کے مطابق جا بجا صرفخاص

کے محکمے اور سررشتے قائم ہیں جو ریاست کے محکموں اور سررشتوں سے الگ ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں اشتراکِ عمل ضروری ہے مگر پھر بھی دونوں کی نوعیت جداگانہ ہے صرفِ خاص کی آمدنی کا اندازہ ۱/۲ ۱ کروڑ سالانہ کیا جاتا ہے۔

حیدرآباد میں بعض قدیم سلطنتوں کی یادگار جاگیریں موجود ہیں مختلف زمانوں میں یہ ریاست نما جاگیریں مختلف حاکموں کو خراج ادا کرتی تھیں۔ عرصہ تک مرہٹوں کو چوتھ ملا کیا اور انگریزی عملداری نے بھی ان سے خراج حاصل کیا۔ ان علاقوں کو "سمستان" کہتے ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ اہم گدوال کی سمستان ہے۔ سمستانوں کی کل تعداد دس بارہ ہے جن میں پالونچہ ونپرتی، جتھہ پرول، اَمرچنتا گروگنٹہ وغیرہ ہیں۔ ہرایک سمستان کی طرف سے حیدرآباد ریاست کو کچھ نہ کچھ پیشکش ضرور ملتا ہے۔ گدوال کا پیشکش ۱ لاکھ پندرہ ہزار، ونپرتی کا ۸۲۰۰۰ اور جتھہ پرول اور اَمرچنتا کا تقریباً پون پون لاکھ ہے۔ کل سمستانوں کی مجموعی آمدنی کا اندازہ پچیس تیس لاکھ سے کم نہیں۔

صرفِ خاص مبارک اور سمستانوں کے علاوہ حیدرآباد میں تین بڑی بڑی جاگیریں ہیں جنھیں پائیگاہیں کہتے ہیں۔ ریاست کی خودمختاری کے وقت سے یہ پائیگاہیں قائم ہیں۔ سب سے بڑی پائیگاہ کرکٹ کے مشہور سرپرست نواب معین الدولہ بہادر مرحوم کی ہے اس کا رقبہ ۲ ہزار مربع میل ہے اور آمدنی ۲۲ لاکھ ہے۔ تینوں پائیگاہوں کی مجموعی سالانہ آمدنی تقریباً نصف کروڑ ہے۔

صرفِ خاص، سمستانوں اور پائیگاہوں کے علاوہ چھوٹی بڑی کئی جاگیریں ہیں جن کی آمدنی متعلقہ جاگیرداروں کو ملتی ہے۔ ان جاگیروں کے اہم ترین ذرائع آمدنی مالگزاری اور آبکاری ہیں۔ ہر جاگیر کی حیثیت، رقبہ آبادی اور آمدنی کے مطابق مختلف ہے۔ بڑی بڑی جاگیروں کو دیوانی اور فوجداری کے حقوق حاصل ہیں۔ اُنکی پولیس بھی علیحدہ ہے۔ البتہ ہر جگہ ریاست کی بڑھتی ہوئی نگرانی کیوجہ سے حالت کسی قدر بہتر

رفتار پر ہی سہی) رو بہ اصلاح ہے۔

سب سے بڑی جاگیر نواب سالار جنگ بہادر کی ہے۔ جن کے دادا حیدرآباد کے محسن اعظم اور کل ہند شہرت اور مقبولیت پانے والے مدبر تھے۔ موجودہ نواب سالار جنگ بہادر بھی کچھ عرصہ کے لیے وزارت کر چکے ہیں۔ اور اپنے باپ دادا کی طرح حیدرآباد کی علمی، تمدنی اور مادی دولت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد مرحوم کی جاگیر کی آمدنی دس لاکھ سے زیادہ کی ہے۔ حیدرآباد کے ممتاز جاگیرداروں میں (جو ریاست کے باہر بھی شہرت حاصل کر رہے ہیں) نواب کمال یار جنگ بہادر، نواب مہدی جنگ بہادر اور "قائد ملت" نواب بہادر یار جنگ بہادر ہیں۔ اول الذکر کل ہند تعلیمی کانفرنس کے صدر رہ چکے ہیں اور کئی تمدنی تحریکوں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ نواب مہدی جنگ بہادر نے ٹینس کی سرپرستی کر کے کھیل سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں میں بجا طور پر مقبولیت حاصل کی اور بہادر یار جنگ بہادر مسلم عوام کے ہر دلعزیز رہنما ہیں۔

متذکرہ جاگیروں کے علاوہ مختلف وسعت اور نوعیت کی سینکڑوں جاگیریں ہیں جن کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکی۔ مجموعی آمدنی کا البتہ اندازہ لگایا گیا ہے اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ چھوٹی بڑی تمام جاگیروں کی مجموعی آمدنی کسی طرح پچاس لاکھ سے کم نہیں ہے۔

ریاست حیدرآباد سے کل مالگزاری اور آبکاری جس قدر وصول ہوتی ہے اس کا اندازہ ایک اور طرح لگایا جا سکتا ہے۔ ریاست حیدرآباد کا صرف پچپن فی صد رقبہ دیوانی ہے۔ بقیہ ۴۵ فی صد رقبہ صرفخاص، پائیگاہوں اور جاگیروں پر مشتمل ہے۔ ہمیں یقین سے معلوم ہے کہ دیوانی علاقوں کی مالگذاری اور آبکاری پونے پانچ کروڑ (۴،۷۵،۰۰،۰۰۰) سالانہ ہوتی ہے۔ اگر جس نسبت سے دیوانی علاقوں سے آمدنی ہوتی ہے اسی نسبت سے غیر دیوانی علاقوں سے بھی آمدنی ہوتی ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ

صرفخاص مبارک، پائیگاہوں، سمستانوں اور جاگیروں کو تقریباً ۴ ۳/۴ کروڑ آمدنی ہوتی ہوگی اور اس طرح کل ممالک محروسہ سرکار عالی سے دیوانی اور غیر دیوانی علاقوں کی مالگذاری ۳،۷۵،۰۰،۰۰۰ + ۴،۷۵،۰۰،۰۰۰ یعنی ۸،۵۰،۰۰،۰۰۰ ہے۔

حیدر آباد کے سرکاری ذرائع آمدنی کے بارے میں تیسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ یہاں آمدنی محصول (انکم ٹیکس) اب تک رائج نہیں ہوا۔ مالیات کے ممتاز محققوں کے نزدیک آمدنی محصول بہت ہی جائز اور مناسب ذریعہ آمدنی ہے جسکی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ آسانی سے منتقل نہیں ہو سکتا اور اس کی بدولت مالدار لوگ اپنی حیثیت اور آمدنی کے مطابق سرکاری اخراجات کا بار سہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

دنیا کے تمام آزاد اور ترقی پذیر ملکوں میں آمدنی محصول رائج ہے۔ برطانوی ہندوستان میں آمدنی محصول ۱۸۸۶ء سے مستقل طور پہ ذریعہ آمدنی بن گیا ہے اور اس کی بدولت مرکزی حکومت کو تیرہ چودہ کروڑ روپیہ سالانہ ملتے ہیں۔ دیسی ریاستوں میں بڑودہ، ٹراونکور اور ترقی پذیر میسور میں آمدنی محصول لیا جاتا ہے ۱۹۳۵ء سے کشمیر میں بھی انکم ٹیکس لیا جاتا ہے۔ اس ٹیکس کی بدولت میسور کو تقریباً ۵ ۲ لاکھ سالانہ وصول ہوتا ہے۔

اگر حیدر آباد میں بھی صرف جاگیرداروں، سیٹھ ساہوکاروں، سرکاری عہدہ داروں اور مرفہ الحال تاجروں اور گتہ داروں سے معقول شرح پر انکم ٹیکس وصول کیا جائے تو ریاست کی آمدنی میں ایک کروڑ کا اضافہ ممکن ہے۔

برطانوی ہند میں انکم ٹیکس کے متعلق جتھار اور بیری نے اپنی معروف کتاب ہندوستانی معاشیات میں لکھا ہے:-

جنگ سے پہلے بہت کم محصول آمدنی The yield of the income tax before

وصول ہوتا تھا، تقریباً ۳ کروڑ روپئے۔ مالدار طبقے بہت آسانی سے بچ نکلتے تھے اور بار محصول میں سے اپنے حصہ کا جائز بار برداشت نہیں کرتے تھے[1]

the war was very small, being only about Rs. 3 crores. The richer classes escaped two lightly and did not bear theii legitimate share of the burden of taxation

یہی حال حیدرآباد کے موجودہ مالدار طبقوں کا ہے۔ وہ اپنی مالی حیثیت کے مطابق سرکاری اخراجات کا بار اٹھانا تو درکنار جائز بار محصول کا نصف بھی برداشت ہنیں کر رہے ہیں۔ ایسے بھی کئی لوگ ہیں جنھیں ریاست کے امن اور انتظام سے لاکھوں روپیہ کی سالانہ آمدنی ہوتی ہے اور وہ براہ راست ایک پیسہ بھی سرکاری تجوری میں جمع ہونے کے لیے ہنیں دیتے۔ ظاہر ہے یہ صورت حال عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی۔

جودھپوری مالیات

جودھپور کے متعلق جدید ترین اعداد سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء کے دریافت ہو سکے۔ اس قسم کی باتوں سے ثبوت ملتا ہے کہ دیسی ریاستوں کا انتظام برطانوی ہند کے علاقوں سے بعض امور میں بہتر ہو سکتا اور رہوتا بھی ہے۔ جودھپور کی ریاست کو سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں تقریباً پونے دو کروڑ کی حقیقی آمدنی ہوئی تھی۔ اہم ذرائع آمدنی اور حاصل کی ہوئی رقمیں یہ تھیں:-

ریلیں	۴۳،۱۵،۰۰۰
کروڑگیری	۲۴،۲۲،۰۰۰
آبکاری اور نمک	۱۷،۲۹،۰۰۰

[1] سنہ ۱۹۳۰ء صفحہ ۳۴۵

سود، تبادلہ، ٹپہ	۱۴،۶۷،۰۰۰
مالگزاری	۹،۸۳،۰۰۰
معاہدے	۹،۷۱،۰۰۰
متفرق ذریعے (کانیں، صنعت و حرفت، خراج)	۵۶،۶۹،۰۰۰
میزان	۱،۷۵،۵۶،۰۰۰

میسوری مالیات

ریاست میسور کے متعلق جدید ترین اعداد ۱۹۴۱-۴۲ء کے معلوم ہو سکے بعض ریاستوں کی ہر جہتی ترقی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اُن کے متعلق مطلوبہ اعداد اور معلومات حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ بہرحال میسور میں آمدنی کے ذریعے اور اُن سے ۱۹۳۹-۴۰ء میں حقیقی حاصل کی ہوئی آمدنی اور ۱۹۴۱-۴۲ء میں متوقع آمدنی کے اعداد یہ ہیں

	۱۹۳۹-۴۰ء کی حقیقی آمدنی	۱۹۴۱-۴۲ء کی متوقع آمدنی
مالگزاری	۱،۲۴،۷۷،۰۰۰	۱،۲۵،۲۹،۰۰۰
آبکاری	۴۹،۷۱،۰۰۰	۵۱،۵۵،۰۰۰
آمدنی محصول (انکم ٹیکس)	۲۹،۵۹،۰۰۰	۴۰،۳۰،۰۰۰
جنگل	۲۷،۵۳،۰۰۰	۲۵،۹۳،۰۰۰
اسٹامپ	۱۷،۷۹،۰۰۰	۱۷،۶۲،۰۰۰
رجسٹریشن	۳،۰۳،۰۰۰	۳،۰۰،۰۰۰
متفرق محصولی نوعیت کی آمدنی	۱۶،۱۰،۰۰۰	۲۳،۰۵،۰۰۰

محصولی نوعیت کی کل آمدنی	۲،۶۸،۵۲،۰۰۰	۲،۸۶،۷۴،۰۰۰
جل بجلی (تشریح کے لیے دیکھئے عبارت [ا])	۴۹،۴۸،۰۰۰	۵۸،۲۹،۰۰۰
ریلین (〃 〃 〃 〃 [ب])	۲۷،۴۹،۰۰۰	۲۶،۳۷،۰۰۰
معدنی کان (〃 〃 〃 〃 [ج])	۲۶،۳۲،۰۰۰	۲۱،۱۳،۰۰۰
سود	۲۰،۱۳،۰۰۰	۱۷،۳۷،۰۰۰
سونا (〃 〃 〃 〃 [د])	۳،۸۵،۰۰۰	۲۳،۷۶،۰۰۰
صنعتی کاروبار (〃 〃 〃 〃 [ہ])	۳،۱۱،۰۰۰	۵،۴۷،۰۰۰
کرشنا راج ساگر (〃 〃 〃 [و])	۲،۰۱،۰۰۰	۵،۸۵،۰۰۰
متفرق	۱۷،۰۷،۰۰۰	۱۳،۲۶،۰۰۰
کل آمدنی	۴،۱۷،۹۸،۰۰۰	۴،۵۸،۲۴،۰۰۰

ف ا۔ جل بجلی کی کل آمدنی ۴۹،۴۸،۰۰۰ بتائی گئی ہے۔ اگر خالص منافع لکھدیا جاتا تو یقین ہوتا کہ یہ رقم عام اخراجات کے لیے بچ گئی ہے۔ آمدنی سے یہ احتمال رہتا ہے کہ عام کاروباری اخراجات تو نکال لیے گئے مگر اصل لاگت پر سود نہیں جوڑا گیا یا کم قدری کی مد میں کچھ نہیں رکھا گیا۔ ہماری مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ میسور ریاست پر نکتہ چینی کریں، البتہ ایک بات واضح کردینی تھی کیونکہ درحقیقت بعض ریاستوں نے منافع یا آمدنی لکھکر یہ غلط فہمی پیدا کی کہ متذکرہ رقم خالص منافع ہے جو ریاست کے عام اخراجات کے لئے بچ رہا ہے حالانکہ وہ رقم خام منافع تھی جس میں سے لاگت کا سود اور قائم اصل کا کم قدری[۱] کا مطالبہ نکالنا ضروری تھا۔

(ب)۔ یہ رقم خالص وصولی ہے[۲]۔ پتہ نہیں کہ ریلوں کی لاگت کا سود اور کمقدری

---

[۱] (Depreciation)

[۲] (Net Receipt)

کے اخراجات منہا کئے گئے یا نہیں۔ "خالص وصولی" کے بجائے خالص منافع لکھا جاتا تو مطلب صاف ہوتا۔

(ج) اصل ترکیب جو بجٹ میں استعمال کی گئی ہے۔ یعنی کان کنی کی آمدنی ہے یہاں بھی مطلب واضح نہ ہوا کہ آمدنی کی نوعیت کیا ہے؛ خام منافع یا خالص منافع ؟

(د) کل ہندوستان میں تقریباً ۳ ۱/۴ لاکھ اونس (ایک اونس۔ ۲ ۱/۲ تولے کے مساوی ہوتا ہے) سونا پیدا کیا جاتا ہے۔ اور بجز ۱۰۰ یا ۱۲۵ سو تولوں کے سب کا سب میسور ریاست کی "کولار گولڈ فیلڈ" سے ملتا ہے۔ جنگ کے قبل اس سونے کی قیمت ۳ کروڑ ہوتی تھی جس میں سے میسور ریاست کو صرف تین چار لاکھ ملتا تھا اور باقی رقم ان سونے کی کانوں کو چلانے والی ٹھیکہ دار بدیسی کمپنی کو ملتا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں جب اس کمپنی کا پہلا ٹھیکہ ختم ہونے والا تھا تو مرکزی حکومت ہند کے دباؤ سے مجبور ہوکر میسور کو ٹھیکہ کی تجدید کرنی پڑی۔ غنیمت ہے میسور نے دلیری سے مقابلہ کرکے ایسی شرطیں منوائیں جن سے ریاست کو آئندہ سالوں میں ۲۵ آٹھ گنی زیادہ آمدنی ہوگی۔ تین کروڑ کے مالیتی سونے سے ۲۵ لاکھ پانا روپیہ میں صرف ایک آنہ حاصل کرنا ہے۔ مگر آفریں ہے میسور کے سابق دیوان سرمرزا اسمٰعیل اور مرحوم مہاراجہ پر کہ انھوں نے انگریزی راج سے لڑبھڑ کر اور اپنی پوزیشن خطرہ میں ڈالکر ریاست کے لیے سولہواں حصہ تو حاصل کرلیا ورنہ پہلے کی طرح اب بھی وہی تین چار لاکھ ملتے نہ کہ متوقع ۲۵ لاکھ۔

(ہ) صنعتی اعتبار سے میسور سب دیسی ریاستوں اور کئی برطانوی صوبوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ ریاست کے کئی کارخانے ہیں جن سے خالص وصولی تین چار لاکھ ہوتی ہے۔

(و) کرشنا راج ساگر میسور کا سب سے بڑا تالاب ہے جس کی آبپاشی سے

Mining Revenue

دو تین لاکھ کی خالص وصولی ہوتی ہے۔ یعنی آبپاشی کا انتظام کرنے کے اخراجات نکالنے کے بعد یہ رقم بچ رہتی ہے۔ خالص منافع کتنا ہوتا ہے یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔

ہندوستان کی مجموعی سرکاری آمدنی

گذشتہ صفحوں سے ظاہر ہے کہ ہندوستان میں سرکاری طور پر محصول وصول کرنے والی کئی اقتداری ہستیاں ہیں یہ سب جس قدر محصول وصول کرتی ہیں وہ یہ ہے:۔

مرکزی حکومت ہند	تقریباً	۱۲۱	کروڑ
تمام صوبائی حکومتیں	"	۸۵	"
میونسپالٹیاں	"	۴۱	"
ڈسٹرکٹ بورڈ	"	۱۶	"
بندرگاہی ٹرسٹ	"	۷	"
کل برطانوی ہند کی سرکاری آمدنی	"	۲۷۰	"
تمام دیسی ریاستوں کی " "	"	۵۲	"
کل ہندوستان کی " "	"	۳۲۲	"

اس طریقے پر ہندوستان کی مرکزی، صوبائی، بلدی، مقامی، بندرگاہی اور دیسی ریاستی آمدنی کی کل میزان ۰۰۰، ۰۰، ۲۲، ۳ یعنے تین سو بائیس کروڑ یا تقریباً سوا تین ارب ہوتی ہے۔

یہ یاد رہے کہ اس رقم میں زیادہ تر مالگذاری کی وہ آمدنیاں شامل نہیں ہیں جو چھوٹے بڑے تعلقہ دار، جاگیردار وغیرہ حاصل کرتے ہیں حالانکہ ان کی نوعیت میں اور سرکاری طور پر حاصل کی ہوئی مالگذاری میں کچھ فرق نہیں ہے۔ ہندوستان

(Authorities)

کے ہر حصہ میں سینکڑوں ہی نہیں ہزاروں[1] زمیندار اور جاگیردار ہیں جنھیں کاشت کار مالگذاری ادا کرتے ہیں اور اس کا صرف جزوی حصہ ہی سرکاری تجوری تک پہنچتا ہے۔ بقیہ قدیم رواج، سند، خوش بختی اور حسن اتفاق سے جاگیرداروں اور زمینداروں کو ذاتی خرچ کے لئے بچ رہتا ہے۔ چونکہ ان آمدنیوں کا شمار نہیں کیا جاتا لہٰذا اوسط بار محصول کے متعلق غلط نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔

معاشیات ہند سے دلچسپی رکھنے والے کے لئے یہ موضوع تحقیق بہت موزون ہوگا کہ ہندوستان میں بار محصول کی کیا اصلیت ہے؟

اس کے لئے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہوگا کہ ہندوستان میں کتنا محصول سرکاری اور غیر سرکاری طور پر لیا جاتا ہے؟ یعنے وہ کل کتنی رقم ہے جو سارے ہندوستان سے محصولوں اور محصولی نوعیت رکھنے والی آمدنیوں سے حاصل کی جاتی ہے؟ چونکہ مالگذاری محصول ہے لہٰذا بار محصول کا مسئلہ حل کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ دریافت کرنا ہوگا کہ کل کس قدر محصول مالگذاری سارے ہندوستان سے وصول کیا جاتا ہے؟ اس کے قطع نظر کس قدر کس کو ملتا ہے یعنے مالگذاری کی مقدار صرف حکومت ہے یا جاگیرداروں کو بھی کچھ ملتا ہے۔ یا ہر ایک کے حصے میں کس قدر رقم آتی ہے؟ تاوقتیکہ اس قسم کی تحقیق نہ ہو ہمیں مجبوراً اس رقم کو ملحوظ رکھنا پڑے گا جو سرکاری طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کی کل میزان سارے ہندوستان کے لئے ۳ ۱/۴ ارب ہوتی ہے۔

بظاہر ۳ ۱/۴ ارب یعنے دراصل ۳۲۲ کروڑ سے بھی کچھ اندازہ نہیں ہوتا، یہ رقم بہت زیادہ ہے؟ یا بہت کم؟ اس کی اصلیت کا اندازہ صرف تقابل سے

[1] افسوس ہے کہ باوجود کوشش اور کھوج کے صحیح اعداد معلوم نہ ہو سکے اور تو اور خود حیدرآباد میں مجموعی طور پر کتنے جاگیردار ہیں؟ اس کا بھی صحیح پتہ نہ چلا۔

ہو سکیگا۔ اگر ہم ہندوستان کی آمدنی کا موازنہ اور مقابلہ دوسرے ملکوں کی آمدنیوں سے کریں گے تو ہمیں اپنی اصلیت کے بارے میں کسی قدر بہتر رائے قائم کرنے میں مدد ملیگی کم سے کم ہمیں یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ ۳۲۲ کروڑ جو ایک نردھن خاندان یا تنگ دستی میں گذر کرنے والے طالب علم کے لئے قارون کے خزانے سے زیادہ معلوم ہوتا ہے بین اقوامی مالیات میں کیا اہمیت رکھتا ہے؟

کہتے ہیں کہ ریگستانی صحرا کا اونٹ پردیس جانے والے قافلے کے ساتھ کسی پہاڑ کے قریب پہنچا تب اُسے خیال ہوا کہ موجودات میں اس سے بھی بڑھکر چیزیں ہیں۔ اسی طرح کا احساس ان لوگوں کو ہوتا ہے جو پہلے پہل اپنے ملک کی حالت و حیثیت کا مقابلہ ایران و افغانستان سے نہیں بلکہ یورپ اور امریکہ کی ترقی یافتہ، ترقی پسند اور ترقی پذیر قوموں سے کرتے ہیں۔

بعض ممتاز ملکوں کی سرکاری آمدنی

آئندہ جدول میں دُنیا کے بعض ترقی پذیر ریاستوں کی سرکاری آمدنی کے اعداد اسٹیسمن ایئربک بابتہ ۱۹۴۲ء سے لے کر یک جا کئے گئے ہیں باوجود کوشش کے اسٹیسمن ایئربک کے علاوہ کسی اور ذریعے سے جدید سرکاری آمدنیوں کا حوالہ نہیں مل سکا۔

سال	ملک	آمدنی
۱۹۳۹ء	انگلستان (پاونڈ)	۱،۰۰،۶۲،۳۵،۰۳۴
۱۹۳۹ء	ریاستیں (ڈالر)	۵،۶۶،۷۸،۲۴،۰۰۰
۱۹۳۸-۳۹ء	کناڈا (")	۴۹،۸۰،۱۶،۷۰۶
۱۹۴۰ء	ارجنٹائن (کاغذی پیسو)	۹۳،۲۰،۱۹،۰۰۰
۱۹۴۰ء	برازیل (" کانٹو)	۴۲،۰۹،۴۰۷

سنہ ۱۹۴۰ء	فرانس (فرانک)	۷۹،۹۶،۱۱،۸۴،۱۱۲
سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء	اطالیہ (لیرے)	۲۹،۰۰،۲۰،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء	جاپان (ین)	۱۰،۲۸،۲۰،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء	ترکی (ترکی پاؤنڈ)	۲۶،۱۱،۱۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء	ہندستان (روپئے)	۱،۲۱،۷۹،۹۵،۰۰۰

چونکہ ہر ملک کی آمدنی اسی ملک کے سکہ میں دی گئی ہے اس لئے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ رقموں کا باہمی تناسب کیا ہے اور ان رقموں کی بذاتہ کیا اہمیت ہے؟ بعض علمی اور درسی کتابوں میں غیر ملکوں کی موازنوں کی کیفیت درج ہے مگر حیرت ہوتی ہے کہ نہ صرف حوالے کی کتابوں میں بلکہ درسی اور علمی کتابوں میں بھی صرف بیرونی زر میں اعداد دیئے گئے ہیں، اس پر طرہ یہ کہ ہر ملک کے اعداد اسی ملک کے زر میں دئیے ہیں اور کہیں بھی شرح تبادلہ یا اوسط شرح تبادلہ یا باہمی قدر کا کچھ ذکر نہیں۔ مختلف قسم کے بیرونی زروں کی قدر وقیمت جاننا تو درکنار بسا اوقات ہم ان کے نام سے تک ناواقف ہوتے ہیں۔ تقابل کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک مانوس اور یکساں معیار کے مطابق حوالے دیئے جائیں۔ مختلف ملکوں کی مالی سرگذشت بیان کرتے ہوئے کہیں جاپانی زر میں حوالہ دینا، کہیں چینی ڈالر میں، کبھی اطالوی لیروں میں اعداد پیش کرنا، کبھی جرمن مارکوں میں ایسی ہی "دانشمندی" ہے جیسے کسی سوانحی سرگذشت کی اعداد کہیں ہجری سنہ میں کہیں فصلی سنہ میں اور کہیں عیسوی سنہ یا بکرمی سمبت میں پیش کرنا۔ نامانوس زر میں حوالے دینے سے ذہنی پریشانی ہوتی ہے۔ مالی حالت کچھ معلوم نہیں ہوتی اس لیے میں نے دردسری گوارا کر کے ایک جدول تیار کی ہے جس میں تمام ملکوں کی آمدنی روپیوں میں منتقل کی گئی ہے۔ اول تو یہی معلوم کرنے میں بہت دقت ہوئی کہ مختلف ملکوں کے زر موجودہ اور قبل از جنگ شرح تبادلہ کیا تھی؟ نہ تو کسی علمی کتاب میں کچھ پتہ چلا اور نہ کسی ماہر سے مدد ملی۔ حیرت تو یہ ہے کہ برازیل اور ارجنٹائن

کے کونسل صاحبوں سے دریافت کرنے سے بھی معلوم نہ ہوا کہ اِن ملکوں کے سکوں کی کیا قدر و قیمت تھی اور ہے۔ اِن بھلے مانسوں نے سِرے سے خط کا کچھ جواب ہی نہ دیا۔ آخر کار ہیں نے مقامی بنکوں کو لکھا۔ ایک بنک نے کوئی جواب ہی نہ دیا۔ سیٹھ رگھوناتھ ل بنکر نے بڑی مہربانی سے دو استفساروں کے جواب دیئے اور اُن ہی کی مدد سے میں نے یہ جدول تیار کی ہے پردیسی زروں کو پونڈ میں تبدیل کرکے اور پھر پونڈ کے روپیہ بنانے میں ممکن ہے کہ غلطی ہوئی ہو۔ مگر امکانی کوشش کی گئی ہے کہ حساب صحیح ہو۔ میں سیٹھ رگھوناتھ ل کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُن کی توجہ سے پردیسی زروں کی قدر و قیمت معلوم کرنے میں دشواری کم ہوئی۔

ظاہر ہے کہ اِس جدول میں دیئے ہوئے اعداد کی ذمہ داری بہرحال مجھ ہی پر ہے اِس کا ذکر میں عمداً تحقیقی کاموں کی دشواری اور اپنی کم واقفیت کو ظاہر کرنے کے لیے کر رہا ہوں اگر کوئی صاحب مہربانی کرکے مزید معلومات بہم پہنچائیں یا غلطیوں کی طرف متوجہ کریں تو شکریہ کے ساتھ آئندہ مضمون میں اُن کا حوالہ دیا جائیگا اور ضروری تصحیح کی جائے گی۔

بعض ممتاز ملکوں کی آمدنی (روپیوں میں)

(اِس جدول میں ملکوں کی ترتیب مجموعی آمدنی کے لحاظ سے کی گئی ہے)

امریکی متحدہ ریاستیں	۱۷،۰۰،۳۴،۷۲،۰۰۰
انگلستان	۱۳،۴۱،۶۴،۶۷،۰۰۰
جاپان	۱۲،۶۲،۶۲،۹۲،۰۰۰
فرانس	۶،۰۵،۷۶،۶۵،۰۰۰
اطالیہ	۴،۳۵،۰۸،۸۰،۰۰۰
کناڈا	۱،۴۹،۴۰،۵۰،۰۰۰
ہندستان (صرف مرکزی حکومت کی آمدنی)	۱،۲۱،۷۹،۹۵،۰۰۰

ترکی ۶۶،۹۵،۰۷،۰۰۰

صرف آمدنیوں کا تقابل ہی مختلف ملکوں کی مالی حالت اور وہاں کی آبادیوں کی مالی حیثیت کو واضح نہیں کرتا، کیونکہ سب ملک یکساں بڑے نہیں ہیں۔ تقابل کے لیے اور بھی باتیں معلوم کرنا ضروری ہے محض سہولت کی خاطر ہم دو ملکوں کے متعلق تفصیل پیش کرتے ہیں۔

برطانیہ ۱۹۳۹ء میں برطانیہ کی آمدنی ۴۴،۰۳۴،۲۳۵،۶۰۰،۱ (یعنے ایک ہزار چھ ملین پاؤنڈ سے زیادہ) تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک پونڈ ۱۳ر ۵ر ۴ کا ہوتا ہے نیز انگریزی اور ہندستانی زر کی قیمت مقرر ہے، یعنے فی روپیہ ایک شلنگ چھ پنس۔ اس شرح کے مطابق پونڈ کے ۵ر ۴ہر ہوتے ہیں اور اسی شرح کی مناسبت سے برطانیہ کی آمدنی ۱۴۰،۶۷،۶۴،۱۴،۱۳ روپیہ یعنے تقریباً ساڑھے تیرہ ارب ہوتی ہے خیال فرمائیے کہ ایک ملک جس کا رقبہ صرف ۹۴ ہزار مربع میل ہو اور جس کی آبادی صرف پونے پانچ کروڑ ہو اس کی سرکاری آمدنی ساڑھے تیرہ ارب روپیہ ہے اور ہندوستان جو رقبہ کے اعتبار سے سولہ گنا زیادہ ہو اور آبادی کے اعتبار سے آٹھ گنا زیادہ ہے اس کی مرکزی آمدنی ۱۲۱ کروڑ اور مجموعی سرکاری آمدنی صرف ۲۲۳ کروڑ ہے۔ انہیں اعداد سے ہندستان کی مفلسی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور سمجھنے والوں کے لیے ان اعداد میں انگلستان کی عظمت اور ہندستان کی نکبت جھلکتی ہے۔

امریکہ کی متحدہ ریاستیں اس میں شک نہیں کہ امریکہ کی متحدہ ریاستوں کا رقبہ ہندستان کے رقبہ سے سوا دو گنا زیادہ ہے اور وہ نہ صرف میکانی اعتبار سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ بلکہ معاشی نقطہ نظر سے سب سے زیادہ دولتمند ملک ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندستان کے مقابلہ میں امریکہ کی آبادی صرف ایک تہائی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ امریکہ کی متحدہ ریاستیں ۴۸ ہیں جو سیاسی نقطہ نظر سے بہترین وفاقی حکومت کے تحت ہیں۔ اگر ان تمام ۴۸ ریاستوں کی علیحدہ علیحدہ آمدنیاں اور امریکہ کی میونسپلٹیو کی آمدنیاں شامل کی جائیں تو نہ معلوم اس کی میزان کتنے کھرب روپئے ہو۔ ہم نے صرف

وفاقی حکومت کی آمدنیاں لی ہیں جو ۵،۶۶،۸۷،۲۴،۴،۰۰۰ یعنے تقریباً چھ ہزار ملین ڈالر ہے جنگ سے پہلے ڈالر کی قیمت تقریباً ۳/۱۲ تھی اس لحاظ سے امریکہ کی وفاقی آمدنی ۱۷،۰۰،۳۴،۲،۰۰۰ یعنے سترہ ارب سے زیادہ ہوتی ہے۔ ہر ملک کے زر کی قیمت، شرح تبادلہ رقبہ اور آبادی کی تفصیل پیش کرنا چونکہ طوالت کا باعث ہے اس لئے میں نے آئندہ جدول میں فی کس سرکاری آمدنی بتائی ہے۔ اِس جدول سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ مختلف ملکوں میں سرکاری آمدنی کا کیا اوسط ہے۔

فی کس سرکاری آمدنی کے لحاظ سے ملکوں کی جدولی ترتیب

۱۔ انگلستان	۲۹۸ روپیہ
۲۔ جاپان	۱۸۰ "
۳۔ فرانس	۱۴۴ "
۴۔ متحدہ ریاستیں	۱۲۴ "
۵۔ کناڈا	۱۰۵ "
۶۔ اطالیہ	۱۰۱ "
۷۔ ارجنٹائن	۴۷ "
۸۔ ترکی	۴۱ "
۹۔ ہندستان	۳ ۱/۲ "

صرف مرکزی حکومت کی آمدنی کے لحاظ سے سرکاری آمدنی کا اوسط ۳ ۱/۲ روپیہ سالانہ فی کس ہوتا ہے۔ اگر مرکزی حکومت کے علاوہ تمام صوبائی اور تمام دیسی ریاستوں کی میزان نکالی جائے تو ۱۲۱ + ۸۵ + ۵۲ = ۲۵۸ کروڑ آمدنی ہوتی ہے اس لحاظ سے ہندوستان میں سرکاری آمدنی کا فی کس اوسط

$\frac{1}{2}$، روپیہ سالانہ نکلتا ہے۔

سرکاری اوسط آمدنیوں کی جدول میں مختلف قوموں کی مرفہ الحالی اور تباہ حالی، خوشحالی یا کنگالی جھلکتی ہے اور ایک سمجھدار آدمی کے لیے محض ان اعداد سے متعلقہ قوموں کی معاشی حالت معلوم کرنا اور معیار زندگی کا اندازہ کرنا ممکن ہے۔ یعنے کہیں دولت وثروت اور کہیں افلاس اور مصیبت؛ کہیں فراوانی کہیں کنگالی!!



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسیات

(از)

سید معین الدین قادری متعلم ایم ، اے جامعہ عثمانیہ سرکار عالی

کمیٹی جشن میلاد جامعہ عثمانیہ نے اس مضمون کو طیلسانی طبقہ میں انعام اول کا مستحق قرار دیا۔

محمد بشیر الدین

معتمد کمیٹی میلاد جامعہ عثمانیہ

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ایک شخص حضرت عائشہ صدیقہ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کے اخلاق سے متعلق دریافت کرنے لگا۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے اس شخص سے پوچھا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ اسنے کہا ہاں پڑھتا ہوں۔ آپ نے جواب میں فرمایا تو بس "خلقہ، قرآن"

جب حقیقت یہ ہے کہ وَمَا یَنطِقُ عَنِ الھَوٰی۔ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحیٌ یُوحیٰ (۵۳: ۴-۳) تو ہم آپ کی سیاسیات کو "الٰہی سیاسیات" یا "قرآنی سیاسیات" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور چونکہ قرآن اور سنت دونوں کے لیے مجموعی طور پر اسلام کا جامع و مانع لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے ہم آپ کی سیاسیات کو بہتر طریقہ پر "اسلامی سیاسیات" کا نام بھی دیکتے ہیں

آپ کی سیاسیات کا تاریخی پس منظر

ایک مشہور سائنسدان نے تاریخ کو سیاسیات کی جڑ اور سیاسیات کو تاریخ کا پھل کہا ہے۔ اس لیے آپ کی سیاسیات کو پیش کرنے سے پہلے اُس کے تاریخی پس منظر کو نہایت اجمال سے پیش کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے[1]

آپ کی ولادت باسعادت کے زمانہ میں دُنیا کی حالت نہایت ابتر ہو رہی تھی اس زمانہ میں روم اور ایران کی دو عظیم الشان سلطنتیں خود غرضانہ شہنشاہیت کے اصولوں پر قائم اور آپس میں باہم دست و گریبان تھیں۔ عرب کا ملک مختلف قبیلوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر قبیلہ اپنی جگہ آزاد تھا۔ مرکزیت ناقابل تصور تھی۔ آئے دن قبیلوں میں کشت و خون اور غارت گری کا بازار گرم رہتا تھا۔ جان و مال و آبرو ہمیشہ خطرہ میں تھے۔ امن و چین کا نام و نشان نہ تھا۔ لوٹ مار اور غارت گری کسب معاش کا ذریعہ بنے ہوئے تھے۔ جنگ کی وجہ سے ان کے جنگجویانہ قویٰ تو ہمیشہ بیدار رہتے تھے لیکن اسی جنگ کے باعث ان میں طرح طرح کی بے اعتدالیاں اور بدعنوانیاں جڑ پکڑ رہی تھیں۔ قماربازی، شراب خوری آپس میں گالی گلوچ اور ایک دوسرے کی بے حرمتی، جان اور مال اور آبرو کی تحقیر اور نوع انسانی کی جگہ قبیلوں اور خاندانوں میں انسانیت کی تقسیم الغرض قسم قسم کی گمراہیاں اُن میں پرورش پا رہی تھیں جس کے باعث انسانیت قعر ذلت اور تباہی کے عمیق غار کے کنارے آچکی تھی۔ وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا (پ ۴ ع ۲)

ہمیشہ ظلمت کے بعد نور، فساد کے بعد امن اور ضلالت کے بعد ہدایت کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ لہٰذا جب دُنیا اپنی انتہائی ضلالت کی حد تک پہنچ چکی تھی تو پھر ہدایت کا

---

[1] یہ تاریخی واقعات سیرۃ النبی صلعم از شبلی صاحب جلد اول، تاریخ الامت حصہ اول از محمد اسلم صاحب جیراج پوری اور تاریخ اسلام حصہ اول از شاہ معین الدین صاحب سے لیئے گئے ہیں۔

آنا ضروری تھا۔ چنانچہ ۵۷۰ء کی صبح کو خدا نے ہادی برحق کی ولادت سے دنیا کو مسعود کیا۔ اور اس کے چالیس سال بعد اسی شہر مکہ سے آفتاب رسالت کو طلوع کیا۔ اس آفتاب عالمتاب نے پہلے اپنے گھر پھر اعزہ و اقربا، پھر قبیلہ کے لوگوں کو اور پھر پورے شہر کے باشندوں کو اپنی شعاعوں سے گرمانا شروع کیا۔ تاریک گھنگھور گھٹائیں اس کے درمیان حائل ہو رہی تھیں اور اس کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کر رہی تھیں۔ لیکن یہ نور سارے عالم کو منور کرنے والا اور ظلمت و تاریکی کو دنیا کے گوشہ گوشہ سے دور کرنے والا تھا اور بالآخر یہ شعاعیں وادی غیر ذی زرع سے نکلکر طائف اور حبشہ تک میں ضوگستری کرنے لگیں اور دوسری طرف یثرب کو اپنی ضیاء تابی سے گرما کر اپنے لئے زمین ہموار کرلی۔

۶۲۲ء سے آفتاب رسالت کی شعاعوں نے اپنی پوری آب و تاب سے سارے عرب میں ضیاء پاشی کرنا شروع کیں اور دیکھتے دیکھتے مدینہ کی اکثریت کے قلوب کو اپنے نور سے منور کرلیا۔ گویا یہیں سے آپ کی سیاسی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے۔

جب مدینہ میں ایک شہری مملکت قائم ہوگئی تو آپ نے قرآنی احکامات کی روشنی میں اس مملکت کا سیاسی انتظام کرنا شروع کر دیا۔ وہاں کی اقلیت یا یہودیوں سے آپ نے معاہدے کئے اور ان کے اور مسلمانوں کے حقوق و فرائض کو متعین کرلیا۔ قرب و جوار کے قبیلوں سے بھی آپ نے معاہدے کئے اور اپنے مشن کا پوری شدت سے پرچار کرنا شروع کر دیا۔

مدینہ آنے کے بعد بھی آپ کو امن و چین نصیب نہ تھا۔ یہاں کفار قریش کے علاوہ مدینہ کے یہود اور منافقوں سے بھی سابقہ تھا۔ کفار قریش کی سازشیں اور مدینہ کے یہودیوں اور منافقوں کی ان سے سازباز برابر جاری تھا۔ لیکن اس پر بھی مکہ والوں کو تسلی نہ ہوئی اور وہ رمضان ۲ھ کو مدینہ پر مسلمانوں کو تباہ کرنے کے ارادہ سے حملہ آور ہوئے مسلمان مظلوم تھے۔ خدا نے انہیں بھی جنگ کی اجازت دیدی۔ بالآخر ۱۷ رمضان کو کمزور

اسلام پہلی بار باضابطہ طور پر نبرد آزما ہوئے اور خدا کی نصرت مسلمانوں کے شامل حال رہی اور کفر کو حق کے سامنے بھاگنا ہی پڑا۔ اس کے بعد کفار سے متعدد جنگیں ہوئیں مگر اتنی نہیں جتنی کہ مغازی رسولؐ پڑھنے کے بعد معلوم ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان اصحاب نے ہر معمولی واقعہ کو، دو تین آدمیوں کی جھڑپ، دشمنوں کی دیکھ بھال، قافلہ کی روک ٹوک اور اس قسم کے معمولی واقعات کو ایک جنگ کی حیثیت دیدی۔ ورنہ بڑی بڑی جنگیں بس یہی چند بدر، احد، بنی نضیر، خندق، بنی قریظہ، بنی مصطلق، خیبر، مکہ، حنین اور تبوک کی لڑائیاں تھیں۔ یہ تمام جنگیں مدافعانہ تھیں۔ مکہ بغیر خون ریزی کے فتح ہوگیا اور یہ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے تاریخ اسلام کا بہت عہد آفرین واقعہ ہے۔ فتح مکہ ۸ھ کے بعد سارے عرب میں اسلام کا رعب داب قائم ہوگیا اور اس کے بعد عرب کے مختلف قبائل اسلام میں جوق در جوق آنے لگے۔ اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا اور یہ سال (۹ سنہ ہجری) عام الوفود کے نام سے تاریخ اسلام میں مشہور ہوگیا۔

عرب پر تسلط قائم ہونے کے بعد آپ نے اپنے تبلیغی کام کو سارے عالم تک پھیلا دیا اور تمام سلاطین اور رؤساء کے نام مراسلات روانہ فرمائے۔ قیصر نے دل سے اسلام کی حقانیت قبول کرلی اور اسی طرح عزیز مصر نے بھی اس دین کی سچائی کا اقرار و اعتراف کیا لیکن دربار کی وجہ سے اسلام سے یہ ہر دو مشرف نہ ہو سکے۔ لیکن شاہ حبش نجاشی نے اسلام قبول کرلیا کسریٰ نے نخوت و تکبر سے نامۂ مبارک کو چاک چاک کر دیا اور باذان کو آپ کے پکڑ لانے کا حکم دیا۔ اور شاہ غسان نے سفیر کو قتل کر دیا جن کے قصاص کے لیے سریہ موتہ کا واقعہ پیش آیا۔

الغرض آفتاب رسالت گھر سے قبیلہ، قبیلہ سے شہر، شہر سے اطراف و اکناف شہر، پھر طائف و حبش و یثرب، اس کے بعد سارے عرب اور بالآخر سارے عالم میں تنویر ہدایت پہنچا کر رہا اور جس حق کو پہنچانے کے لیے طلوع ہوا تھا اس کو پہنچا کر چھوڑا۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔

یہ تھا عہد نبوی صلعم کی تاریخ کا ایک نہایت ہی مختصر تدریجی اور ارتقائی خاکہ ہے اس کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی سیاسیات کی خصوصیات بیان کرنے سے پہلے اس کے نظام حکومت کا ایک مختصر سا خاکہ بھی پیش کر دیا جائے کیونکہ محض نظر سے بغیر عملی نمونہ کے بے رُوح ہوتے ہیں :-

نظامِ حکومت گو آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہجرت کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا لیکن اسلام کی شہنشاہی کا پہلا دن فتح مکہ ۸ھ تھا کیونکہ اس واقعہ کے بعد ہی سارے عرب نے وفود بھیج کر گویا آپ کی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا۔ آپ نے اصل خلافت آلٰہی کے اہم اجزاء اواخر ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقعہ پر سب کو بتلا دئیے تھے۔[1]

آپ کی بعثت کا اصل مقصد دعوت مذہب، اصلاح اخلاق، اور تزکیہ نفوس تھا۔ اس کے علاوہ اور تمام فرائض ضمنی حیثیت رکھتے تھے۔ اس بناء پر انتظامات ملکی آپ نے اسی حد تک قائم کئے جہاں تک ملکی بدامنی کے باعث دعوتِ توحید میں عوائق پیش آتے تھے لیکن ایک صالح سیاسی نظام کے لیے جو جو باتیں ضروری تھیں اُن کا آپ نے اپنی عملی مثال اور نمونہ سے صحابہ کے سامنے ایک اجمالی مگر پورا خاکہ پیش کر دیا۔

اُس وقت آپ کی عمر شریف ساٹھ برس کی تھی تاہم حکومت کے تمام کام آپ خود ہی انجام دیتے تھے۔

سپہ سالاری یا امیر العسکری چھوٹی مہمون کے لیے صحابہ کو بھی بھیج دیا کرتے تھے لیکن بڑی مہمین تمامتر آپ ہی سرانجام دیتے تھے۔ جنگ میں شرکت سے مقصد صرف لڑائی اور آخری فتح ہی نہ ہوتا تھا بلکہ فوج کی عام اخلاقی اور رُوحانی نگرانی کرنی

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سیرۃ النبی صلعم جلد دوم باب "تاسیس حکومت" صفحہ ۲۳ - ۸۱ یہ تمام واقعات اُسی کتاب سے لیے گئے ہیں۔ بڑی تقطیع۔

اور انہیں میدان رزم کے صحیح اور معتدل طریقے بتلانا بھی ہوتا تھا۔

افتا و فصل مقدمات افتا اور فصل مقدمات کے لیے کوئی خاص وقت مقرر نہ تھا۔ اذن عام تھا۔ دروازہ پر کوئی دربان نہ ہوتے تھے۔ آپ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے صحابہ کو مسائل سمجھاتے اور احکامات دیتے تھے اور جھگڑے اور نزاعات کا فیصلہ قرآن کی روشنی میں فرمایا کرتے تھے۔ اگر قرآن کی کوئی آیت نازل نہ ہوئی ہوتی تو صحابہ سے مشورہ فرماتے اور اہل کتاب سے بھی ان کے کتابی احکام معلوم کر کے فیصلہ فرماتے۔ بعض اکابر صحابہؓ مثلاً ابوبکرؓ، عمرؓ، علی اور معاذ بن جبل (رضوان اللہ علیہم اجمعین) وغیرہ کو آپ نے فصل مقدمات کی اجازت دی تھی۔ لیکن مدینہ اور حوالی مدینہ کے اکثر مقدمات خود آپ ہی فیصل فرمایا کرتے تھے۔

کتابت اس کام کی اہمیت کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں اگرچہ دوسرے صیغوں کے باضابطہ دفتر قائم نہیں ہوئے تھے لیکن اس کام کے لیئے ایک باضابطہ محکمہ قائم تھا۔ سلاطین و ملوک کو دعوت اسلام کے خطوط، غیر قوموں کے ساتھ معاہدے، مسلمان قبائل کو احکامات لکھوانا، عمال محصلین کو تحریری فرامین، فوج کا رجسٹر مرتب کرنا، بعض کو حدیثیں لکھوانا اور قرآن پاک کی کتابت سب اسی محکمہ کے تفویض تھے۔ ان کاموں پر متعدد صحابہ فائز رہے مثلاً حضرت علیؓ امیر معاویہؓ وغیرہم لیکن ان میں حضرت زید بن ثابتؓ کو ایک خاص امتیاز یہ حاصل تھا کہ وہ عربی کے ساتھ عبرانی زبان بھی جانتے تھے۔

مہمانداری ۔ اس محکمہ کا کام وفود اور سفیروں کی خاطر تواضع، نومسلموں کے تالیف

لہ مثلاً حضرت علیؓ اور معاذ بن جبلؓ کو فیصلوں کے طریقے سکھا کر آپ نے یمن بھیجا ہے۔ اور معاذؓ سے خود طریقہ دریافت فرما کر ان کے جواب پر خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے۔

قلوب کے لیے ان سے حسن سلوک اور غریب و نادار مسلمانوں کے لیے غذا و لباس مہیا کرنا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ برہنہ جماعت آئی تو آپ نے صحابہ کو جمع کرکے ان سے حسن سلوک کی تلقین کی اور آن کی آن میں کپڑوں اور غلہ کے انبار لگ گئے اور ان کی احتیاج رفع کردی گئی۔ سفیروں کے ساتھ آپ خاص تواضع اور مدارات کرتے۔ نجاشی کے سفیروں کی مہمانداری آپ نے خود اپنے دست مبارک سے کی کہ انھوں نے مہاجرین حبشہ کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا۔ آپ کو وفود کی خاطرداری کا اتنا خیال تھا کہ آخری وقت آپ نے نصیحت فرمائی تھی اجیزالوفد بنحو ماکنت اجیزھم۔

عیادت مرضی آپ یوں بھی حسن معاشرت کے طریقے ہمیشہ صحابہ کو سکھاتے رہتے کہ اس سے حقیقی امن وچین بستیوں میں قائم رہتا ہے لیکن جب کوئی مرض میں مبتلا ہوتا تو اس کی خاص طور سے عیادت فرماتے اور نزاع کے وقت اکثر لوگ آپ کو اپنے گھر لیجاتے اور مریض کے لیے دعائے مغفرت کے طالب ہوتے۔ آپ دعائے مغفرت کرتے اور جنازہ کی نماز بھی پڑھاتے۔ آپ نے باوجود صحابہ کی مخالفت اور آگاہ کرنے کے عبداللہ بن ابی منافق کی نماز جنازہ پڑھائی اور اپنا کرتہ مبارک کفن کے لیے دیا تاکہ اس کے قبیلہ والے اور دوسرے منافقین راہ راست پر آجائیں اور ان میں خلوص پیدا ہوجائے[1]۔ اگر کسی کے اوپر قرض ہوتا تو آپ اس کے جنازہ کی نماز نہ پڑھاتے نتیجہ یہ ہوتا کہ دوسرے صحابہ اس مردہ کا قرض ادا کردیتے اور پھر آپ اس کی نماز جنازہ ادا فرمادیتے۔

احتساب۔ تمدن اسلامی کے دور ترقی میں محکمۂ احتساب ایک مستقل محکمہ تھا جو نہایت وسیع پیمانہ پر تمام قوم کے اخلاق وعادات، بیع وشریٰ اور معاملات دادوستد کی نگرانی کرتا تھا۔ لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہ محکمہ قائم نہیں ہوا تھا

---

[1] یہ اس احسان کا بدلہ بھی تھا جو ابی نے حضرت عباسؓ پر جب وہ بدری قیدی تھے اپنا کرتہ دیکر کیا تھا

بلکہ آپ خود اس فرض کو انجام دیا کرتے تھے۔

آپ کے صحابہ جو آپ کی ذات سے اپنا تزکیہ قلب کر چکے تھے خود اپنے محتسب آپ ہوتے تھے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو اپنا فریضہ سمجھتے اس لیے کسی خاص محکمہ کی ضرورت ہی نہ تھی۔ بقول مولانا ابو الکلام آزاد اسلامی عبادات خود سب سے بڑے محتسب تھیں۔ (اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ اور الصَّوم جُنَّۃ) "یہ محتسب تمہارے پاس پانچ وقت آتے ہیں۔ ہر سال آتے ہیں تمام عمر میں ایک بار آتے ہیں"[۱] لیکن پھر بھی جیسے جیسے کاروبار اور اجتماعی زندگی میں وسعت ہوتی گئی آپ کے لیے ان پر نگرانی رکھنی اور انہیں صحیح طریقے دکھلانے بھی ضروری ہو گئے۔ چنانچہ ایک بار آپ نے بازار میں اناج کا ڈھیر دیکھا۔ اندر ہاتھ ڈالا تو نمی تھی۔ فرمایا کہ اس حصہ کو اوپر کر دیا ہوتا کہ لوگوں کو حقیقت کا علم ہو جاتا۔ پھر فرمایا "جو لوگ دھوکہ دیتے ہیں وہ ہم میں سے نہیں"۔ ایک بار ابن اللتیہ صدقہ کا مال لیکر آئے اور کہا یہ مال صدقہ کا ہے اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے آپ نے فرمایا "تمہیں یہ ہدیہ گھر بیٹھے بیٹھے کیوں نہیں مل گیا"۔ پھر آپ نے ایک عام خطبہ دیا جس میں اس قسم کے کاموں کی ممانعت فرمائی۔

اصلاح بین الناس

اسلام امن وسلامتی کا علم بردار تھا۔ یہ تمام دنیا کے تفرقوں کو عموماً اور عرب کے اختلافات کو خصوصاً مٹانے آیا تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کام کو اپنا ضروری فرض سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ عمرو بن عوف کے قبیلہ میں جھگڑا ہو گیا تو آپ اس جھگڑے کے چکانے میں اس قدر منہمک ہو گئے کہ جماعت میں دیر سے آکر ملے۔ حدرد اور کعب میں قرضہ کے معاملہ میں تکرار ہوئی تو اس کا بہترین طریقہ پر تصفیہ فرما دیا۔ عبداللہ بن ابی کی شرارتوں اور ریشہ دوانیوں سے ایک بار انصار کے

---

[۱] الحسبہ فی الاسلام یعنی احتساب فی الاسلام از ابو الکلام آزاد الہلال جلد ۵ نمبر

دو قبیلوں کی تلواریں نکل گئی تھیں پھر آپ نے معاملہ پاک کروا دیا اور ان میں صلح کرادی اس طرح آپ ہمیشہ نزاعات کو پیدا ہونے سے روکتے رہتے اور ان کے تمام منافذ بند کرتے رہتے تھے۔

حکام وولاۃ فصل قضایا، اقامت عدل، بسط امن اور رفع نزاع کے لیے متعدد ولاۃ وحکام کی ضرورت تھی اور آپ نے متعدد صحابہ کو مختلف مقامات کا حاکم و والی بنا کر بھیجا۔ چونکہ یمن ایک متمدن اور بڑا ملک تھا اس لیے اس کو پانچ حصوں میں تقسیم کرکے ہر حصہ کا علیحدہ علیحدہ گورنر مقرر فرمایا۔ عموماً جب کسی مہاجر کو عامل مقرر فرماتے تو اس کے ساتھ ایک انصاری کا بھی تقرر فرما دیتے۔ ملکی انتظامات، فصل مقدمات، اور تحصیل خراج وغیرہ کے علاوہ ان عمال کا سب سے مقدم فرض اشاعت اسلام اور سنن و فرائض کی تعلیم تھی۔ اس طرح یہ لوگ حاکم ملک ہونے کے ساتھ ساتھ مبلغ دین اور معلم اخلاق بھی ہوتے تھے۔ "ھم باللیل رھبانٌ وبالنھار فرسان"

باوجود عرب اتنا وحشی ملک ہونے کے وہاں کے لوگوں پر جب حاکم مقرر فرماتے تو اُن سے نہایت نرمی اور خوش اخلاقی کا برتاؤ کرنے کا حکم دیتے۔ چنانچہ معاذؓ سے فرمایا "احسن خلقك للناس (ابن سلم)" "یسر ولا تعسر او بشر اولا تنفر اد تطادعاً ولا تختلفاً" (مسلم جلد۲ صہ۶۳)۔

محصلین زکوۃ مسلمان خود صدقہ لاکر پیش کر دیتے لیکن حکومت کی وسعت باضابطگی کی مقتضی ہوئی۔ چنانچہ ۹ھ میں ہر قبیلہ کے لیے محصلین مقرر فرمائے اور عموماً روساء خود محصل ہوتے تھے جن کا تقرر عارضی ہوتا تھا۔ جو خود درخواست کرتا اُسے مقرر نہ فرماتے بلکہ آپ خود دیکھکر مقرر فرماتے اہلبیت کے لیے صدقہ جائز نہیں ہے۔ اسلئے اپنے خاندان والوں کو اس پر مقرر نہ فرماتے اور اس بنا پر آپ نے حضرت فضلؓ بن عباسؓ کی درخواست رد کر دی تھی۔ محصلین کو مال کے اقسام، اُس کے احکامات

لینے کے طریقے سکھلاتے اور ان کو حسب ضرورت معاوضہ عطا فرماتے تھے۔

جلاد۔ اس کام کو مختلف صحابہ انجام دیتے تھے جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے۔

پولیس۔ اس کا کوئی باضابطہ محکمہ نہ تھا۔ اکثر صحابہ آپ کے ساتھ پھرتے اور کام انجام دیتے تھے۔

غیر قوموں سے معاہدے اسلامی فتوحات کو ترقی ہونے کے بعد مختلف مقامات پر غیر مسلموں کی اقلیتیں پیدا ہوگئی تھیں کیونکہ اکثر مقام کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ لہذا ملک میں امن کے قیام کے لیے ان سے معاہدے ضروری تھے۔ چنانچہ حجاز، یمن کے یہودی اور یمن کے یہودیوں اور عیسائیوں، حدود شام، دومۃ الجندل، ایلہ، تفناد، حربا، اذرح نبالہ اور نجران کے غیر مسلمون سے معاہد طے پائے جن میں انہی رعایا کی حیثیت دی گئی اور انہیں جنگی خدمات سے بری کرکے جزیہ کا محصول لیا گیا جس کے معاوضہ میں ان کی جان مال، عزت و آبرو، آزادی وغیرہ کی ضمانت مسلمانوں نے اپنے ذمہ لی۔ جزیہ کی[1] رقم مقرر نہ تھی عموماً ہر عاقل و بالغ اور مستطیع سے سالانہ ایک دینار کی رقم وصول کی جاتی تھی جس سے بوڑھے، بچے، دیوانے اور عورتیں بری تھے۔ بعضوں سے خاص معاہدے بھی طے پاتے تھے کہ وہ مسلمانوں کو اگر وہ انکے ملک سے گذریں تو مہمان رکھیں گے۔ خیبر، فدک، وادی القریٰ اور تیمٰی کے لوگوں سے نصف پیداوار پر مصالحت ہوئی تھی۔ اس کے بعد جزیہ کی آیت نازل ہوئی لیکن پرانا معاہدہ برقرار رہا۔

اصناف محاصل و مخارج مختلف اغراض و مصالح کی بنا پر اسلام میں آمدنی کے صرف پانچ

---

[1] یسئلونک عن الانفال قل الانفال للہ والرسول (انفال) واعلموا انما غنمتم من شیئ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربی والیتمی والمساکین وابن السبیل (انفال)

ذرائع تھے غنیمت، فئی، زکوٰۃ، جزیہ اور خراج جن میں غنیمت مستقل آمدنی نہ تھی۔ خمس نکال دینے کے بعد غنیمت کا ایک ایک حصہ سوار کو تین یا دو اور پیادہ کو ایک حصہ کے حساب سے تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ خمس میں اگرچہ ان کا حق نہ تھا لیکن پھر بھی اکثر انہی پر خرچ ہو جاتا تھا۔

زکوٰۃ صرف مسلمانوں سے لی جاتی تھی تاکہ دولت صرف مالداروں میں جمع نہ ہو جائے[1] اور دوسرے بھائیوں کو بھی اُس میں سے حصہ ملے۔ یہ چار مدوں سے وصول ہوتی تھی: نقد روپیہ، پھل اور پیداوار، مویشی (بجز گھوڑا) اسباب تجارت۔ دو سو درہم چاندی بیس مثقال سونا، پانچ اونٹ اور ۵ وسق سے کم پر زکوٰۃ نہ تھی۔ اس کے یہ مصارف تھے۔ انما الصدقات للفقراء والمساکین، والعاملین علیھا، والمولفہ قلوبھم وفی الرقاب والغارمین فی سبیل اللہ وابن السبیل (توبہ - ۸) یہ رقم نہایت تاکید سے اُنہی لوگوں پر صرف کی جاتی تھی اور عموماً جہاں سے وصول کی جاتی تھی وہیں کے لوگوں پر صرف ہوتی تھی۔

خراج: غیر مسلم کاشتکاروں کے کھیت اور باغ وغیرہ جب تیار ہو جاتے تو محصلین بھیج دیئے جاتے اور وہ حسب معاہدہ تخمینہ کر کے وصول کر لیتے خیبر وغیرہ میں آدھی پیداوار پر صلح ہوتی تھی۔ رفع اشتباہ کے لیے تخمینہ میں سے ایک ثلث کم کر دیا جاتا تھا۔

تقسیم حسب ضرورت ہوتی تھی۔ رجسٹر میں نام لکھے ہوتے تھے۔ متاہل لوگوں کو دو اور مجرد کو ایک حصہ دیا جاتا تھا۔ اوّل آزاد کردہ غلام پھر سپاہیوں کو دیا جاتا تھا۔

رسول کریم صلعم کی سیاسیات آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا تاریخی پہلو اور آپ کے نظام حکومت کا نہایت اجمالی اور مختصر خاکہ پیش کرنے کے بعد اب ہم آپ کی سیاسیات پر فنی اعتبار سے روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

مبدا سلطنت سیاسیات کی کتابوں میں سب سے پہلی بحث مبدا سلطنت کی ہے۔ مختلف سیاست دانوں نے اپنی اپنی فکر اور معلومات کے اعتبار سے

---

[1] کی لایکون دولۃً بین الاغنیاء

سلطنت کا مبداء مختلف قرار دیا ہے۔ کسی نے اس کو "معاہدۂ معاشری" کا نتیجہ بتلایا تو کسی نے جبر و قوت کا اور کسی نے "ارتقائی" یا "تاریخی" نظریہ پیش کیا اور چند دینی لوگوں نے اسکے "ربانی" ہونے پر یقین کیا۔ الغرض۔ع

"شد پریشان خواب من از کثرتِ تعبیرہا"

عقلیت پسندوں نے "ربانی" نظریہ کی طرف زیادہ توجہ نہ کی کیونکہ اس میں نعیشات عقلی کے لیے کچھ زیادہ سامان موجود نہ تھا۔

اسلام نے سلطنت کا مبداء خدا کی ذات کو قرار دیا ہے:۔ وللّٰہ ملک السمٰوات والارض وما فیھن[1] (۵ ۱۲۰) اور اس نے انسان سے پہلے ہی معاہدہ لے رکھا ہے کہ وہی ان کا پروردگار اور پالنہار ہے۔ اَلستُ بربکم؟ قالو بلیٰ۔

اقتدار اعلیٰ یہ بھی سیاسیات کے معرکۃ الآراء مباحث میں سے ایک ہے کہ حکومت میں سب سے اعلیٰ اقتدار کس کو حاصل ہے۔ آیا بادشاہ کو یا عوام کو؟ اس مسئلہ سے متعلق بھی سیاست دانوں نے اپنے عقلی اور تاریخی خیالات ظاہر کیے ہیں۔ کسی نے بادشاہت کو معاہدہ کا نتیجہ بتلاتے ہوئے آخری اقتدار عوام کا ثابت کیا ہے اور بادشاہ کے اختیارات کو محض مفوضہ اختیارات قرار دیا ہے۔ دوسرے گروہ نے جو معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہت کا بہت طرفدار تھا "ظل الٰہی" نظریہ گھڑ کر بادشاہ کی ذات کو خدا کا سایہ ہما یا یہ تبلایا اور اقتدار اعلیٰ کو بادشاہ میں مرکوز کر دیا۔ بہرحال کل حزبٍ بما لدیھم فرحون۔

قرآن نے کھلے طور پر کہہ دیا کہ حکومت صرف خدا کی ہے اور اس کی حکومت میں کوئی شریک نہیں۔ ان الحکم الا للّٰہ (۱۲ ۴۰) لا یشرک فی حکمہ احداً (۱۸ ۲۶) اور کل لہ قانتون (۲ ۱۱۶)[2]

---

[1] لہ مقالید السمٰوات والارض (۳۹ ۶۳) وللّٰہ المشرق والمغرب (۲ ۱۱۵) ولہ ما سکن فی اللیل والنھار (۶ ۱۳) وللّٰہ خزائن السمٰوات والارض (۶۳ ۷) فسبحٰن الذی بیدہ ملکوت کل شیءٍ (۳۶ ۸۳)۔

[2] قل اللّٰھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل

خلافت اس حکومت میں بادشاہت، آمریت یا اس قبیل کی چیزوں کا کوئی تصور ہی نہیں بلکہ قرآن نے بار بار فرعون وہامان اور قارون جیسے لوگوں کا ذکر کرکے لوگوں کو متنبہ کر دیا ہے کہ یہ خدا کے باغی اور دنیا میں فساد پھیلانے والے ہیں۔ اِذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی اور ان فرعون علا فی الارض وجعل اھلھا شیعا یستضعف طائفۃً منھم ویذبح ابناءھم ویَستَحی نساءھُم (۲۸: ۴) اور خدا نے ان "اربابا من دون اللہ" کی حکومت اور بادشاہت اور حکم قائم کرنے کا بارہا حکم دیا ہے[1]

خدا نے انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ[2] یا نائب بنا کر بھیجا ہے اور اس کے حقوق متعین کر دیئے ہیں۔ اُس کو کوئی حق نہیں کہ وہ اپنا حکم چلائے اور بجائے خدا کی بادشاہت دنیا میں قائم کرنے کے خود اپنی خدائی کا دعویٰ کر بیٹھے[3]۔ اس کا کام صرف عامل یا "عاملہ" کا ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں خدا کے نازل کئے ہوئے احکامات کا نفاذ کرکے خدائی حکومت قائم کرے اسکو زیادہ سے زیادہ یہ حق ہے کہ وہ ان احکامات کی آپس کے مشورہ اور غور وخوض سے تاویل[4]

---

[1] فلا تُطِع اٰثماً اوکفوراً ۲۹:۲۳ فلا تُطِع المکذبین ۲۹:۱۲ ولا تطیعوا امر المسرفین۔ الذین یفسدون فی الارض ولا یصلحون ۲۶: ۵۱: ۵۲ اور اُن باغیوں میں صرف بادشاہ ہی نہیں بلکہ قارون جیسے بخیل سرمایہ دار اور رہبان احبار بھی ہیں: اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہِ (التوبہ۔ ۵)

[2] واِذ قال ربک للملٰئکۃ اِنی جاعلٌ فی الارض خلیفۃ (بقرہ)

[3] ماکان لبشرٍ اِن یوتیہُ اللہُ الکتٰبَ والحکمَ والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادًالی من دون اللہِ ولکن کونوا ربانیین (آل عمران۔ ۸) واِذا تولّٰی سعیٰ فی الارض لیفسدَ فیھا ویُھلکَ الحرثَ والنسلَ واللہ لایحب الفسادَ (بقرہ۔ ۲۵)

[4] انّا انزلنا الیکَ الکتابَ بالحق لتحکمَ بین الناس بما اراکَ اللہ ۱۶:۱۴ وَمَا یعلمُ تاویلہ الا اللہُ والراسخون فی العلم یقولون اٰمنا بہ کل من عندِ ربنا ۳:۱

کرے اور ان نازل کئے ہوئے اساسی قوانین کی بنا پر فروعی احکامات و قوانین مستنبط کرے اور بس۔

آپ نے اپنی زندگی سے اس کی بہترین مثال پیش کی کہ اس سے اکمل اور کوئی مثال نہیں ہوسکتی۔ آپ نے کبھی اس دنیا میں اپنی بڑائی نہیں چاہی اور جب کفار قریش نے حضرت ابو طالب کے آگے آپؐ کے سامنے بادشاہت پیش کی تو آپ نے اُسے صاف ٹھکرا دیا۔ اور اپنے کام کو باوجود ناقابل تصور سختیوں اور مشکلوں کے جاری رکھا اور وہ کام اپنی نہیں بلکہ خدا کی بادشاہت کا قیام تھا۔ آپ کو جب طاقت حاصل ہوئی تو آپ نے وہ تمام طاقت و قوت کو خدائی حکومت کے قیام کے لیے صرف کیا۔ آپ نے صحابہ کو نیابت الٰہی کے طریقے سکھائے۔ یعنی وامرھم شوریٰ بینھم ۴۲: ۳۸ اور وشاورھم فی الامر ۳/ ۱۵۹

دستور دساتیر قسم قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض قوم کی تدریجی ترقی کا نتیجہ ہوتے ہیں مثلاً انگلستان کا دستور، بعض جگہ کوئی دستور ساز جماعت بیٹھکر ایک دستور قوم کے لیے مرتب کر دیتی ہے جیسے فرانس میں انقلاب کے بعد ہوا تھا۔ بعض محض بادشاہوں یا حاکموں کے عطا کردہ ہوتے ہیں جیسے ہندوستان کا دستور یا ہماری دیسی ریاستوں کے حالیہ نافذہ دساتیر، اور بعض مملکتوں میں سرے سے دستور ہی نہیں ہوتا جیسے آج بھی بہت سے ہندوستانی دیسی ریاستوں میں ہے۔

پھر ان دساتیر کی تقسیم ایک اور طرح بھی کی جاتی ہے یعنی لچکدار و غیر لچکدار اور تحریری و غیر تحریری۔

اسلامی ریاست کا دستور خدا کی طرف سے نازل کیا ہوا، ناقابل تغیر و تبدل اور تحریری و ائمٹ ہوتا ہے۔ اور صرف فروعی حد تک لچکدار یہ دستور خدا کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے جو انسانی جذبات، خواہشات و اغراض اور ماحول کے اثرات سے بالکل پاک اور انسان کو صراط مستقیم بتلانے والا ہے: کتاب انزلناہ الیك لتخرج الناس

من الظلمٰت الی النور ؎ وما انزلنا علیک الکتاب الا لتبین لھم الذی اختلفوا فیہ ؎ وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم و لعلھم یتفکرون ؎۔

یہ دستور ناقابل تغیر و تبدل ہے اس لیئے کہ یہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ واُوحی الیّ ھذا القرآن لانذرکم بہ ومن بلغ اسی لئے آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا کہ "تم کو لازم ہے کہ میرا یہ کلام اُن لوگوں کو پہنچا دو جو یہاں موجود نہیں ہیں کیونکہ بہت لوگ روایتاً کلام کو سنکر اُن سے زیادہ سمجھتے ہیں جو خود اپنے کانوں سے سُنتے ہیں۔" یہ اُس دستور کے دائمی ہونے کا ثبوت ہے۔ اور اس میں مقام کی بھی قید نہیں کہ یہ سارے عالم کے مُسلمانوں کے لیے ہے اور مسلمان کسی جغرافی قوم کا نام نہیں۔ ونزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکل شیٍ ءھدیً ورحمۃً وبشریٰ للمسلمین ؎

اور چونکہ یہ دائمی اور عالمی ہے اس لیئے اس کی محافظ خود خدا کی ذات ہے: انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحفظون ؎ لہٰذا نہ اُس کو کوئی مٹا ہی سکتا ہے اور نہ اُس میں تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔ واتل ما اُوحی الیک من کتاب ربک لا مبدل لکلماتہ ولن تجد من دونہ ملتحداً ؎۔

اور یہ دستور چونکہ انسانی جذبات، تحریکات، خواہشات واغراض اور ماحول و علم کے اثرات سے پاک ہے اس لیے اس میں جھوٹ، غلطی، فریب، غلط فہمی، غلط انتاج یا خامی بھی نہیں ہو سکتی: وما ھو بقول شاعرٍ قلیلاً ما تومنون۔ ولا بقول کاھنٍ قلیلاً ما تذکرون۔ تنزیلاً من رب العالمین ؎ اور وانہ لکتابٌ عزیزٌ لا یاتیہ الباطلُ من بین یدیہ ولا من خلفہ۔ تنزیلٌ من حکیمٍ حمید ؎

اور یہ دستور تمام انسانوں کے لیے ہے جو ان الفاظ " لتخرج الناس من الظلمات الی النور"

؎ بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ ؎ ۔

اور " لتبین للناس ما نزل الیھم " سے ظاہر ہے۔ لیکن اس دستور سے فائدہ اُٹھانے کے لیے انسانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ خدا کی حکومت کو تسلیم کرلیں یعنی وہ مسلمان ہوجائیں ورنہ نہ ان پر اس دستور کی پابندی ہی لازم ہے اور نہ وہ اس کی خوبیوں سے فائدہ اُٹھاسکتے ہیں "ھدیٰ ورحمۃ وبشریٰ للمسلمین " اور جو اس حکومت کو قبول کرلیتا ہے وہ اس سے بلا امتیاز رنگ ونسل[1] مستفید ہوسکتا ہے کیونکہ کل مومنین اخوۃ اور ان اکرمکم عنداللہ اتقکم۔ اور آپ نے فرمایا: لیس لاحد علی احد فضل الا بدین وتقویٰ (مشکوٰۃ) اور " اقیموا حدود اللہ علی القریب والبعید ولا تاخذکم فی اللہ لومۃ لائم (ابن ماجہ کتاب الحدود)۔

اس دستور کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر انسان اس پر سختی سے عمل کریں تو خواہ وہ کیسی ہی مسکنت اور کتنے ہی افلاس میں کیوں نہوں بہت جلد وہ حکومت اور دنیا و دین میں برتری حاصل کرکے رہیں گے۔ مگر اس دستور پر یقین و ایمان اور اس پر عمل شرط ہے۔ وانتم الاعلون ان کنتم مومنین اور وعد اللہ الذین امنوا منکم واعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف من قبلھم (النور۔۷)

قانون ہر ملک میں اس کے تاریخی روایات، احوال اور تمدنی و تہذیبی ترقی کے اعتبار سے مختلف قوانین ہوتے ہیں۔ اور یہ قوانین چند خاص اساسی اصولوں کے تحت مرتب کئے جاتے ہیں۔ اور جیسے جیسے زمانہ بدلتا جاتا ہے ان قوانین میں بھی رد و بدل ہوتا رہتا ہے۔ جیسے فرانس میں مشہور انقلاب کے بعد یا روس میں ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد ہوا۔ اور یوں بھی ان میں تغیر و تبدل ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ اور اس کا انحصار بہت کچھ اس وقت کی

---

[1] یا معشر قریش ان اللہ قد اذھب منکم نخوۃ الجاھلیۃ وتعظمھا الاباء۔ ایھا الناس کلکم من آدم وآدم من تراب لا فخر للانساب لا فخر للعربی علی العجمی ولا للعجمی علی العربی

[illegible]

حکومت پر ہے مثلاً قدامت پرست، جدت پسند، آزاد خیال یا اعتدال پسند اور انقلابی وغیرہ اور یہ قوانین بنانے کا کام ایک خاص جماعت "متقننہ" کے تفویض ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ ظاہر ہے اکثر و بیشتر اکثریت والی جماعت کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر یہ قوانین بنائے جاتے ہیں جو برسراقتدار ہو ۔ اور ان میں ترمیم و تنسیخ صرف اسی وقت ممکن ہے جب کہ یہ دوسری جماعت بھی اپنے آپ کو اکثریت میں تبدیل کرلے۔

اسلامی قانون مثل اس کے دستور کے بالکل خدائی قانون ہے۔ یعنی قرآن اس قانون میں اجتماعی اور انفرادی ہر دو قسم کی زندگیوں کے لیے قوانین موجود ہیں۔ اور ان "حقوق العباد" و "حقوق اللہ" کو تفصیل اور تکرار کے ساتھ بیان کر دیا گیا: وکذالک نصرف الآیٰت لیقولوا درست ولنبینہ لقوم یعلمون ۱۰۵

یہ قوانین تمام زمانوں اور مقاموں کے لیے یکساں طور پر قابل عمل ہیں۔ اور انہیں نہ کوئی تجدد پسند "اساطیر الاولین" کہہ کر بدل سکتا ہے اور نہ کوئی قدامت پرست "حسبنا ما وجدنا علیہ اباءنا" کہہ کر ان کو رد کر سکتا ہے اور نہ کوئی جماعت برسراقتدار آنے کے بعد محض اپنی جماعت کی خاطر اس میں ردوبدل کرکے اپنے موافق مقصد قوانین بنا سکتی ہے۔ انسانوں کو اس قانون کی صرف تاویل کی اجازت دی گئی ہے کہ ان بتلائے ہوئے اساسی اصولوں کی رو سے زمانہ اور حالات اور واقعات کو دیکھکر فیصلہ کریں۔ یہ قوانین فروعی ہو سکتے ہیں اور انہی اساسوں پر ان کا قائم ہونا ضروری ہے۔ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الظالمون (مائدہ۔۷)

جس حکومت کے لیے قانون پہلے ہی سے موجود ہو اور تمام باشندگان حکومت کو اس پر عمل کرنے اور اس میں غور کرنے کی تاکید ہے تو ظاہر ہے کہ پھر کسی جماعت متقننہ کی اس حکومت میں ضرورت نہیں۔ اب رہ جاتا ہے صرف اس کی تاویل کرنے اور اس کو نافذ کرنے کا کام تو یہ عدلیہ اور عاملہ کا کام ہے۔ اور اس حکومت میں متقننہ، عدلیہ اور عادلہ میں "تفریق

اختیارات" کا کوئی سوال ہی نہیں کہ یہ سب ایک ہی حکومت کے اعضاء ہیں اور سب کا مقصد بالکل ایک سا ہے۔ بلکہ ان سب کو تعاون اور اتفاق سے کام کرنے کی تاکید ہے اور سب میں" تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" کی رُوح کارفرما ہے۔

اِس قانون میں تمام اس کے ماننے والوں کے لیے برابر کے حقوق اور فرائض ہیں اور اس کے آگے کسی کو رنگ ونسل (الا بدین وتقوی) کوئی اِمتیاز حاصل نہیں[1]۔ یہ قانون حاکم یا امیر سے بھی اسی قدر پابندی چاہتا ہے جس قدر کے ایک ادنیٰ شہری سے آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس کی آئینہ دار ہے۔ باوجود اس کے کہ آپ معصوم تھے اگر کوئی آپ پر اعتراض کرتا تو آپ اُس کو تشفی بخش جواب دیتے اور اگر کوئی حق مانگتا تو اُس کو دیدیتے۔ حق تو کیا لوگ ناحق آپ سے کوئی چیز مانگتے تو آپ دے دیتے۔ چنانچہ ایک وقت ایک بدوی نے آکر آپ سے آپ کی ردائے مبارک مانگ لی اور آپ نے اُس کو دے دی حالانکہ آپ کے پاس خود دوسری چادر نہیں تھی۔ ایک اور دفعہ ایک شخص نے آکر کہا کہ آپ نے ایک وقت مجھے کوڑا مارا تھا۔ میں اب آپ سے بدلہ چاہتا ہوں۔ آپ نے اپنی ننگی پیٹ پر اس کو بدلہ لینے کی اجازت دی۔

ایک دفعہ ایک مخزومی عورت نے چوری کی۔ لوگوں نے اُس کے خاندان کا خیال کرکے حضرت اسامہؓ کو آپ کے پاس سفارش کے لیے بھیجا۔ آپ بہت خفا ہوئے اور فرمایا انما اھلک الذین قبلکم، انھم کانوا اذا سرق فیھم الشریف ترکوہ واذا سرق فیھم الوضیع، اقاموا علیہ الحدود۔ ایم اللہ، لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا (بخاری۔ الشفاعۃ فی الحدود)

---

[1] اقیموا حدود اللہ علی القریب والبعید ولا تاخذکم فی اللہ لومۃ لائم (ابن ماجہ کتاب الحدود)

یہ تو تھے قانونی حقوق۔ اور حقوق بغیر فرائض نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا قرآن نے جہاں اپنے ماننے والوں کو بشارتیں دیں اور حقوق عطا کئے ان سے وہیں چند فرائض کی پابجائی بھی چاہی ان میں سب سے بڑے فرائض تو وہی اسلام کے پانچ بڑے ارکین ہیں یعنی اس حکومت کے تسلیم کرنے کا عہد و حلف و توحید۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ ان کے علاوہ اس حکومت کی بقا کے لیے اُن سے انتہائی ایثار بھی طلب کیا کہ اگر وقت پڑے تو تمہیں اس خدا کی حکومت کے لیے اپنی جان سے بھی دریغ نہ کرنا چاہیئے (جہاد) اِن اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیل اللہ صفاً کانھم بنیان مرصوص[1] (الصف۔۴) اور چونکہ کوئی حکومت بغیر تنظیم اور حاکم یا امیر کی اطاعت کے بغیر چل نہیں سکتی اس لئے جہاں اُنہیں آزادی اعتراض کی اجازت دی وہیں اُن پر امیر کی اطاعت کو لازم کر دیا۔ وما ارسلنا من رسولٍ الا لیطاع باذن اللہ (۴/۶) یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ و رسولہ ولا تولوا عنہ و انتم تسمعون (۸/۲) یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فَاِنْ تنازعتم فِی شَیٍٔ فردوہ الی اللہِ والرسول (۴/۸) مَا کَانَ لمومنٍ ولا مومنةٍ اِذا قضی اللہُ و رسولُہ امراً اَنْ یکونَ لَھُمُ الخیرۃَ مِنْ اَمرِھِم (۳۶/۳۳)[2] اور آپ کی ہدایت ہے۔ اسمعوا و اطیعوا ولو استعمل علیکم عبد حبشی۔

---

[1] اور دوسری آیت یہ ہیں:۔ وما لکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساءِ والولدَ ان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم اھلھا (النساء۔ ۱۰)
روزہ کی فرضیت کے لئے یہ آیت ہے: کُتب عَلیکُمُ الصیام کما کُتب علی الذین مِن قبلکم
اور نماز کے لیے: اِنّ الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتبا موقوتا (النساء۔ ۱۵) زکوٰۃ کے لئے: خذ مِن اموالھم صدقةً تطھرھم و تزکیھم بھا (توبہ ع۔ ۱۳) اور حج کے لئے: وللہ علی الناس حج البیت من استطاعَ الیہ سبیلا (آل عمران ع۔ ۱۰)

[2] دیگر آیات یہ ہیں: ومایشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدیٰ ویتبع غیر سبیل المومنین نولہ ما تولی

عدلیہ | جیسے آپ کے زمانہ میں مقننہ نہیں تھی (یعنی فروعی قوانین بنانے کی جماعت)
اسی طرح کوئی عدلیہ اور عاملہ کی علیحدہ علیحدہ جماعتیں بھی نہیں تھیں۔ یہاں تفریق اختیارات
تھی نہ فرائض میں بہت زیادہ علیحدگی تھی۔ بیک وقت امیر فروعی قوانین بھی بنا سکتا تھا
فیصلے بھی کر سکتا تھا اور سزا بھی اپنے ہاتھ سے دے سکتا تھا۔ جب آپ عاملین کو بھیجتے تو انہیں
تبلیغ دین کی بھی تاکید فرماتے۔ ایک ہی صحابی اُن کے زمانہ میں قاضی یا والی کا کام بھی
کرتا تھا اور میدانِ جنگ میں امیر العسکر بھی ہوتا تھا اور پھر خود فیصلہ بھی صادر کرتا تھا۔ ھم
باللیل رھبان وبالنھار فرسان۔

آپ کی ذات تو جامعیت کا انتہائی نمونہ تھی۔ آپ جہاں قرآن کو سمجھاتے اور سمجھاتے
اور اُس کی روشنی میں دوسرے قوانین بناتے وہیں آپ خود تمام مدینہ و اطراف مدینہ کے
لوگوں کے قضیوں اور مقدموں کا فیصلہ بھی کرتے۔ لیکن پھر بھی آپ نے چند صائب الرائے
اور راسخ العلم صحابہ کو فیصلوں کی اجازت دے رکھی تھی۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ اور
معاذ رضوان اللہ علیہم اجمعین اس کام کو آپ کی زندگی ہی میں انجام دیتے تھے۔ حضرت
علیؓ اور معاذؓ کو آپ نے یمن روانہ کیا تھا تاکہ وہاں کے لوگوں سے مختلف رقومات وصول
کریں اور انہیں قرآنی احکامات سمجھائیں۔ پہلے خود آپ نے انہیں تمام طریقے سکھا دیے۔
چنانچہ یمن روانہ کرتے وقت معاذؓ سے آپ نے جو فصل مقدمات سے متعلق پوچھا تھا وہ آج
تک معیاری طریقہ ہے۔ وھو ھذا:۔ قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) لمعاذ
بن جبل حین وجھہ الی الیمن بم تقضی قال بما فی کتاب اللہ قال فان لم تجد بما فی
سنۃ رسول اللہ قال فان لم تجد قال اجتھد رائی فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)

ملاحظہ ہو حاشیہ (ص ۳۲۱) ونصلہ جھنم ۱۱۵/۴ ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ ۴/۸۰ فان تولیتم فانما علی رسولنا البلاغ المبین
۱۲/۶۴ انما کان قول المومنین اذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا واطعنا واولئک ھم المفلحون
واوحی الی ھذا [illegible]

مطابحب رسول اللہ صلعم۔ آپ کا فیصلہ کرنے کا طریقہ بھی یہی تھا کہ اگر قرآن کی آیات اِس خصوص میں نازل ہوگئی ہوتیں تو پھر بالکل اسی کے مطابق فیصلہ کیا کرتے ورنہ آپ صحابہ سے مشورہ[1] کرکے قرآن کے بتلائے ہوئے اصول: وامرھم شوری بینھم (۴۲: ۳۶)۔ وشاورھم فی الامر (۳: ۱۶۹) پر عمل کرتے۔ آپ ایسی صورت میں اہل کتاب سے دریافت فرماتے، (اس لئے کہ اسلام بھی اپنی گذشتہ ادیان کی تصدیق اور تکمیل کے لیے آیا تھا) اور ان پر غور فرماکر اکثر اسی کے مطابق فیصلہ فرماتے اور آپ کے بھی فیصلے نظائر کی حیثیت سے فروعی قوانین کی شکل اختیار کرلیتے۔

عاملہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا مقننہ (فروعی قوانین بنانے والی جماعت) (اور عدلیہ کی طرح عاملہ کی بھی علیحدہ جماعت نہ تھی بلکہ ایک عامل یا حاکم عامل ہونے کے ساتھ عادل بھی ہوتا تھا اور قاضی بھی۔ چنانچہ جب آپ صحابہ کو والی بناکر بھیجتے تو اُن کو عدل وانصاف اور نرمی کی تاکید فرماتے آپ کی ذات تو ان صفات کی اکمل طور پر حامل تھی۔ جہاں آپ ملک کے مہمات امور انجام دیتے وہیں معمولی سے معمولی کام حتیٰ کہ لوگوں کا سامان اٹھا دینا، جنازہ اٹھانا اور اس قسم کے کام بھی خود اپنے دست مبارک سے انجام دیتے۔

اِن حاکمون کو خود آپ منتخب فرماتے اور جو خود اپنے کو پیش کرتا اُس کو نہ بناتے[2]۔ انکو منتخب فرمانے کے بعد اُن سے رعایا کے ساتھ حسن سلوک، نرمی، عدل وانصاف اور تبلیغ وتعلیم کی تاکید فرماتے۔ اور جب یہ لوگ واپس آتے تو اُن کا محاسبہ فرماتے اور اگر کسی نے غلطی کی ہوتی تو اُس کو سزا بھی دیتے۔ ایک بار اللیتہؓ کو زکوٰۃ جمع کرنے کے لیے روانہ فرمایا

---

[1] لایجتمع امتی علی الضلالہ (حدیث) ید اللہ علی الجماعۃ فمن شذ، شذ فی النار (الترمذی) ماراٰہ المسلمون حسناً فھو عند اللہ حسن۔

[2] تفصیلات سیرۃ النبی صلعم از سلیمان ندوی جلد دوم باب "تاسیس حکومت"، ص۵۷

عدلیہ | جیسے آپ کے زمانہ میں مقننہ نہیں تھی (یعنی فروعی قوانین بنانے کی جماعت) اسی طرح کوئی عدلیہ اور عاملہ کی علیحدہ علیحدہ جماعتیں بھی نہیں تھیں۔ یہاں تفریقِ اختیارات تھی نہ فرائض میں بہت زیادہ علیحدگی تھی۔ بیک وقت امیر فروعی قوانین بھی بنا سکتا تھا، فیصلے بھی کر سکتا تھا اور سزا بھی اپنے ہاتھ سے دے سکتا تھا۔ جب آپ عاملین کو بھیجتے تو انہیں تبلیغ دین کی بھی تاکید فرماتے۔ ایک ہی صحابی اُن کے زمانہ میں قاضی یا والی کا کام بھی کرتا تھا اور میدانِ جنگ میں امیر العسکر بھی ہوتا تھا اور پھر خود فیصلہ بھی صادر کرتا تھا۔ ھم باللیل رھبان وبالنھار فرسان۔

آپ کی ذات تو جامعیت کا انتہائی نمونہ تھی۔ آپ جہاں قرآن کو سمجھاتے اور سمجھاتے اور اُس کی روشنی میں دوسرے قوانین بناتے وہیں آپ خود تمام مدینہ و اطراف مدینہ کے لوگوں کے قضیوں اور مقدموں کا فیصلہ بھی کرتے۔ لیکن پھر بھی آپ نے چند صائب الرائے اور راسخ العلم صحابہ کو فیصلوں کی اجازت دے رکھی تھی۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، علی اور معاذ رضوان اللہ علیہم اجمعین اس کام کو آپ کی زندگی ہی میں انجام دیتے تھے۔ حضرت علیؓ اور معاذؓ کو آپ نے یمن روانہ کیا تھا تاکہ وہاں کے لوگوں سے مختلف رقومات وصول کریں اور انہیں قرآنی احکامات سمجھائیں۔ پہلے خود آپ نے انہیں تمام طریقے سکھا دئے۔ چنانچہ یمن روانہ کرتے وقت معاذؓ سے آپ نے جو فصل مقدمات سے متعلق پوچھا تھا وہ آج تک معیاری طریقہ ہے۔ وھو اھذا: قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) لمعاذ بن جبل حین وجھہ الی الیمن بم تقضی قال بما فی کتاب اللہ قال فان لم تجد بما فی سنۃ رسول اللہ قال فان لم تجد قال اجتھد رائی فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)

ملاحظہ ہو حاشیہ (ص۳۲۳) ونصلہ جھنم ۴/۱۱۵ ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ ۴/۸۰ فان تولیتم فانما علی رسولنا البلاغ المبین ۶۴/۱۲
۲۴/۵۱ انما کان قول المومنین اذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا واطعنا واولئک ھم المفلحون
۲۴/۵۴ قل اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول فان تولوا فانما علیہ ما حُمِّلَ وعلیکم ما حُمِّلتم وان تطیعوہ تھتدوا ۲۴/۵۴ واُوحی الی ھذا القرآن لانذرکم بہ ومن بلغ ۶/۱۹

طابحب رسول اللہ صلعم۔ آپ کا فیصلہ کرنے کا طریقہ بھی یہی تھا کہ اگر قرآن کی آیات اِس خصوص میں نازل ہوگئی ہوتیں تو پھر بالکل اُسی کے مطابق فیصلہ کیا کرتے ورنہ آپ صحابہ سے مشورہ[1] کرکے قرآن کے بتلائے ہوئے اُصول: وامرھم شوریٰ بینھم (۳۶:۴۲)۔ وشاورھم فی الامر ۳/۱۵۹ پر عمل کرتے۔ آپ ایسی صورت میں اہل کتاب سے دریافت فرماتے، (اِس لئے کہ اسلام بھی اُنہی گذشتہ ادیان کی تصدیق اور تکمیل کے لیے آیا تھا) اور اُن پر غور فرماکر اکثر اسی کے مطابق فیصلہ فرماتے اور آپ کے بھی فیصلے نظائر کی حیثیت سے فروعی قوانین کی شکل اختیار کر لیتے۔

عاملہ جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا مقننہ (فروعی قوانین بنانے والی جماعت) اور عدلیہ کی طرح عاملہ کی بھی علیحدہ جماعت نہ تھی بلکہ ایک عامل یا حاکم عامل ہونے کے ساتھ عادل بھی ہوتا تھا اور قاضی بھی۔ چنانچہ جب آپ صحابہ کو والی بنا کر بھیجتے تو اُن کو عدل وانصاف اور نرمی کی تاکید فرماتے آپ کی ذات تو ان صفات کی اکمل طور پر حامل تھی۔ جہاں آپ ملک کے مہات اُمور انجام دیتے وہیں معمولی سے معمولی کام حتیٰ کہ لوگوں کا سامان اُٹھا دینا، جنازہ اُٹھانا اور اِس قسم کے کام بھی خود اپنے دست مبارک سے انجام دیتے۔

اِن حاکموں کو خود آپ منتخب فرماتے اور جو خود اپنے کو پیش کرتا اُس کو نہ بناتے[2]۔ انکو منتخب فرمانے کے بعد اُن سے رعایا کے ساتھ حسن سلوک، نرمی، عدل وانصاف اور تبلیغ وتعلیم کی تاکید فرماتے۔ اور جب یہ لوگ واپس آتے تو اُن کا محاسبہ فرماتے اور اگر کسی نے غلطی کی ہوتی تو اُس کو سزا بھی دیتے۔ ایک بار اللیتہؓ کو زکوٰۃ جمع کرنے کے لیے روانہ فرمایا

---

[1] لایجتمع امتی علی الضلالہ (حدیث) یداللہ علی الجماعۃ فمن شذ شذ فی النار (الترمذی) مارأہ المسلمون حسناً فھو عنداللہ حسن۔

[2] تفصیلات سیرۃ النبی صلعم از سلیمان ندوی جلد دوم باب "تاسیس حکومت" ص۵۷

وہ واپس آئے اور کہا یہ مال صدقہ کا ہے اور یہ میرا۔ آپ نے اس پر خفا ہو کر فرمایا" تمہیں یہ ہدیہ گھر بیٹھے بیٹھے کیوں نہ مل گیا" اور پھر خطبہ دیکر سب کو اس قسم کے کام سے منع فرمایا۔ ایک دفعہ حضرت خالدؓ نے غلطی سے چند لوگوں کو قتل کر دیا تو آپ کو معلوم ہونے پر آپ نے اپنی براۃ ظاہر کی اور خدا سے مغفرت طلب کی اور ان مقتولین کا معاوضہ اُن کے وارثین کو ادا فرمایا۔

جنگ جنگ کا لفظ بہت وسیع المعنیٰ ہے اور اس میں ہر قسم کی بھلی اور بری جنگ شامل ہے خواہ وہ محض وسعت سلطنت اور سامراجیت کے لیئے ہو، خواہ دوسروں کو غلام بنا کر زمین میں فساد و شر پھیلانے اور لوٹ کھسوٹ کرنے کے لیئے ہو خواہ کسی اچھے مقصد اور خاص خیالات کی ترویج کے لیے ہو یہ سب جنگ ہی میں شامل ہیں۔ تمام دنیا کے شریف اور عقلمند انسان اس کو ایک بدی اور ناگزیر برائی سمجھتے ہیں۔ اسلام نے بھی محض جنگ کو کبھی اچھا نہیں کہا۔ لیکن وہ برائی اور دائمی بدی کو جنگ سے زیادہ بری سمجھتا ہے" الفتنة اشد من القتل"۔ انما یحاربون الله ورسوله ویسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا ۵:۳۳

اسلامی جنگ کا مقصد کبھی محض جنگ کی خاطر جنگ یا کوئی دنیاوی و مادی فائدہ کی خاطر جنگ نہیں رہا اور نہ ہی زمین میں فساد و فتنہ پھیلانا ہے۔ بلکہ بالکل اس کے برعکس اسکا مقصد امن کی خاطر جنگ ہے[1]۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کی تمام جنگیں مدافعانہ ہوتی ہیں[2]۔ وہ

---

[1] وقاتلوا فی سبیل الله الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان الله لا یحب المعتدین۔
اور وقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنة ویکون الدین لله (بقرۃ - ۱۸۹)

[2] اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان الله علی نصرھم لقدیر۔ الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا الله۔ ولولا دفع الله الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات ومسجد یذکر فیھا اسم الله۔ اور فان قاتلوکم فاقتلوھم (۲:۱۹۲) فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدی علیکم ۲:۱۹۴

اس وقت تک جنگ کی اجازت نہیں دیتا جب تک کہ دوسرا فریق نقض امن نکرے، یا امن قائم کرنے میں رکاوٹ پیدا نکرے یا امن کوشوں سے جنگ شروع نکردے۔ فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم فما جعل اللہ علیکم سبیلا (النساء-۹۲) اذن للذین یقتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر۔ الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ۔ اور فان قاتلوکم فاقتلوھم (۲: ۱۷۲) واقتلوھم حیث ثقفتموھم واخرجوھم من حیث اخرجوکم والفتنۃ اشد من القتل۔

اسلامی جنگ کا مقصد ہمیشہ بدی کی بیخ کنی اور نیکی و بھلائی کا دنیا میں قیام رہا ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ (آل عمران-۱۱) اور اُن اسلامی مجاہدین اور دیگر جنگجویوں کا فرق یہ ہے کہ: الذین اٰمنوا یقاتلون فی سبیل اللہ والذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت (النساء-۱۰) اسی انما الاعمال بالنیات کے نقطہ کو علامہ اقبال ؒ نے کیا خوب ادا کیا ہے۔

قرب حق از ہر عمل مقصود دار تا ز تو گردد جلالش آشکار
صلح شر گردد چو مقصود است غیر گر خدا باشد غرض جنگ است خیر

اور اسی نیک مقصد اور پاک نیت کو ظاہر کرنے کے لیے اسلام نے ایسی جنگوں کا نام "جہاد"[1]

1. An eminent Muslim Jurist has defined Jihad as: "Jihad in the technology of law is used for expending ability and power in fighting the path of God by means of life, property tongue and other than these"—"Muslim conduct of State"—Dr. Hamidullah, Islamic Culture Vol. XV No. 3 P. 273.

رکھا ہے۔ اور یہ اسلامی جہاد صرف مقاتلہ و محاربہ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ اُس مسلسل جنگ کا نام ہے جو مومن رات دن اپنے نفس اَمّارہ، اپنے ناپاک ماحول، اور اپنے نجس معاشرہ کے خلاف مصروف پیکار رہتا ہے۔ اور مقاتلہ و محاربہ اس کا ایک انتہائی اور خون ریز مظاہرہ ہے۔ لیکن اُن سب میں مشکل ترین اور نتیجۃً افضل ترین جہاد وہی ہے جس کو ذات اقدس صلعم نے "جہاد بالنفس" فرمایا ہے۔ ودر من قال۔

مرد مومن زندہ و با خود بجنگ بر خود افتد ہم چو بر آہو پلنگ

اور اُن تمام قسم کے جہادوں کا مقصد بس ایک ہی ہے یعنی "اعلائے کلمۃ الحق"؛ فرق اتنا ہے کہ کہیں اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اِنسان خود اپنے آپ سے برسر پیکار رہتا ہے، کہیں ماحول اور معاشرہ کے خلاف مصروف جہاد ہو جاتا ہے اور کہیں پورے ملک بلکہ ساری ساری دنیا کے مخالفین کے خلاف سرگرم قتال ہو جاتا ہے[۱] اور یہ تمام جد و جہد اور کوشش

بقیہ حاشیہ صفحہ (۳۲۵)

"The lawful reasons" says Dr. Hamidullah in his essay "Muslim Conduct of State," for Muslims to wage war may fall into the following categoies: (1) The continuation of the existing war; (2) Defense; (3) Sympathetic; (4) Punitive, and (5) Idealistic.

[۱] لا یستوی القاعدون من المومنین غیر اولی الضرر والمجاهدون فی سبیل اللہ باموالهم وانفسهم فضل اللہ المجاهدین باموالهم وانفسهم علی القاعدین درجۃ وکلا وعد اللہ الحسنیٰ و فضل اللہ المجاهدین علی القاعدین اجراً عظیماً (نساء ۱۳)

وکاوش اس لیے ہے کہ وہ اپنا بہترین نظام دُنیا میں قائم کرکے ایک دائمی امن، الٰہی قانون اور خدائی حکومت دنیا میں قائم و استوار دیکھنا چاہتا ہے۔ جیسا کہ مولوی ابوالاعلیٰ مودودی نے کہا ہے "اسلام محض ایک مذہبی عقیدہ اور چند عبادات کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک جامع سسٹم ہے جو دنیا سے زندگی کے تمام ظالمانہ اور مفسدانہ نظامات کو مٹانا چاہتا ہے اور اُن کی جگہ اپنا ایک اصلاحی پروگرام نافذ کرنا چاہتا ہے جس کو وہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے سب سے بہتر سمجھتا ہے[۵]"۔ الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر (الحج - ۶) لیکن خدا کو معلوم تھا کہ ایک فریق مسلمانوں کے اُن نیک ارادوں کی مزاحمت کرے گا اور اُنہیں سخت محن وفتن مصیبت و تکلیف اور امتحان و ابتلا میں گرفتار کریگا اور اُن سے گھر، وطن، مال و دولت، خویش و اقربا حتیٰ کہ جان تک کی قربانی طلب کریگا اور جب اُنہیں ان تمام آزمائشوں میں ثابت قدم اور مضبوط پائیگا تو اُس کو مجبوراً اُن کے لیے جگہ خالی کردینا پڑیگی۔ چنانچہ قرآن نے آگاہ کردیا کہ: لایزالون یقاتلونکم حتیٰ یردوکم عن دینکم ان استطاعوا۔ اور اس کے رسول نے (صلوٰت اللہ علیہ) کھلے طور پر کہہ دیا کہ اگر تم باطل کے سامنے دب گئے تو پھر تم حق کو کسی طرح سے بھی قائم کرنے کے قابل نہ رہوگے۔ والذی نفسی بیدہٖ لتامرن بالمعروف ولتنھن عن المنکر ولتاخذن علی ید المسئی ولتطرنہ علی الحق اطراءً ولیضربن اللہ قلوب بعضکم علی بعض

بقیہ حاشیہ صفحہ (۳۲۶) انما المومنون الذین اٰمنوا باللہ ورسولہ ثم لم یرتابوا وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ اولٰئک ھم الصادقون (حجرات - ۲) فالذین ھاجروا واخرجوا من دیارھم واوذوا فی سبیلی وقاتلوا وقتلوا لاکفرن عنھم سیاتھم ولادخلنھم جنٰت (آل عمران - ۲۰)

[۵] "الجہاد فی الاسلام" از سید ابوالاعلیٰ صاحب۔ ترجمان القرآن جلد ۱۴ - عدد ۳۔

اَو لیلعنکم کما لعنھم (الترمذی، ابوداؤد) انہی باتوں کو جانتے ہوئے جہاں آپ نے اپنے آپکو "انا نبی الرحمۃ" فرمایا وہیں "انا نبی الملحمۃ" بھی فرمایا کیوں کہ بغیر اس کے "وجاءَ الحقّ وزھقَ الباطِلَ۔ اِنَّ الباطِلَ کانَ زھُوقًا" کی پیش گوئی پوری نہیں ہوسکتی تھی۔ لہذا خدا نے پہلے تو اُنہیں اپنا کام صلح و آشتی[لہ] اور نرمی سے انجام دینے کو کہا اور ہر قسم کے ایثار و قربانی کی تلقین کی اور اگر اس پر بھی کفار خاموش نہوں تو پھر اُن کی گردنیں اُڑا دینے کی اجازت دے دی۔ اِنّما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون فی الارض فسادًا ان یقتلو ۳۳/۵ اذن للذین یقتلون با نھم ظلموا الخ اور اگر یہ لوگ اس وقت بھی صلح کی طرف جھکیں تو شمشیروں کو نیام میں کر لینے کا حکم دیا کہ مقصد اگر بغیر لڑائی اور جنگ کے حاصل ہوجاتا ہے تو پھر کیوں خون ریزی ہو فان جنحو للسلم فاجنح لھا وتوکل علی اللہ ۶۱/۸ اور اگر بیچ معرکہ میں بھی صلح جوئی کریں تو اُنہیں چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم فما جعل اللہ علیکم سبیلا (۴-۹۲) لیکن اگر وہ نہ مانیں اور جنگ و قتال پر تُلے ہوئے ہوں تو پھر اُن کی گردنیں گاجروں کی طرح اُڑا دینے کی اجازت دی: فاذ لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب ط حتیٰ اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منّاً بعدُ واِما فداءً حتیٰ تضع الحربُ اوزارھا (محمد ع-۱) چنانچہ جنگ بدر میں خوب خون ریزی ہونے سے پہلے کفار کو اسیر بنانے اور پھر اُنہیں فدیہ لے کر چھوڑنے پر خدا کا عتاب نازل ہوا[عہ]۔ ماکانَ لنبیٍّ اِن یکونَ لہٗ اسریٰ حتیٰ یُثخِنَ فی الارض (انفال) اور بغیر کسی ظلم و زیادتی اُن کو ترکی بہ ترکی جواب دینے کی اجازت دی۔ واقتلوھم

لہ دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیئے بیچین نہو بلکہ اُن کو امن و صلح کی طرف بلاؤ اور اس پر بھی اُن سے تمہارا مقابلہ ہوجائے تو پھر ثابت قدم رہو اور صبر کرو اور جان لو کہ جنت تلوار کے سایہ میں ہے (بخاری) "وجادلھم بالتی ھی احسن" ۱۶/۱۲۵

عہ لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذابٌ عظیم (انفال)

حیث ثقفتموھم واخرجوھم من حیث اخرجوکم. والفتنۃ اشد من القتل ـ ۱۹۱

قوانین جنگ اس کے معنی یہ نہیں کہ میدان جنگ میں اتر آنے کے بعد ہر قسم کی بہیمیت وسبعیت جائز کردی جاتی ہے. بلکہ اس میدان کارزار میں بھی قوانین اور قیود کا پابند کردیا گیا ہے کہ درندگی اور انسانی جنگوں میں فرق رہے. چنانچہ آپ کا ارشاد ہے:

ثم امر بلالا ان یدفع الیہ اللواء فدفعہ الیہ ـ فحمد اللہ وصلی علی نفسہ ثم قال: خذہ یا ابن عوف اغزوا جمیعا فی سبیل اللہ فقاتلوا من کفر باللہ ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا ولا تقتلوا ولیداً ولا امرأۃ ـ فھذا عھد اللہ وسیرۃ نبیہ فیکم (ابن ہشام) چنانچہ آپ کا دستور تھا کہ جب کبھی کہیں فوج روانہ فرماتے تو سردار فوج کو بلا کر احکام دیتے کہ شہری اور غیر متحارب آبادی کا لحاظ رکھیں (ابوداؤد میں ہے. لا تقتلوا شیخاً فانیا ولا طفلا ولا صغیراً ولا امرأۃ ـ یہ احکامات اسلئے تھے کہ جنگ کا مقصد کبھی اسلام میں جنگ اور خونریزی نہ تھا بلکہ وہ امن قائم کرنے کا ایک ناگزیر ذریعہ سمجھی جاتی تھی اور اگر یہ مقصد صلح سے حاصل ہوسکے تو پھر جنگ کی اجازت ہی نہیں تھی، فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم فما جعل اللہ علیکم سبیلا (نسا ـ ۹۲) اور اگر دوران کارزار میں عین غلبہ کے وقت بھی وہ صلح جوئی کریں تو مان لینے کا حکم تھا. فلا تھنوا وتدعوا الی السلم وانتم الاعلون (محمد ـ ۳۷)

صلح اسلام اپنے نام ہی میں ہمیشہ صلح کی دعوت رکھتا ہے اور اُس کا کام بھی دُنیا میں لوگوں کو صلح و آشتی سے رہنے کے طریقے سکھلانا ہے تاکہ قیام امن کے بعد ایک دائمی صلح وسلامتی زمین میں قائم و برقرار رہ سکے. اس لئے جب وہ انسانوں کو اپنی طرف بلاتا ہے تو حقیقت میں صلح ہی کی طرف بلاتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو اُٹھتے بیٹھتے اور لوگوں کے آپس میں ملتے اور جُدا ہوتے وقت ایک دوسرے کی سلامتی چاہنے کی تلقین کرتا ہے. یہی وجہ ہے کہ دوران کارزار بھی اور عین غلبہ کے وقت بھی دُشمن

صلح جوئی کرے تو خونریزی روک کر صلح کر لینے کا حکم ہے۔ ایک دفعہ حضرت خالدؓ کی غلط فہمی سے چند لوگوں کو قتل کر دینے پر آپ نے اس واقعہ سے اپنی براۃ کا اظہار فرمایا اور خدا سے مغفرت طلب کی اور مقتولین کے وارثین کو اُن کی دین دلوائی۔

صلح ایک معاہدہ ہے۔ یہ معاہدہ بعض وقت جنگ ملتوی کرنے کے لیے کیا جاتا ہے کبھی لڑائی سے پہلے ہی امن کی زندگی بسر کرنے کے لئے تعین مدت کے ساتھ خاص خاص شرائط پر طے پاتا ہے جیسے صلح حدیبیہ میں ہوا اور بعض وقت غالب و مغلوب قوموں میں بھی طے پاتا ہے کہ اب آئندہ ان ان طریقوں سے ان دونوں قوموں کو زندگی گذارنی ہوگی۔ الغرض ان سب کا مقصد زمین میں سلامتی، امن اور چین قائم کرنا ہے۔ اور ایک بار صلح کے شرائط طے پا جائیں تو پھر دونوں فریقوں پر تا ختم مدت معینہ یا نقض عہد اُس کی پابندی لازمی ہوتی ہے تا آنکہ کوئی فریق تراضی فریقین سے کسی شرط میں ترمیم کرنی چاہیئے جیسے کہ کفار قریش صلح حدیبیہ کے بعد "کفار مسلمانوں کے پاس مدینہ جائیں تو واپس کر دیئے جائیں" والی شرط سے دست بردار ہو گئے تھے۔ اور جب صلحنامہ طے پا جائے تو پھر مسلمانوں کو فریق ثانی سے نیک برتاؤ نرمی اور انصاف کرنے سے منع نہیں کیا گیا۔ لا ینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم و تقسطوا الیھم فقولا لہ قولا لینا لعلہ یتذکر او یخشیٰ ۲۰؂۔ اور اگر مغلوب قوم ہے تو اس سے بھی کسی قسم کی بدسلوکی روا نہیں رکھی گئی اور آپ نے صحابہ کو ناانصافی اور بدسلوکی سے سختی سے روکا ہے۔ الا من ظلم معاھدا او انتقصہ او کلفہ فوق طاقتہ او اخذ منہ شیئا بغیر طیب نفس فانا حجیجہ یوم القیامۃ (ابو داؤد جلد دوم صفحہ ۷۷)

معاہدہ معاہدہ ایک تہ نامہ ہوتا ہے جس پر فریقین آپس کے بحث و مباحثہ اور مشورہ کے بعد تراضی طرفین سے عمل کرنے کا وعدہ کر لیتے ہیں اسلام نے

معاہدہ کی بہت تکریم کی جاتی ہے۔ نہ اس کو "کاغذ کے پُرزہ" کے برابر سمجھا جاتا ہے اور نہ کوئی معاہدہ "محض توڑنے" کے لیے کیا جاتا ہے۔ قرآن اس کی تحریم کا سختی سے حکم دیتا ہے۔ واوفوا بالعهد ان العهد كان مسئولا (۱۷:۳۶) اور اگر فریق ثانی معاہدہ کی کسی دفعہ کو توڑے نہیں اور دشمنوں کی مدد نہ کرے تو پھر اُس معاہدہ پر مدت معینہ تک عمل کرنا ضروری ہے الا الذين عاهدتم من المشركين ثم لم ينقصوكم شيئاً ولم يظاهروا عليكم احداً فاتموا اليهم عهدهم الى مدتهم ان الله يحب المتقين (۹:۴) الذين عاهدتم عند المسجد الحرام فما استقاموا لكم فاستقيموا لهم ان الله يحب المتقين (۹:۷)

معاہدے کئی قسم کے ہوتے ہیں:۔ اشخاص کے درمیان کسی کاروبار میں یا کسی معاملہ پر، ملک کی حاکم و محکوم قوموں کے درمیان، قبیلوں یا ملکوں سے کسی کاروبار کے سلسلہ میں یا غیر جانبداری وغیرہ کے لیے، جنگ ملتوی کرنے یا روکنے اور صلح کرنے، اور جنگ کے بعد مفتوح فریق سے اور مختلف ممالک کے درمیان بین ملکی معاہدے۔ سوائے آخری قسم کے جس میں بجز اُن خطوط کے جو سلاطین اور ملوک کے نام لکھے گئے تھے (اور یہ کوئی معاہدے نہیں تھے) دوسری قسم کے معاہدوں کی مثالیں آپ کی سیرۃ میں کافی ملتی ہیں۔

شخصی معاملات اور لین دین میں پہلے تو ایمانداری کی تلقین کی گئی اور پھر تاکید کر دی گئی کہ جب کوئی معاملہ کرو تو اُسے لکھ بھی لیا کرو تاکہ بعد میں جھگڑا اور فساد نہ ہونے پائے اور ہر اس قسم کے مستقبل کے لین دین کے لیے جس غلط فہمی یا شر و فساد کا ڈر ہو غیر مبہم الفاظ میں ٹھیک ٹھیک طور سے پہلے ہی تصفیہ کرنے کو کہا گیا اور دوسرے معاشرتی عہد جس میں عقد نکاح بھی ہے ان سے متعلق صراحتاً بتلا دیا گیا کہ کس طرح عمل کیا جائے۔ اسی طرح جماعتوں میں بھی معاہدے ہوتے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کے مدینہ میں یہودیوں سے معاہدے تھے

اور ان کی برابر مسلمان پابندی کرتے تھے تاآنکہ انھوں نے جنگ احزاب میں کفار کے ساتھ ملکر مسلمانوں کے خلاف لشکر آرائی کی اور ان قدیم مدینہ کے معاہدوں کی تنسیخ کردی آپ اکثر قبیلوں سے پہلے ہی غیر جانبداری کے معاہدے طے کرلیتے تھے تاکہ کفار حملہ کی جراءت نہ کرسکیں چنانچہ بنی قریظہ اور بنی نضیر وغیرہ سے آپ نے معاہدے کئے تھے۔ اگر کوئی فریق جنگ میں صلح چاہتا تو آپ فوراً اس کے لیے راضی ہوجاتے اور مفتوحین سے بھی معاہدہ طے کرکے اس کی پابندی فرماتے جیسے خیبر وغیرہ میں ہوا۔

الغرض ان تمام معاہدوں کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ دنیا میں امن قائم ہوسکے اور ہر طرح سے شر و فساد کے منافذ بند ہوجائیں لیکن معاہدوں سے اس وقت تک اطمینان اور چین حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی پوری طور پر تحریم نہ کی جائے۔ آپ نے اس سلسلہ میں اپنی ایسی مثال پیش کی کہ آج تک دنیا کی تاریخ پیش نہیں کرسکتی، صلح حدیبیہ کے وقت ابوجندل رض کو کفار کے حوالہ کرنا، اور اس کے بعد ابو بصیر کو مدینہ میں کفار کے مطالبہ پر ان کے حوالہ کردینا یہ اور اس قسم کے کئی واقعات آپ کی سیرت میں موجود ہیں۔ آپ صحابہ کو بھی اس کی تحریم کا خیال رکھنے کی سختی سے تاکید فرماتے تھے: چنانچہ آپ کا ارشاد ہے: الا من اظلم معاهداً او انتقصه او كلفه فوق طاقته او اخذ منه شيئاً بغير طيب نفسٍ فانا حجيجه يوم القيامة (ابو داؤد جلد دوم صفحہ ۷۷)

رواداری۔ دو مختلف الخیال اور متفرق المسلک اشخاص یا جماعتوں میں دوستی اور محبت ہونا بالکل فطری امر ہے کیونکہ محبت اور دوستی کی اساس ہی خیالات کی ہم آہنگی، اعمال کی یکرنگی اور مقاصد کی یکجہتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے جب دو مختلف المذاہب قومیں ایک ہی ملک میں بستی ہوں تو ملک کے امن و چین کو برقرار رکھنے کے لیے ان کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، دوسروں کے کاروبار و معاملات میں ناجائز مداخلت نہ کرنا، ہر ایک کو ان کے حقوق سے استفادہ کا موقع دینا

اور ہر ایک طریقہ سے آپس میں لڑائی جھگڑا نہ ہونے دینا اُس کا نام رواداری ہے۔

اِسلام کی تمام تعلیمات رواداری سے بھری ہوئی ہیں اور اگر اُن پر سختی سے عمل کیا جائے تو اُس سے بہتر قسم کی اور کوئی رواداری نہیں ہوسکتی۔ بقول علامہ محمد پکتھال مرحوم کے مسلمانون میں اگر رواداری کا فقدان پایا جاتا ہے تو یہ صرف اُس وقت سے پایا جاتا ہے جب سے کہ اُنھوں نے اپنے دین پر عمل کرنا چھوڑ دیا[1]۔ نہ مذہب اِسلام میں جبر و اکراہ جائز ہے "لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی پ۳ع۲" اور نہ ہی اُس مذہب نے اَمن جو اور صلح کل لوگوں سے اچھے طریقہ سے ملنے اور نیکی کرنے سے روکا ہے۔ لا ینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم و تقسطوا الیھم (۲۸۔ ممتحنہ ع۔۲) اور اگر دوسرا فریق درپے آزار ہے اور قسم قسم کی سازشیں اور مخالفانہ چالیں چل رہا ہے تو پھر مسلمان مجبور ہیں کہ اُن سے ترک موالات کریں۔ انما ینھٰکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین و اخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم ج ومن یتولھم فاولٰئک ھم الظالمون (ممتحنہ ع۲ پ۲۸)

اگر انہیں اپنے مسلک کی طرف بلانا ہو تو بہترین طریقہ سے بلانے کا حکم ہے: ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن پ۱۴ اور آپکی

---

1. "It was not until the Western Nations broke away from their religious law that they became more tolerant, and it was only when the Muslims fell away from the religious law that they declined in tolerance and other evidences of the highest culture." P. 90 "Tolerance"—"The Cultural Side of Islam"—"Md. Pickthall.

ذاتِ مقدس صلعم خود انتہائی اخلاق اور رحمت کا مجسمہ تھی: فبما رحمۃٍ من اللہ لنت لھم ولو کنت فظاً غلیظ القلب لا انفضوا من حولک (پ۴ ال عمران - ۱۷ع) وانک لعلےٰ خلق عظیم (القلم) اور آپ نے اسی طریقہ کی اپنے صحابہ کو بھی تلقین کی تھی۔ چنانچہ حضرت معاذ کو یمن بھیجتے وقت آپ نے جو ہدایتیں کی تھیں وہ یہ تھیں، انک تاتی قوماً من اھل الکتاب فادعھم الی الشھادۃ ان لا الہ الا اللہ وانی رسول اللہ فان ھم اطاعو لذالک فاعلمھم ان اللہ افترض علیھم صدقۃ توخذ من اغنیا ئھم وترد الی فقرائھم فان ھم اطاعوا لذالک فایاک وکرائم اموالھم واتق دعوۃ المظلوم فانہ لیس بینھا وبین اللہ حجاب" اور پھر آخر میں فرمایا۔ یسر ولا تعسر او بشر اولا تنفر او تطاوعا ولا تختلفا" اور فرمایا۔ احسن خلقک وللناس (ابن سعد) آپ اکثر ان دیگر قوموں سے معاہدہ فرمالیتے تاکہ دونوں کے حقوق کھلے طور پر متعین اور واضح ہوجائیں اور اس پر سختی سے عمل فرماتے۔ الامن ظلم معاھداً او انتقضہ او کلفہ فوق طاقتہ او اخذ منہ شاءً بغیر طیب نفس فانا حجیجہ یوم القیامۃ (ابو داؤد جلد۲) اس طرح اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو معاہدوں کے مطابق پورے حقوق حاصل تھے اور اگر وہ سازشیں اور بدعہدی نہ کرتے اور فساد و طغیان نہ مچاتے تو ان کی جان و مال وآبرو اور مذہبی آزادی کے ضامن خود مسلمان ہوتے تھے۔

معاشرت میں سیاسیات کا دخل مغربی سیاسیات اور مشرقی سیاسیات میں بھی قدیم سے معاشری کاروبار کو سیاسیات سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کی گئی اور اس کو باشندگانِ ملک کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے معاشرہ کی آفرنیش اور ارتقا میں عقل و حکمت سے زیادہ خواہشات و جذبات کارفرما رہے اور نتیجۃً عورتوں کے مردوں کے برابر حقوق، ضبط تولید، زنا، مخلوط تعلیم، شراب خواری، جوا، اور

قسم قسم کی تعیشات میں اسراف وبے اعتدالی اُن کے معاشرہ کا جزو لاینفک بن گئے۔
لیکن جب فطری حدود سے تجاوز کے قدرتی نتائج برآمد ہوئے تو اُنہیں آخر میں اپنی نادانیوں کا اعتراف کرنا پڑا چنانچہ مارشل پتیین نے حال میں فرانس کی شکست کے جو تین اہم اسباب بتلائے اُن میں سے دو انہی معاشرتی خرابیوں کا نتیجہ تھے یعنی "بہت کم لڑکے اور زنانہ اخلاق"
لیکن ؎ آنچہ دانا کند کند نادان لیک بعد از خرابیٔ بسیار

لیکن اسلام جس کی وسعت انسانوں کی ہر دو زندگیوں کو محیط ہے اُس کی دُور رس نگاہوں نے اس عدم مداخلت کی حکمت عملی کو روز اول ہی اپنی سیاسیات میں جگہ نہیں دی اور اُس فعل میں جو اُس کے بتلائے ہوئے اساسی اُصولوں کے خلاف پڑتے ہوں مداخلت کو اپنا جائز حق قرار دیا چنانچہ شادی بیاہ، پردہ، عورتوں کے حقوق، اور اُن کی سرگرمیوں کے حدود، سب مقرر کر دئے۔ چنانچہ جہاں مردوں کو "الناس قوامون علی النسا" قرار دیا وہیں اُن کی اور اُن کے اولاد کی کفالت اور اُن کے حقوق کی نگہداشت کی ذمہ داری بھی اُن پر عائد کر دی۔ آپ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر فرمایا کہ: عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو، تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔" اور قرآن نے اُن کا باہمی تعلق "ھن لباس لکم و انتم لباس لھن" بتلایا۔

اس کے بعد زنا، متعہ وغیرہ جیسے فاسد معاشرتی اعمال کی ممانعت کر دی۔ اسی طرح شراب جوا، انصاب و ازلام وغیرہ کو بھی جنسے معاشرتی خرابیاں پھیلتی تھیں بالکل حرام قرار دے دیا۔ یسلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر و منافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما۔ اور اُن تمام چیزوں کو نجس قرار دیا: انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ (مائدہ) اور اُس کی حکمت بھی تبلادی: انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلوۃ فھل انتم منتھون (مائدہ)

غلامی جس کو اتنی مذمت کرنے کے باوجود بھی آج تک یورپ اپنے معاشرہ سے نکال نہ سکا اُسکی اجازت سے متعلق قرآن میں کوئی نص صریح تو نہیں ہے لیکن "ماسلکت ایمانکم" جیسے الفاظ کا اس طرف اشارہ ہے۔ اور اُس نے اُن کے لیے زکوٰۃ کے اخراجات میں ایک حصہ رکھا ہے (وفی الرقاب) اور آنجناب (روحی فداہ) کے اُن سے حسن سلوک کا یہ عالم تھا کہ آپ نے حضرت انس کو باوجود اُن کے ہمیشہ حاضر خدمت رہنے کے کبھی کسی بات پر "لما فعلت" نہیں فرمایا اور صحابہ کو اُن سے حسن سلوک کی تاکید کی ایک صحابی کو جو اپنے غلام کو مار رہے تھے فرمایا "یہ تمھارے بھائی ہیں جو خود کھاؤ اُن کو کھلاؤ اور جو خود پہنو اُن کو پہناؤ" اور اسی قسم کے الفاظ حجۃ الوداع کے موقع پر بھی فرمائے۔ اُن کے ساتھ آپ کے حسن سلوک کا یہ عالم تھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر خاص معاشرتی اور معاشی مصالح پیش نظر نہ ہوتے تو آپ ہمیشہ کے لیے غلامی کا انسداد فرما دیتے۔

الغرض اسلامی حکومت معاشرتی سرگرمیوں میں اتنی آزادی نہیں دیتی جیسی کہ آج کل کی ناعاقبت اندیش حکومتیں دے رہی ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ بڑی بڑی سیاسی خرابیوں کا سبب یہی معاشرتی خرابیاں رہی ہیں اور اسلامی حکومت کا زوال خود اُنہی نفس پرستوں کا رہین منت ہے۔

معاشی نظام فن معاشیات کو کبھی سیاسیات کا محض ایک جزو سمجھا جاتا تھا لیکن مغرب کی مادہ پرستی نے اس فن کو اب اتنی اہمیت دیدی ہے کہ تمام سیاسی سرگرمیوں کا محور یہی معاشی کاروبار ہو گئے ہیں۔ فن کے اعتبار سے ایسا ہو تو ہو لیکن عملی زندگی میں سیاسی اور معاشی سرگرمیوں کا تعلق ہمیشہ چولی دامن کا رہا ہے۔ لیکن اسلام نے کبھی مادیت کو اتنی اہمیت نہیں دی کہ وہ ایک مقصد حاصل کرنے کے ذریعہ سے ہٹ کر خود بذاتہ مقصد بن جائے۔ اسی لیے اُس نے انسان کی معاشی سرگرمیوں کو اُن کے حدود[1] میں رکھنے کے لیے معتدل بنیادوں پر ایک صالح معاشی نظام پیش کیا جو

---

[1] کلوا واشربوا ولا تسرفوا (اعراف ۳) ولا تجعل یدک مغلولۃ الیٰ

سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے افراطی و تفریطی میلانات سے پاک ہے۔ خیر الامور اوسطھا۔
اسلام کے ہر نظام کا مرکز خدا کی ذات ہے کیونکہ وہی ہمارا مقصد وحید اور ہماری ہر حرکت کا محور ہے۔ وھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً (بقرہ) لیکن نائب سلطنت کو حقوق دئے کہ وہ اُن میں انتظام کرے "عادی الارض للہ و رسولہ ثم ھی لکم منی" (حدیث)
جہاں یہ کہا گیا کہ وما من دابۃٍ فی الارض الا علی اللہ رزقھا (ہود) وہیں اس ذمہ داری کے ساتھ آسمان و زمین کے تمام خزانوں کو انسان کے لیے مسخر کرکے اُس کے سامنے پھیلا دیا: وفی السماء رزقکم وما توعدون۔ اور اُس سے استحصال کی ایک ہی شرط رکھی یعنی لیس للانسان الا ما سعی تاکہ اُنہیں جد وجہد اور کوشش کرنا پڑے اور حکمت بتلادی کہ لو بسط اللہ الرزق لعبادہ لبغوا فی الارض ولکن ینزل بقدر ما یشاء۔ انہ بعبادہ خبیر بصیرہ (الشوریٰ ع ۲) لیکن انسان کی محنت اور اُس کی جد وجہد کے میدان کی وسعت میں کسی قسم کے ناجائز حدود قرار نہیں دئے بلکہ اُس کو خاص اُصول اور قوانین بتلادئے کہ جس طرح اُس کو آزادی ملی ہے اُس طرح وہ بھی اپنے عمل سے دوسروں کی آزادی کو سلب نکرے "لا یرضی لاخیہ الا ما یرضی لنفسہ" (حدیث) اور تمدنی زندگی کی بقا و صلاح کے لے ایک دوسرے سے نیکی میں تعاون کرے: تعاونوا بالبر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (پ ۶) اور اگر پھر بھی اپنے عمل یا مواقع کی وجہ سے اُس کو دوسروں پر فضیلت یا بہتری حاصل ہوجائے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: وھو الذی جعلکم خلٰئف فی الارض ورفع بعضکم فوق بعض درجٰت لیبلوکم فی ما اٰتکم (۶ / ۱۶۵) تو چونکہ اُس کی فضیلت کے حاصل کرنے میں خدا کی مہربانی و عنایت اور معاشرہ کا تعاون حاصل ہے اس لیے اُسے چاہیے کہ اپنی اس مکتسب آمدنی میں کچھ نہیں تو بطور شکر اپنے

ملاحظہ ہو بقیہ حاشیہ صفحہ (۳۴۶) عنقک ولا تبسطھا کل البسط فتقعد ملوماً محسوراً (بنو اسرائیل ع ۳)

دوسرے محروم بھائیوں کو بھی شریک کرےلہ اور اُن کے لیے بھی ایسے مواقع بہم پہنچائے، وفی اموالھم حق للسائل والمحروم (۱۹/۵۱)

یہ اُس معاشی نظام کے چند اساسی اصول وحکم ہیں۔ اِس کے علاوہ اجازت اور رُوک تھام کے لیے بھی چند قوانین بتلا دیے گئے ہیں اُس معاشی نظام میں اِس بات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ فرد کی انفرادیت وآزادی کو پوری طور پر قائم رکھتے ہوئے اسکو ملت کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنایا جائے۔ یعنی فرد وجماعت باہم معاون ہوں مخالف نہوں جن کاروبار سے معاشرہ کو نقصان نہیں پہنچتا اُن سے اکتساب دولت کی پوری پوری اجازت بلکہ ہدایت ہے: فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ (جمعہ) آپ کی بھی صحابہ کو بھی ہدایت تھی اور آپ خود کبھی تاجر تھے۔ جسکا نتیجہ یہ تھا کہ مہاجرین مدینہ آنے کے چند ہی روز بعد اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہو گئے اور اُنھوں نے انصار کو اپنی ذمہ داریوں سے بہت جلد سبکدوش کر دیا۔ آپ نے محنت کو اِس قدر باوقار صفت بنا دیا کہ صحابہ معمولی سے معمولی کام کو بھی نکھٹو رہنے سے معزز سمجھتے تھے۔ اور اُس سے بے روزگاری کا مسئلہ بہت جلد حل ہو گیا۔ اور اِس طرح صنعت وحرفت، زراعت، تجارت وغیرہ میں بہت جلد صحابہ نے اپنے آپ کو مصروف کر لیا۔ فتوحات کے بعد جب زمینیں ہاتھ آئیں تو اُن کو بھی آپ نے صحابہ میں تقسیم فرما دیا۔ اور بنجر زمین پر جو پہلے قبضہ کر کے اپنی روزی کمانے کا اُسے ذریعہ بنائے اُس شخص کو اُس میں مالکانہ حقوق عطا کر دے۔ من احیٰ ارضاً میتۃ فھی لہ (حدیث) لیکن رفاہ عام کی چیزوں میں کسی قسم کے حقوق مالکانہ عطا نہیں فرمائے: لاحمی الا اللہ ورسولہ

(تلک الرسل)
لہ الذین ینفقون اموالھم باللیل والنھار سراً وعلانیۃ فلھم اجرھم عند ربھم۔
واتی المال علی حبہ ذوی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب (۱۷۷: ۲)

اور دوسری جگہ فرمایا:" پانی اور چارہ اور آگ یہ ایسی چیزیں ہیں جن میں سب مسلمان شریک ہیں"
بعض چیزوں کی خرید و فروخت کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے۔ مثلاً وہ چیزیں جو حرام ہیں۔ یا وہ چیزیں جو نجس ہیں جیسے مُردار، خون، جانوروں کا فضلہ وغیرہ یا ایسے معاملات جو نزاع کا دروازہ کھولتے ہیں مثلاً بلا تعین شکل یا مشروط طریقہ پر بیع و شری جس میں بعد میں قیل و قال کا اندیشہ ہو۔ آپ نے فرمایا " جو چیز تمہارے ہاتھ میں نہ ہو اس کی بیع نہ کرو" اور " جو کوئی گیہوں خریدے اُس وقت تک بیع نہ کرے جب تک کہ اس کو اپنے قبضہ میں نہیں کر لیتا" اور دوسری جگہ فرمایا: " سوچو اللہ تعالیٰ نے پھلوں کو نیست و نابود کر دیا تو پھر کوئی کس طرح شئے کے عوض بھائی کا مال لیتا ہے" اور ایسے طریقہ سے نفع کمانے کی کوشش بھی منع کر دی گئی جو عامۃ الناس کے لیے موجب نقصان و تکلیف ہوں جیسے اِحتکار آپ نے فرمایا: "من احتکر فھو خاطی" اور دوسری جگہ فرمایا " الجالب مرزوق والمحتکر ملعون" معاملات میں دھوکہ بازی، ڈنڈی مارنا اور اِس قسم کی فریب دہی ممنوع قرار دی گئی: ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون۔ واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون (التطفیف) آپ نے بازار میں ایک مرتبہ اَناج کے ڈھیر میں ہاتھ ڈال کر دیکھا کہ نمی ہے تو فرمایا کیوں اس کو کھلا رکھکر لوگوں کو بتلا نہیں دیتے پھر فرمایا " جو دھوکہ دیتا ہے وہ ہم میں سے نہیں" اور کاروبار میں تعاون کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے مقابلہ میں ایسی باتوں سے روکا گیا جن میں کوئی شخص اپنی طاقت و دولت سے فائدہ اُٹھا کر دوسروں کو اکتساب رزق سے محروم کر دے اور خود اجارہ حاصل کرلے کیونکہ اکثر اس کا نتیجہ بغض، عناد اور حسد ہوتا ہے جو جھگڑوں اور لڑائیوں پر منتج ہوتا ہے اس مثال میں دوسروں کو مجبور کر کے خود فائدہ اُٹھانے کی کوشش تھی اور دوسری طرف ایک طریقہ دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھانے کا ہے یعنی ربوا۔ اِس لیے قرآن نے ربا کو حرام قرار دے دیا کہ اُس سے تمام معاشرہ کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھا کر اُنہیں ہمیشہ مجبوریوں میں رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے[1]: لاتاکلوا الربوا اضعافاً مضاعفہ (آل عمران)

[1] یمحق اللہ الربوا ویربی الصدقات واللہ لایحب کل کفار اثیم (بقرہ) وما اتیتم

احل اللہ بیع وحرم الربوا (بقرہ) اور آپ نے سود کے ہر کاروبار کو قطعاً ناجائز قرار فرمایا: عن جابر قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربوا وموکلہ وکاتبہ وشاھیدہ وقال ھم سواء (مسلم) جب سود حرام کیا گیا تو آپ نے بعض یہودیوں سے جو معاہدے کئے تھے ان میں ایک شرط یہ بھی رکھی تھی کہ سودی کاروبار وہ لوگ نہ کریں۔ نزول آیت کے بعد سودی کاروبار بند ہو گئے اور راس المال واپس لے لینے کا حکم ہو گیا کہ اس سے فریقین میں سے کسی کا بھی نقصان نہ تھا۔ یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربوا ان کنتم مومنین فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ (بقرہ) اور وان تبتم فلکم روس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون (بقرہ) اور تلقین کی کہ بجائے انکی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کے ان کی ایسے وقت امداد واعانت کرو اور انہیں قرض حسنہ دو: من یقرض اللہ قرضا حسناً فیضاعفہ لمن یشاء اور اس قرض میں "تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" کی روح کارفرما ہونی چاہیئے آپس میں تعاون، ایثار اور جائز محنت یہی وہ چیزیں ہیں جس سے ایک صالح معاشی نظام چل سکتا ہے۔ آپ نے ایسی نیک اور پُرخلوص محنت کرنے والے کی ستائش فرمائی: خیر الکسب کسب العامل اذا نصح (مشکوٰۃ جلد ۲) اور مزدوروں کو ان کا حق یعنی اجرت فوراً ادا کرنے کی تاکید فرمائی: اعط الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ (بیہقی) اور بغیر قبل از قبل تصفیہ کے معاملہ کرنے سے منع فرمایا: نھی عن استیجار الاجیر حتی یبین لہ اجرہٗ" اور انفاق فی سبیل اللہ کی تلقین فرمائی[1]

بقیہ حاشیہ صفحہ (۳۳۹) من ربا لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ (روم) الذین یاکلون الربوا لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطان من المس ذالک بانھم قالوا انما البیع مثل الربوا (بقرہ) یہ ربوا سے متعلق دوسری اور آیتیں تھیں۔ [1] واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئاً وبالوالدین

الحاصل اسلامی معاشی نظام نہ اشتراکیت کی طرح روبہ عمل کرکے سب کچھ معاشرہ ہی کو قرار دیتا ہے اور نہ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح دولت کو چند ہاتھوں میں جمع کرکے خدا کی ایک کثیر مخلوق کے لیے عرصہ حیات تنگ کرتا ہے بلکہ وہ بین بین مسلک پر چلکر فرد و جماعت دونوں کی فلاح کی تدبیرین پیش کرتا ہے دولت کی ساری تقسیم اور اس کو ایک جا سمٹنے یا جمع ہونے سے روکنے کے لیے زکوٰۃ کا طریقہ رکھا "توخذ من اغنیاء ھم وترد الی فقرائھم[1]" (ترمذی ص۲۳۳) اور مالداروں کے انتقال کے بعد اُن کی دولت کو اُن کے ورثا میں تقسیم کا قانون بنا دیا: للرجال نصیب مما ترك الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترك الوالدان والاقربون مما قل منه اوكثر نصيبا مفروضاً۔

اسلامی سیاسیات کا مقصد کوئی خیال یا کوئی کام جو بغیر مقصد کے ہو وہ قابل اعتنا نہیں۔ یہی مقصد ہی ہوتا ہے جو ہمارے ہر ارادے، ہماری ہر حرکت اور ہماری ہر جد وجہد کو متعین کرتا ہے۔ اور نہ صرف راہ متعین کرتا ہے بلکہ تمام لائحہ عمل، پورے ارتقائی مدارج اور اُس تک پہنچنے کے سارے ذرائع میں اسی کی رُوح جاری و ساری رہتی ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسیات کی بزرگی اور برتری کا راز تمام تر اسی میں مضمر ہے کہ

بقیہ حاشیہ صفحہ (۳۴۰) احسناً وبذی القربی والیتامی والمساکین والجار ذی القربی والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبیل وماملکت ایمانکم (والمحصنٰت)

[1] واتوا الزکوٰۃ (بقرہ) اور اس کی حکمت یہ بتلائی گئی لایکون دولۃً بین الاغنیاء اور جمع کرنے والوں کے وعید ہے: والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولاینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم اور ان سرمایہ داروں کا انجام بتلایا: اولم یعلم ان اللہ قد اھلك من قبلہ من القرون من ھو اشد قوۃ واکثر جمعاً۔ قارون کی تباہی کا بھی یہی نخوت و بغاوت سبب ہے (توبہ)

آپ نے حکومت کا نقشہ پیش کرنے سے پہلے اس کا مقصد پہلے متعین فرمالیا۔ اور اپنی تمام جدوجہد کا محور اسی مقصد وحید یعنی "توحید" کو بنالیا۔ اس مقصد کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مقصد تمام وسعتوں کو محیط، زمان ومکان کی قید سے آزاد، ہمیشہ قائم ودائم، اور وحدت نوع انسانی کا حامل ہے۔ بظاہر یہ مقصد ناقابل حصول معلوم ہوتا ہے لیکن جس قدر اس تک پہنچنے کی کوشش کی جائے گی اسی قدر نوع انسانی اپنی اصلی بزرگی اور اشرفیت سے قریب تر ہوتی جائیگی حتیٰ کہ ایک نوبت ایسی آجائے گی جہاں پہنچکر حکومت کی سرے سے ضرورت ہی نہ ہوگی۔ گو اس مقام کا حاصل کرنا ایک جماعت اور قوم کے لیے بے انتہا مشکل ہو لیکن ناممکن نہیں۔ انہی مقامات کو حاصل کرنے کے لیے حکومت کی داغ بیل ڈالی جاتی ہے، دستور اور قوانین بنائے جاتے ہیں۔ عدلیہ وعاملہ کی تشکیل کی جاتی ہے۔ ان بتلائے ہوئے الٰہی احکامات و ہدایات کو نافذ کیا جاتا اور ان پر سختی سے عمل کرایا اور کیا جاتا ہے، اپنے خیالات کی تبلیغ کی جاتی ہے اور ہر طرح سے امن وامان کو قائم کیا جاتا ہے اور دشمنوں سے بھی اچھا سلوک کیا جاتا ہے کہ آج نہیں تو کل یا یہ نہیں تو ان کی اولاد ان کے خیالات کو قبول کرلے گی اور یہ سب کچھ اسی لیے کیا جاتا ہے کہ تمام بنی نوع انسان اپنے مقصد وحید تک پہنچ سکے۔

اسلامی سیاسیات کی امتیازی خصوصیات

یہ مقصد جس قدر بلند وبرتر ہے، اور اس کا حصول جس قدر کٹھن ومشکل اور ایک عمر نوح کا طالب ہے اسی قدر وہ اپنے ماننے والوں کو سخت مصیبت وتکلیف، امتحان وابتلا اور محن وفتن میں ڈال کر ان کو جلا دینا چاہتا ہے اور ان سے بڑی سے بڑی قربانی وایثار کا مطالبہ کرتا ہے لیکن یہ ابتدائی مراحل اس وقت تک طے نہیں ہوسکتے جبتک کہ اس کی سیاسی تعلیمات اور اس کی حکومت کی ہیئت ایسی نہو جو سارے عالم کے لوگ قبول کرسکیں۔ اسی لیے چونکہ یہ عالمی حکومت ہے اور اس کے قیام کی تکمیل کی مدت نامعلوم ہے اس لیئے اس کے قوانین زمان ومکان کے قیود سے آزاد ہیں، اس کے عدل کے سامنے تمام انسان مساوی المرتبہ ہیں

اور اس حکومت کے عامل یا حاکم کے لئے "الا بدینٍ و تقوی" کسی رنگ و نسل یا مقام کے امتیاز کی ضرورت نہیں۔ یہی وہ اساسی اصول ہیں جو اسلامی سیاسیات کو دیگر اقوام کی سیاسیات سے ممتاز بناتے ہیں۔ انہی اعلیٰ خیالات یعنی "حریت" "مساوات و اخوت" کو بڑے بڑے مفکرین بڑی بڑی ترقی یافتہ اور متمدن قوموں نے اپنا مقصد بنائے رکھا لیکن یہ مقصد کبھی کتابوں اور دماغوں سے نکلکر اس چلتی پھرتی دنیا میں ان سے رائج نہ ہو سکا لیکن انہی تعلیمات کو، انہی قوانین کو اور اسی حکومت کو عرب کے ایک امی ہادی نے اپنے صحابہ میں، اپنی حکومت میں اور خود اپنا اعلیٰ نمونہ پیش کر کے عملی طور پر قائم کر کے سارے عالم کو دکھا دیا۔ اور یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسیات کی سب سے بڑی امتیازی شان ہے۔ کان خلق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) القرآن (عائشہؓ)

حقیقت یہ ہے کہ اچھے سے اچھا خیال اور اعلیٰ سے اعلیٰ مقصد بے روح ہے اگر اس کے پیچھے عملی قوت کارفرما نہو۔ آپ نے کوئی خیال کوئی ہدایت اور کوئی حکم ایسا نافذ ہی نہیں کیا جب تک اس کو اپنے آپ پر بھی عائد نہ کر لیا اور یہی چیز تھی جس نے صحابہ میں عملی روح پھونک کر انہیں دیکھتے ہی دیکھتے "استخلاف فی الارض" کا مستحق بنا دیا۔ اسی کے متعلق "عروج و زوال روم" کے مشہور مصنف گبن نے لکھا ہے: "قوائے عمل اور زندہ دلی جو صومعوں اور خانقاہوں میں سوئی پڑی تھی عسکر حجاز کے آواز دہل سے چونک پڑی اور اسلام کی ملت کا ہر رکن حسب استعداد و فطرت و حوصلہ اپنے اپنے مرتبہ پر پہنچ گیا" لیکن اسلامی حکومت کا مقصد تو انسان کو اس کے انتہائی مقام تک پہنچنے کی سہولت بہم پہنچانا ہے جہاں سے اس کو سوائے اپنے "مقصد وحید" کے تمام چیزیں ہیچ نظر آئیں۔

در دست جنونِ من جبریل زبوں صیدے یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

لیکن یہ تمام سیاسیات اپنے اعلیٰ مقصد، بہترین لائحہ عمل اور پُر خلوص قوانین یہاں تک کہ اس کے پیچھے ایک عملی نمونہ کے ہوتے ہوئے بھی ایک دائمی اور عالمی حیثیت اختیار

نہیں کر سکتی اگر اُس کے ماننے والوں میں بغیر کسی بیرونی اور مادی خوف کے خود دل سے اُس کے قائم کرنے، اُس پر عمل کرنے اور کروانے اور اس کی حفاظت ہر قربانی سے کرنے کی خواہش ہو اور یہ چیز اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ غیبی احتساب ہو، ایمانی قوت ہو اور خدا کے ہر جا و ہمہ وقت حاضر و ناظر وجود کو انسان دل سے تسلیم کرے: الم تر ان اللّٰہ یعلم ما فی السموات وما فی الارض ما یکون من نجوی ثلثۃ الا ھو رابعھم ولا خمسۃ الا ھو سادسھم ولا ادنی من ذالک ولا اکثر الا ھو معھم این ما کانوا ثم ینبئھم بما عملوا یوم القیامۃ (۵۸ : ۷) ؎

لن ترجع الانفس عن غیھا مالم یکن منھا لھا زاجر

(ابو نواس)

صلوۃ اللّٰہ علیہ وتحیہ

لٹریچر

علاوہ قرآن پاک و حدیث شریف کے اس مضمون کی تیاری میں حسب ذیل کتب اور مضامین سے مدد لی گئی:-

(۱) سیرۃ النبی صلعم از شبلی نعمانیؒ جلد اول

(۲) " " " جلد دوم

(۳) تاریخ الامت جلد اول (سیرۃ) از محمد اسلم صاحب جیراجپوری

(۴) تاریخ اسلام " از شاہ معین الدین "

(۵) خطبات مدراس۔ سید سلیمان ندوی مدظلہ و فیوضہ

(۶) تفہیمات از ابو الاعلیٰ صاحب مودودی

(۷) الحریت فی الاسلام الہلال ۱۹۱۳ء جلد ۳۔ مدیر احمد المکنی بابی الکلام الدہلوی

(۸) اسلام کا نظام حکومت " " " "

(۹) اولیاء اللہ و اولیاء الشیاطین الہلال ۱۹۱۴ء جلد ۵ مدیر: احمد المکنی بابی الکلام الدہلوی
(۱۰) الحیتہ فی الاسلام 〃 〃 〃 〃 〃
(۱۱) الحرب والاسلام 〃 〃 〃 〃 〃
(۱۲) غزوات اسلامیہ 〃 〃 〃 〃 〃
(۱۳) پابندی عہد اور قرآن حکیم 〃 〃 〃 〃 〃 〃
(۱۴) الحرب 〃 〃 〃 〃 〃
(۱۵) مقاصد حج 〃 〃 〃 〃 〃
(۱۶) اسوہ حسنہ (آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم میدانِ جنگ میں) 〃 〃 〃
(۱۷) اسلام کا نظریہ سیاسی۔ ابوالاعلیٰ صاحب مودودی "ترجمان القرآن" جلد ۱۵، عدد ۴
(۱۸) تفریق دین و سیاست۔ ابوالحسن علی صاحب "ترجمان القرآن" جلد ۱۶، عدد ۶
(۱۹) اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے۔ ابوالاعلیٰ صاحب 〃 〃 〃
(۲۰) 〃 قانون معیشت از افادات شاہ ولی اللہ 〃 〃 〃 جلد ۱۴، عدد ۳، ۴
(۲۱) 〃 نظام محمد اسلم صاحب جیراجپوری "جامعہ" جلد ۲۹، عدد ۴
(۲۲) عہد نبوی کی سیاست کاری۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب۔ "سیاست" جلد ۱، نمبر ۱
(۲۳) اسلام دونوں جہان کی بادشاہی۔ سید سلیمان ندوی "معارف" جلد ۵۴، نمبر ۳

24. The Cultural side of Islam, Muhamad Pichthall.
25. The Religious Polity of Islam, Abdullah Yusuf Ali– "Islamic Culture" 1933.
26. The Political Theory of Islam, Bashiruddin – 1934
27. The Administration of justice in Early Islam, Md. Hanudullah – 1937.
28. The Origin of Islamic Polity – H. K. Sherwani. 1936.
29. The Quranic State – H. K. Sherwani 1936.
30. Muslim Conduct of State – Dr. Hamidullah – " 1941.

سلاجقہ کی سیاست

(از)

قاضی احمد کبیر الدین (عثمانیہ)

چوتھی صدی ہجری کے اواخر اور پانچویں صدی کی ابتداء میں مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور اسلامی سیاست میں تخریبی عناصر نشو نما پا رہے تھے بنی اُمیہ نے خلیفہ بغداد کی وقعت اتنی گھٹا دی تھی کہ اب سیاسی لحاظ سے اون کا عدم و وجود دونوں برابر تھے۔ آل سامان اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہے تھے اُن کی جگہ ایک نئی قوت وجود میں آکر با اقتدار ہو رہی تھی۔ یہ غزنی کی حکومت تھی۔ یہی ابتری کا زمانہ ہے جب کہ سلاجقہ پہلی مرتبہ سیاسی میدان میں ظاہر ہوئے اور اُن کی ترقی و عروج کے سامان خود بخود پیدا ہوتے چلے گئے۔

سلجوق ترکی قبیلۂ غز سے تعلق رکھتے تھے۔ غز اسلامی سرحد کے قریب رہتے تھے اور اکثر خطرہ کا باعث سمجھے جاتے تھے۔ اِن ترکوں کا اصلی وطن ترکوں کا علاقہ تھا۔ وہاں کے بادشاہ جیغو کے زمانہ میں سلجوق کا باپ وقاق یا نقاق بہت مشہور ہوا۔ اُسی بادشاہ کے دور حکومت میں سلجوق پیدا ہوا۔ اُس کی تمام تربیت شاہی محل اور نگرانی میں ہوئی سلجوق کی بادشاہ کے ساتھ وابستگی اِس قدر بڑھی کہ ملکہ کو اندیشہ ہوا اور وہ اُس کے قتل کے درپے ہو گئی۔ جب اس کی اطلاع سلجوق کو ہوئی تو وہاں سے بھاگ نکلا اور سمرقند کے والی کے پاس

اپنے قاصد روانہ کرکے اُس سے پناہ طلب کی، اسلام قبول کرکے دریائے سیحون کے کنارے جند کے مقام پر آباد ہوگیا۔ سلجوق اور اُس کے ساتھی جو نقل مقام کرکے چلے آئے تھے بلا امتیاز آلِ سلجوق یا سلاجقہ کہلاتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اُن کی تعداد پچاس ہزار سے بھی زیادہ تھی اور یہ لوگ عقائد کے اعتبار سے بہت جلد پکے مسلمان بن گئے۔ اسلامی تعلیمات اور نسلی روایات نے ان میں بہت جلد وہ خصوصیات پیدا کردیں جو ان دنوں اسلامی دُنیا میں اخلاقی انحطاط کی وجہ سے جو سیاسی انتشار کا لازمی نتیجہ تھا مفقود ہوچکی تھیں۔

ان لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کا نقل مقام کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی بلکہ اُن کے نئے وطن میں اُن کے لیے نئے نئے مسائل پیدا ہوگئے اور اُن مسائل کی پیچیدگی نے آگے چلکر مختلف شکلیں اختیار کیں۔ گو جند کا علاقہ اسلامی سرحد میں شامل تھا۔ لیکن اس دور دراز کے علاقے میں کوئی خاص انتظام قائم نہیں تھا یہاں تک کہ بعض مرتبہ غیر مسلم ترک بھی مسلمانوں سے خراج کا روپیہ لیا کرتے تھے۔ اُن ہی روایات کے مطابق ترکوں کی ایک جماعت نے سلجوقیوں سے خراج طلب کیا تو بجائے خراج ادا کرنے کے یہ جنگ پر آمادہ ہوگئے۔ اِس جنگ سے دو نتائج پیدا ہوئے۔ ایک تو یہ کہ اسلامی ممالک میں اُن کی اہمیت کا احساس ہوا اور اُس کے علاوہ دوسرے ترک اُن سلجوقیوں سے آکر ملتے گئے۔ اِس طرح اُن کی مجموعی قوت میں اضافہ ہوتا گیا۔

یہ وہ دَور ہے جبکہ سامانی خاندان کی خانہ جنگی اُن کی اپنی بربادی کا باعث ہو رہی تھی۔ ابراہیم سامانی کے خلاف ہارون بن ایلک خاں نے بغاوت کی اور اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے ابراہیم سامانی سلجوق سے مدد کا طالب ہوا۔ سلجوق ہی کی کوشش کی بدولت ہارون بن ایلک خاں کو شکست ہوئی اور وہ فرار ہوگیا۔ یہ سلاجقہ اور آلِ سامان کا پہلا تعلق تھا اور سلجوقی اقتدار و قوت کی ترقی کا دوسرا زینہ۔

اِس طرح جب سلجوق کی طاقت مستحکم ہوگئی تو اس نے اپنے قیام کے لیے بخارا کے

اطراف و اکناف کو پسند کیا۔ سلجوق کے چار بیٹے تھے جن کے نام میکائل۔ موسیٰ اور اَرسلان تھے اور اَرسلان کا لقب بیغو تھا۔ اس کا ایک اور بیٹا عنفوانِ شباب میں مَر گیا۔ ایلک خان کی بغاوت فرو کرنے کے وقت میکائل کام آیا۔ اِس حادثہ سے سلجوق بہت متاثر ہوا اور میکائل کے بیٹوں کو اعلیٰ درجہ کی سیاسی اور فوجی تربیت دِلائی۔ یہ دونوں بھائی طغرل بک اور چغری بک اپنے دادا سلجوق کے اِنتقال کے بعد سلاجقہ کے سرغنہ بنے۔

سلجوق محمد داؤد کے انتقال کے وقت سلجوقیوں کی شہرت قابلیت اور دلیری کا رعب ماوُرالنہر کے حکمرانوں پر بہت گہرا پڑ چکا تھا۔ مگر وہ یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ سلجوقیوں کو دُشمن سمجھیں یا دوست۔ کبھی تو وہ دُوستانہ تعلقات سلجوقیوں سے بڑھاتے اور کبھی اُن سے خوفزدہ ہو جاتے۔ اُس کی اچھی مثال بغراخاں اور ایلک خاں کے طرزِ عمل سے ملتی ہے۔ ھارون بن ایلک خاں اِن بھائیوں کو سدِ راہ سمجھتا تھا اِس لئے چاہتا تھا کہ اُن کا قلع قمع کر دیا جائے۔ اِس غرض سے اُس نے فوجیں جمع کرنا شروع کر دیا۔ چغری بک کو اِن تیاریوں کی اِطلاع اُس وقت ملی جب اُس کی جمیعت منتشر تھی اور اُسے جمع کرنا آسان کام نہیں تھا اُس نے اِس موقعہ پر مصلحت اُس میں دیکھی کہ بغراخاں سے مِل کر غنیم کا مقابلہ کیا جائے۔ بغراخاں نے اُس کے ایلچیوں کی خاطر و مدارات کی۔ گو فریقین میں دُوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے۔ لیکن طغرل بک اور چغری بک کو بغراخاں کی طرف سے اِطمینان نہ تھا۔ اِسلیے اِن دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ دونوں بوقتِ واحد بغراخاں کے پاس جمع نہوں۔ اِس سے یہ اَندازہ ہوتا ہے کہ بغراخاں ایک طرف تو اون سے دَوستی بھی کرنا چاہتا تھا تو دوسری طرف اُن کی قوت سے بھی خایف تھا اِس لیے اُن پر سخت نگرانی قائم کرنا چاہتا تھا۔ یہ دونوں بھائی معلوم ہوتا ہے کہ صورتِ حال سے اچھی طرح واقف تھے۔ اِس وجہ سے اُنھوں نے یہ اِحتیاط کی تھی کہ بغراخاں دونوں کو بوقتِ واحد گرفتار نہ کر سکے۔ جب بغراخاں کو اِس طرح سیاست کاری کے میدان میں شکست ہوئی تو اُس نے اپنے اِرادہ کو فوجی قوت کے ذریعہ

پورا کرنا چاہا۔ اس نے طغرل بک کو قید کر کے ایک لشکر چغری بک کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اس کا لازمی نتیجہ ایک فیصلہ کن جنگ تھی۔ میدانِ جنگ میں بغراخاں کو شکست ہوئی اور وہ مصالحت کرنے پر مجبور ہوا۔ دونوں بھائیوں کی اس کامیابی سے علی تگین حاکم سمرقند پریشان ہوا اور چاہا کہ ترکستان کے حکمرانوں کی مدد سے اُن کا زور توڑے۔ اِس موقعہ پر اُن دونوں بھائیوں نے یہ طے کیا کہ طغرل بک جنگلوں میں پناہ لے اور چغری بک خراسان کی طرف روم کے والی بغراخاں کے پاس چلا جائے۔ چغری بک جب روم کی جانب منزلیں طے کرنے لگا تو غزنی کے فرمانروا سلطان محمود کو فکر دامن گیر ہوئی اور سلطان نے طوس کے والی سے جواب طلب کیا کہ کس طرح چغری بک کو اِس علاقہ میں سے گذرنے کا موقعہ دیا گیا۔ اس پر حاکم طوس نے اُس کی واپسی کے وقت گرفتاری کے انتظامات کئے لیکن چغری بک نے بھیس بدل کر اس علاقہ کو پار کیا۔

۳۷۹ھ ۹۸۹ء میں سامانیوں کے خاتمہ کے بعد سلجوقیوں کا اثر و نفوذ اور بھی زیادہ ہوگیا۔ لیکن سامانیوں کا اصلی جانشین اور وارث غزنی کا فرمانروا سلطان محمود سبکتگین تھا۔ اس نے دریائے جیحون کو عبور کر کے ماوراء النہر پر قبضہ کر لیا تھا۔ محمود کی نظر میں سلجوقی ماوراء النہر میں فساد اور کشت و خون کا باعث تھے۔ اِس لیے انہیں زیر کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ اِسی بنا پر سلطان محمود نے اُن کے سردار ارسلان کو جو بیغو کے نام سے مشہور تھا بہت سے وعدے کر کے بلایا تھا اور پھر اُس کو قید کر لیا تھا۔ یہی وہ واقعہ ہے جہاں سے سلجوقیوں کی حقیقی آوارہ گردی شروع ہوتی ہے۔ اِس وجہ سے کہ اب انہیں وسط ایشیاء کے حکمرانوں کے قول و فعل پر بھروسہ نہیں رہا۔ یہ لوگ دریائے جیحون اور خراسان کے سارے علاقہ پر چھا گئے اور آذربائیجان تک پہونچے۔ ۴۲۹ھ ۱۰۳۷ء میں سلاجقہ کی کیفیت یہ ہوئی تھی کہ وہ نہ تو کسی کو پناہ دیتے اور نہ کسی کی پناہ تلاش کرتے۔ محمود کا جانشین مسعود اپنے باپ کی طرح فریں اور جفاکش نہیں تھا۔ اس نے حماقت سے سلجوقیوں کو

اپنا دشمن بنا لیا۔ خوارزم شاہ چاہتا تھا کہ سلطان مسعود کی قوت کے ذریعہ سلجوقیوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اُس نے اِس موقع پر چالبازی سے کام لیا اور سلجوقیون کو یہ باور کروا دیا کہ وہ بیچ بچاؤ کر کے سلجوقیون اور سلطان مسعود میں دُوستی پیدا کروا دے گا۔ لیکن جب طغرل بک اور چغری بک نساء کے علاقہ میں پہنچے تو مسعود نے اُن کو اس علاقہ سے نکل جانے کا حکم دے کر اُن کی توہین کی۔ اِس طرح اَب مسعود اور سلاجقہ میں جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا اور پہلے ہی معرکہ میں سلطان مسعود کی فوج کو شکست ہوئی۔ اَب سلطان مسعود بذات خود سلجوقیوں سے لَڑنے کے قصد سے غزنی سے نکلا۔ مگر اُس کی قوت فیصلہ بالکل جواب دے چکی تھی۔ وہ کبھی اُنھیں دُوستی کا پیغام دیتا اور کبھی اُن سے لَڑنے کی تیاری کرتا۔ رفتہ رفتہ سلجوقیون کو اُس کے قول و فعل پر اعتبار باقی نہ رہا۔ اُنھوں نے بجائے اُس کی دُوستی کے جنگ کو پسند کیا۔ تین سال تک مسعود اور سلجوقیوں میں جنگ و جدال کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ عمایدِ سلطنت کے مشورہ سے مسعود خود جنگ کے میدان میں نہیں آیا لیکن ایک سپہ سالار سیاشی کو بھیجا جس کو پے در پے شکستیں ہوئیں اور چند علاقے غزنی کی حکومت نے کھو دیے۔ حتیٰ کہ ۴۳۱ھ ۱۰۳۹ء میں خود سلطان کو اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔ لیکن اُس نے ہرات، مرو اور نیشاپور کے علاقے ہمیشہ کے لیے کھو دیئے۔ اسی سال طغرل بک نیشاپور کے علاقہ کا بادشاہ بنا اور چغری بک مرو کا مالک ہوا۔

اِس طرح سلجوقیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ باعزت جماعت اور ایک زبردست سیاسی قوت بن گیا۔ اَب سلجوق اس قابل تھے کہ اسلامی دنیا کی دوسری سیاسی قوتوں کا مقابلہ کریں اور اُون پر بھی اپنی برتری ثابت کریں۔

اِس طرح نیشاپور اور مرو کے علاقوں پر قبضہ جمانے کے بعد طغرل بک اور چغری بک نے اپنی نوزائیدہ سلطنت کے استحکام کی طرف توجہ کی چغری بک بلخ کی طرف متوجہ ہوا یہاں بھی مسعود کے طرفداروں کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد خوارزم شاہ بھی اُن کے

سیلاب سے نہ بچ سکے۔ ملک شاہ شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اَب طغرل بک پہلے دہستان کی طرف اور اس کے بعد جرجان کی طرف متوجہ ہوا۔ ۴۴۶ھ ۱۰۵۴ء کا وہ سنہ ہے جب کہ طغرل بک نے آذربائیجان کو فتح کر لیا۔

اِس کے بعد ۴۴۷ھ ۱۰۵۵ء میں سلجوقیوں کی توسیعی حکمت عملی دو خطوط پر کام کرنے لگی۔ ایک تو خط وہ بنے جہاں یونانیوں کا (بازنطینیوں کا) پہلے ہی سے محاذ قائم ہے اور دوسرا خط بغداد کی طرف ہے۔

جب طغرل بک بغداد کی طرف متوجہ تھا تو اس دوران میں چغری بک کے بیٹے اَلپ اَرسلان نے ارمینیہ کے عیسائی ریاستوں کا زور توڑنے کی کوشش کی جو ہمیشہ بازنطین کے بل بوتے پر مسلمانوں کے لیے خطرہ کا باعث بنے رہتے تھے۔ لیکن اِس دور کا سب سے اہم کارنامہ دوسرے خط پر اِقدامی حکمت عملی ہے۔

ان دنوں بغداد کی حالت بہت خراب تھی۔ آلِ بویہ کا عروج ختم ہو چکا تھا اور ملک الرحیم دیلمی اُن کا آخری بادشاہ تھا۔ اس میں اِتنی بھی قوت اور اہلیت نہیں تھی کہ وہ بغداد کی چاردیواری کے اندر ہی اَمن و امان قائم رکھ سکے۔ شہر میں رات دن شورش کے طوفان برپا ہوتے رہتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بغداد میں ایک بہت بڑے سیاسی انقلاب کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ سلطان بہاء الدولہ بویہ کا ایک غلام وہ کام کرنا چاہتا تھا جو خود آلِ بویہ نے نہیں کیا تھا۔ اس نے فاطمی خلیفہ مستنصر سے خط و کتابت کی اور یہ سازش مکمل کر لی گئی کہ عباسی خلیفہ کو مستقل طور پر خلافت سے علیحدہ کر کے فاطمی خلافت کا اِعلان کر دیا جائے۔ عباسی خلیفہ کو جب اس سازش کا پتہ چلا تو اس کو ساتھ ہی اِس بات کا احساس ہوا کہ ملک الرحیم دیلمی محض عضو معطل ہے اور اس سے مدد کی کوئی امید نہیں ہو سکتی۔ اِدھر بساسیری نے بغداد سے بھاگ کر حلب میں پناہ لی اور نور الدولہ حاکم حلب سے مدد کا طالب ہوا۔ ناچار

خلیفہ کو بیرونی مدد طلب کرنی پڑی. ظاہر ہے کہ اس وقت اسلامی دنیا میں طغرل بک کے سوا، کوئی شخص اُس کی مدد کرنے کے قابل نہیں تھا۔ چنانچہ اُس نے خط لکھ کر اُس کو مدد کے لیے بلایا۔ نہروان کے قریب طغرل بک کا شایان شان استقبال کیا گیا۔ طغرل بک ۴۴۶ھ ۱۰۵۵ء میں بغداد پہونچا اور چند روز کی کشمکش کے بعد ملک الرحیم دیلمی گرفتار کر لیا گیا۔ وقتی طور پر فاطمی خطرہ زائل ہو گیا تھا اول تو بغداد میں طغرل بک کے پیر نہیں جمے تھے اور دوسرے یہ کہ بساسیری ایسی سازشوں میں لگا ہوا تھا کہ ۴۵۶ھ ۱۰۶۴ء میں طغرل بک کے ماموں ینال نے بغاوت کی اور چاہا کہ ہمدان کے خزانہ پر قابض ہو جائے ۔ اَب مجبوراً طغرل بک بغداد سے ہمدان کی طرف متوجہ ہوا. بساسیری نے اس موقعہ سے فائدہ اُٹھایا اور موصل پہونچا۔ قریش ابن بدران سے جو اس وقت موصل کا والی تھا سازش کر کے بغداد پر حملہ آور ہوا۔ اور اسی سال بساسیری کے حکم سے خلیفہ القائم کو قید کیا گیا اور المستنصر کے نام کا خطبہ بغداد میں پڑھا گیا۔ اِدھر صورت حال یہ تھی کہ خراسان میں چغری بک کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کا جانشین اُس کا بیٹا الپ ارسلان مقرر ہوا۔ وہ فوراً ہی اپنے چچا کی مدد کو آگیا۔ دونوں نے اشتراک عمل ذریعہ ابراہیم نیال کو شکست دی اور اس قضیہ سے مطمئن ہونے کے بعد عراق عرب کا رُخ کیا۔ یہاں سے چند لوگ سباسیری کے کے پاس روانہ کیے تاکہ وہ خلیفہ کو بحال کر دے۔ لیکن مباسیری نے اُس کے برخلاف عمل کر کے خلیفہ کو برسہ کی طرف روانہ کر دیا۔ اس کے بعد طغرل بک نے اپنے ایک لائق وزیر عمید الملک الکندری کو خلیفہ کی رہائی کے لیے روانہ کیا ۴۵۱ھ و ۱۰۵۹ء میں طغرل بک کے آدمیوں نے خلیفہ کو مباسیری کے پنجہ سے چھڑا کر بغداد کا رُخ کیا۔ خود طغرل بک نے ۴۵۱ھ و ۱۰۵۹ء میں خلیفہ سے ملاقات کی اور شایان شان سلوک کیا۔ طغرل بک اس کے بعد رے پہونچکر مر گیا۔ الپ ارسلان اس کا جانشین بنا۔ اس نئے سلطان نے اپنے چچا کے ملک کو عملی جامہ پہنایا اور سلطنت اور خلافت کے استحکام کی طرف متوجہ ہوا۔

اَلپ اَرسلان کے زمانہ کے کارناموں کا جائزہ لیتے وقت اس کی سیاست اور حکمت عملی کے دو پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ایک تو وہ فوجی کارروائیاں دوسرے وہ بنیادی اُصول جن پر نہ صرف وہ خود کاربند رہا بلکہ اُس کے بیٹے ملک شاہ کے زمانے میں بھی اُون پر عمل ہوا۔ قبل اِس کے کہ اُس کے زمانہ کی فوجی کارروائیوں کو زیر مطالعہ لایا جائے بہتر یہ ہوگا کہ اُس کی سیاست اور حکمت عملی کا تجزیہ کیا جائے۔ سلجوقی حکمت عملی کا بنیادی اُصول یہ تھا کہ بغداد کی سیاست اَیَن فاطمی یا باطنیہ کی مداخلت کو رُوکا جائے ۳۵۵ھ ۹۶۵ء تک شمالی اَفریقہ میں رہے اور ۳۵۶ھ ۹۶۶ء میں اُن کے سپہ سالار جوہر نے مصر فتح کیا ۳۵۸ھ ۹۶۸ء خلیفہ معز مصر میں منتقل ہوا۔ اَب یہاں سے فاطمی سلطنت کی توسیع شروع ہوئی۔ شام اور فلسطین پر اُنھوں نے آسانی سے قبضہ جما لیا اور کچھ مدت تک حرمین بھی اُن کے قبضہ میں رہے۔ اَب وہ صرف اِن علاقوں پر اپنا قبضہ کافی نہیں سمجھ رہے تھے بلکہ اُس کے خواہاں تھے کہ عباسی خلافت کے طول و عرض میں اپنے مخصوص اُصولوں کی تبلیغ کر کے اُس کو نقصان پہونچائیں۔ اُنھوں نے نہ صرف قرامطہ سے ساز باز کیا تھا اور اپنی سازش کا جال عباسی خلافت میں خاموشی سے پھیلانے میں کامیاب ہوئے تھے بلکہ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ وہ یہاں تک کامیاب ہوئے تھے کہ عباسی خلیفہ القائم بامراللہ کو تخت سے علیحدہ کر کے خود بغداد پر قبضہ کر لیں۔ بر خلاف اِسکے بغداد کی یہ حالت تھی کہ بنی بویہ عباسی خلیفہ کے خیر خواہ نہ تھے۔ اُنھوں نے نہ صرف اُسکے وقار کو صدمہ پہونچایا بلکہ خلاف کو کمزور کرنے لگے۔ لیکن اپنے ذاتی اغراض کی بنا پر اُنھوں نے خلافت عباسیہ کو برائے نام باقی رکھا مگر وہ خود اِتنے کمزور ہو گئے تھے کہ باطنی فتنہ کا سدِّ باب نہیں کر سکتے تھے۔ سلجوقیوں نے اِس کام کو بکمال فوجی انجام دیا اور اپنے مخالف عناصر کا قلع قمع کرنے کے بعد وہ فوراً باطنی فرقہ کے ازالہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

بساسیری کے خاتمہ کے بعد بہ ظاہر اس خطرہ کا سدباب ہوگیا تھا لیکن فی الحقیقت اندرونی اور خفیہ خطرہ روز بروز بڑھتا جارہا تھا۔ حسن بن صباح نے خود ایران میں باطنیہ کا ایک مرکز قائم کرلیا تھا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی کہ مصر کے مرکز سے ایشائی ممالک میں تبلیغ کے کام کی نگرانی کی جائے۔ حسن بن صباح اب الموت میں بیٹھ کر اور بھی زیادہ آسانی کے ساتھ اسماعیلی عقاید کی تبلیغ کرسکتا تھا۔ اس کی روک تھام اس طرح کی گئی کہ نظام الملک طوسی نے محسوس کیا کہ تعلیم پر سرکاری نگرانی قائم کی جائے اور ر عقاید کے تبلیغ کی مانعت اور روک تھام کی جائے جو حکومت وقت کی حکمت عملی کے خلاف ہوں۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر مدارس نظامیہ قائم کئے جن کے ذریعہ عوام کی ذہنیتوں میں تبدیلی پیدا ہونے لگی۔ یہ مدرسے بہت مشہور ہوئے جن میں امام غزالی جیسے استاد پڑھاتے تھے اور بلند پایہ شاگرد تعلیم پاکر نکلتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ امام غزالی جیسی بزرگ ہستیوں نے طریقت کے اصولوں کے ذریعہ باطنی اثرات کا تدارک کیا اس طرح باطنی عقائد کے کاٹ کے لئے ایک ایسی جماعت کھڑی ہوئی جس کو امام غزالی جیسے جید عالم سے بہت بڑی مدد ملی۔ علماء ان مدرسوں میں تربیت پاتے اور اصحاب طریقت ملک کے طول وعرض میں پھیل کر ایسے اصولوں کی تعلیم دیتے تھے جو عوام کے عقاید کو باطنی فرقہ کی خفیہ تبلیغ اور پروپگنڈے سے محفوظ رکھ سکیں۔ ان چیزوں سے باطنی دعوت اور خفیہ سازشوں کی روک تھام ہونے لگی نیشاپور اور دوسرے مقاموں کی درسگاہیں بالخصوص مدرسہ نظامیہ علم وفضل کی دنیا میں ہردلعزیز ہوگئیں اور لازمی طور پر باطنی مخالفت کا مرکز بن گئیں۔ اور بہت تھوڑے ہی عرصہ میں یہ مدرسے جامعہ ازہر کے ہم پلہ ہوگئے۔

الپ ارسلان اس خطرہ سے بھی آگاہ تھا جو عیسائی حکومتوں کی وجہ سے لاحق تھا۔ ارمینہ کی عیسائی ریاستیں یونان (بازنطین) اور اسلامی ممالک کے درمیان حد فاصل تھیں۔ یہ ریاستیں عیسائیت کے دوسرے بڑے مرکز بازنطین کے اشارہ پر چلتیں اور

فوجی نقطہ نظر سے اُس کی حفاظت کرتی تھیں۔ اَلپ اَرسلان نے سنہ ۴۵۶ھ ۱۰۶۴ء میں اُن کے مشہور مامن اَنی پر قبضہ کر کے اُن کی طاقت کو کمزور کر دیا تھا۔ اَنی کا مسلمانوں کے ہاتھ میں اجانا بزنطین کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوا۔ کیونکہ ارمینہ کے عیسائی اب بے بس ہو گئے تھے۔ گو اول اول قیصر قسطنطینیہ اِس خطرہ سے اچھی طرح آگاہ نہ تھے لیکن اَنی کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد بازنطینی نہ صرف اِسلامی خطرہ کا سدِّباب کرنا چاہتے تھے بلکہ اُن کے نزدیک نوزائیدہ سلجوقی حکومت کو شکست دینا اور مشرق میں اِقدامی حکمت عملی اختیار کرنا ضروری تھا۔ اِس قسم کے منصوبوں کے ساتھ بازنطینیوں نے جنگ کی زبردست تیاری کی تھی جیسا کہ طریقہ تھا۔ ارمنی، یونانی، ضعلبی، فوجوں کے دستے بہت جلد تربیت دے کر خود شہنشاہ نے فوج کی اعلیٰ کمان اپنے ہاتھ میں لی اور پیش قدمی کا حکم دیا۔ اَلپ ارسلان کو جب اِس ناگہانی حملہ کی اِطلاع ملی تو وہ بہت تھوڑی سی مُدت میں جس قدر تیاری ممکن ہو سکی کر کے جنگ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ یُوروپین اور اسلامی مورخوں کے بیان کی بموجب اَلپ ارسلان اور روما نوس چہارم کی افواج کا ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یونانی افواج کی امداد اِسلامی افواج کے مقابلہ میں بہت زیادہ تھی۔ اِس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ اَلپ اَرسلان نے آخری وقت تک صلح کی کوشش کی تھی۔ مگر جب یہ کوشش بے سود ہوئی تو اُسے لڑنا ہی پڑا اور ملازکرا کے مقام پر یہ جنگ ۴۶۳ھ ۱۰۷۱ء میں ہوئی جس میں قیصر کو شکست فاش نصیب ہوئی اور وہ گرفتار ہو کر اَلپ اَرسلان کے دربار میں لایا گیا۔ ترکی دستور کے مطابق اَلپ ارسلان نے اُس کی گردن پر اپنا پیر رکھا اور اُس کے بعد شاہانہ سُلوک مرعی رکھا۔ فریقین میں ایک عہدنامہ ہوا جس کی رُو سے طے پایا کہ قیصر روما نوس چہارم اَلپ اَرسلان کا مطیع رہے گا۔ اپنی بیٹی کو شہزادہ ملک اَرسلان کے حبالۂ عقد میں دے گا۔[1] نیز یہ کہ

---

[1] روضۃ الصفا۔ باب متعلقہ آل سلجوق۔ صفحہ نمبر شمر

زر کثیر بطور تاوان ادا کرے گا۔ ابھی تیسری شرط پوری ہونے نہیں پائی تھی کہ خود قیصر کے خلاف قسطنطنیہ میں بغاوت شروع ہو گئی۔ اور اُس کو تخت سے برطرف کر دیا گیا جتنی رقم وہ جمع کر سکا تھا اُسے سلطان کے پاس بھیجدیا اور باقی کے لیے وہ معذرت کا خواہاں ہوا۔ رُومانوس چہارم[1] کی تخت سے برطرفی مسلمانوں کے خلاف اُس کی شکست کا لازمی نتیجہ تھی۔

رومانوس ناکام ہوا تھا۔ قسطنطینہ کے لیے سلجوقی خطرہ بجائے زائل ہونے کے اور زیادہ شدید ہو گیا تھا۔ مگر حکومت اس طرف توجہ نہیں کر سکی۔ کیونکہ اندرونی طور پر قسطنطینہ کی حالت بہت خراب تھی۔ اِس طرح بازنطینی دوبارہ مستقبل قریب میں ایشیائے کوچک کے میدانوں میں قسمت آزمائی کرنے سے باز رہے۔ اِس جنگ کے بعد ایشیاء کوچک میں مسلمانوں کے قدم آہستہ آہستہ جمنے لگے۔ لیکن اِس اثناء میں جب کہ سلطان اَلپ ارسلان دریائے جیحون کے کنارے پر کے قلعہ دار کو سزا دے رہا تھا۔ اِس قلعہ دار نے سلطان کو مار ڈالا۔ واقعات یہ بیان کئے جاتے ہیں کہ یہ شخص تکین کا قلعہ دار تھا اور سُلطان اس سے کچھ اطلاعات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سلطان کے سپاہیوں کی تعیش کی وجہ سے اُس نے خود سلطان پر حملہ کر کے اُس کو قتل کرایا۔

اَلپ ارسلان کے بعد اس کا بیٹا ملک شاہ حسب وصیت تخت نشین ہوا۔ اُسکے پیش نظر دو اہم اُمور تھے۔ ایک تو یہ کہ علمی ترقی کو فروغ دیا جائے تاکہ عوام کے عقاید درست رہیں اور وہ علم کی روشنی سے مالامال ہوں۔ اور دوسرے بیرونی مسائل سلطان ملک شاہ خود علم پرست عادل اور با اخلاق شخص تھا۔ وہ عالی دماغ صاحب تدبیر سیاست دان تھا اور مذہب کا سخت پابند تھا۔ غالباً یہ پہلا سلجوقی حکمران ہے جو لکھنے پڑھنے کے فن سے

---

[1] Roman us IV. Deogenes Condact of Educa

واقفیت رکھتا تھا۔ اس نے علم و فضل کی ترقی کی شروع میں بہت کوشش کی اور نہایت مستعدی کے ساتھ نظام الملک طوسی کا ہاتھ بٹایا۔ الپ ارسلان کی حکمت عملی کے اہم اصول اس کے دور میں بدستور روبہ عمل لائے گئے۔

دوسری طرف بزنطین میں انقلاب کے بعد لازماً وہ عہد نامہ منسوخ ہوگیا جو الپ ارسلان اور رومانوس چہارم دیوجانس میں طے ہوا تھا۔ جب ملک شاہ برسر اقتدار آیا تو اس کو بھی اس کا خیال تھا لیکن اس دوران میں فلوری طوس نامی ایک ارمنی سردار نے جو رومانوس چہارم کی فوج کے ایک بڑے دستے کی کمان کر رہا تھا قسطنطینیہ کے خلاف سر اٹھایا اور اس انقلاب سے فائدہ اٹھایا جو رومانوس چہارم کے خلاف بیزنطین میں رونما ہوا تھا۔ اس نے بزنطین کے ایشیائی علاقوں میں اپنے قدم جمائے اور رومانوس چہارم کی موت کے بعد خود قیصر کا لقب اختیار کیا۔ بالآخر اس کو دربار قسطنطنیہ نے انطاکیہ کا امیر اعظم تسلیم کرلیا۔ جس زمانہ میں یہ شخص قیصر ہونے کا وعدہ دار ہوا تھا اتفاقاً ملک شاہ اپنی چھوٹی سی جماعت کے ساتھ اس کے پاس گرفتار ہوگیا۔ ملک شاہ نے بکمال خوبی اپنے آپ کو چھپایا اور نظام الملک طوسی نے اس کو اپنے حسن تدبر سے چھڑا لیا۔ ملک شاہ نے فلوری طوس کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھے۔ اور جب تک وہ زندہ رہا ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں کی جانب سے کسی قسم کا اقدام نہیں کیا گیا۔ فلوری طوس کے انتقال کے بعد ملک شاہ نے سلیمان ابن قتلمش ابن اسرائیل ابن سلجوق کو ایشیائے کوچک کے مہمون پر نیم خود مختارانہ اختیارات دے کر مامور کیا۔ یہی شخص سلاجقہ روم کا بانی تھا۔

سلیمان نے ملک شاہ کے زیر ہدایت ایشیائے کوچک کے معاملات میں بہت کامیاب طریقہ کار اختیار کیا۔ اس جانب اسلامی مملکت کی توسیعی حکمت عملی کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ سیاسی حالات، جو وقتاً فوقتاً پیدا ہوئے اور دوسرے وہاں کی رعایا کی عام حالت۔

جس زمانہ میں ایشیائے کوچک پر اسلامی مہمون کی ابتداء ہوئی اس وقت دربار

قسطنطنیہ کے خلاف اور سل جان ڈوکس نے بغاوت کی ۱۰۷۴ء؁ میں میکائل چہارم نے جو اس وقت قیصر قسطنطنیہ تھا اُن باغیوں کی سرکوبی کا ارادہ کرلیا۔ اس لیے اُس نے سلجوقیوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرکے نو مفتوحہ علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ تسلیم کرلیا۔ اِس عہدنامہ کی ملک شاہ نے بھی توثیق کی۔ اُس کی رو سے مسلمان ایشیا، کوچک کے بہت بڑے علاقہ کے مالک تسلیم کئے گئے۔ قیصر مغفور ہفتم نے بھی معاہدہ کی تجدید کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی سلطنت کے یوروپین معاملات میں اُلجھا ہوا تھا اور چاہتا تھا کہ اِس طرح وہ نہ صرف سلیمان کی دوستی کو حاصل کرے بلکہ اُس سے فوجی مدد بھی لے۔

سلجوقی مہم جوں کی غیر معمولی دلیری اور جفاکشی کے علاوہ ایشیاء کوچک کے اُن علاقوں میں حالات کچھ ایسے تھے کہ مسلمانوں کا قبضہ مستحکم ہوتا گیا۔ اِس علاقہ میں اُنھوں نے رُومی باغیوں کے جاگیردارانہ و زمیندارانہ حقوق چھین کر وہاں کے کاشتکاروں اور دہقانوں کے مفاد کو اُن کے حقوق محفوظ کرکے ترقی دی۔ اِس طرح ایسا طبقہ وجود میں آیا جو اپنی بقاء کے لیے سلجوق حکمرانوں کی مدد کا طالب ہوتا تھا۔ علاوہ بریں یہاں بہت سے ترک نوآباد کار لاکر بسائے گئے اور رفتہ رفتہ ترک نوآبادیاں کثرت سے پھیلنے لگیں ان علاقوں میں ترک نوآبادیاں پھیلنے کی وجہ سے ترکی اقتدار اور بھی مستحکم ہوتا گیا۔ اِس طرح رعایا، حکمرانوں سے خوش بھی تھی اور ہاتھ پیر بھی نہیں ہلا سکتی تھی۔ یہ سب واقعات ملک شاہ کے عہد کے زرین کارنامے ہیں۔

الکسیوس کامے توس کی آنکھیں اُس وقت کھلیں جب قسطنطنیہ کے بلند مقاموں پر سے مسلمانوں کے مقبوضہ علاقے نظر آنے لگے تھے۔ خلیج مارمورا اور باسفورس تک مسلمانوں کا قبضہ نہایت مستحکم ہوگیا تھا اور اب اس وجہ سے بازنطین کو حقیقی خطرہ تھا۔

ملک شاہ حقیقت میں سلجوقیوں کا آخری بڑا سلطان تھا۔ اصل یہ ہے کہ اُس کے دَور کی تمام تر کامیابی نظام الملک طوسی جیسے تجربہ کار اور لائق وزیر کے سر ہے۔ مگر

نظام الملک نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ اُس کے حاسد دربار میں بہت ہو گئے تھے خود ملکہ ترکان خاتون بھی جانشینی کے مسئلہ میں اُس کی مخالف ہو گئی۔ آخر کار سلطان کو اُس سے بدظن کیا گیا۔ لیکن اُس کا رسوخ اتنا زیادہ تھا کہ کوئی شخص بھی اُس کے خلاف آسانی سے ہاتھ نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ ایک اسیر کو اس کام کے لیے تیار کیا گیا۔ اُس کے اشارہ سے خواجہ نظام الملک طوسی قتل ہوا مگر یہ مشہور کیا گیا کہ اس کو ایک باطنی نے قتل کیا ہے مرنے سے پہلے وزیر نے سلطان کو کہلا بھیجا کہ میری دوات اور میرا تاج دونوں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ایک کے بعد دوسری چیز باقی نہیں رہ سکتی۔ اتفاق سے ایسا ہی ہوا۔ اُس کے مرنے کے بعد سلطنت میں بڑے اختلافات رُونما ہوئے۔ اِن اختلافات کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے اِس بات کا دیکھنا ضروری ہے کہ وہ کس نوعیت کے تھے اور کس طرح وہ سلطنت کی بقاء کے لیے خطرناک ثابت ہوئے۔

نظام الملک طوسی کے دور وزارت میں ملک شاہ نے سلجوقی دستور اور انتظامی مصلحتوں کے مدنظر اپنی سلطنت کو بہت سے حصوں میں تقسیم کر کے اُن کی عنانِ حکومت مختلف امراء کے سپرد کر دی تھی۔ شہکین تونکین کو خوارزم دے دیا تھا، قیم الدولہ اقنقر کو جو فارس کے آتابکون کا جد اعلیٰ تھا دیار بکر و شام و حلب کے لیے نامزد کیا تھا۔ رکن الدولہ قیمازتکین کو فارس کا علاقہ دے دیا تھا۔ لیکن شام کی حکومت آگے چل کر اپنے ایک اور عزیز کے حوالہ کی۔ اب اُن مختلف علاقوں کو مرکز کے ساتھ وابستہ کر لینے کے لیے زبردست مرکزیت اور تدبر کی ضرورت تھی۔ لیکن ملک شاہ کے بعد یہ مرکزیت باقی نہ رہی۔ خواجہ نظام الملک طوسی اُن ہی حالات کے مدنظر چاہتا تھا کہ سلطان ملک شاہ کا جانشین ایسا شخص ہو جو تمام صوبوں پر اچھی طرح قابو رکھ سکے اور اندرونی انتظامات کا شیرازہ بکھیرنے نہ دے۔ اِس لیے نظام الملک سمجھتا تھا کہ برکیاروق جو ذہین اور قابل تھا اپنی فطری صلاحیتوں کے باعث ملک شاہ کا موزون جانشین ثابت ہوگا۔ سلطان کی ملکہ ترکان

خاتون چاہتی یہ تھی کہ اس کا بیٹا محمود جو ابھی بچہ تھا جانشین ہو۔ شہزادہ کی ماں کو نظام الملک کے منصوبوں کا پتہ چل گیا۔ اول سلطان کو بدظن کیا گیا اور بعد میں اس کو قتل کروا دیا گیا۔ نظام الملک کے قتل کے بعد ملکہ کے حمایتی برسر اقتدار آئے۔ حالانکہ یہ اہل نہ تھے۔ لازماً تمام اہل ملک ملکہ کے جوڑ توڑ کو بری نظر سے دیکھتے تھے۔ اور اِس طرح سیا سیات میں عورتوں کے عمل دخل کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اِس طرح سیاسی تفریق شروع ہوئی۔ ملک شاہ کے بعد نظام الملک طوسی کے خیال کی موافقت میں فوجوں سے محمود کی مخالفت کی اور برکیا روق کو سلطان بنانا چاہا۔ خلیفہ کو اُس کی اطلاع دے دی گئی۔ لیکن خلیفہ نے جو فرمان مرتب کیا تھا وہ خلیفہ کے سامنے تھا اور دستخط ثبت ہونے سے پہلے ہی خلیفہ کا اَچانک اِنتقال ہوگیا اور خانہ جنگی شروع ہوئی۔ برکیا روق کی تمام عمر اِس خانہ جنگی میں کٹی۔ محمود کو سلطان بنا دیا گیا۔ لیکن دو برس بعد ہی اُس کا اِنتقال ہوگیا۔ برکیا روق گیارہ برس تک حکمران رہا۔ مگر اس کی زندگی بھی سخت پریشانیوں میں گذری۔ اِس کے بعد اس کا بھائی غیاث الدین ابو شجاع محمد سلطان ہوا۔ یہاں تک کہ عنان حکومت سنجر کے ہاتھ میں آئی اس کا عہد بھی گیارہ برس رہا۔ اُن میں اس نے اپنے عہد کے آخری دن قید میں کاٹے ۵۲۳ھ ۱۱۲۸ء میں اُس کا انتقال ہوا۔ یہی سلطان سلاجقہ اعظم کے سلسلہ کا آخری سلطان تھا۔ جیسا کہ واقعات شاہد ہیں سنجر کے اِنتقال کے قبل ہی سلجوقیوں میں انتشار کے آثار رونما ہو چکے تھے۔ آخری سلجوق اعظم سنجر کے بعد جب یہ سلطنت پارہ پارہ ہوگئی تو اُس کے پانچ ٹکڑے ہو گئے۔ سلاجقہ کرمان۔ سلاجقہ عراق۔ سلاجقہ شام۔ سلاجقہ روم اور سلاجقہ فارس۔ سلجوقی قوت کے اِس طرح منتشر ہو جانے سے مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کی سیاست میں بہت دور رَس اثرات پیدا ہوئے۔ مشرق وسطیٰ کی سلطنتیں اُس کی خانہ جنگیوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو رہی تھیں اور اون کی جگہ اتابکہ سر اُٹھا رہے تھے۔ ان خانہ جنگیوں اور پریشانیوں سے مشرق قریب

کے سلاجقہ بھی بچ نہ سکے۔ لیکن سلجوقیوں کے اس طرح منتشر ہو جانے سے مشرق قریب کی سیاست میں غیر معمولی تبدیلی پیدا ہوئی اور سلجوقیوں کے خلاف مشرق قریب میں ایک زبردست رَدِعمل پیدا ہوا جس نے اُنہیں تباہ و برباد کر دیا۔

اوّل تو سلطنت قسطنطنیہ کو جو خطرہ سلاجقہ اعظم کی وجہ سے پیدا ہوا تھا اُس کا رِدِعمل شروع ہوا اور قسطنطنیہ کی حکومت نے سلجوقیوں کے خلاف یورپ کے احساسات اُبھارے اِس لیے یہ ردِعمل "مغرب بمقابلہ مشرق" بن گیا۔ اِس ردِعمل کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ عین اُس وقت مصر سیاسیات کے میدان میں ظاہر ہوا اور بنو عباس کی کمزوریوں کی وجہ سے فائدہ اُٹھانا چاہا۔

ایشیاء کوچک میں سلطان ملک شاہ نے سلیمان بن قتلمش بن اسرائیل سلجوقی کو نیم خود مختار حاکم بنا کر بھیجا تھا جب تک ملک شاہ زندہ رہا اس وقت تک اسلامی قوت برابر ایشیاء کوچک کے مغربی جانب پھیلتی گئی۔ لیکن جیسا کہ واقعات شاہد ہیں۔ ملک شاہ کے انتقال کے بعد سلاجقہ اعظم میں جو پھوٹ پڑی اُس سے مشرق قریب کے اُس حصہ میں دو قسم کے نتائج پیدا ہوئے۔ ایک تو یہ کہ مرکزی حکومت سے اُن کی وابستگی ختم ہوگئی دوسرے یہ کہ مغربی جانب اُن کی توسیعی حکمتِ عملی رُک گئی۔ اَب سلیمان بن قتلمش کی اَولاد کی حکومت ایشیاء کوچک میں مقامی قوت بن کر رہ گئی۔ اُس کا اثر د صرف مقامی سیاسیات تک تھا اور جو ردِعمل اُس سرزمین میں اسلامی دُنیا کے خلاف اُس وقت ہونے والا تھا اُس سے نجات دلانے کے لیے یہ سلطنت خاطر خواہ طور پر انتظام نہیں کر سکتی تھی۔ اگر اسلام کی فوری مخالفت شروع نہیں ہوتی تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ سلاجقہ روم طاقتور رہے بلکہ قسطنطنیہ اور آرمینیہ کے مخصوص حالات اُس کے ذمہ دار تھے جوں جوں حالات بدلے اور سیاسی اختلافات دَبتے گئے مسلمانوں کے خلاف ردِعمل کا عملی پہلو ظاہر ہوا لیکن

مشرق قریب میں مسلمانوں کے خلاف جو ردِ عمل رونما ہوا اس کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے پیشتر بہتر یہ ہوگا کہ مصر اور شام کے تعلقات پر ایک نظر ڈالی جائے اور دیکھا جائے کہ اُن کا اثر سلاجقہ روم کی سیاسیات پر کیا پڑا۔

مصر کے حالات پر غور کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ شام کی تاریخ کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے کیونکہ شام ہی وہ علاقہ ہے جہاں اِس ردِ عمل کا عملی پہلو کی ابتدا ہوئی۔ اور دوسرے یہ غور کرنا ضروری ہے کہ فاطمین جو عباسیوں کے خلاف ریشہ دَوانیاں کر رہے تھے۔ مشرقی علاقوں میں جغرافی وسعت چاہتے تھے۔

اخشید یہ حکومت کے بانی محمد بن طغج نے جو خلافت عباسیہ کی جانب سے مصر کا حاکم بنا کر روانہ کیا گیا تھا مصر میں عباسیوں کا نائب السلطنت ہونے سے پہلے خود دمشق کا حاکم کا بیٹا تھا۔

جب مصر میں اخشید یہ حکومت ختم ہوگئی اور اُس کی جگہ فاطمین نے لی تو اُنھوں نے دعوت اور فوجی کارروائیوں کے ذریعہ قرامطہ کے ساتھ ساز باز کرنے کے بعد حجاز اور شام میں اپنے اَثرات پھیلائے۔ لیکن سلجوقی ترک جنھوں نے فاطمی خطرہ کے اِزالہ کا ذمہ لیا تھا اُس سے غافل نہیں رَہ سکتے تھے۔ اُنھوں نے مصر کے سیاسی اِنتشار سے فائدہ اُٹھا کر ۴۶۳ھ ۱۰۷۰ء میں بیت المقدس پر قبضہ کر لیا اور اُس کے بعد ۴۶۸ھ ۱۰۷۶ء میں دمشق پر قابض ہو گئے۔ سلجوق گو چاہتے یہ تھے کہ مصر پر بھی حملہ آور ہوں چنانچہ ایک سلجوقی سپہ سالار اتسنر نے اس کام کا بیڑا بھی اُٹھایا تھا۔ مگر مصر میں بدر نامی ایک مدبر کی کوشش سے بہت جلد اَمن و امان تو قائم ہو گیا لیکن بدر اس قابل نہیں تھا کہ ترکوں کے خلاف کوئی فوجی کارروائی کرے۔ وہ اشوتوں کے ذریعہ کام نکالنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف اتسنر کے پاس بھی ساز و سامان کی اِتنی کمی تھی کہ وہ مصر پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس بدر نے ملک میں امن امان

قائم کرکے فلسطین اور شام کا رُخ کیا۔ اس وقت اتسز نے بیت المقدس کا تخلیہ کر دیا اور اپنی مرکزی حکومت سے مدد مانگی۔ طوطش سلجوقی اس کی مدد کے لیے آگیا اس نے اتسز کو بیت المقدس کا تخلیہ کرنے پر بہت بُرا بھلا کہا اور قید کرکے قتل کر دیا۔ ۴۷۸ھ ۱۰۸۵ء سے طوطش شام اور حلب کے علاقوں میں عباسیوں کی طرف سے حاکم مقرر رہا۔ طوطش کے انتقال کے بعد اس کے دو بیٹے اس کے جانشین ہوئے۔ دقاق دمشق کا حاکم بنا اور دوسرے بیٹے رضوان نے حلب کی حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ یہ دونوں بھائی ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔

اَب مشرق قریب کی سیاست پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہاں تین قوتیں ہیں۔ ایک تو بازنطینی دوسری فاطمی اور تیسری سلجوقی۔ سلجوقی قوت میں انتشار نمایاں ہوچکا ہے۔ اُدھر بازنطینی ایک طرف تو سلجوقیوں کو مشرقی علاقوں میں پیچھے ڈھکیل دینے کی سوچ رہے ہیں تو دوسری طرف فاطمیین اور سلجوقیوں کی شام کے معاملات میں اَن بن چلی آرہی ہے۔ چنانچہ اِن تمام چیزوں کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جب یورپ کی جانب سے عیسائی قوتوں نے مشرق قریب میں ایک زبردست کارروائی کا آغاز کیا تو فاطمین نے اُنہیں خوش آمدید کہا۔ کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ وہ اور عیسائی قوتیں آپس میں ملکر خلافت عباسیہ کو تقسیم کرلیں گے۔ اِس کے معنے یہ ہوئے کہ وہ سلطنت عباسیہ کی تباہی میں برابر کا حصہ لینے کا اِرادہ کر رہے تھے۔ لیکن یہاں اُن دونوں قوتوں کے نظریوں میں فرق تھا عیسائی چاہتے تھے کہ فاطمین اور عباسیوں کی کشمکش سے فایدہ تو اُٹھائیں لیکن فاطمین کو اپنا شریک نہ بنائیں۔

اَب ہم مشرق قریب میں جو یورپی قوتوں کے جانب سے ردِعمل شروع ہوا اُسکا مطالعہ کرینگے کیونکہ یہیں سے صلیبی جنگوں کا آغاز ہوتا ہے۔

ہندوستان کی مالیاتی پالیسی

(از)

جناب ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی پی، ایچ، ڈی۔ صدر شعبۂ معاشیات جامعۂ عثمانیہ

"ہندوستان کی مالیاتی پالیسی" بی، پی ادارکر ریڈر معاشیات الہ آباد یونیورسٹی کی تصنیف ہے۔ اس کتاب کے باطنی محاسن پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ظاہری خوبیوں کے متعلق بھی کچھ تذکرہ کر دیا جائے۔ اس کتاب کے ناشران "کتابستان" قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے حال ہی میں کئی ایک کتابیں ایسی شائع کی ہیں جو ظاہری دیدہ زیبی کے لحاظ سے کسی یورپ یا امریکہ کی اچھی سے اچھی شائع شدہ کتاب سے کم نہیں اور موجودہ کتاب بھی انہیں کتابوں میں سے ایک ہے۔ کتاب کا ٹائپ اور چھپوائی اس قدر نفیس ہے کہ پڑھنے میں لطف آتا ہے کاغذ نہایت اعلیٰ استعمال کیا گیا ہے اور سرورق اور جلد بھی قابل تعریف ہے۔

مجھے یہاں اس بات کے بیان کرنے سے چنداں شرم معلوم نہیں ہوتی کہ اگر اس کتاب میں ظاہری دلچسپی اور جاذبیت اس قدر نہ ہوتی تو غالباً میں اس کتاب کو نہ پڑھتا۔ حالانکہ مسٹر ادارکر ہندوستان کے معاشیین میں بہت ممتاز درجہ رکھتے ہیں اور ان کے قلم میں روانی اور صاف بیانی اس قدر ہوتی ہے کہ ان کا نام اس بات کا ضامن ہو گیا ہے کہ کتاب پڑھنے کے لائق ضرور ہو گی لیکن بڑے سائز کے چھ سو سے اوپر صفحات کی

کتاب کو پڑھنے کا ہتیہ کرنا ہی کچھ کم ہمت کا کام نہیں ہے۔

یہ کتاب ۲۲ ابواب پر مشتمل ہے۔ کتاب کے تین حصے کئے گئے ہیں۔

تعارف۔ حصہ اول و حصہ دوم۔ تعارف ۲۵ صفحے کا ہے یہ وہ رسمی تعارف نہیں جس میں یا تو مصنف اپنی مشکلات کا رونا روتا ہے یا کسی نے اس کے کام کی تعریف کی ہو۔ تعارف میں نفسِ مضمون کی نوعیت پر نہایت فاضلانہ روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں مالیاتی نظریہ کی اضافی حیثیت واضح کی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں اسی نظریہ کو صاف کرکے دوبارہ بیان کیا گیا ہے۔ تیسرے حصہ میں امتیازی تاین پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے اور چوتھے حصہ میں نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔

کتاب کا حصہ اوّل ۱۵ ابواب پر مشتمل ہے جو زیادہ تر واقعاتی ہے۔ ان ۱۵ ابواب میں ان تمام صنعتوں کا تذکرہ ان کی تاریخ اور نشو و نما درج ہیں جن کو تاین دی گئی ہے اس میں مندرجہ ذیل صنعتیں شامل ہیں۔

(۱) لوہے اور فولاد کی صنعتیں۔ (۲) لوہے اور فولاد کی دیگر ذیلی صنعتیں (۳) سوتی پارچہ بافی کی صنعت (۴) پارچہ بافی کی دیگر صنعتیں۔ (۵) شکر سازی کی صنعت (۶) کاغذ سازی کی صنعت۔ (۷) دیا سلائی کی صنعت۔ (۸) نمک سازی کی صنعت۔ (۹) دوسری چھوٹی چھوٹی صنعتیں جن کو تاین دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس حصہ میں اُن صنعتوں کا بھی ذکر ہے جنھوں نے تاین حاصل کرنے کے لیے حکومت کے پاس درخواستیں پیش کیں لیکن بعض وجوہ کی بنا پر اُن کو تاین کے قابل نہیں سمجھا گیا۔ ایسی صنعتوں میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔

(۱) سیمنٹ سازی کی صنعت۔ (۲) بھاری کیمیا کی صنعت (۳) کویلہ اور تیل کی صنعتیں۔ (۴) کلنچ بنانے کی صنعت وغیرہ۔

کتاب کا دوسرا حصہ ۷ ابواب پر مشتمل ہے جن میں ہندوستان کی مالیاتی پالیسی پر تنقید وتبصرہ کیا گیا ہے۔

کتاب نہایت محنت سے لکھی گئی ہے۔ ہندوستان کے مالیاتی مسایل کی حد تک یہ حوالہ کی کتاب کا کام دیتی ہے۔ اِس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُس کی بنیاد معاشی نظریوں پر رکھی گئی ہے اور اُنہیں نظریوں کی روشنی میں مالیاتی مسایل پر بحث کی گئی ہے۔ ہندوستان میں معاشی مسایل پر اکثر جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُن میں بڑا نقص یہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر واقعاتی اور جذباتی ہوتی ہے۔ محض واقعات کے جاننے یا اُن کو بیان کرنے سے چنداں زیادہ فایدہ نہیں جب تک کہ اِن واقعات سے کچھ نتایج حاصل نہ کئے جائیں اور اُن نتایج کو معلومہ علم کی روشنی میں جانچا اور پرکھا نہ جائے اور نہیں معاشی ارتقائی کڑی کے کسی جزو کے ساتھ نہ ملایا جا سکے۔ جب تک ایسا عمل نہ کیا جائے کوئی علم ترقی نہیں کر سکتا۔ یہ ہماری بڑی بدقسمتی ہے کہ ہندوستان میں اکثر جو کتابیں معاشی مسایل پر لکھی گئی ہیں اُن کے لکھنے والوں کو خود نظریاتی مسایل سے دلچسپی نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ خود علم کی گہرائیوں تک پہنچے ہوتے ہیں میں نے اکثر جامعات میں ہندوستانی طلباء کو کہتے سنا ہے کہ اُن کو اس قدر زیادہ نظریاتی معاشیات پڑھانے سے کیا فائدہ ہے اُن کے زیادہ پرچے تو عملی معاشیات اور ہندوستان کے معاشی مسایل پر ہونے چاہیں۔ کیا عملی معاشیات اور ہندوستان کے معاشی مسایل نظری معاشیات سے کوئی الگ اور جدا چیزیں ہیں؟

اشتراکیت کے میدان میں مختلف مجتہد اور ریفارمر آئے لیکن کامیابی کا سہرا کارل مارکس کے سر ہی رہا۔ کیوں؟ مارکس پہلا شخص تھا جس نے اشتراکیت کو جذبات اخلاق۔ مذہب۔ ہمدردی اور انسانیت کے کمزور پنجوں سے چھڑا کر علمی بنیادوں پر اُس کی عظیم الشان عمارت قائم کی۔ مارکس لوگوں کے جذبات ترحم اور اخلاق کو اپیل

نہیں کرتا۔ بلکہ علمی نظریوں کی بنا پر وہ کہتا ہے کہ کس طرح اشتراکیت بام ارتقا کا آخری زینہ ہے اور اس پر پہنچے بغیر چارہ ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان اشتراکین کا عوام تو کیا خواص تک نام بھی نہیں جانتے جو ابتدائی انیسویں صدی میں مارکس سے کہیں زیادہ مشہور تھے۔ مسٹر ادارکر نے بھی اپنی کتاب میں معاشی نظریوں کا سہارا لیا ہے جس کی وجہ سے اس کی کتاب کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے اور اس کے دلایل مضبوط ہو گئے ہیں اُستادی معاشیات (کلاسیکل) میں آزاد تجارت کی اہمیت پر بہت زور دیا گیا ہے اور اس مفروضہ پر اس علم کی بنیادیں قایم ہیں۔ چنانچہ جب کبھی شروع شروع میں ہندوستانی صنعتوں کو تاپین دینے کا تذکرہ کیا گیا اور ملک کی طرف سے آہستہ آہستہ یہ مطالبہ زیادہ شدید ہوتا گیا تو ان کو ہمیشہ یہی کہا گیا کے یہ معاشی اُصولوں کے خلاف چیز ہے۔ ہندوستان میں پہلے پہل تاپین کے لئے جتنے مطالبے اور تقاضے ہوتے رہے وہ زیادہ تر سیاسی اور قومی وجوہ کی بنا پر تھے۔ لیکن حال میں ملک میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو یہ کہتا ہے کہ تاپین معاشی بنا پر ضروری ہے۔ مسٹر ادارکر بھی اسی گروہ کے رکن ہیں چنانچہ تعارفی حصہ میں اُنھوں نے معاشی دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ موجودہ حالت کے لحاظ سے آزاد تجارت کے نظریئے درست نہیں ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ موجودہ حالات کے لحاظ سے یہ نظریئے بے معنی ہو گئے ہیں کیونکہ وہ مفروضات جن کی بنا پر آزاد تجارت کے نظریئے قائم کئے گئے تھے اَب موجود نہیں ہیں۔ ازاد تجارت کا سب سے پہلا اور اہم مفروضہ یہ ہے کہ ازاد تجارت اس وقت کسی ملک کے لیے نفع بخش اور فایدہ رساں ہو سکتی ہے جب کہ ملک میں سب لوگ کام پر لگے ہوئے ہوں اور اُنکو پھر مختلف کام منتخب کرنے کا اختیار حاصل ہو لیکن جب ملک میں ایک کثیر حصہ بیکار ہو اور ان کو انتخاب کا موقع ہی حاصل نہ ہو تو اس وقت نظریہ مصارف متوازن بالکل بے معنی چیز ہو جاتی۔ دوسرا اہم مفروضہ آزاد تجارت کا یہ ہے کہ آزاد تجارت کے ساتھ

آزادی نقل و حمل بھی ہو لیکن وہ لوگ جو ہمیشہ عدم مداخلت کی تعریف و توصیف کا جھوٹا سچا دم بھرتے رہتے ہیں خود اپنے ممالک میں اسی اُصول کے دوسرے جزو پر کہاں تک عمل کرتے ہیں۔ اِن حالات میں آزاد تجارت بے معنی چیز ہو جاتی ہے اور وہ لوگ جو تاین کا مطالبہ کرتے ہیں کم سے کم اُصولی لحاظ سے کفر و شرک کے مرتکب نہیں ہوتے کتاب کے اس حصہ میں انھیں اُصولوں کی روشنی میں مسٹر ادارکر نے ثابت کیا ہے کہ اصول عدم مداخلت اَب فرسودہ ہو چکا ہے اور اُصولی لحاظ سے تاین ہندوستان کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ ادارکر کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اُنھوں نے ہندوستان کے لئے تاین کا مطالبہ صرف سیاسی یا قومی اُصولوں کی بنا پر نہیں کیا بلکہ معاشی اُصول کی بنا پر کیا ہے۔

کتاب کا پہلا حصہ جیسا کہ اُوپر ذکر کیا جا چکا ہے واقعاتی ہے جس پر تبصرہ کرنا بہت طوالت کا کام ہے۔ ہاں اتنا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر ادارکر نے ٹیرف بورڈ کی رپورٹوں کا نہایت وسیع اور گہرا مطالعہ کیا ہے اور بہت کام کا مواد یکجا جمع کر دیا ہے اگر کوئی شخص ہندوستان میں مختلف صنعتوں کی تاریخی نشو و نما اور اُن کی موجودہ حالت پر کم سے کم فرصت میں زیادہ سے زیادہ صحیح اور مستند معلومات حاصل کرنا چاہے تو اسکو اِس کتاب کے اس حصہ میں مل جائینگی۔

کتاب کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ وہ ہے۔ (دوسرا حصہ) جس میں مسٹر ادارکر نے تاین کی اُس پالیسی پر تبصرہ کیا ہے جو ۱۹۲۳ء سے اس ملک میں کارفرما ہے۔ حکومت ہند کا ہمیشہ سے دعویٰ رہا ہے کہ وہ تاین دینے کے متعلق ہمیشہ بے لاگ اور انصاف پسند رہی ہے۔ مسٹر ادارکر نے حکومت کے رویہ پر بڑی کڑی نکتہ چینی کی ہے اور وہ تو یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ حکومت نے ہر ممکن طریقے سے اس پالیسی کو جو بذات خود پہلے سے ڈھیلی تھی اس طریقہ سے بر سر عمل رکھا ہے کہ ملک کو اُس سے چنداں فائدہ نہ پہنچے

ٹیرفٹ بورڈ جو قائم کئے گئے اُن کے اراکین حکومت کے منتخب کردہ ہوتے تھے۔ لیکن حکومت نے ہمیشہ اپنے منتخب شدہ اراکین کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ یہ بذات خود کوئی ایسی بری بات نہیں ہے لیکن حکومت کی نیت پر شبہ اس وجہ سے ہونے لگتا ہے کہ جب کسی صنعت کو تامین دینے کے متعلق ٹیرف بورڈ نے سفارش کی یا اس کے تامین کی کوئی خاص شرح مقرر کی تو حکومت کو کئی وجوہات کی بنا پر بورڈ کی رائے سے اختلاف کرنا پڑا لیکن جب کبھی بورڈ نے کسی صنعت کو تامین نہ دینے کی سفارش کی تو حکومت نے ہمیشہ بورڈ کی رائے سے اتفاق کیا اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل حقایق دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ اس کتاب کے صفحہ ۳۶۴ پر مندرجہ ذیل جدول پیش کیا گیا ہے۔ صنعتوں کو اس تجزیہ کے لیے پانچ جماعتوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

جماعت اوّل	ٹیرف بورڈ کی سفارش	حکومت کا رویہ	صنعتوں کی تعداد
الف	ٹیرف بورڈ نے تامین یا مالی امداد کی سفارش کی۔	حکومت نے اسے منظور کرلیا۔	۲۵
ب	ٹیرف بورڈ نے تامین یا مالی امداد کی سفارش کی۔	حکومت نے اس میں ترمیم کردی۔	۱۱
ج	ٹیرف بورڈ نے تامین یا مالی امداد کی سفارش کی۔	حکومت نے اُسے مسترد کردیا۔	۶
د	ٹیرف بورڈ نے تامین دینے سے انکار کردیا۔	حکومت نے بورڈ کی رائے سے اتفاق کیا۔	۷
ح	ٹیرف بورڈ نے انکار کیا۔	حکومت نے مداخلت کی۔	×

اِن اِعداد کا مصنف نے مزید تجزیہ کیا ہے۔ وہ صنعتیں جن کو حکومت نے ٹیرف بورڈ کی سفارش پر تاین عطا کی اُن کی تعداد جیسا کہ جدول سے ظاہر ہے ۲۵ تھی اُن میں سے صرف پانچ اہم صنعتیں تھیں باقیوں کی کوئی زیادہ اہمیت نہ تھی۔ اُسکے برعکس وہ چھ صنعتیں جس میں ٹیرف بورڈ نے سفارش کی اور حکومت نے اِنکار کیا سب کی سب اہم صنعتیں تھیں جس میں سیمنٹ، پارچہ بافی (پارچہ بافی کی صنعت کو ابتداءً تاین دینے سے حکومت نے اِنکار کر دیا تھا۔ بعد میں مخصوص حالات کے تحت اُسے تاین دی گئی) بھاری کیمیائی صنعتیں۔ شیشہ سازی۔ ریشم اور اُون سازی کی صنعتیں ہیں۔

اِس سلسلہ میں حکومت پر بڑا اِعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اگر حکومت کے سامنے ملک کا مفاد پیش ہوتا تھا اور اسی جذبہ کے تحت اُسے اکثر اپنے منتخب شدہ اراکین ٹیرف بورڈ کی آراء سے اختلاف کرنا پڑا تو کیا ایسا کبھی موقعہ نہ آیا کہ حکومت نے اُس صنعت کو تاین دی ہو۔ جب بورڈ نے کسی صنعت کو تاین دینے سے اِنکار کیا تو حکومت نے ہمیشہ اُمناً وصدقناً کہہ کر ہمیشہ بورڈ کی سفارش کو بسروچشم تسلیم کر لیا مسٹر ادارکر نے حکومت کی نیک نیتی پر ایک اور زاویہ نگاہ سے بھی اعتراض کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب کسی صنعت کو طوعاً وکرہاً تاین دی بھی گئی تو وہ بھی نہایت خاص انداز سے بہت کچھ نخروں اور ٹال مٹول کے بعد دی گئی مثلاً دیا سلائی کی صنعت کو تاین دینے میں دو سال کا طویل عرصہ لگ گیا۔

پارچہ بافی کی صنعت کے متعلق بورڈ نے تو رپورٹ پیش کر دی لیکن حکومت نے اس کے متعلق فیصلہ کرنے میں اڑھائی سال گذار دیئے اِس طرح شکر سازی کے متعلق بھی دو سال لگ گئے۔ نمک سازی کا بھی یہی حشر ہوا۔

میگنیشم کلورائیڈ کو مدد دینے میں تین سال لگ گئے۔ یہ تمام وہ صنعتیں ہے جن کے متعلق بورڈ نے سفارش کی تھی کہ اُن کو تاین دی جائے اور حکومت نے بالآخر کئی کئی برس سوچ کر بورڈ کی رائے سے اتفاق کر لیا۔ جماعت ب کی صنعتیں جن کے متعلق حکومت کو بورڈ کی سفارشات میں ترمیم کرنا پڑی اُس میں سے بھی زیادہ وقت لگا۔ رُستی سازی کی صنعت کو مدد ملنے میں چار برس لگ گئے اسی طرح بعض دوسری صنعتوں کو مدد ملنے کے لیے تین سے پانچ برس کا عرصہ لگا۔ شاید کچھ ایسے ہی موقعوں کے لیے غالب مرحوم نے فرمایا تھا ؎

میں نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

اس طرح وہ صنعتیں جن کے لیئے بورڈ نے سفارش کی تھی لیکن حکومت نے اس سفارش کو مسترد کر دیا اِن صنعتوں کو مدتوں امید و بیم کی حالت میں منتظر رہنا پڑا اور ان کی صنعت کو ۱۹۳۴ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک انتظار کرنا پڑا اور اس طول انتظار کے بعد اُسے بتایا گیا کہ تاین نہیں دی جائیگی۔ کانچ کی صنعت جس کے متعلق ۱۹۳۱ء میں درخواست پیش کی گئی تھی اور اُس کو ٹیرف بورڈ کے حوالے کیا گیا تھا۔ بورڈ نے ۱۹۳۲ء میں اُسکے متعلق رپورٹ پیش کر دی اور سفارش کی کہ اِس صنعت کو تاین ملنی چاہیئے۔ اِس رپورٹ کو ۱۹۳۴ء میں شائع کیا گیا اور حکومت نے تاین عطا کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ کچھ اس قسم کے حالات میں یاس یگانہ لکھنوی نے فرمایا ہے۔

اُمید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

حکومت کے دفاتر میں ایسی دیری اور تساہل کچھ تعجب انگیز اَمر نہیں ہے لیکن سب سے حیرانی اور تعجب کی بات، یہ ہے کہ وہ صنعتیں جن کو تاین نہ دینے کے لیے

بورڈ نے سفارش کی ایسی رپورٹیں حکومت نے فوراً شائع کردیں اور جھٹ سے بورڈ کی رائے کے ساتھ اتفاق کرلیا۔ یہاں ایک یہ بھی اہم سوال مسٹر ادارکر نے اٹھایا ہے کہ یہ رپورٹیں حکومت کے منتخب شدہ ماہرین نے ملک کا دورہ کرکے نہایت محنت اور جانفشانی سے مرتب کی تھیں پھر حکومت کے محکمہ کامرس کے افسران کو جو باوجود اپنی دوسری اہلیتوں اور قابلیتوں کے اِس کے فن کے ماہر نہ تھے کیا حق حاصل تھا کہ وہ اُن ماہرین کی سفارشات پر اپنے فتوے صادر فرمائیں۔ ویسے تو اکثر اوقات ملک کے آزاد خیال لوگوں نے ٹیرف بورڈ کی ہئیتِ ترکیبی پر سخت اعتراضات کئے ہیں کیونکہ اِس بورڈ کے اکثر اراکین سرکاری عہدے دار ہوتے تھے۔ تمام بورڈوں کے جملہ ۱۱۴ اراکین میں سے ۷۱ سرکاری اراکین تھے اور صرف ۴۳ غیر سرکاری۔ سرکاری اراکین کے متعلق اکثر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ حکومت کے اگر زیرِ اثر نہیں تو کم سے کم ایسے حلقہ میں رہنے سے اکثر ہر چیز کو حکومت کے زاویہ نگاہ سے ہی دیکھنے کے عادی ہو رہتے ہیں اِن حالات میں یہ بات اور بھی قابل افسوس ہی نہیں بلکہ سخت قابل اعتراض ہے کہ حکومت نے کیوں اِن اراکین کی متفقہ سفارشات کے خلاف عمل کیا۔

یہی نہیں بلکہ مسٹر ادارکر نے تو یہاں تک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پس پردہ بہت کچھ کشمکش جاری تھی اِس سلسلہ میں مسٹر ادارکر کے اہم نتائج ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ وہ صنعتیں جن کو تامین دینے سے غیر برطانوی کارخانوں کو نقصان پہنچتا تھا اور ویسے تامین کے لیے درخواست گذاروں کا معاملہ مضبوط تھا ایسے تمام حالات میں حکومت نے ہمیشہ تامین دینا منظور کریں۔

۲۔ جہاں تامین سے برطانوی مفاد کو نقصان پہنچتا تھا وہاں ٹال مٹول سے کام چلایا گیا۔ اور بالآخر انکار کردیا گیا۔

۳۔ جہاں ایسا سمجھوتا ہو سکتا تھا کہ باوجود تاین کے بعض اقسام کا برطانوی مال اچھے داموں پر آکر فروخت ہو سکے وہاں تاین دے دی گئی۔

۴۔ بعض ایسی صنعتوں کو تاین دی گئی جن کے پہلے ہی سے برطانوی کارخانے ہندوستان میں موجود تھے۔ بسٹر ادارکر امتیازی تاین کے سخت مخالف ہیں۔

اگر امتیازی تاین کا اُصول درست تسلیم نہیں کیا جاتا اور اس کے برعکس یہ مطالبہ کیا جاتا ہے جیسا کہ سٹرادارکر نے کہا ہے کہ تاین نہایت فراخدلی سے عام طور پر دی جائے تو ایسی صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فراخدلی سے کیا مراد ہے۔ تاین کی ایک مقدار ایک شخص کے لیے فراخ ہو سکتی ہے اور دوسرے کے لیے نہایت معمولی اور تنگ آخر اِس فراخدلی کا کچھ اُصول اور معیار بھی تو مقرر ہونا چاہیئے مسٹرادارکر نے اپنی کتاب میں کوئی ایسا اُصول اور معیار پیش نہیں کیا حالانکہ یہ انتہائی ضروری تھا۔

اُنھوں نے اِمتیازی تاین کے اُصول پر جا بجا کڑی نکتہ چینی کی ہے جو اکثر اَوقات حدِ اعتدال سے گزر گئی ہے۔ اگر عام طور پر فراخدلی سے تاین دینے کی پالیسی اِختیار کی جائے تو یہ حد کہاں تک ختم ہوگئی۔ اِس فراخدلی کے بھی کچھ اُصول مقرر ہونا چاہیں۔

میری رائے یہ ہے کہ اِمتیازی تاین کا جو فارمولا قائم کیا گیا ہے وہ نہایت درست ہے۔ یاد دہانی کی خاطر اس کلیہ کے تین اہم جزو یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) وہ صنعت جس کو تاین دی جائے ایسی ہو کہ اس کی ترقی کے لیے تمام قدرتی ذرائع ملک کے اندر موجود ہوں۔ تمام خام مال ملک میں کافی طور پر بکثرت پایا جاتا ہو۔ ملک میں اُس کے لیے مزدور اور کاریگر موجود ہوں اور اُس صنعت کی پیدا شدہ اَشیاء کے لئے ملک میں مانگ موجود ہو۔

(۲) صنعت کی نوعیت ایسی ہو کہ وہ یا تو تاین کے بغیر ترقی ہی نہ کر سکتی ہو یا

اتنی جلدی ترقی نہ کر سکتی ہو۔

(۳) صنعت کی نوعیت ایسی ہو کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکے۔

قصور دراصل فارمولا کا نہیں ہے بلکہ اُس سے معنی نکالنے کا ہے۔ مثلاً اس فارمولا کی پہلی شرط یہ ہے کہ خام مال کثرت سے ملک میں پایا جاتا ہو۔ حکومت ہند نے کانچ کی صنعت کو تامین دینے سے اس لیے انکار کر دیا تھا کہ ملک میں راکھ سوڈا نہیں پایا جاتا جو کانچ کے لیے ضروری ہے حالانکہ ٹیرف بورڈ نے اس فارمولا کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سفارش کی تھی کہ راکھ سوڈا ایک معمولی جزو ہے جو آسانی سے باہر سے منگوایا جا سکتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس فارمولا کے اندر رہ کر بھی ایسی صنعتوں کو تامین دی جا سکتی ہے جس کے لیے خام مال کے اکثر اجزا ملک کے اندر موجود ہوں لیکن جزوی طور پر بعض چیزیں باہر سے منگوانی پڑیں۔ اور یہ بات بھی عام فہمی کی ہے لیکن حکومت ہند نے اس فارمولا کو بالکل لغوی معنی پہنائے اور تامین دینے سے انکار کیا جو صریحی طور پر غلط ہے۔

اگر اس فارمولا کو ہمدردانہ طور پر استعمال کیا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ ملک کی صنعتی ترقی کے راستہ میں یہ فارمولا حایل ہوگا۔

ملک میں صنعتی ترقی کے ہم کتنے ہی حامی کیوں نہ ہو اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر قسم کی صنعت کو تامین نہیں دی جا سکتی۔ ۱۹۲۶ء میں ہلٹن ینگ کمشن کی سفارش پر حکومت نے روپیہ کی پونڈ کے ساتھ شرح تبادلہ ایک شلنگ چھ پنس مقرر کر دی تھی۔ جنگ عظیم سے پہلے یہ شرح تبادلہ ایک شلنگ چار پنس تھی۔ مسٹر ادار کر نے کتاب میں بار بار اس شرح کے تباہ کن اثرات کا تذکرہ کیا ہے اور اس راگ کو اس قدر الاپا ہے کہ پڑھنے والے کے سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔

وقت بے وقت موسم بے موسم موقع بے موقع وہ اِس تان کو اڑاتے چلے گئے ہیں کہ اِس شرح نے ہندوستان کی صنعتوں کو تباہ کر دیا ہے۔ اگر کسی سیاسی کتاب میں اس قسم کی بے سُری باتیں ہوتیں تو قابل معافی تھیں لیکن ایک متین علمی کتاب میں جس کی بنیاد معاشی نظریات پر رکھی گئی ہوں اس قسم کا طرز بیان زیادہ شایان شان نہیں مسٹر ادارکر نے جا بجا اِس شرح کی مذمت کی ہے اور اُس کے نقصانات بتائے ہیں لیکن اِس شرح سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں اُن کا تذکرہ صرف ایک آدھ جگہ دبی زبان سے کرنے کے بعد اُنھوں نے بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ ۱۹۲۵ء اور ۱۹۳۵ء کے درمیان ہندوستان میں بہت نمایاں صنعتی ترقی ہوئی۔ ذرائع نقل وحمل میں موٹر لاریوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اِس صنعتی ترقی کے لیے جو مشنری منگوائی گئی وہ مروجہ شرح تبادلہ کی وجہ سے بہت سستی پڑی اور ملک کو یقیناً اُس سے بہت فائدہ پہنچا۔ وہ مُلک جو صنعتی ترقی چاہتا ہو اور جو مشنری تمام کی تمام باہر سے خریدتا ہو اُسکے لیے یہ فائدہ کچھ کم اہم نہیں ہے۔ اِس طرح جب مسٹر ادارکر تاین کے بار کا تجزیہ کرتے ہیں تو اُن کا تجزیہ حقیقت سے دور ہو جاتا ہے۔ تاین کے بار سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا ہاں اُسکے متعلق اختلاف ہونا ممکن ہے کہ آیا یہ بار ملک برداشت کرنے کے قابل ہے یا نہیں اور یہ بار آیندہ چلکر ملک کے لیے فائدہ کا سبب بنے گا۔ مثلاً دیا سلائیوں کے متعلق ٹیرف بورڈ کا حوالہ دیتے ہوئے مسٹر ادارکر لکھتے ہیں کہ دیا سلائی کی ڈبیہ کی قیمت رسمی ہے جو ملک کے چھوٹے سے چھوٹے سکّے کے حساب سے مقرر کی جاتی ہے ہندوستان میں عام رائج الوقت چھوٹے سے چھوٹا سکہ چونکہ پیسہ ہے اس لیے خواہ محصول عائد کیا جائے یا نہ کیا جائے دیا سلائی کی قیمت ایک پیسہ ہی رہیگی۔ چنانچہ دیا سلائی کی صنعت کو جو تاین دی گئی ہے اس کا صافین پر کوئی بار نہیں پڑا۔ یہ استدلال حقایق اور واقعات سے قطعی ہٹا ہوا ہے اگر ملک میں چھوٹے سے چھوٹا رائج الوقت سکہ

ایک پیسہ ہے تو کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ دیا سلائی کی ڈبیہ ایک پیسے کو فروخت ہونے کی بجائے ایک پیسہ کی دو ڈبیہ کے حساب سے کوئی فروخت نہ کی جاسکے۔ اگر محصول کی وجہ سے ایک کی بجائے پیسہ کو دو ڈبیہ نہیں ملتیں تو یقیناً صارفین کو اور بالخصوص غریب صارفین کو بہت کافی نقصان پہنچا ہے۔ بنگلوں اور کوٹھیوں میں رہنے والے ہندوستانی معاشیں کے نزدیک یہ کوئی ایسا اہم بار نہ سمجھا جائے تو یہ الگ بات ہے لیکن میں ذاتی مشاہدے کی بنا پر جانتا ہوں کہ غریب لوگ محلوں میں دوسرے گھروں سے آگ مانگ کر لاتے ہیں تاکہ اس کی مدد سے آگ جلائی جاسکے اور ایک کاڑی کی بچت ہوجائے برسات کے دنوں میں مدتوں پھونکیں مار مار کر مغز خالی ہوجاتا ہے تب کہیں جاکر ایک کاڑی کی بچت ہوتی ہے۔ اِن حالات میں یہ کہنا کہاں تک مناسب ہے کہ اس کا صارفین پر بار نہیں پڑتا۔ میرا اِستدلال یہ ہے کہ صارفین پر بار ضرور پڑتا ہے لیکن چونکہ دیا سلائی پر خرچ مزدور کی آمدنی کا اِس قدر خفیف حصہ ہوتا ہے کہ وہ اسے برداشت کرسکتا ہے۔ بالخصوص جب یہ بار برداشت کرنے سے وہ خود اپنے لیے نہیں تو کم سے کم اپنے اولاد کے لیے صنعتی ترقی کی صورت میں روزی کا سامان پیدا کرتا ہے۔

دوسرے مسٹر ادارکر کا یہ استدلال بھی غلط ہے کہ تامین کی صورت میں اُس کا بار غریبوں پر نہیں بلکہ اعلیٰ طبقوں پر پڑتا ہے۔ مٹی کا تیل دیا سلائیاں۔ نمک اور سوتی کپڑا یہ سب غریب ہی زیادہ استعمال کرتے ہیں اور ان پر محصول کا بار پڑتا ہے۔

مسٹر ادارکر کی کتاب میں میری رائے میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اُنھوں نے اِن مسایل پر روشنی نہیں ڈالی جو فراخدلی سے تامین کی پالیسی پر عمل کرنے سے ملک میں پیدا ہوں گے۔ صارفین پر تامین کا بار ضرور پڑتا ہے اور میں اس کو مان چکا ہوں کہ وہ اس بار کو قہر درویش بر جان درویش کی صورت میں برداشت کرسکتے ہیں لیکن یہ کوئی

وجہ نہیں کہ ملک کے تاجر پیشہ لوگوں اور کارخانہ داروں کو ڈھیلی رسی سے چھوڑ دیا جاتے۔ تاین کی وجہ سے کارخانہ دار جو غیر معمولی منافع حاصل کرتے ہیں اُنپر ان کا کیا حق ہے؟ کیا وہ عوام کے ایثار کا نتیجہ ہیں۔ اور کیا عوام یا ان کی نمایندہ جماعت یعنی حکومت کو اس منافع سے حصہ وصول کرنے کے کوئی حق نہیں۔ کارخانہ دار جو اپنی لاپروائی اور دیگر کمزوریوں کی وجہ سے اپنے اخراجات پیدائش کو کم نہیں کرتے کیا اپنر عوام کا کوئی حق نہیں کہ وہ ان کو اپنی حالت درست کرنے کے لئے مجبور کریں۔ جب تاین کی وجہ سے منافع بڑھ جاتا ہے اور بڑھتے ہوئے منافع اور آیندہ توقعات کی بنا پر حصوں کی قیمتیں دھڑا دھڑ بڑھنی شروع ہو جاتی ہیں اور سو روپیہ کا حصہ پانچ سو روپیے میں فروخت ہونے لگتا ہے تو کیا اس صورت میں حکومت پر کوئی پابندی لاحق نہیں ہوتی کہ وہ اس سٹہ بازی کا ابتدا میں سدّباب کرے۔ یہ تمام مسائل تاین کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور مسٹر ادار کرنے اپنر کچھ روشنی نہیں ڈالی۔ بہ وقت فرصت کسی علیحدہ مضمون میں میں اُنپر روشنی ڈالونگا۔

(۶۱۹)

کتاب کے ملنے کا پتہ۔ کتابستان۔ الہ آباد۔ قیمت ۵ا روپئے صفحات

نازیت کا معاشی پہلو

جناب امتیاز حسین خاں صاحب۔ بی کام (لندن) لکچرار معاشیات جامعۂ عثمانیہ

قبل اس کے کہ یہ بیان کیا جائے کہ نازی جماعت نے جرمنی میں سیاسی اقتدار پانے کے بعد کس قسم کا معاشی نظام قائم کرنے کی کوشش کی یا پھر یہ کہنا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے نو سال میں ان کی کس قسم کی معاشی پالیسی رہی نازیت کا معاشی پس منظر پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ موجودہ دور میں آج تک کوئی ایسی بڑی سیاسی تحریک پیدا نہیں ہوئی جس کے وجود میں آنے کے اہم معاشی اسباب موجود نہ رہے ہوں۔ انقلاب فرانس محض ایک سیاسی منظہر سمجھا جاتا ہے لیکن اس کے نمودار ہونے کے بھی اہم معاشی اسباب موجود تھے۔ انقلاب روس کی کامیابی میں سیاسی اسباب سے زیادہ معاشی اسباب نے حصہ لیا۔ اسی طرح سے نازیت کے وجود میں آنے اور عروج پانے کے اہم معاشی اسباب پائے جاتے تھے۔ اس تحریک کے ظہور کا اہم سبب افراط زر (Inflation) تھا اور نازی جماعت کو قوت ۳۲ - ۱۹۲۹ کی عالمی کساد بازاری کی وجہ سے حاصل ہوئی۔

نازیت کا معاشی پس منظر | جرمنی میں پچھلی جنگ عظیم کے دوران اور اس کے بہت بعد تک افراط زر کی پالیسی پر عمل ہوتا رہا۔ اس

معاشی اصطلاح اور اس کی وجہ سے معاشرہ کے لئے جس قسم کے اثرات پیدا ہوتے ہیں ان کی تشریح کی ضرورت ہے۔ افراط زر کی تعریف ہر ماہر معاشیات نے مختلف الفاظ میں کی ہے اور اسی لئے اس کے سمجھنے میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ آسان اور مُفید تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ افراط زر سے مراد ایسی حالت ہے جبکہ عام طور پر قیمتوں میں اضافہ ہو یا اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ زر کی قدر یا اسکی قوتِ خرید گھٹے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ قیمت میں ہر قسم کے اضافہ کو افراط زر سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے یہ لازمی شرط ہے کہ عام طور پر قیمتوں میں اضافہ ہو۔ افراط زر کے حالات عموماً جنگ کے دوران اور اس کے بعد پیدا ہوتے ہیں حکومتوں کے لئے موجودہ جنگیں بہت زیادہ مہنگی ثابت ہوئی ہیں اسی لئے ان کے اخراجات حکومتوں کے معمولی ذرائع آمدنی سے پورے نہیں کئے جا سکتے اور مجبوراً افراط زر کی پالیسی اختیار کرنی پڑتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ زر کی مقدار میں اضافہ کرکے حکومت اپنی بڑھتی ہوئی ضروریات پوری کرتی ہے۔ ایک طرف زر کی مقدار تو بڑھ جاتی ہے لیکن اس کے مقابلہ میں اشیاء اور خدمات کی مقداریں بہت کم ہوتی ہیں۔ عام طور پر مانگ بڑھنے کی وجہ سے ہر چیز کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے موجودہ جنگ کا بھی یہ اثر ہوا ہے کہ قیمتیں کافی بڑھ گئی ہیں لیکن پھر بھی ابتک حالات اتنے زیادہ خراب نہیں ہوئے ہیں جتنے کہ پچھلی جنگ کے دوران میں ہر ملک کی قیمتوں میں اضافہ ہوا تھا۔ انگلستان میں قیمتیں تین گنی تک بڑھی تھیں فرانس میں قیمتوں میں اضافہ پانچ گنا اور اٹلی میں چھ گنا ہوا تھا۔ ان ممالک کے مقابلے میں جرمنی کی حالت بہت زیادہ ابتر تھی۔ ۱۹۲۳ئہ میں ۱۹۱۴ئہ کے مقابلہ میں قیمتوں کی سطح ۶۵۰،۷ گنا زیادہ تھی۔

جب کبھی معاشرہ میں اس قسم کا افراط زر نمودار ہو تو مختلف معاشی طبقات

سیاست ۲ ماہ جولائی ۱۹۴۲ء

نازیت کا معاشی پہلو

۳۸

غالباً "یا پھر" استعمال کرنے کی عادت سی ہو گئی ہے حالانکہ یہ غلط ہے آئندہ میں دیکھوں گا

کے لئے بُرے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ ۱۹۲۳ء کے افراط زر نے جرمنی کی معاشرتی اور سیاسی ہئیت میں بہت سی اہم تبدیلیاں کردیں۔ اس کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان اوسط طبقہ کو اُٹھانا پڑا۔ اس طبقہ میں عموماً ایسے لوگ شامل ہوتے ہیں جن کی آمدنیاں مقرر ہوتی ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ، سرکاری اور نیم سرکاری ملازمین اور ایسے لوگ جو کچھ تھوڑا بہت بچا رکھتے ہیں اور اپنی پس انداز کی ہوئی دولت سے مختلف قسم کی تمسکات خرید لیتے ہیں یا پھر مقررہ شرح سود پر قرض دیتے ہیں ان لوگوں پر قیمتوں کے بڑھنے کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح سے وہ لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں جن کی آمدنی کا ذریعہ پنشن یا پھر مکانات وغیرہ کے کرائے ہوتے ہیں۔ اور اسی قسم کی دوسری آمدنیاں ایسی ہیں جن میں جلد جلد تبدیلیاں نہیں ہوتیں۔ بعض ان میں سے تو ایسی آمدنیاں ہیں جو ہمیشہ مقرر رہتی ہیں اور بعض دوسری ایسی ہیں جو قیمتوں میں اضافہ کے ساتھ ساتھ نہیں بڑھتی۔ جرمنی میں افراط زر کا نتیجہ یہ ہوا کہ اوسط طبقہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھا۔ اُن کی پس اندازہ کی ہوئی دولت بالکل ختم ہوگئی یا پھر اس کی کوئی حیثیت نہیں رہی۔ مزدور جماعت کے مقابلہ میں اوسط طبقہ کو بہت زیادہ نقصان اُٹھانا پڑا۔ صنعتی ممالک میں مزدور جماعت منظم ہوتی ہے۔ جب کبھی قیمتوں میں اضافہ ہو مزدور سبھائیں اپنے ارکین کی اُجرتوں میں بھی اضافہ کا مطالبہ کرتی ہیں اور بڑی حد تک انہیں اپنے اس مطالبہ میں کامیابی بھی ہوجاتی ہے۔ اوسط طبقہ کسی ملک میں بھی منظم نہیں ہوتا اس لئے ان کی آمدنیاں حالات کے ساتھ ساتھ نہیں بدلیتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے طبقات کے مقابلہ میں اوسط طبقہ کو افراط زر سے بہت زیادہ نقصان پہونچتا ہے جرمنی میں اوسط طبقہ کے ہزاروں خاندان بالکل غریب ہوگئے اور انہیں بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں کے لئے ایک جدید اصطلاح "نئے غریب" (New Poor

ایجاد کی گئی ۔جنگ سے پہلے اِس طبقہ کے معاشی حالات بہت بہتر تھے اور اس کے افراد چین کی زندگی گذارتے تھے ۔حالات بدلنے کی وجہ سے جب انھیں مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا تو انھوں نے بہت زیادہ محسوس کیا ۔انھوں نے اپنی معاشی حالت بہتر کرنے اور پستی کو دور کرنے کی ایک ہی صورت پائی اور وہ یہ کہ اپنے ملک کی حکومت پر قبضہ کیا جائے ۔چاہے ایسا کرنے میں انہیں کسی قسم کے ذرائع کیوں نہ اختیار کرنے پڑیں ۔حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش نے نازی تحریک کی شکل اختیار کی ۔نازی جماعت کے قائدین پر نظر ڈالنے سے فوراً معلوم ہوجاتا ہے کہ ان کی اکثریت اوسط طبقہ سے تعلق رکھتی ہے ۔شروع شروع میں اس تحریک کے حمایت کرنے والے بھی اوسط طبقہ کے افراد تھے ۔یہی حال فسطائیت کا دوسرے ممالک میں بھی ہے ۔

ہم نے دیکھا کہ نازی جماعت کی ابتداء افراط زر کے بدترین حالات میں ہوئی یعنی اِس تحریک کے ظہور میں آنے کا ایک اہم معاشی سبب موجود تھا ۔یہاں نازی تحریک کی سیاسی تاریخ بیان نہیں کی جائے گی ۔صرف اتنا بتلانے پر اکتفا کیا جائیگا کہ اس کے قوت پانے کا بھی ایک اہم معاشی سبب موجود تھا ۔۱۹۲۳ء میں جرمنی کے زر کو استحکام دینے کے لئے نئی قسم کا مارک جاری کیا گیا ۔دوسرے ممالک سے قرضے حاصل کرکے صنعتوں کی نئے سرے سے تنظیم کی گئی ایسا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ سستی چیزیں تیار کرکے برآمد میں اضافہ کیا جائے اور تاوان جنگ ادا کیا جاسکے ۔نئے انتظامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو سال کے قلیل عرصے میں جرمنی میں خوشحالی کا دَور دَورہ شروع ہوا ۔اس کی تجارت خارجہ کو ترقی ہوئی ۔لوگوں کو مختلف قسم کے کاروباروں میں کام ملنے کی وجہ سے بیروزگاری گھٹی ۔یہی وہ زمانہ ہے جبکہ نازی تحریک کے بہت کم حامی رہ گئے تھے ۔ہٹلر سیاسی قوت حاصل

کرنے کی پہلی کوشش ۱۹۲۳ء میں کرچکا تھا اور اب بالکل گمنامی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ لیکن دُنیا میں خوشحالی کا دَور دَورہ کچھ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہا۔ ۱۹۲۹ء میں مشہور عالمی کساد بازاری شروع ہوئی۔ اس کی ابتدا، توریاستہائے متحدہ امریکہ سے ہوئی لیکن اس کے بڑے اثرات سے دنیا کا کوئی ملک بھی محفوظ نہیں رہ سکا۔ ۱۹۲۹ء کے آخر میں طوفان کی طرح اس کے اثرات جرمنی میں بھی پھیل گئے۔ کساد بازاری کے اثرات سے بچنے کے لئے بہت سے ممالک نے معاشی خودکفالت کی پالیسی اختیار کی۔ اِن تمام حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت بین الاقوام پہلے کے مقابلہ میں آدھی رہ گئی اور خاص طور پر ان ممالک کو نقصان بہت زیادہ پہونچا جن کی معیشت کا انحصار تجارت خارجہ پر زیادہ تھا۔ جرمنی نے اپنی صنعتوں کی نئے سرے سے تنظیم اس مفروضہ پر کی تھی کہ دوسرے ممالک والے اُس کی سستی مصنوعات بہت زیادہ مقداریں خریدتے رہیں گے اور بھاری تاوانِ جنگ ادا کرنے کی یہی ایک صورت ہو سکتی تھی۔ جرمنی کا یہ مفروضہ غلط ثابت ہوا۔ نئے حالات پیدا ہو جانے کی وجہ سے دوسرے ممالک والے اس سے زیادہ مقداریں مال خریدنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ برآمد میں کمی نے بہت سی صنعتوں کو نقصان پہونچایا اور بہت سے مزدور بے روزگار ہو گئے۔ مانگ کم ہونے کی وجہ سے دوسری صنعتوں کو جو اندرونی بازار کے لئے چیزیں تیار کرتی تھی یہی نقصان پہونچنا لازمی تھا۔ اس طرح سے کساد بازاری کا بُرا چکر جرمنی میں بھی شروع ہو گیا۔ بیروزگاری میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ ۱۹۳۲ء میں بے روزگار مزدوروں کی تعداد ۶۰ اور ۷۰ لاکھ کے درمیان تھی۔ اِن بے روزگار لوگوں میں بہت سے ایسے نوجوان شامل تھے جن کے باپ افراطِ زر کے زمانے اپنی ساری پونجی کھو چکے تھے۔ انھوں نے نازی جماعت کی طرف نظریں اُٹھائیں۔ ہٹلر اس موقعہ کا منتظر بیٹھا تھا اس نے

بھوکے مزدوروں کی خوب آؤ بھگت کی اور نازی تحریک کے مختلف قائدین نے روزگار مہیا کرنے کے وعدے شروع کر دیے۔ بے روزگار مزدور کے لئے روزگار حاصل کرنے سے زیادہ کوئی دوسری چیز اہمیت نہیں رکھتی۔ بھوک کی شدت میں وہ اپنے عقائد تک کو بھول جاتا ہے۔ اس امید میں کہ نازی تحریک کی کامیابی انہیں روزگار دلائے گی۔ مزدور طبقہ نے اس کی حمایت شروع کر دی جس کا ثبوت چند اعداد و شمار سے ملتا ہے۔ ۱۹۲۸ء کے عام انتخاب میں نازیوں کو تمام جرمنی میں صرف ۸ لاکھ ووٹ حاصل ہوئے تھے۔ لیکن کساد بازاری کے بعد جو پہلا انتخاب ۱۹۳۰ء میں ہوا اس میں نازی جماعت کو ۶۵ لاکھ ووٹ ملے تھے ان اعداد و شمار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح سے ناتیت کی مقبولیت میں کساد بازاری نے مدد دی۔ رفتہ رفتہ اس جماعت کا اقتدار بڑھتا گیا اور بہت جلد ۱۹۳۳ء میں جرمن حکومت ان کے قبضہ میں آگئی۔

ناتیت کا معاشی پروگرام نازیوں کے اقتدار میں آنے سے پہلے انھوں نے جرمن قوم کے سامنے جو معاشی پروگرام پیش کیا تھا اس پر زیادہ اثر فیڈر (Fader) کے خیالات کا پڑا تھا۔ اس کی رائے میں اگر سود کی بندھنوں کو توڑ دیا جائے تو معاشرتی نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس نے بتلایا کہ سرمایہ کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک قومی سرمایہ جو پیدا آور ہوتا ہے اور دوسرا یہودیوں کا سرمایہ جس کا مقصد قوم کا استحصال کرنا ہے۔ مارکس کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح سے قومی سرمایہ ختم ہو جائے تاکہ یہودیوں کا بین الاقوامی سرمایہ قومی معیشت پر اپنا اقتدار قائم کر سکے۔ فیڈر کے خیال میں نازی معیشت میں سود کے لئے کوئی جگہ نہ ہونی چاہیئے۔ نازی جماعت نے اقتدار پانے کے بعد سود کو ختم کرنے کی کبھی بھی کوشش نہیں کی۔ البتہ بنک کاری کے نظام پر قابو

پا کر اتنا ضرور کیا گیا کہ جہاں تک ہو سکے اس کی شرح کم کی جائے تاکہ ملک کی صنعت و حرفت، زراعت اور تجارت کو فروغ ہو۔ معاشی پروگرام کے دوسرے حصوں کا مطالعہ کیا جائے تو بعض دفعات ایسی ضرور ملتی ہیں جن میں اشتراکیت کی بو پائی جاتی تھی۔ لیکن قوت پانے کے بعد ان میں سے کسی پر نازی جماعت نے عمل نہیں کیا اس لئے اس پروگرام کے متعلق تفصیلات بیان کرنا بے سود ثابت ہوگا۔

جب سے نازی جماعت نے جرمنی کی حکومت اپنے ہاتھ میں لی ہے جرمن معیشت کے عام رجحان کے متعلق لوگوں میں مختلف خیالات پائے جاتے ہیں۔ بعضوں کا کہنا ہے کہ نازیت کی شکل میں سرمایہ دارانہ نظام نے مزدوروں کے خلاف آخری محاذ قائم کیا ہے۔ اس قسم کے دوسرے اور خیالات بھی پائے جاتے ہیں۔ ان مختلف خیالات میں تھوڑی بہت صداقت ضرور ہے۔ لیکن سب سے زیادہ صحیح غالباً یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ نازیت اصل میں ایک قسم کی فوجی آمریت ہے جس میں ایک پارٹی نے قوت حاصل کرنے کی غرض سے قوم کی پوری معیشت کو اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ آگے چلکر جیسے جیسے نازی جماعت کی معاشی پالیسی کے مختلف اجزاء کی تشریح کی جائے گی یہ بات واضح ہو جائے گی کہ کس طرح سے قومی معیشت کے ہر پہلو پر حکومت کی نگرانی قائم ہے۔ اس لئے جرمنی کے موجودہ معاشی نظام کے لئے جو اصطلاح استعمال کی جاتی ہے وہ (Controlled Capitalism) ہے نازی جماعت سے پہلے دوسرے مغربی ممالک کی طرح جرمنی میں بھی سرمایہ دارانہ نظام قائم تھا۔ اس نظام میں عاملین پیدائش ذاتی ملکیت میں ہوتے ہیں۔ لوگوں کو کاروبار کرنے میں ہر قسم کی آزادی حاصل ہوتی ہے یعنی آزاد مقابلہ موجود ہوتا ہے۔ اس معاشی نظام کی قوت محرکہ منافع ہے۔ سرمایہ داری کے نظام میں آجر منافع کمانے کی غرض سے اشیاء تیار کرتے ہیں اور اسی طرح سے خدمات انجام پاتی ہے۔ سرمایہ داری

کی یہ اہم خصوصیات جرمنی کے معاشی نظام میں بھی پائی جاتی تھیں۔ صرف مقامی حالات کی وجہ سے تھوڑا سا فرق تھا۔ دوسرے ممالک کے مقابلہ میں جرمنی میں اجارہ کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اجارہ کی جو شکل جرمنی میں رونما ہوئی اُس کو کارٹل کہا جاتا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں اِس قسم کے تقریباً تیس ہزار کارٹل مختلف قسم کے کاروبار میں قائم تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جرمن سرمایہ داری میں آزاد مقابلہ کو وہی حیثیت حاصل نہیں تھی جو دوسرے مغربی ممالک میں۔ لیکن اُنیسویں صدی کے آخر میں دوسرے ممالک بالخصوص امریکہ میں بھی اجارہ کو فروغ ہوا تھا۔ مزدور سبھائیں بھی جرمنی میں دوسرے ممالک کے مقابلہ میں زیادہ منظم تھی جس کا مطلب یہ ہے کہ مزدور تحریک میں بھی اجارہ دارانہ رجحان پایا جاتا تھا۔ اِن معمولی اختلافات کے علاوہ جرمن سرمایہ داری کی ایک اور اہم خصوصیت یہ تھی کہ بہت سے کاروبار مرکزی اور مقامی حکومتوں کی طرف سے انجام دئے جاتے تھے۔ یا تو یہ صورت تھی کہ حکومت کی ملکیت میں بہت سے کاروبار چلتے تھے یا ہر کمپنیاں قائم تھیں جن کے زیادہ حصوں کی مالک حکومت تھی۔ لیکن یہ رجحان دوسرے ممالک کے معاشی نظام میں بھی پیدا ہو چلا تھا۔ خاص طور پر ۱۹۲۹ء کی عالمی کساد بازاری کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام میں بعض اہم تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ یہ تبدیلیاں جرمن نظام میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ نازیوں کو جب جرمنی کی حکومت ملی اس وقت سرمایہ دارانہ نظام اپنا بہت کچھ رنگ روپ بدل چکا تھا۔

اَب نازیت کی معاشی پالیسی کے اہم اجزا بیان کئے جائیں گے جن سے یہ واضح ہو جائے گا کہ حکومت کی نگرانی قومی معیشت کے ہر پہلو پر قائم ہے ظاہر ہے کہ تھوڑے سے وقت میں نہ تو معاشی پالیسی کے اجزا کی تفصیلات ہی بیان کیجا سکتی ہیں اور نہ اس کے ہر جزو کو شامل کیا جا سکتا ہے۔

ناتیت اور اشتراکیت ناتیت کا پورا نام (National Socialism) یا قومی اشتراکیت ہے۔ اس نام کی وجہ سے بڑی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ مغربی ممالک میں عام طور پر اشتراکیت سے جو مراد لی جاتی ہے قومی اشتراکیت کو اس سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ کسی کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اشتراکیت کی حیثیت ایک ایسی ٹوپی کی سی ہے جس کو بہت سے لوگوں نے پہنا ہو اور اسی وجہ سے اس کی شکل بالکل بگڑ گئی ہو۔ لوگوں نے اشتراکیت کی تشریح اور تعریف مختلف انداز سے کی ہے۔ اس کی بہت سی قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔ لیکن پھر بھی بعض خصوصیات ایسی ہیں جن کا ہر قسم کی اشتراکیت میں موجود ہونا ضروری ہے۔ اشتراکیت کی پہلی اہم خصوصیت یہ ہے کہ عاملین پیدائش پر ذاتی ملکیت کے بجائے اجتماعی ملکیت قائم ہوتی ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں اشتراکیت کے نظام میں مزدور یا کسان طبقہ کو زیادہ اقتدار حاصل ہونا چاہیئے۔ یہ دونوں خصوصیات نازی تحریک میں بالکل نہیں پائی جاتیں۔ اب بھی عاملین پیدائش ذاتی ملک ہیں۔ نازی یہ کہتے ہیں کہ جرمنی کی قومی اشتراکیت اور مارکس یہودی کی بین الاقوامی اشتراکیت میں بین فرق ہے۔ مارکس کی اشتراکیت کے لئے عاملین پیدائش پر اجتماعی ملکیت کا قائم ہونا ضروری ہے۔ لیکن قومی اشتراکیت کے لئے یہ چیز ضروری نہیں۔ اسی طرح سے نازی جرمنی میں مزدور طبقہ کو پہلے سے زیادہ اقتدار حاصل نہیں ہے۔ اس کے برخلاف (جیسا کہ بیان کیا جائے گا) مزدور جماعت اپنی تمام سیاسی اور معاشی مراعات کھو چکی ہے۔ ان کی سبھائیں اور سیاسی تحریک کا خاتمہ کر دیا گیا ہے اور وہ نازی جماعت کا آلہ کار بن کر رہ گئی ہے۔ ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ناتیت میں اشتراکیت کی دو اہم خصوصیات موجود نہیں ہیں۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر تحریک کے نام میں اشتراکیت کا لفظ کیوں شامل کیا گیا۔ اسکی

محض وجہ ایک خاص مقصد حاصل کرنا تھا۔ اشتراکیت کے لفظ کو اپنا کر نازی یہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح مزدور جماعت کے اراکین اور اداروں کی ہمدردیاں اور حمایت حاصل کریں اور اُنہیں آسانی سے دُہوکا دے سکیں۔ جب کبھی بڑے بڑے سرمایہ داروں اور زمینداروں (جنھوں نے شروع ہی سے تحریک کی مالی امداد کی تھی) نے تحریک کے نام پر یا پھر اُس کے معاشی پروگرام کے بعض اجزا پر اعتراضات کئے تو اُنہیں یقین دلایا گیا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ایسا صرف ایک خاص مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کیا گیا ہے اور سرمایہ داروں کے مفاد کی حفاظت کا وعدہ نازی جماعت برابر کرتی رہی۔

نازی جماعت اور معاشی خود کفالت کی پالیسی

اُوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ۱۹۲۳ء میں مارک کو استحکام دینے اور دوسرے ملکوں سے بہت کافی مقدار میں قرضے حاصل کرنے کے بعد جرمن صنعتوں کو نئے سرے تنظیم دی گئی تھی۔ نئی تنظیم کی وجہ سے جرمن صنعتیں بہت زیادہ مقدار میں سستی چیزیں تیار کر سکتی تھیں لیکن اس سے پورا پورا فائدہ اُسی وقت اٹھایا جا سکتا تھا جبکہ مصنوعات کی بہت زیادہ برآمد کی جاتی۔ صرف جرمنی کا بازار ان مصنوعات کے لئے ناکافی تھا۔ کساد بازاری کے اثرات نے عالمی بازار کو بہت ہی محدود کر دیا تھا۔ حکومت پر قابو پانے کے بعد نازی جماعت کے سامنے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ کس طرح سے جرمن صنعتوں اور زراعت کی حالت سدھاری جائے۔ اس مشکل مسئلہ کے حل کے لئے انھوں نے ایک طرف تو معاشی خود کفالت کی پالیسی اختیار کی۔ ایسا کرنے سے وہ زراعت اور چھوٹی صنعتوں کی حالت تو بہتر کر سکتے تھے۔ لیکن جرمنی کی بھاری صنعتوں کا مسئلہ پھر بھی حل نہیں ہوتا تھا۔ اس کے لئے برآمد کو ترقی دینا اور دوسرے ممالک کے بازار پر قبضہ کرنا ضروری تھا۔ اُن کی

معاشی پالیسی کا دوسرا اہم جزو یہ تھا کہ جرمن مصنوعات کے لئے بازار تلاش کئے جائیں۔ اس طرح سے انھوں نے معاشی خودکفالت کی پالیسی اور برآمد کو ترقی دینے کی پالیسی میں مصالحت پیدا کرنے کی کوشش کی۔

زراعت اور چھوٹی صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے معاشی خودکفالت کی پالیسی پر عمل کیا گیا۔ اس پالیسی سے مراد یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے اپنی ضروریات کی چیزیں اپنے ہی ملک میں تیار یا پیدا کی جائیں۔ اگر اس پالیسی کو انتہا تک پہونچایا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دوسرے ممالک سے تمام تجارتی اور مالیاتی تعلقات منقطع کرے جائیں۔ ظاہر ہے کہ موجودہ دور میں کوئی ترقی یافتہ قوم ایسا نہیں کرسکتی۔ قوموں کے درمیان تجارتی تعلقات اس قدر اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کو بالکل ختم کر دینا تقریباً ناممکن ہے۔ انسانی ضروریات نے اتنی وسعت حاصل کرلی ہے کہ ان کو پورا کرنے کے لئے ہر چیز ایک ہی ملک کے ذرائع سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لئے یہ لازمی امر ہے کہ ہر ملک کو دوسرے ممالک سے اشیاء اور خدمات کی خرید و فروخت کرنی پڑے گی۔

معاشی خودکفالت کی پالیسی پر عمل تو بہت پہلے ہوچکا تھا لیکن اس میں کامیابی حاصل کرنے کا جو طریقہ خاص طور پر اختیار کیا گیا وہ دوسرا چہار سالہ لائحہ عمل تھا جس کی ابتدا ستمبر ۱۹۳۶ء سے ہوئی۔ اس لائحہ عمل کے تحت یہ کوشش شروع کی گئی کہ جہاں تک ہوسکے قومی ضروریات پوری کرنے کے لئے ضروری اشیا خوراک اور دوسری خام اشیاء کی زیادہ سے زیادہ مقدار میں ملک کے اندر ہی پیدا کی جائیں۔ جو چیزیں آب و ہوا کے اختلاف یا پھر کسی دوسری وجہ سے ملک کے اندر پیدا نہیں کی جاسکتی تھیں ان کے بدل دریافت کرنے کی کوشش کیجاۓ

جس کی بہترین مثالیں مصنوعی ربر اور کوئلہ سے پٹرول تیار کرنا ہے۔ اس طرح سے معاشی اور سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لئے جدید سائنس سے بھی پوری پوری مدد لی گئی۔

معاشی خود کفالت کی پالیسی اختیار کرنے کا ایک اہم معاشی سبب ہے اس کے حامیوں کا خیال ہے کہ اس کے ذریعہ سے قومی معیشت کو تجارتی چکر کے بُرے اثرات سے محفوظ کیا جاسکتا ہے لیکن اس پالیسی پر عمل کرنے اور کامیابی حاصل کرنے سے ایک سیاسی فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ جرمن قوم کا کہنا ہے کہ معاشی لحاظ سے خود مکتفی نہ ہونے کی وجہ سے جرمنی کو پچھلی جنگ میں شکست اُٹھانی پڑی۔ وہ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ جرمن فوجوں کو میدان جنگ میں کبھی بھی شکست نہیں ہوئی البتہ اشیاء خوراک کی کمی نے عام آبادی کو بغاوت کرنے پر مجبور کیا اور بالآخر فوجوں کو بھی ہتھیار ڈالنے پڑے۔ حکومت برطانیہ کی معاشی ناکہ بندی بہت زیادہ کامیاب تھی اور اسی لئے جرمنی دوسرے ممالک سے اشیاء خوراک اور دوسری چیزیں خرید نہیں سکا اور جرمن قوم کو بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر قوم خود مکتفی ہوجائے تو پھر اس قسم کا خطرہ باقی نہیں رہتا۔ اسی خیال کو پیش نظر رکھکر اٹلی میں بھی معاشی خود کفالت کی پالیسی اختیار کی گئی ہے۔ اٹلی کو جنگ حبشہ کے دوران میں معاشی حدود (Sanctions) کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔

نئی معاشی پالیسی نے جرمنی کے عام لوگوں کا معیار زندگی پست کردیا ہے اس پالیسی کے تحت باہر کا سستا مال ملک میں آنے سے روکا جاتا ہے اور اس قسم کی چیزیں ملک کے اندر تیار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن جب چیزیں غیر موافق حالات میں تیار کی جاتی ہیں تو ان کے مصارف پیدائش بڑھ جاتے ہیں اور عام لوگوں کو ان کی ضروریات کی چیزیں زیادہ قیمت پر ملتی ہیں جس کا

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی مقررہ آمدنی سے اشیاء اور خدمات کی کم مقداریں خرید سکتے ہیں اور ان کا معیار زندگی پست ہوجاتا ہے۔ لیکن معاشی خود کفالت کے حامی معیار زندگی کے پست ہونے کی زیادہ پروا نہیں کرتے وہ اتنی قربانی کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں بشرطیکہ ایسا کرنے سے قوم کو معاشی خود مختاری حاصل ہوجائے۔ اُن کی نظر میں معاشی خود مختاری معیار زندگی کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

نازی معاشی پالیسی کے پہلے جزو یعنی معاشی خود کفالت کے ذریعہ سے کسانوں، بڑے بڑے زمینداروں اور چھوٹی صنعتوں کے مالکوں کی حالت کو بہتر کیا جاسکتا تھا لیکن بھاری صنعتوں کو سدھارنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ برآمد کو ترقی دی جاتی۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں کی مالی امداد نے نازی تحریک کو کامیاب بنایا تھا اِس لئے ان کو بھی خوش رکھنا ضروری تھا۔ اس زمانہ میں ہر ملک خود مکتفی بننے کی کوشش میں لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے مغربی یورپ کے ممالک میں جرمن مصنوعات کے لئے گنجائش بالکل نہیں تھی۔ دوسرے صنعتی ممالک کا بھی یہی حال تھا۔ جرمنوں کے پاس نوآبادیات بھی نہیں تھیں جہاں وہ اپنی مصنوعات کی کھپت کر سکتے۔ جرمنی کے لئے صرف جنوب مشرقی یورپ کے ممالک کے بازاروں پر قبضہ کرنے کا موقعہ تھا۔ یہ تمام ممالک زرعی ہیں اور ان کی معاشی حالت بالکل ہندوستان جیسی ہے۔ یہاں مختلف قسم کی صنعتوں نے بہت کم ترقی کی ہے اور صنعتی ممالک کی اشیاء کے لئے اچھے بازار ثابت ہو سکتے ہیں۔ جرمنی نے مختلف طریقوں سے اِن ممالک کے بازاروں پر قبضہ جمانا شروع کیا۔ لیکن ایسا کرنے میں جرمنی کو اپنی مصنوعات کے بدلے میں ان کی خام اشیاء خریدنی پڑیں۔ یہ ممالک بھی بہت سی ایسی چیزیں پیدا کرتے ہیں جن کے لئے جرمنی، خود مکتفی ہونے کا اِرادہ کر چکا تھا۔ اس طرح سے نازی

جماعت کی معاشی پالیسی کے دو اہم اجزاء میں تصادم ہونے کے بہت زیادہ امکانات تھے۔ اِس تصادم کو دور کرنے کے لئے جرمنی نے مشرقی یورپ کے ممالک کو ایسی خام اشیاء پیدا کرنے پر مجبور کیا جن کی اسے ضرورت تھی۔ دوسرے لکچر میں اسکے متعلق اور زیادہ تفصیلات بیان کئے جائیں گے اور یہ بتلایا جائے گا کہ کس طرح سے جرمنی نے اپنے مفاد کے لئے ان ملکوں کی معیشت کو اپنے قابو میں کر رکھا ہے۔

نازیت اور بیروزگاری کا مسئلہ

نازی جماعت کے اِقتدار میں آتے ہی سب سے اہم اور پیچیدہ مسئلہ جس کا اُنہیں سامنا کرنا پڑا وہ مسئلہ بیروزگاری تھا۔ جب ہٹلر کے ہاتھوں میں حکومت آئی تو اس وقت جرمن قوم عالمی کساد بازاری کے بدترین اثرات سے گذر رہی تھی جس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ ۱۹۳۲ء کے آخر میں تقریباً ۷ لاکھ مزدور بیکار تھے۔ یہ ہم معلوم کر چکے ہیں کہ بیکار مزدوروں سے روزگار مہیا کرنے کا وعدہ کر کے نازیوں نے ان سے ووٹ حاصل کئے تھے۔ یہ کہنا تو غالباً صحیح نہ ہوگا کہ نازی جماعت نے محض اپنے وعدہ کو پورا کرنے کی غرض سے بیروزگاری کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی۔ اصل وجہ یہ تھی کہ اس کے بغیر نازی تحریک کو معاشی اور سیاسی استحکام حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر بے روزگار مزدوروں کی بڑی تعداد موجود رہتی تو نازیوں کو ہر وقت اس بات کا خطرہ لگا رہتا کہ معلوم نہیں کس وقت مزدور طبقہ ان سے منحرف ہو جائے اور ان سے سیاسی قوت چھیننے کی کوشش کرے۔

نازی عہد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ جرمنی میں بیروزگاری کا بالکل خاتمہ ہو چکا ہے اِس حقیقت سے کوئی شخص انکار بھی نہیں کر سکتا اگر بیروزگاری کے تعداد شمار پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ۱۹۳۳ء کے بعد سے بہت جلد بیکار مزدوروں کی تعداد میں ہر سال کمی ہوتی گئی ۱۹۳۴ء

کے شروع میں ۶۰ اور ۷۰ لاکھ کے درمیان مزدور بیکار تھے۔ ۱۹۳۷ء میں انکی تعداد صرف پانچ لاکھ سے کچھ زیادہ تھی۔ اس کے بعد سے جرمنی میں مزدوروں کی کمی محسوس کی جانے لگی اور اس کمی کو دور کرنے کے لئے دوسرے ملکوں شلاً پولینڈ اور اٹلی وغیرہ سے مزدوروں کی درآمد کی گئی۔ جب سے موجودہ جنگ شروع ہوئی ہے جنگ کے قیدیوں سے بھی مختلف کام لئے جارہے ہیں تاکہ جرمن صنعتوں اور زراعت کے مختلف شعبوں میں مزدوروں کی کمی نہ پڑے اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس وقت قیدیوں کے علاوہ دوسرے ملکوں کے تقریباً ۲۰ لاکھ مزدور جرمنی میں کام کر رہے ہیں۔ جرمنی میں اب جو کچھ تھوڑے بہت مزدور بیکار رہ گئے ہیں وہ یا تو کاروبار بدلنے کی وجہ سے یا روزگار پانے کے مستحق نہیں سمجھے جاتے وہی شخص اِس کارنامہ کی اہمیت کی قدر کر سکے گا جو بے روزگاری کی مصیبتوں اور دقتوں کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ لیکن اس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے اگر ہم یہ معلوم کریں کہ کن طریقوں سے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ایسا کرنے میں مزدوروں کو کس قسم کی قربانیاں ادا کرنی پڑ رہی ہیں۔

اب ہم ان طریقوں کی طرف متوجہ ہوں گے جن کو نازی جماعت نے بیروزگاری کو دور کرنے کے لئے اِختیار کیا۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ہٹلر نے یکم مئی ۱۹۳۳ء کو چہار سالہ لائحہ عمل کا اِعلان کیا اور بہت جلد اس پر عمل بھی شروع ہو گیا۔ اس لائحہ عمل کے تحت سب سے پہلے تو رفاہ عامہ کے کاموں پر دل کھولکر روپیہ صرف کیا گیا جس کی بہترین مثال وہ سڑکیں ہیں جو جرمنی میں نازیوں کے بعد تیار کی گئیں۔ ان سڑکوں کی تیاری پر ساڑھے تین ارب مارک خرچ کئے گئے۔ عمدہ سڑکیں بنانے سے دو مقاصد حاصل کئے جا سکتے تھے ایک تو

لوگوں میں موٹر رکھنے کا شوق بڑھا جس کی وجہ سے موٹروں کی صنعت کو ترقی ہوئی دوسری طرف سڑکوں کی تیاری میں بہت سے مزدور لگ گئے اور بیروزگاری میں کمی ہوئی رفاہ عامہ کے دوسرے کاموں پر بھی بہت زیادہ روپیہ خرچ کیا گیا۔ بعض خاص خاص حالات میں انکم ٹیکس کی شرح کم کر دی گئی تاکہ آجروں کو نئی مشین وغیرہ خریدنے اور اپنے کاروبار کو ترقی دینے کی ترغیب دلائی جائے شادی کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے ایک ایک ہزار مارک کے قرضے دیئے گئے جنکے ساتھ شرط یہ تھی کہ بیوی کسی قسم کی ملازمت یا مزدوری نہیں کر سکتی تھی۔ بہت سی عورتیں اس طرح سے روزگار حاصل کرنے کی مستحق نہیں سمجھی گئیں اور ان کی جگہ مرد مزدوروں نے لے لی۔ ان قرضوں پر کسی قسم کا سود نہیں لیا جاتا تھا اور ہر مہینہ ایک فیصد کے حساب سے قرضہ کی ادائیگی کرنی پڑتی تھی۔ قرضے دینے کا ایک اور فائدہ بھی ہوا۔ جن لوگوں نے قرضے حاصل کئے تھے انھوں نے اس رقم کو اپنی مختلف قسم کی ضروریات کی چیزوں مثلاً فرنیچر وغیرہ پر خرچ کیا جس کی وجہ سے مختلف قسم کی صنعتوں کو فروغ اور روزگار میں اضافہ ہوا۔ بیروزگاری میں کمی کرنے کے لئے ایک اور طریقہ بھی اختیار کیا گیا۔ قانوناً ہر نوجوان لڑکے اور لڑکی کے لئے مزدوری کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ ہر سال جو نوجوان پیدائش دولت کے مختلف شعبہ جات میں مزدوری کرنے کے لئے بلائے جاتے ہیں انھیں زر کی شکل میں اجرت ادا نہیں کی جاتی بلکہ صرف ان کی معمولی قسم کی ضروریات زندگی مہیا کر دی جاتی ہیں۔ ایسا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کم خرچ کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مزدوری دی جا سکے۔ بہت سے یہودی، اشتمالی اور اشتراکی مزدوروں کو بیروزگار مزدوروں کی تعداد سے خارج کر دیا گیا ہے اور یہ لوگ روزگار حاصل کرنے کے مستحق نہیں سمجھے جاتے۔

مندرجہ بالا طریقوں سے ایک طرف تو روزگار میں اضافہ کرنے یا پھر مزدوروں کی مانگ بڑھانے اور دوسری طرف مزدوروں کی رسد میں کمی کرنے کی کوشش کی گئی اور ایک حد تک بیکار مزدوروں کی تعداد میں کمی ضرور ہوئی لیکن اصل میں بیروزگاری کا مسئلہ اس وقت حل ہوا جبکہ نازی جماعت نے جرمنی میں اپنی حیثیت مستحکم کر لی اور ۱۹۳۵ء میں انجمن اقوام کو چھوڑ کر جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ ہٹلر نے لوگوں کو روزگار دیا اور انھوں نے اس کے لئے جہاز، ہوائی جہاز، دبابے، توپیں اور آبدوز تیار کئے، جنگی تیاریوں نے بے روزگاری کے خطرہ کو دور کیا۔ اس کے علاوہ جنگی تیاریوں کی وجہ سے ایک اہم سیاسی مقصد بھی حاصل ہوا۔ شروع شروع میں جرمن فوج اور نازی پارٹی میں کوئی خاص اتحاد نہیں تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ایک حد تک اختلافات پائے جاتے تھے۔ اب جبکہ نئی پالیسی اختیار کی گئی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جرمن سیاست میں فوج کی اہمیت کو مان لیا گیا۔ بہت جلد دونوں جماعتوں کے اختلافات دور ہو گئے اور فوجی قائدین اور نازی جماعت میں اتحاد قائم ہو گیا۔

آخر میں مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ بے روزگاری کے مسئلہ کو حل کرنے میں نازی جماعت کامیاب ضرور ہوئی ہے۔ مزدوروں کو روزگار مل گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں بہت سی قربانیاں کرنی پڑ رہی ہیں۔ ان کی سبھاؤں اور سیاسی تحریک کو ختم کر دیا گیا ہے اور مزدور طبقہ نازی تحریک کا ایک اہم جزو بن کر رہ گیا ہے پچھلی صدی اور موجودہ صدی میں انھوں نے اپنی جدوجہد کے ذریعہ جو کچھ مراعات اور سیاسی اور معاشی آزادی حاصل کی تھی اس کو وہ جرمنی کے نئے نظام میں بالکل کھو چکے ہیں۔ ان کا معیار زندگی پہلے کے مقابلہ میں بہت پست ہو گیا ہے۔ بیروزگاری کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے معاشی نظام پر سخت قسم کی قیود عائد کی گئی ہیں۔ معاشی

زندگی کے ہر پہلو (قیمتوں، منافع، اجرتیں، اوقاتِ کار، صرف دولت، زر اور مبادلاتِ خارجہ) پر قابو پالیا گیا ہے۔ قومی معیشت کو معیشت جنگ میں تبدیل کرکے بیکار مزدوروں کو کام پر لگایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جنگی تیاریاں صرف اسی وقت تک قائم رہیں گی جب تک جنگ جاری ہے۔ جنگ کے خاتمہ پر نئے مسائل پیدا ہوں گے اور معاشی نظام میں جو کچھ بے ترتیبیاں نمودار ہوگئی ہیں انہیں دور کرنا پڑے گا۔ بہت سے مزدور جو اس وقت جنگی صنعتوں میں کام کر رہے ہیں یہ بیکار ہو جائیں گے۔ لاکھوں آدمی جو اس وقت جنگی خدمات انجام دے رہے ہیں جنگ کے خاتمہ پر معمولی کاروبار میں روزگار تلاش کریں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ بیکار مزدوروں کی ایک بڑی فوج تیار ہو جائے گی جسے کام پر لگانا کوئی آسان کام نہ ہوگا۔ بیروزگاری کے مسئلہ کو نازی معیشت میں صرف موقتی طور پر حل کیا گیا ہے اور کسی طرح سے بھی یہ نازی جماعت کا بہت بڑا کارنامہ نہیں سمجھا جا سکتا۔

مزدور تحریک اور نازی جماعت کسی جماعت میں مزدوروں کی حالت اور اس بات کو دیکھکر کہ انہیں کس قسم کی سیاسی آزادی حاصل ہے اس جماعت کی خوشحالی اور معاشی بہبودی کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نازی عہد میں جرمن مزدوروں کی حیثیت میں غیر معمولی تبدیلی ہوئی ہے۔ سنہ ۱۹۳۳ء سے پہلے جرمنی میں مزدوروں کی جماعت دوسرے صنعتی ممالک کے مقابلہ میں بہت زیادہ منظم اور ترقی پسند تھی۔ مزدوروں نے اپنی جدوجہد سے بہت سے حقوق حاصل کرلئے تھے۔ صنعتی انقلاب کے ساتھ ساتھ مزدور طبقہ کی تحریک کی ابتداء سنہ ۱۸۶۸ء سے ہوئی۔ رفتہ رفتہ یہ تحریک ترقی کرتی گئی اور مزدور سبھاؤں کا اقتدار بڑھتا گیا۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں اُن کے اراکین کی تعداد ۹۰ لاکھ تک پہونچ گئی تھی۔ بعد میں معاشی حالات خراب ہونے کی وجہ سے مزدور سبھاؤں کے اراکین کی

تعداد کم ہونا شروع ہوئی پھر بھی ۱۹۲۹ء میں اُن کے اراکین ۶۰ لاکھ تھے۔ مزدور طبقہ نے اپنی آواز حکومت تک پہونچانے اور اس پر قبضہ کرنے کے لئے اپنی سیاسی پارٹی بھی علیحدہ قائم کی۔ یہ پارٹی ۱۹۱۲ء کے عام انتخاب میں کل ووٹوں کے ایک تہائی ووٹ حاصل کر چکی تھی۔ جنگ عظیم کے خاتمہ پر جب جرمنی میں جمہوریت قائم ہوئی تو مزدور طبقہ نے اپنے اقتدار میں اور زیادہ اضافہ کیا اور بہت سی مراعات حاصل کیں

نازی جماعت کے اقتدار میں آنے کے بعد سے مزدور تحریک کے بُرے دن شروع ہوئے۔ نازیوں کے سیاسی فلسفہ کے مطابق ان کی پارٹی کے علاوہ ملک میں کوئی دوسری پارٹی قائم نہیں رہنا چاہیئے تھی۔ اُنھوں نے اپنے اِس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے یکم مئی ۱۹۳۳ء کو مزدور سبھاؤں کو خلاف قانون قرار دیدیا۔ ان کی عمارتیں اور دوسری اِملاک ضبط کر لی گئیں۔ مزدور سبھاؤں کے سب قائدین گرفتار کر لئے گئے ان کی سیاسی تحریک کو بھی ختم کیا گیا۔ کوئی نئی مزدور سبھا یا سیاسی پارٹی بنانے کی بالکل منادی کر دی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مزدور تحریک کا پوری طرح سے خاتمہ ہو گیا۔ اور یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اس کے بعد جرمنی میں مزدور طبقہ کی کوئی تنظیم (جن معنوں میں دوسرے صنعتی ممالک میں سمجھی جاتی ہے) باقی نہیں رہی۔

صرف مزدور تحریک کو ختم کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ وقتاً فوقتاً بہت سے ایسے قوانین پاس کئے گئے جن کی رو سے مزدور جماعت کی ہر قسم کی آزادی سلب کر لی گئی۔ ۱۹۳۵ء میں ایک قانون پاس ہوا جس کے تحت ہر نوجوان لڑکے اور لڑکی سے چھ مہینے کے لئے جبری خدمت لی جاتی ہے۔ اُن کی اُجرتیں زر کی شکل میں ادا نہیں کی جاتیں بلکہ ضروریات زندگی مہیا کر دی جاتی ہیں۔ ۱۸ اور ۲۵ سال کی عمر کے درمیان اس خدمت کے لئے بلایا جاتا ہے۔ اِس سلسلہ میں

ہر سال تقریباً ۲ لاکھ لڑکوں اور ایک لاکھ لڑکیوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک دوسرے قانون نے حکومت کو یہ حق دیا کہ وہ ایک ایسے علاقہ میں جہاں بیروزگاری زیادہ ہو دوسرے علاقوں کے مزدوروں کو کام کرنے سے روک سکتی تھی۔ اس طرح کے ایک اور قانون نے زرعی مزدوروں کو سرکاری عہدہ داروں کی اجازت کے بغیر اپنا پیشہ یا علاقہ چھوڑنے کی منادی کر دی جو زرعی مزدور دوسری صنعتوں میں کام کر رہے تھے اور انہیں اپنا پرانا پیشہ چھوڑے ہوئے تین سال سے زیادہ نہیں ہوئے۔ اس قانون کے تحت مجبور کئے جا سکتے تھے کہ وہ زراعت کو پھر اپنا پیشہ بنائیں۔ یہ حالات قرون وسطیٰ کے حالات سے بھی کہیں بدتر ہیں۔ قرون وسطیٰ میں کسانوں کو جن کے پاس تھوڑی بہت اپنی زمین ہوتی تھی زمین کو چھوڑ کر کسی دوسرے علاقہ میں منتقل ہونے کی منادی تھی۔ بیسویں صدی میں جرمنی میں زرعی مزدوروں کو نہ صرف زمین سے باندھ دیا گیا ہے بلکہ زرعی پیشہ جسے وہ چھوڑ چکے تھے پھر سے اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا۔ جون ۱۹۳۸ء میں ایک اور قانون پاس کیا گیا جس کی رو سے ہر شخص کو حکومت مجبور کر سکتی ہے کہ وہ اپنا پیشہ اور گھربار چھوڑ کر کسی دوسرے پیشہ یا علاقہ میں کوئی اہم قومی خدمت انجام دے۔ اسی قسم کے بعض دوسرے قوانین نے مزدور طبقہ کو بہت سی بندشوں میں جکڑ دیا ہے اور وہ روزگار پانے کا پورا پورا فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔

مزدور سبھاؤں کو ختم کرنے کے بعد نازیوں نے مزدور تحریک کو نئے سرے سے منظم کیا۔ نئی تحریک کا نام "جرمن مزدوروں کا محاذ" German Labourfronts رکھا گیا۔ جرمنی میں صرف یہی ایک ایسی تنظیم ہے جس میں مزدوروں کو شرکت کی اجازت دی جاتی ہے۔ لیکن حقیقی معنوں میں اسے مزدور طبقہ کی تنظیم نہیں کہا جا سکتا۔ مزدوروں کا محاذ ایک بہت بڑا ادارہ ہے جس میں مزدور اور آجر دونوں

شریک ہیں۔ اِس ادارے پر پوری طرح سے نازی جماعت حاوی ہے ہر مزدور کے لئے اس تحریک کا رکن بنا قانوناً لازمی قرار نہیں دیا گیا ہے لیکن تقریباً سب جرمن مزدور اس میں شامل ہیں۔ اِس کا سرمایہ جبری طور پر اراکین سے حاصل کیا جاتا ہے اس طرح سے مزدوروں کے محاذ کو مختلف قسم کے محاصل وصول کرنے کا ایک اہم ذریعہ بنایا گیا ہے۔ ایک نئی تحریک کے شروع کرنے کا مقصد یہ تھا کہ مزدور جماعت اپنی علیحدہ تنظیم نہ کر سکے اور نازی جماعت کا ایک جزو بن جائے۔

مزدوروں کا محاذ تین اہم کام انجام دیتا ہے۔ پیشہ وری تعلیم کی نگرانی کرنا۔ مزدوروں کی بہبودی کے لئے مختلف کام انجام دینا اور ان کے لئے تفریح کے مختلف ذرائع فراہم کرنا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نئی تحریک نے مزدوروں کے لئے بہت سے کام انجام دئے ہیں۔ لیکن جو مراعات و حقوق وہ اپنی نئی تحریک کے ذریعہ سے اَب حاصل کر رہے ہیں نازیوں سے پہلے کے معاشی نظام میں اپنی سبھاؤں کے ذریعہ سے حاصل کر چکے تھے۔

مزدوروں کا محاذ وہ تمام کام جو آزاد سرمایہ داری کے نظام میں اپنے اراکین کے لئے مزدور سبھائیں کرتی ہیں انجام نہیں دے سکتا۔ اجرتوں اور اوقاتِ کار پر اسے کسی قسم کا اقتدار حاصل نہیں ہے۔ اِن معاملات میں وہ کسی قسم کی مداخلت نہیں کر سکتا اِن مسائل کو طے کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے عہدہ دار (Labur Trusters) کہا جاتا ہے مقرر کئے جاتے ہیں۔ مزدوروں کو ہڑتال کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اِس طرح سے اُنھوں نے اپنے مطالبات منوانے کا سب بڑا حربہ بھی کھو دیا ہے۔

حکومت کا منافع، اجرتوں اور قیمتوں پر قابو

اشتمالی نقادوں کا خیال ہے کہ نازیت نے بڑے بڑے کاروبار کرنے والوں کے

مفاد کی حفاظت کی اور مزدوروں کی قوت کو توڑا یہ کہنا ایک حد تک ضرور صحیح ہے کہ ہٹلر کی کامیابی میں سرمایہ داروں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ان کی مالی امداد کی وجہ سے ہٹلر جرمنی کی حکومت حاصل کر سکا تھا اور انہیں کے معاشی مفاد کی خاطر مزدوروں کی سیاسی جماعتوں اور سبھاؤں کا خاتمہ کیا گیا۔ لیکن اِس تشریح میں اِس بات کا خیال نہیں رکھا جاتا کہ بڑے بڑے کاروبار کو بھی نازیت اپنے مفاد کی خاطر اسی طرح سے قابو میں رکھتی ہے جس طرح سے مزدور جماعت کو۔ جرمن صنعتوں کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہیں ہے اُن کے منافعوں پر اس قسم کی نگرانی قائم ہے جس طرح کی مزدوروں کی اُجرتوں پر۔ سرمایہ داروں کو بھاری قسم کے محاصل ادا کرنے پڑتے ہیں۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں کو اب مزدور جماعت کی طرف سے تو کسی قسم کا خطرہ باقی نہیں رہا ہے لیکن وہ نازی پارٹی کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ان سے نازی یہ کہتے ہیں کہ تھوڑے دنوں تک انہیں تکالیف اُٹھانی پڑیں گی۔ جب نازی جماعت تمام یورپ پر اپنا تسلط قائم کرے گی تو پھر جرمن مصنوعات کے لئے بازار بہت زیادہ وسیع ہو جائے گا اور وہ خوب منافع کما سکیں گے۔

سرمایہ داروں کے منافع کے علاوہ مزدوروں کی اُجرتوں اور قیمتوں پر بھی نازیوں نے سخت قسم کی نگرانی قائم کر رکھی ہے۔ انھوں نے اقتدار پاتے ہی توسیع اعتبار کی پالیسی اختیار کی تاکہ بیروزگاری دور کی جا سکے لیکن انہیں ہر وقت اِس بات کا خطرہ لگا رہتا تھا کہ کہیں ۲۳-۱۹۲۲ء کے حالات یعنی ملک میں افراط زر کے اثرات پیدا نہ ہو جائیں اِس لئے اُنھوں نے شروع ہی سے قیمتوں کو استحکام دینے کی پالیسی پر عمل کیا۔ قیمتوں کو استحکام کے ساتھ ساتھ اُجرتوں کا استحکام بھی لازمی تھا وقتاً فوقتاً حکومت کی طرف سے قوانین نافذ ہوئے جن کا مقصد قیمتوں کو بڑھنے سے روکنا تھا جیسا کہ آج کل مختلف ممالک میں ہو رہا ہے جب سے جنگ چھڑی ہے

رسد بندی (Rationing) کا طریقہ عام طور پر اختیار کیا گیا ہے اس طریقہ کو اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنی ضروریات کی بہت تھوڑی مقدار میں حاصل کر سکتے ہیں اور اشیاء اور خدمات کی قیمتیں بہت زیادہ نہیں بڑھنے پاتیں اور معاشرہ افراط زر کے بڑے اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔

مبادلات خارجہ اور تجارت خارجہ پر حکومت کی نگرانی۔

نازی جماعت سے پہلے جرمنی کی مالیاتی حالت بہت زیادہ خراب تھی جن بیرونی اداروں اور دوسرے ملکوں کے افراد نے اپنا سرمایہ جرمن صنعتوں اور بلدیات کی تمسکات وغیرہ میں لگا رکھا تھا انھوں نے ۱۹۳۱ء کے مالیاتی ہیجان شروع ہونے سے پہلے اپنے سرمایہ کو واپس لینا شروع کر دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جرمنی کے مرکزی بنک (Reoihsbank) کے سونے کا ذخیرہ صرف ایک ارب مارک سے کچھ زیادہ رہ گیا تھا۔ یہ صورت قوم کی ساکھ کے لئے بہت زیادہ خطرناک تھی۔ سونے کے ذخیرہ کی حفاظت کی غرض سے حکومت بندش تبادلہ (Ex change Control) قائم کرنے پر مجبور ہوئی۔ بندش تبادلہ کی صورت میں حکومت مبادلات خارجہ کے بازار پر اپنی نگرانی رکھتی ہے اور کسی شخص کو اس بات کی اجازت نہیں ہوتی کہ جتنی مقدار میں چاہے بیرونی زر حاصل کر سکے۔ باہر والے اپنا سرمایہ بھی واپس نہیں لے سکتے اور نہ ہی اس ملک کے افراد اور ادارے اپنا سرمایہ دوسرے ممالک کو منتقل کر سکتے ہیں۔ مرکزی بنک کے ذریعہ سے مبادلات خارجہ کے معاملات طے پاتے ہیں۔

نازیوں سے پہلے جرمنی میں بندش تبادلہ بحرانی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے قائم کیا گیا تھا ایسا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے ممالک والے اپنا سرمایہ جرمنی سے واپس نہ لے سکیں۔ نازی جماعت نے اس ذریعہ کو سیاسی مقاصد حاصل کرنیکا

ایک اہم آلہ کار بنالیا ہے۔ اب جرمن حکومت (Recihsbank) رائش بنک کے ذریعہ سے پوری تجارت خارجہ کو اپنے قابو میں رکھتی ہے۔ کوئی جرمن تاجر بغیر خاص قسم کا اجازت نامہ حاصل کئے بیرونی ممالک کے مال کی درآمد نہیں کرسکتا۔ حکومت ایسی خام اشیاء جو جنگی تیاریوں کے لئے ضروری ہوں اور دوسری ضروری اشیاء کی درآمد کو ترجیح دیتی ہے اور انھیں کے لئے اجازت نامے پہلے جاری کئے جاتے ہیں تعیشات کی چیزوں کے لئے اجازت نامے بالکل نہیں دیئے جاتے۔ اجازت نامے جاری کرتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ کن ملکوں سے تجارتی تعلقات قائم کرنا جنگی اور سیاسی نقطہ نظر سے زیادہ بہتر ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ بندش تبادلہ کے ذریعہ کو اختیار کرکے حکومت تجارت خارجہ کے ہر پہلو پر قابض ہے۔

نازی جماعت اور نوآبادیات کا مسئلہ

موجودہ جنگ سے پہلے نازی جماعت کی طرف سے برابر اس بات کا دعویٰ کیا جاتا تھا کہ جرمنی کی آبادی بہت زیادہ ہے اور اس کے لئے ملک کا رقبہ ناکافی ہے۔ دوسری قوموں کے پاس نوآبادیات ہیں جہاں وہ اپنی زائد آبادی کو منتقل کرسکتے ہیں۔ یا پھر اپنی آبادی کے لئے اشیاء خوراک اور صنعتوں کے لئے خام اشیاء حاصل کرسکتی ہیں۔ انگلستان اور فرانس کے علاوہ ہالینڈ اور بلجیم جیسی چھوٹی قوموں کے قبضہ میں دنیا کے بڑے بڑے رقبہ ہیں جہاں سے وہ اپنی ضروریات کی مختلف چیزیں حاصل کرتی ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں جاپان نے منچوریا پر قبضہ کیا اور ۱۹۳۶ء میں اٹلی نے حبشہ کو فتح کیا۔ اس طرح سے ان دونوں قوموں کو بھی زرخیز رقبے مل گئے۔ صرف جرمنی ایک ایسی بڑی قوم باقی رہ گئی تھی جو نوآبادیات سے محروم تھی۔ اس لئے اس کی سابق نوآبادیات واپس ملنی چاہئیں۔

لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو جرمنی کا یہ کہنا کہ اس کی آبادی بہت زیادہ ہے

صحیح نہیں کیونکہ خود حکومت کی پالیسی یہ رہی ہے کہ آبادی کو جس طرح سے بھی ہو سکے بڑھایا جائے۔ اُوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ شادی کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے قرضے دیئے جاتے ہیں۔ ہر بچہ پیدا ہونے پر قرضے کا ایک چوتھائی حصہ معاف کر دیا جاتا ہے۔ ایسے خاندانوں کو جن میں بچوں کی تعداد زیادہ ہو خاص قسم کی مراعات حاصل ہوتی ہیں۔ مختلف طریقوں سے غیر شادی شدہ اشخاص کو ترغیب دلائی جاتی ہے کہ وہ جلد سے جلد شادی کریں۔ جو لوگ شادی نہ کریں انھیں بھاری محصول ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ سنہ ۳۷ء کے بعد سے زراعت اور صنعت کے ہر شعبہ میں مزدوروں کی کمی محسوس کی جا رہی ہے اس کمی کو دور کرنے کے لئے دوسرے ملکوں کے مزدوروں سے کام لیا جا رہا ہے اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ زائد آبادی کو منتقل کرنے کے لئے نوآبادیات کا مطالبہ کرنا کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اِس کے علاوہ یہ بات بھی ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ سابق جرمنی نوآبادیات کی آب وہوا کسی طرح سے بھی یورپی اقوام کے لئے موزوں نہیں ہے۔ جنگ عظیم سے پہلے بھی بہت کم جرمن اِن علاقوں میں آکر بسے تھے۔

خام اشیاء اور اشیاء خوراک حاصل کرنے کی دلیل پھر بھی باقی رہ جاتی ہے۔ اشیاء خوراک کے معاملے میں جرمنی دوسرے ممالک کے مقابلہ میں بہت زیادہ خود مکتفی ہے۔ جرمن قوم اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے اشیاء خوراک کا ۸۳ فیصد اپنے ملک کی پیداوار سے حاصل کرتی ہے۔ یورپ میں بہت سے ایسے ممالک ہیں جو اس سے بہت کم اپنے یہاں پیدا کرتے ہیں اور ان ممالک کے پاس نوآبادیات بالکل نہیں ہیں۔ ناروے اپنی ضروریات کا صرف ۴۳ فیصد اپنے یہاں پیدا کرتا ہے۔ سوئٹزرلینڈ ۴۷ فیصد۔ اِن ممالک کو دوسرے ملکوں سے اشیاء

خوراک حاصل کرنے میں کسی قسم کی دِقت پیش نہیں آتی ۔ خام اشیاء کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ جرمنی اپنی پرانی نوآبادیات سے کچھ بہت زیادہ مستفید نہیں ہو سکتا اگر جبری خدمت کے اصول پر کام کیا جائے تو خام اشیاء کی مقداروں میں تھوڑا بہت اِضافہ ضرور کیا جا سکے گا لیکن یہ مقداریں جرمن ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بالکل ناکافی ہونگیں ۔

نازیت کی معاشی پالیسی کے اہم اجزاء کی تشریح سے اہم نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ اس پالیسی کا مرکزی خیال یہ ہے کہ قومی معیشت کے ہر پہلو پر حکومت کی نگرانی قائم ہو ایسا اِس لئے کیا گیا کہ نازی جرمنی اور یورپ میں اپنا اِقتدار قائم کرنے کے لئے قومی معیشت کو آلہ کار بنا سکیں ۔ اُنہیں اِس بات کا پہلے سے یقین تھا کہ قوت حاصل کرنے کے لئے یورپ میں ایک نہ ایک روز بہت بڑی جنگ کرنی پڑے گی ۔ اس لئے موجودہ جنگ کے لئے اُنھوں نے اقتدار پاتے ہی تیاریاں شروع کر دی تھیں اور ان تمام ذرائع پر جنھیں حکومتیں مجبوراً جنگ کے دَوران میں اِختیار کرتی ہیں پہلے سے عمل شروع کر دیا تھا ۔ قیمتوں، منافع، اُجرتوں اَوقاتِ کار، تجارت خارجہ اور مبادلات خارجہ پر نگرانی اِسی غرض سے قائم کی گئی مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ نازیوں نے اَمن کی معیشت کو جنگ کی معیشت میں تبدیل کرنے کی کوشش ۱۹۳۳ء ہی سے شروع کر دی تھی ۔

رفتارِ عالم

یورپ افریقہ

رُوس کی لڑائی روز بروز تیز اور غضبناک ہوتی جارہی ہے راسٹو پر قبضہ ہوجانے سے جرمن فوجوں کے لئے قفقاز کا دروازہ کھُل گیا۔ چنانچہ پچھلے دو ہفتوں کی خبروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جرمن فوجوں کا اقدام شمالی قفقاز میں شروع ہوگیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ روسی بڑی بے جگری سے مقابلہ کر رہے ہیں اور دادِ شجاعت دے رہے ہیں۔ اسٹالن گراڈ کے قریب ان کی فوجوں نے جرمنوں کو پے در پے پسپا کیا ہے۔ اب صورت حال یہ معلوم ہوتی ہے کہ شمالی قفقاز پر قبضہ ہوجانے سے روسیوں کے تیل کے چشمے چھن جائیں گے جن کے بغیر روسی جنگی صنعت کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ لیکن اس کا امکان موجود ہے کہ انگریز اور امریکی ذرائع سے پٹرول کی اس کمی کو پورا کیا جاسکے۔ بہرحال قفقاز کی مہم اب شروع ہوچکی ہے۔ لینن گراڈ اور ماسکو کے محاذوں پر پچھلے دنوں خاموشی رہی۔ کبھی کبھی روسیوں کی طرف سے حملے کئے گئے تاکہ جرمنوں کی توجہ قفقاز کی طرف سے کچھ ہٹ جائے لیکن اس میں معلوم ہوتا ہے زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ جرمنوں کی توجہ ہٹانے کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ وسیع پیمانہ پر انگریز اور امریکہ دوسرا محاذ قایم کردیں۔ اس طرح جرمنوں کو دو طرف الجھنا پڑے گا اور ان کی قوت تقسیم ہوجائے گی۔

مصر کے مورچہ پر انگریزی فوجوں نے رومل کے بڑھتے ہوئے لشکروں کو

روک لیا ہے اور یقین ہے کہ اب وہ انھیں آگے نہیں بڑھنے دیں گی۔ محوری دول کا مصر پر یہ تیسرا حملہ ہے۔ پہلا حملہ اطالوی فوجوں نے کیا تھا جبکہ وہ سدی برانی تک بڑھ آئی تھیں۔ دوسرا حملہ جرمن قیادت میں اطالوی اور جرمن فوجوں نے مل کر کیا تھا اور محوری افواج سولم تک پہونچ گئی تھیں۔ لیکن دونوں مرتبہ انگریزی فوجوں نے محوری لشکروں کو مصر سے باہر نکال کر لیبیا کے اچھے خاصے علاقے پر قبضہ و تصرف حاصل کر لیا تھا۔ اب یہ محوری دول کا تیسرا حملہ ہے۔ جنرل آکن لک نے بڑی قابلیت اور ہمت سے العالمین پر جو اسکندریہ سے ۷۰ میل ہے رومل کو روک لیا ہے۔ اُمید بندھتی ہے کہ جنرل موصوف حسب سابق اس دفعہ پھر محوری فوجوں کو پسپا کر کے انھیں لیبیا میں ڈھکیل دیں گے۔ مصر کی لڑائی برطانوی اقتدار کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مصر میں اگر خدانخواستہ اتحادیوں کو شکست ہو گئی تو مصر کا سیاسی مستقبل بالکل تاریک ہو جائے گا۔ ہماری رائے میں برطانوی حکومت کو چاہیئے کہ وہ اس وقت اعلان کر دے کہ ۱۹۳۶ء کے معاہدہ کی رو سے مصر نے جو شرائط منظور کر لی تھیں انھیں ختم کر دیا جائے گا اس کا بہت اچھا اخلاقی اثر مترتب ہو گا اور مصری قوم کی عملی امداد حاصل ہو جائیگی جو اب تک اتحادیوں کو بدقسمتی سے حاصل نہیں ہے۔ نحاس پاشا نے اپنے اعلان میں صراحت کی ہے کہ مصر حسب سابق غیر جانبدار رہے گا۔ لیکن ایسے نازک موقع پر جبکہ ان کے ملک کی موت و زیست کا سوال درپیش ہے اور ان کی سرزمین پر جنگ ہو رہی ہے ضرورت اس کی ہے کہ اہل مصر اتحادیوں کے ساتھ عملی تعاون کا ثبوت دیں کہ مستقبل میں یہی ان کے ملک کے حقوق کی ضمانت ہو گی۔

مشرق بعید مشرق بعید میں جاپان نے برما کی فتح کے بعد اپنے جنگی وسائل کا رُخ چین کی طرف پھیر دیا ہے۔ چین کی جنگ کا اب چھٹا سال

شروع ہوگیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اہل چین نے جس جرات، استقلال اور حوصلہ مندی کا ثبوت دیا ہے وہ مشرق کی دوسری قوموں کے لئے ایک مثال ہے۔ دولت و صنعت میں، جن کے بغیر موجودہ زمانہ میں جنگ کرنا بہت دشوار ہے، چین کا جاپان سے کوئی مقابلہ نہیں۔ لیکن پھر بھی چینی سپاہ جس جانبازی سے جاپانی غاصبوں کا مقابلہ کر رہی ہے اس کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ حق اور انصاف میں باوجود بے چارگی کے بے پناہ قوت موجود ہے۔ اس وقت چین کے کمک و رَسد کے بیشتر راستوں پر بھی جاپانی قابض ہو چکے ہیں۔ لیکن تبت اور روس کے راستے ابھی کھلے ہوئے ہیں جدھر سے اتحادی زیادہ سے زیادہ مدد بھیج سکتے ہیں۔ چین کی جنگ آزادی کی اہمیت ہندوستان کے لئے بھی کچھ کم نہیں۔ اگر چین کی طرف جاپان کو یکسوئی حاصل ہوگئی اور وہ اس وسیع ملک کے وسائل کو اطمینان سے اپنے تصرف میں لے آیا تو ہندوستان کے لئے یہ امر سخت تشویش کا موجب ہوگا۔

ہندوستان کانگریس کی مجلس عاملہ کی قرارداد جس میں انگریزوں کو ہندوستان سے دستبردار ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں بھی منظور ہوگئی۔ چونکہ اس قرارداد کے ضمن میں کانگریس کے پیش نظر سارے ملک میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنا تھا اس لئے حکومت نے کانگریس کے صدر اور مجلس عاملہ کے سب ارکان کو گرفتار کر لیا۔

کانگریس کی مجلس عاملہ کی تحریک کے متعلق ہمارا یہ خیال تھا کہ پیشتر اس کے کہ ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں میں اتحاد و اتفاق قائم ہو سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنا سخت خلفشار کا موجب ہوگا۔ دوران جنگ تک کے لئے ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں میں مفاہمت ہو جانا کچھ زیادہ دشوار نہ تھا خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ مسٹر جناح اس کے لئے آمادہ تھے جیسا کہ انھوں نے مختلف

موقعوں پر اظہار کیا ہے۔ لیکن اب گاندھی جی اور اُن کے رفقائے کار کی گرفتاری سے بالکل نئی سیاسی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ جس کے نتائج کا اس وقت جائزہ لینا قبل از وقت ہوگا۔ اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کے ذمہ دار قائدین کا یہ فرض ہے کہ ملک میں امن وامان کے قیام کی پوری کوشش کرتے رہیں ورنہ اگر ملک میں بدامنی اور خلفشار پیدا ہوا تو اس سے خود اہل ملک کو نقصان ہوگا۔ اور محوری دول اس سے پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں گی۔ بہرنوع یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہندوستان کا مسئلہ دنیا کے مسائل سے الگ تھلگ کوئی چیز نہیں۔ اس کی قسمت کا فیصلہ اس عالمگیر جنگ کے فیصلہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس میں مطلق شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ اہل ہند کی ہمدردی اتحادیوں کے ساتھ اور محوری دول کے خلاف ہے جن سے کوئی کمزور قوم عدل وانصاف کی توقع نہیں رکھ سکتی۔ جاپان سے جس کے ہاتھ اہل چین کے خون سے رنگے ہوئے ہیں اہل ہند کو کوئی اُمید نہیں رکھنی چاہیے۔

دوسرے رسائل

The Indian journal of Economics بابتہ اپریل ۱۹۴۲ء

معاشی کانفرنس کے پچیسویں سالانہ اجلاس میں ڈاکٹر نیوگی پروفیسر معاشیات جامعہ کلکتہ نے خطبہ صدارت پڑھا۔ یہاں اس خطبہ کا خلاصہ پیش کرنے پر اکتفا کیا جائے گا۔

پروفیسر نیوگی نے ہندوستانی جامعات میں معاشیات کی تعلیم پر اپنے بعض خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ہندوستان میں باقاعدہ طور پر معاشیات کی تعلیم کی ابتداء بیسویں صدی کے شروع سے ہوئی۔ لیکن پچھلے چند سالوں سے اس نے ایک جدا اور اہم مضمون کی حیثیت اختیار کی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ معاشیات کی تعلیم نے جو کچھ ترقی کی ہے اس کا جائزہ لیا جائے اور اس میں جو کچھ خامیاں پائی جاتی ہیں اُن کو دُور کرنے کی کوشش کی جائے۔ معاشیات کے نصاب کی یہہ خصوصیت ہونی چاہیئے کہ اس کے ذریعہ سے طالب علموں میں تنقیدی نظر، واقعات کی چھان بین ان کو جمع کرنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے کی قابلیت پیدا کی جاسکے۔ ہمارے نظام تعلیم کا بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں بہت سی معلومات حاصل کرنے پر زور دیا جاتا ہے اس کے ذریعہ سے دماغی تربیت کی طرف بالکل توجہ نہیں کی جاتی۔ یہی حال معاشیات کے نصاب کا بھی ہے ہندوستانی مسائل کی بہت سی تفصیلات طالب علموں کو بتلائی جاتی ہیں لیکن نظری معاشیات

کے متعلق اُن کی معلومات بہت ہی معمولی ہوتی ہیں۔ کم سے کم بعد طیلسانی نصاب میں نظری معاشیات اور معاشیات عملی میں ایک خاص توازن قائم ہونا چاہیئے۔ اس معیار پر پہونچنے کے بعد طالب علموں کو نظری معاشیات کا عمیق مطالعہ کرنا چاہیئے یہ خیال کہ نظری معاشیات کا مطالعہ حقیقی زندگی میں کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہوتا صحیح نہیں ہے۔ قابل صدر نے بعض مثالیں دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ معاشیات کے مضمون میں جو جدید نظریئے پیش کئے گئے ہیں ان سے ہم اپنے ملک کے معاشی مسائل کے حل کرنے میں بہت کافی مدد لے سکتے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان جدید نظریوں اور خیالات کو جو مختلف ممالک میں پچھلے بیس سال کے عرصے میں پیش کئے گئے ہیں اپنے نصاب میں شامل کریں تاکہ ان سے طالب علموں کی ذہنی تربیت میں مدد مل سکے۔

معاشیات کے نصاب میں دوسری خرابی یہ پائی جاتی ہے کہ اس میں شماریات (Statistiees) کی تعلیم کی طرف بالکل توجہ نہیں کی گئی ہے۔ معاشیات کے ہر طالب علم کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ شماریات کی مبادیات سے واقف ہو اس کے بغیر وہ بہت سے معاشی مسائل کا صحیح طرح سے مطالعہ نہیں کرسکتا۔ حکومت کی طرف سے مختلف مسائل کے متعلق بہت سے اعداد و شمار وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں اُن کو سمجھنے، کام میں لانے اور ان سے نتائج اخذ کرنے کے لئے شماریات کا جاننا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ دَور کے معاشیین کا یہ عام رجحان ہے کہ وہ مسائل کی تشریح میں ریاضی سے بہت زیادہ کام لیتے ہیں۔ ان کی تصانیف سے بھی پورا پورا فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے جبکہ اس علم سے اچھی خاصی واقفیت ہو۔

بعد طیلسانی نصاب میں نظری معاشیات اور شماریات کو اہمیت دیدینے سے

اچھے نتائج اسی وقت نکلیں گے جبکہ علمی معاشیں اور مختلف قسم کا کاروبار کرنے والوں میں خاص ربط قائم ہو تاکہ وہ ایک دوسرے کو اپنے علم اور تجربہ سے فائدہ پہونچا سکیں۔ اِن دونوں کا اتحادِ عمل ملک و قوم کے فائدہ کے لئے بہت ضروری ہے بعض مغربی ممالک خاص طور پر انگلستان میں اِس اتحادِ عمل کی اہمیت کو محسوس کرلیا گیا ہے اور اس کو قائم کرنے کی کوشش شروع کردی گئی ہے۔ اگر یہ دونوں گروہ ایک دوسرے سے جدا رہیں تو اُن کے اختلافات کی وجہ سے قومی مفاد کو بہت کچھ نقصان پہونچ سکتا ہے۔ اِنگلستان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کی تاریخ سے اِن اختلافات کی چند مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ہندوستان اِن ملکوں کے حالات سے فائدہ اُٹھاکر ان دونوں گروہوں میں تعلق قائم کرسکتا ہے۔ اب تک معاشی مسائل کے متعلق جو تحقیقاتی کام مختلف جامعات کی طرف سے ہوا ہے۔ وہ کافی نہیں ہے۔ ڈاکٹر نیوگی کی رائے ہے کہ مختلف کاروباری افراد اور اداروں کو چاہیئے کہ اپنی طرف سے تحقیقاتی اِدارے قائم کریں۔ یورپی اور امریکی ممالک میں اِس قسم کے بہت سے ادارے قائم ہوچکے ہیں اور یہ مفید کام انجام دے رہے ہیں۔

(ا۔ ح)

The Indian journal of Political Science بابتہ جولائی۔ ستمبر ۱۹۴۲ء

اِس اِشاعت میں تین مضمون خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پہلا مضمون "اخلاق، سیاسیات، اور میکیاولی" لکھنؤ یونیورسٹی کے مسٹر مینن کا ہے۔ اس میں موصوف نے بتایا ہے کہ میکیاولی کا نقطۂ نظر اخلاق کے خلاف نہیں ہے بلکہ غیر اخلاقی ہے لیکن یہ فرق منطقی طور پر چاہے صحیح ہو عملی طور پر اس کے نتائج میں بہت کم فرق رہتا ہے۔ اگر انسانی عمل کا محرک اخلاق نہیں تو اس کا قوی اِمکان ہے کہ وہ عمل صرف غیر اخلاقی نہیں رہے گا بلکہ زندگی میں فساد اور خلل کا موجب بن جائے گا۔

ہم موصوف کے اِس خیال سے بھی متفق نہیں ہیں کہ بیشتر سیاسی اعمال کوئی اَخلاقی نوعیت نہیں رکھتے۔ ہمارا تو خیال ہے کہ ہر انسانی عمل کو کسی نہ کسی معیاری کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے۔ ہمیں تعجب ہے کہ مضمون نگار صاحب نے یہ دعویٰ کیسے پیش کر دیا کہ صدر مملکت کی مدت عہدہ یا کابینہ کی ساخت ایسے مسائل ہیں جنھیں اخلاق سے کوئی واسطہ نہیں۔ (ص ۳) حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں مثالیں اِسبات کو واضح کرتی ہیں کہ ان کے تعین میں بھی اجتماعی مسائل کی بھلائی یا برائی کا تصور موجود رہتا ہے۔ دراصل سیاست کو اخلاق سے علیحدہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اخلاق اجتماعی مسائل کی جان ہے چاہے وہ مسائل سیاسی ہوں یا معاشری۔

دوسرا مضمون ”عمومی حکومتوں کے رجحان“ ڈاکٹر بول چند کا ہے۔ اِس میں بڑی خوبی سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ہر عہد اپنے سیاسی مسئلہ کو نئی شکل میں پیش کرتا ہے۔ چنانچہ بیسویں صدی کی عمومیت کو جن معاشری مسائل سے واسطہ پڑ رہا ہے اس کا شائبہ بھی ہمیں انیسویں صدی کی عمومیت میں نہیں دکھائی دیتا۔ سوشل لیجس لیشن کی وجہ سے پارلیمانی حکومت میں بعض نہایت اہم تبدیلیاں پیدا ہوگئی ہیں جس کی مثالیں اِنگلستان اور امریکہ میں نظر آتی ہیں۔ پھر پچھلی جنگ عظیم کے بعد سے مملکت نے منصوبہ بندی کی جو معاشی ذمہ داریاں اپنے سپرد کرلیں اس سے بھی حکومت کے کام میں بنیادی تبدیلی پیدا ہوگئی ہے۔ اور اس جنگ میں جو ہمہ گیر جنگ ہے مملکتوں کو بہت کچھ کرنا پڑ رہا ہے جس کے متعلق چند سال قبل کسی کو گمان بھی نہ تھا۔ پھر اِس کے علاوہ عمومی حکومت مفاہمت اور مصالحت کے اُصول پر مبنی تھی جو مختلف سیاسی جماعتوں میں معاشی نوعیت کے بنیادی اختلاف نہ ہونے کے باعث آسانی سے ممکن تھا۔ لیکن اَب مثلاً اس مسئلہ پر بنیادی اختلاف پیدا ہوگیا ہے کہ ٹکس کا کیا مقصد ہے؟ آیا ٹکس کا مقصد مملکت کے لئے آمدنی ہے

یا تقسیم دولت میں مساوات پیدا کرنا ہے۔ اِن بنیادی اختلافات کے باعث جو روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں پارٹی سسٹم خطرہ میں پڑگیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جبتک عمومی مملکتوں کے عاملانہ اقتدار میں بمقابلہ وضع قوانین کے اقتدار کے اضافہ نہو جائے اُسوقت تک مملکتی مشین کا چلنا دشوار ہے۔

تیسرا مضمون ڈاکٹر ای، اشیرو اتھم کا "ملی جلی کابینہ" ہے۔ اِس مضمون میں اس اصول کی حمایت کی گئی ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں انگریزی پارلیمانی نظام کے مطابق حکومت چلانا دشوار ہے۔ اس دشواری کا حل یہ ہے کہ صوبوں میں اور مرکز میں ملی جلی (کمپوزٹ) کابینہ قائم کی جائے جو سوئٹزرلینڈ کے دستور کے موافق ایک معینہ مدت کے لئے ہو تاکہ آئے دن اس میں تبدیلی کی نوبت نہ آنے پائے۔ اگر اس کو قبل از وقت ہٹانا ضروری ہی ہو تو ایوان زیرین کی ۲/۳ آرا اس کے لئے درکار ہوں۔ یہ کابینہ پوری مقننہ کی نمائندہ ہونی چاہیئے نہ کہ مختلف پارٹیوں کی۔ اس کی نوعیت ایک انتظامی کمیٹی سے زیادہ نہ ہو جسے مدت معینہ کے لئے اختیارات تفویض کئے گئے ہوں ہمارے خیال میں بھی ہندوستان کا سیاسی مسئلہ کمپوزٹ کابینہ کے بغیر حل نہیں ہو سکے گا۔ بہرحال اس کا تجربہ ضرور کرنا چاہیئے تاکہ اس کے نتائج کا جائزہ لینا ممکن ہو۔

تنقید و تبصرہ

The tiger Strikes یہ کتاب حکومت ہند کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ جنرل ویول نے اپنے مقدمہ میں انگلستان، آسٹریلیا اور ہندوستان کی فوجوں کے اُن کارناموں پر تبصرہ کیا ہے جن کا اظہار افریقہ میں اطالویوں کے خلاف ہوا۔ کتاب میں مختلف جنگوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ مثلاً سدی برانی، کرن، اگوردات، اسمارا، مساوا اور امبا الگی کی جنگیں۔ ان کے علاوہ شام کی مہم کا بھی تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ کتاب میں تصاویر اور نقشے بھی ہیں جن کے باعث کتاب کی افادیت اور دلچسپی میں اضافہ ہوگیا ہے۔

بحر الکاہل کی سیاست۔ (از جناب ابن خالدی صاحب۔ مکتبہ جامعہ دہلی قیمت ۸؍)

اس مقالہ میں چین کی معاشی اور سیاسی اہمیت ظاہر کی گئی ہے اور یہ تبلایا گیا ہے کہ کس طرح جاپان اور چین کے تعلقات نے موجودہ شکل اختیار کی۔ جاپان اس وقت سے چین پر اپنی بالادستی قائم کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے جس وقت سے اس کی صنعت وحرفت میں ترقی اور آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اپنے تیار کئے ہوئے مال کے لئے چین سے بہتر منڈی اسے اور کونسی مل سکتی تھی۔ پھر اس کو یہ بھی ناگوار تھا کہ چین کی اشیائے خام کی بیشتر حصہ یورپین اقوام کے حصہ میں آتا تھا۔ چنانچہ جاپان نے یہ نظریہ پیش کیا جو اس کے لئے مفید مطلب تھا کہ ایشیاء کے ممالک ایشیاء والوں کے لئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ جھوٹا اور بدنیتی پر

بنی ہے۔ اس کتاب میں برطانیہ، امریکہ اور روس کی حیثیت بحرالکاہل کی سیاست میں واضح کی گئی ہے۔ کتاب طلبہ اور عام پبلک کے لئے مفید ہے۔

نشریات (از جناب پروفیسر ہارون خاں صاحب شیروانی صدر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ قیمت عہ ۱۲/-

اس مجموعہ میں اٹھارہ تقریریں ہیں جو پروفیسر ہارون خان صاحب شیروانی نے وقتاً فوقتاً محکمہ لاسلکی حیدرآباد کی دعوت پر کی ہیں۔ ان میں سیاسی معاشری اور مذہبی ہر قسم کی تقریریں ہیں۔ مثلاً عربوں کا تمدن، چین، ترکی، ہندوستان کے موجودہ مسائل، عید میلاد، روزہ، تاریخی اور تعلیمی نظمیں وغیرہ۔ طرز بیان سادہ اور سلیس ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کی تدوین قانون اسلامی (از جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب استاذ قانون جامعہ عثمانیہ نمبر ۴ مجموعہ مقالات علمیہ حیدرآباد اکاڈمی قیمت ۸/

اس مقالہ میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے امام ابوحنیفہؒ کی قانون اسلامی کی تدوین کے متعلق داد تحقیق دی ہے۔ اسلامی نظام قانون کے بنیادی اصول تو قرآن شریف میں موجود ہیں لیکن ان کی تفصیل اسلامی فقہ کے مختلف مسلکوں میں ملتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے فقہ کے مسائل کو اس وقت مرتب کرنا شروع کیا جب ان کی نظر اس حدیث پر پڑی کہ "خدا علم کو یک بیک نہیں اٹھا لیتا بلکہ علماء کی موت کے ذریعہ اس کو چھین لیتا ہے۔ اور جاہل لوگ سردار بن جاتے ہیں جو ناسمجھی سے احکام دیتے ہیں"۔ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ اس حدیث سے بیحد متاثر ہوئے اور ایک مجلس تدوین فقہ قائم کی جس میں امام ابویوسف اور امام محمد شیبانی جیسے جید علما، فضیل بن عیاض اور داؤد بن نصیر جیسے عابد و زاہد اور وکیع جیسے ماہر تفسیر شریک تھے۔ قابل مضمون نگار نے اس مقالہ میں اس مختلف فیہ مسئلہ کو بھی چھیڑا ہے کہ آیا اسلامی فقہ پر کس حد تک بیرونی اثرات مترتب ہوئے۔ یہ سوال

نہایت اہم ہے اور ہماری خواہش ہے کہ مضمون نگار صاحب اس پر مستقل مقالہ تحریر فرمائیں اور اپنی تحقیقات سے دوسروں کو مستفید کریں۔ اس ضمن میں بعض مغربی مصنفوں کا خیال ہے کہ اسلامی فقہ پر قانون روما کا اثر پڑ رہا ہے۔ لیکن ان کی رائے ہمارے لئے قابل قبول نہیں اس واسطے کہ ان کے نزدیک اہل مشرق کوئی بڑا کام بغیر کسی کی مدد کے انجام ہی نہیں دے سکتے۔ دوسری طرف ہمارے قدامت پسند مولوی صاحبان ہیں جو کسی بیرونی اثر کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ مقالہ نگار صاحب کی رائے ہے کہ فقہ اسلامی کی توسیع و ارتقا میں متعدد بیرونی ماخذوں سے مدد لی گئی ہے۔ لیکن "قرآن و حدیث نے جن چیزوں کو حرام کر دیا اسے کسی بیرونی اثر نے جائز نہیں بنایا اور جو چیزیں واجب قرار دی گئی تھیں بیرونی اثرات کبھی ان کو مسلمانوں کے نزدیک ناجائز نہیں قرار دے سکے۔ صرف جن چیزوں سے قرآن و حدیث ساکت تھے ان کے متعلق معقول رواجات جو قرآن و حدیث کے الفاظ اور روح کے خلاف نہ تھے قبول کئے گئے یا جاری رہنے دیئے گئے" (ص ۳۴) ہمیں امید ہے کہ اس مسئلہ پر زیادہ تفصیل سے علیحدہ مقالہ میں بحث کی جائیگی جو نہایت ضروری علمی خدمت ہوگی۔

(کتابستان بمبئی۔ قیمت عہ)

جواہر العلوم یہ علامہ طنطاوی جوہری مصری کی کتاب کا ترجمہ ہے جو مولوی عبدالرحیم صاحب پروفیسر عربی، اسلامیہ کالج پشاور نے کیا ہے۔ اس کتاب میں مکالمہ کے انداز میں بعض آیات قرآنی کی تفسیر کی گئی ہے۔ علامہ طنطاوی مصر کے جدید علماء میں سے ہوئے ہیں جنھوں نے جدید سائنس کے مسائل کا حل بھی قرآن میں تلاش کر لیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن علوم کا خزانہ ہے لیکن بعض دفعہ سائنٹفک تفسیر میں بڑی کھینچ تان معلوم ہوتی ہے۔ لیکن باین ہمہ علامہ طنطاوی کی تصانیف کا معیار نہایت بلند ہے۔ اسلامی مدارس کے نصاب میں اگر ان تصانیف کو رکھا جائے تو مناسب ہے۔ کتاب کا

ترجمہ سلیس اور عام فہم ہے۔

شانِ خدا (مؤلفہ عبید الرحمٰن عاقل رحمانی۔ کتابستان۔ پوسٹ بکس ۳۱۶۴۔ بمبئی نمبر ۴۔ صفحات ۱۷۵)

اس رسالہ میں ذات واجب تعالیٰ کی ہستی کو عقلی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مغربی فلاسفہ کے اقوال اور مادہ پرستوں کے فلسفۂ حیات پر سخت تنقید کی گئی ہے اور ان کے اعتراضوں کا جواب دیا گیا ہے۔ مؤلف کا مقصد یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتوں میں جو الحاد اور بے دینی کے خیالات پیدا ہو رہے ہیں انھیں دور کیا جائے اور خدا کے وجود کو عقل سے منوایا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ مؤلف صاحب کو اس کا احساس ہے کہ یقین و ایمان عقلی چیز نہیں بلکہ وجدانی ہے۔ یہ رسالہ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ضرور پڑھنا چاہیئے۔

محمد رسول اللہ (مترجمہ مولوی عبید الرحمٰن صاحب عاقل رحمانی۔ کتابستان پوسٹ بکس نمبر ۳۱۶۴۔ بمبئی نمبر ۴۔ صفحات ۹۳ قیمت ۸/)

یہ کارلائل کی کتاب ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ کارلائل نے اس میں عیسائی پادریوں کے اعتراضوں کے جواب دینے کے علاوہ یہ بتایا ہے کہ آنحضرت کی ذات ستودہ صفات انسانیت کے لئے رحمت تھی۔ وہ آپ کا شمار دنیا کے ان بزرگ ہستیوں میں کرتا ہے جنھوں نے اقوام کی سیرت میں انقلاب پیدا کر دیئے۔ ترجمہ اچھا ہے۔



ازمنۂ وسطیٰ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی اور عمرانی زندگی کے چند پہلو

از

جناب ایم ہمنت راؤ صاحب ایم اے (عثمانیہ)

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام سے قبل کے دور کی نمایاں خصوصیت سیاسی وسماجی انتشار و پراگندگی ہے۔ گیارھویں اور بارھویں صدیوں کو دور لامرکزیت کہنا زیادہ مناسب ہے تمام ہندوستان کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ ہر ایک ریاست تقریباً آزاد و خود مختار تھی۔ مختلف مرکز گریز قوتیں ملک میں ہر طرف کام کر رہی تھیں جن سے ملک میں انتشار، طوائف الملوکی اور خانہ جنگی برپا تھی۔ راجا ہرش وردھن اور پلی کیشن کے بعد سے جس سیاسی زوال کی ابتدا ہوئی تھی وہ اب پایۂ تکمیل کو پہونچ چکا تھا۔

شمالی ہند کے بیشتر اور جنوبی ہند کے کچھ حصہ پر ایک نسل حکمران تھی جو راجپوت یا راج پتر کے نام سے موسوم تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ پرانوں کا عہد ختم ہو چکا تھا اور راجپوتوں کے مختلف خاندان مختلف علاقوں پر مسلط و حکمران تھے جن میں اجمیر و سامبر کے چوہان۔ میواڑ کے گہیل۔ دھار کے پرمار۔ بندھیل کھنڈ کے چندیل۔ چیدی کے کلاچوری۔ گہاروال اور راٹھور۔ انہلواڑہ کے چلوکیہ، بنگال کے پال اور لکھنوتی کے سین خاص شہرت رکھتے ہیں

ان راجپوت راجاؤں کے درمیان بجائے اتحاد و یگانگت کے باہمی نفاق و مخاصمت کا زور تھا۔ ان مختلف سلطنتوں کے درمیان آئے دن جنگ و جدل برپا رہتا کیونکہ باہمی رقابت و خونریزی ان راجپوتوں کی ہمیشہ سے خصوصیت رہی ہے۔ لیکن ان لڑائیوں اور جنگوں کا مقصد بجائے وسعت سلطنت یا حصول ملک کے محض دوسری ہمسایہ ریاستوں پر اپنی فوقیت و برتری جتلانا تھا اسی عہد میں ہم رائے پرتھوی راج چوہان کو تین ہمسایہ سلطنتوں گجرات، بندھیل کھنڈ اور قنوج سے جنگ میں مصروف دیکھتے ہیں۔ یہ لڑائیاں اکثر نہایت خونریز ہوا کرتی تھیں جن میں فریقین کے ہزارہا سپاہی ضائع ہو جاتے تھے۔ ان چار طاقتور سلطنتوں یعنے چوہان۔ راٹھور، چنڈیل اور سولنکی کی جنگی قوت دن بدن کمزور ہوتی گئی۔ اور آخرکار ہر ایک قوت ایک ایک کر کے ایک زبردست و قوی حملہ آور کے مقابلہ میں تباہ ہو گئی۔ آپس کی رقابت و خصومت کا یہ حال تھا کہ ایک غیر ملکی حملہ آور اور ایک مشترک دشمن کا خوف بھی اُنہیں متحد نہ کر سکا۔

ہر راجپوت فرمان روا اپنے تئیں چکرورتی تبلاتا اور ہمسایہ ریاستوں کو اپنا مطیع بنانیکی سعی کرتا تھا۔ لیکن ان ریاستوں کو الحاق کر کے اپنی سلطنت کو وسیع کرنے کا مطلق خیال نہ تھا۔ اس طرح فاتح و مفتوح دونوں کی قوت میں زوال اور کسی کو بھی استحکام حاصل نہیں ہونے پایا تھا۔ مثال کے طور پر مالوہ کے راجا بھوج نے دوسری راجپوت ریاستوں کے ساتھ جنگ کی اور اُنہیں زیر کیا اور مالوا چکرورتی کا لقب حاصل کیا۔[۱] اسیطرح کرن راجا اور کمار پال نے اس عزت کو حاصل کرنے کی سعی کی۔ مسلسل تیس سال تک کمار وال و چوہان خاندانوں میں رقابت جاری رہی۔ پہلے جے چند اور وگرپال اور بعد میں پرتھوی راج اور جے چند برابر جنگ و جدل میں مصروف رہے۔ جیسا کہ صاحب پرتھی راج راسو چاند بردی کا بیان ہے کہ سنجوگتا کے سوئمبر کے سلسلہ میں پرتھوی راج کے نوّے فیصد سمنت (فوجی جاگیردار جنرل)

---

[۱] سی۔ وی۔ ویدیا۔ ڈاون فال آف ہندو انڈیا۔ صفحہ (۳۶۲)

مارے گئے[1]۔ حکمرانوں کی اس باہمی جنگ وجدل کے علاوہ ان ریاستوں کے باشندوں میں احساس قومیت کا فقدان نظر آتا ہے۔ اس عہد کے ہند میں بھی ایشیاء کے دیگر ممالک کی طرح صرف حکمرانوں کا ڈنکا بجتا تھا۔ اور عوام کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ رعایاء کو اس بات کا احساس نہیں تھا کہ مملکت اُن کی ہے اور حکمران بھی اُنہی کا ہونا چاہیے برخلاف اس کے اُن کا خیال تھا کہ ملکیت بادشاہ کی ہے اور وہی بادشاہ ہوتا ہے "جس کو خدا مقرر کرتا ہے۔" اور ظاہر ہے کہ مملکت کی نسبت اس قسم کا تخیل نہ تو قومیت کا احساس پیدا کرتا ہے اور نہ حب الوطنی کا جذبہ۔

اس میں شک نہیں کہ باشندوں میں وفاداری کا جذبہ نہایت قوی تھا۔ اور پرتھوی راج راسو میں اس کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ جذبہ نہایت شدت سے تھا۔ اپنے آقا کی خاطر زندگی قربان کرنا راجپوت کا عین "دھرم" تھا اور اگر آقا کو شکست ہوجائے اور "خدا کی مرضی" سے دوسرا شخص آقا بن جائے تو راجپوت سپاہی اس کے لئے بھی مرنے کو تیار تھا۔ اسی بناء پر ہم چھتری سپاہیوں کو اپنے مسلمان آقاؤں وحکمرانوں کی خاطر قربان ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اور یہ خیال غیر راجپوت باشندوں میں بھی عام تھا۔ زبان کی یکسانیت بھی اُن باشندوں میں احساس قومیت پیدا کرنے میں ناکام رہی۔

ایک زبردست اور فرض شناس مستقل فوج کا وجود ہر ایک مملکت کا اولین فرض ہے لیکن اس عہد کی ہندو مملکتیں اس فرض سے غافل تھیں۔ راجا ہرش اور راجا بھوج کے بعد سے مستقل فوج کے قیام کا خیال معدوم ہوگیا۔ بلکہ اس کے بجائے فوجی جاگیرداری تنظیم کا رواج ہوگیا تھا جس کو "سمنت" کہا جاتا تھا[2] طریقہ سمنت تقریباً اسی طرز کا تھا جیسا کہ بعد میں چلکر

---

[1] دی۔ سی۔ ویدیا۔ ڈاون فال آف ہندو انڈیا صفحہ (۲۶۳)

[2] فوربس۔ راس مالا صفحہ ۲۴۳۔

مغلوں کے عہد میں منصب داری کا طریقہ تھا۔ سمنتوں کی نوعیت فوجی جاگیرداروں کی سی تھی۔ پرتھوی راج کے عہد میں کسی مستقل فوج کا حال نہیں ملتا ہے[1]

یہ فوجی جاگیردار ضرورت کے موقعوں پر اپنی اپنی فوجوں سے بادشاہ کی مدد کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان فوجی سرداروں سے نہ تو کافی مدد ملتی تھی اور نہ ان کی امداد زیادہ مفید وکارآمد ہوتی تھی۔

اس عہد کے ذہنی رجحان نے فن جنگ سے بے اعتنائی برتی۔ مملکت کے صحیح تصور کا احساس بھی مفقود تھا۔ برہمن و چھتری لوگ بجائے مفید وکارآمد علوم کے شعر و ادب کی طرف زیادہ راغب تھے۔ حسن و عشق کے افسانے اور نکات شعر و ادب اس عہد کے اہل علم کا عام مشغلہ تھا۔ حتیٰ کہ حکمران بھی فنون لطیفہ بالخصوص شعر و شاعری و ڈرامانگاری کے شوقین تھے۔ بلاشبہ ان دلچسپیوں سے اس عہد کے ہندوؤں کی خوش مذاقی اور نفاست طبع کا پتہ چلتا ہے لیکن ہندو حکمران اپنے فوجی سرداروں سے زیادہ درباری شعرا کی طرف متوجہ تھے۔ میدان جنگ سے زیادہ اسٹیج کا خیال تھا۔ ان مشاغل شعر و سخن و فنون لطیفہ کا نتیجہ رفتہ رفتہ آرام و عیاشی میں ظاہر ہوا جس سے اخلاقی انحطاط کی ابتدا ہوئی۔ اس تدریجی انحطاط و عیش و عشرت کی تصویر ہمیں راج شیکھر کی تصانیف "کپور منجری" اور نیانندچندر کی "رمبھا منجری" میں نظر آتی ہے۔ اسلامی حکومت کے قیام سے قبل کی صدیوں میں ہندوستان نہایت درجہ خوش حال و مرفہ الحال تھا۔ اس عہد کے عام تمول، معاشی ترقی و زرعی بہتری کی نسبت اس عہد کے تصانیف پرزور الفاظ میں ذکر کرتی ہے۔ بھوشیہ پران کا ایک شلوک اس عہد کی معاشی خوشحالی کو یوں ظاہر کرتا ہے۔

"گاؤں گاؤں میں دیوتا تھے۔ دیش دیش میں قربانیوں کا رواج تھا۔ گھر گھر میں

---

[1] ویدیہ۔ زوال آف ہندو انڈیا صفحہ (۲۰۷)

دولت کی فراوانی تھی ۔ دھرم لوگوں کی زندگی کا جزو لاینفک تھا۔

عام مرفہ الحالی و آسایش جو اس عہد میں نظر آتی ہے یہی یہاں کے باشندوں کے جسمانی انحطاط و اخلاقی زوال کا باعث ہوئی ۔ بالکل یہی خیال رومیوں ، عربوں اور بعد میں ترکوں و مغلوں کا ہوا ۔ آرام و آسایش ، اور باہمی جنگ و جدل اور رقابت و نفاق کی وجہ سے حکمران طبقہ رعایا کی بہتری و بہبودی سے غافل ہوتا گیا ۔

حکمرانوں کو اپنے تفریحی مشاغل کے علاوہ باہمی جنگ و جدل سے اس قدر فرصت نہ تھی کہ وہ رعایا کی طرف متوجہ ہوتے اور ملکی تنظیم کا خیال کرتے ۔ برخلاف اس کے رعایا بھی اخراجات جنگ سے سخت زیر بار تھی[1]۔

صرف سیاسی انتشار و نزاعیت ہی ان دو صدیوں کی عام خصوصیت نہیں تھی بلکہ اس دور کی معاشرت بھی انقلابی دور سے گذرتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ سیاسیات کی مانند معاشرہ میں بھی انتشار نظر آتا ہے ۔ مسلسل کئی صدیوں کی جدوجہد اور کشمکش کے بعد برہمنیت بدھ مت پر غالب ہو چکی تھی ۔ ایک طرف تو راجپوت راجاؤں کی سرپرستی ، دوسری طرف سری شنکر، سری رامانج اور سری مدھو آچاریوں کی فلسفیانہ مذہبی تحریکیں اس برہمن غلبہ کی مدد و معاون بنیں ۔ شیو اور وشنو متوں کا زور ہوتا گیا ۔ اس طرح نویں و دسویں صدی میں ہندو مت سارے ہندوستان پر حاوی ہو چکا تھا ۔ لیکن گیارہویں صدی میں پھر مذہبی اختلافات کا زور ہوا ۔ گجرات اور راجپوتانہ میں جین دھرم کی اشاعت ہونے لگی ، اور دکھن اور جنوبی ہند سے جین مت خارج کر دیا گیا ۔ بدھ دھرم ہندوستان سے ابھی پورے طور پر نہیں مٹا تھا ۔ سندھ پنجاب اور کابل میں اسلام کا اثر بڑھ رہا تھا ۔ غرض کہ مختلف مذہبی تحریکوں کی اشاعت ہو رہی تھی ۔

---

[1] ویدیہ ۔ ڈوون فال آف ہندو انڈیا صفحہ (۲۰۵)

بدھ دھرم کے زوال کے ساتھ ہی ہندو عقاید عام ہوتے گئے۔ ذات پات یا درن دیوستھا کی تنظیم پر پورے جوش کے ساتھ عمل ہو رہا تھا۔ لیکن یہ تنظیم قدیم آریائی تنظیم سے بہت سی باتوں میں مختلف تھی۔ اُس زمانے میں ہندو دھرم میں نئے عناصر شامل ہو گئے تھے جن کی وجہ سے اس کی شکل تبدیل ہو گئی تھی۔ ذات پات کے اصول کی سختی سے پابندی ہونے لگی تھی۔ یہ خاص طور پر بدھ مت کے خلاف ردِعمل کا اثر تھا۔ چار اہم ذاتوں یعنی برہمن، چھتری، ویش اور شودر کے علاوہ اور بھی فرقے در فرقے ہوتے گئے۔ برہمنوں میں کئی قسم کے برہمن تھے۔ اسیطرح سماوت، رائج شدہ فرقوں نے ان ذاتوں کو اور بھی پارہ پارہ کیا۔ اِن فرقوں کے درمیان آئے دن نزاعات میں اضافہ ہونے لگا۔ بالکل غیر اہم عقاید اور اُصول کی نسبت اِن فرقوں میں اختلاف و فساد برپا تھا۔ ہندو دھرم کی وحدت فنا ہو گئی تھی۔ اس سے قبل کی صدیوں میں ان چاروں ذاتوں میں آپسمیں شادیاں ہوا کرتی تھیں۔ ابن خرداد بہ نویں صدی میں بیان کرتا ہے کہ برہمن چھتری عورتوں سے شادی کرتے ہیں لیکن اپنی بیٹیاں اُنھیں نہیں دیتے[1]۔

چنانچہ راج شیکھیر کا مشہور واقعہ ہے کہ اُس نے سنہ ۹۰۰ئہ میں چوہان خاندان میں شادی کی تھی۔ البرونی نے بھی بیان کیا ہے کہ برہمن دیگر ذاتوں کی عورتوں سے شادی کرتے تھے لیکن بعد میں شادی بیاہ صرف اُسی ذات تک محدود ہو گئی ہے[2]۔ نہ صرف شادی بیاہ بلکہ اُسوقت ان ذاتوں کے آپسمیں کھانے پینے تک کی ممانعت ہو گئی تھی۔ اُسیطرح اَب تک جو معاشری یکجہتی ہندوؤں میں پائی جاتی تھی وہ اِس ذات پات کی تنظیم اور فرقہ واری نزاع کی وجہ سے فنا ہونے لگی، اور آپسمیں مغایرت بڑھتی گئی۔

اُصول ذات پات پر سختی سے پابندی کی وجہ سے سلطنتوں کی فوجی و جنگی قوت میں کمی ہونے لگی۔ کیونکہ فوجی ملازمت یا سپہ گری ایک خاص طبقہ تک محدود ہوتی جا رہی تھی۔ اور

---

[1] ایلیٹ۔ ہسٹری آف انڈیا جلد دوم۔
[2] ویدیہ۔ ڈاؤن فال آف ہندو انڈیا صفحہ ۳۹۵۔

دوسرے طبقات آبادی کی فوجی صلاحیت میں زوال شروع ہوگیا تھا۔ رفتہ رفتہ راجپوت و چھتری طبقوں کے علاوہ دیگر طبقے فوجی اور جنگی خصوصیات سے معرا ہوتے گئے۔

بدھ دھرم کے متعدد اُصول و عقاید ہندو مت میں شامل ہوگئے تھے۔ بالخصوص "اہنسا" کے عقیدہ کو ہندوؤں نے عام طور پر تسلیم کرلیا تھا۔ اُصول اہنسا شیو اور وشنو متوں کا بھی مذہبی عقیدہ بن گیا۔ جانوروں کی قربانی اور گوشت خوری ممنوع قرار پائی۔ جنگ و قتل و غارت سے بیزاری پیدا ہوگئی۔

مذہبی جوش میں اضافہ کے ساتھ کٹر پن اور توہم پرستی میں بھی اضافہ ہوگیا۔ عام طور پر ہندوؤں کو یہ وہم ہوگیا تھا کہ کل جگ میں "ملیچھ" (غیر ملکی) ہند پر حاوی ہوجائیں گے۔ لکھنوتی کے راجا لکشمن سین کی نسبت نجومیوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ ایک لمبے ہاتھوں والا ملیچھ اس کے ملک کو فتح کرے گا۔ اور اس پر لکھنوتی کے باشندوں اور خود راجا کو کامل یقین تھا۔ یہانتک کہ جب بختیار خلجی نے بنگال پر حملہ کیا تو راجا نے اس بات کی تصدیق حاصل کرنے کے لئے کہ آیا بختیار خلجی کے ہاتھ لمبے ہیں یا نہیں، اپنے آدمیوں کو روانہ کیا، جنھوں نے اس کی تصدیق کی۔ جب باشندوں کو اس کی خبر ہوئی تو وہ شہر کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے اور راجا کو بھی اپنی شکست کا یقین ہوگیا[1]۔ یہ واقعہ اس عہد کے وہم پرستی کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔

تیاگ و ترک دنیا، نجات اور مکتی کے حصول کی خواہش عام ہوگئی تھی۔ چتا میں زندہ جل مرنا نہ صرف بیواؤں بلکہ امراء اور راجاؤں میں بھی عام تھا، جو اپنے گناہوں کے کفارہ کے طور پر خود کو جلتے شعلوں کے حوالے کرتے تھے۔ بعض راجا لوگ کچھ عرصہ کی حکومت کے بعد اپنے وارث کے حق میں تخت سے دست بردار ہوجاتے اور اپنی زندگی کا آخری عہد کسی مذہبی تیرتھ یا خانقاہ میں گذارتے تھے۔ مصنف رتن مالا اور پربھود چنتامنی بہت سے ایسے راجپوت راجاؤں کا

---

[1] طبقات ناصری۔

حال بیان کرتے ہیں جنھوں نے یا تو چتا میں جلکر جان دی یا تپسیا کی خاطر راج تیاگ کرکے کسی تیرتھ کو اپنے آخری ایام بسر کرنے چلے گئے۔[۱]

نتیجہ: اس ابتری کی حالت میں ہندوستان میں ایک نئی قوم کی آمد تاریخ میں نہایت اہم نتائج پیدا کرتی ہے۔ غیر ملکی حملہ آور اپنے ساتھ ایک نیا تمدن، ایک نئی تہذیب، ایک نیا مذہب اور نئے معاشری و سیاسی ادارات لائے۔ اس نئی نسل کو ہند کے اس لامرکزیت اور طوایف الملوکی سے فائدہ اٹھانیکا موقع ملا۔ ایک مجموعی قوت کے عدم وجود سے انہیں اپنے حملوں میں کامیابی ہوئی اور رفتہ رفتہ سارے شمالی ہند پر قابض ہوگئے۔ پہلے پہل آٹھویں صدی میں عربوں نے سندھ پر قبضہ کرلیا تھا۔ لیکن ان کی حکومت مقامی حیثیت کے علاوہ کوئی اثر ہندوستان میں پیدا نہ کرسکی۔ مسلمانوں میں یہ فخر ترکوں کو نصیب ہوا کہ وہ سارے شمالی ہند پر تسلط جمائیں۔ ان حملہ آوروں کو یہاں پر بجائے کسی متحدہ قوت کے انفرادی طور پر راجاؤں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ سارا شمالی ہند بالکل ہی قلیل عرصہ میں غیر ملکی اقتدار کے زیر آگیا۔

بعض مورخین بالخصوص اسلامی مورخین کا خیال ہے کہ مسلم حملہ آوروں میں مذہبی جوش زیادہ تھا۔ اور ان حملوں کی حیثیت مذہبی تھی۔ لیکن حالات و واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ غزنیوں اور غوریوں کا مقصد تبلیغ یا اشاعت اسلام نہیں تھا بلکہ ان کا مقصد حصول دولت اور وسعت سلطنت تھا۔ اگر ان حملوں کا مقصد اشاعت مذہب تھا تو پھر بعد فتح اس کی کوشش کیوں نہ کی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ پنجاب کے ہندوؤں میں مذہبی جوش نہایت کم تھا لیکن شمالی و وسط ہند خاص کر گنگا و جمنا و سرسوتی کے درمیانی علاقوں کے باشندوں اور راجپوتوں میں ہمیشہ سے مذہبی جوش رہا۔ اور یہ علاقہ ہندو مذہب کا مرکز کہا جاسکتا ہے۔ اس بنا پر یہ دعویٰ غلط نہ ہوگا کہ مذہبی احساس دونوں فریقوں میں مساوی تھا۔

---

[۱] فوربس۔ راس مالا صفحہ (۱۰۱)

ہندوؤں کے اس قدر جلد بغیر کسی قابل ذکر جد وجہد کے محکوم بننے کی وجہ زیادہ تر ان کی باہمی رقابت اور خانہ جنگی تھی جس کے باعث انمیں نفاق پیدا ہوگیا تھا۔ دوسرے تنظیم ذات پات کی سخت گیری سے فن سپہ گری کا ایک خاص طبقہ تک محدود ہوجانا اور عام باشندوں کا اس قومی جدوجہد میں حصہ اور دلچسپی نہ لینا اور غیر ملکی جوئے کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کرنا ہی وہ وجوہ تھے جو غیر ملکی اقتدار کے قیام کے معاون ہوئے۔ جب یکے بعد دیگرے راجپوت قوتوں کو شکست ہوتی گئی تو سارا شمالی ہند بغیر کسی قابل ذکر مقابلہ کے زیر ہوگیا اور حملہ آوروں کی تاب نہ لاسکا۔ ذات پات کی تنظیم کے سبب سے یہاں کی آبادی کا ۹/۱۰ حصہ یا تو قومی محافظت کے ناقابل تھا یا بے پروا راجپوتوں کا طبقہ باہمی نفاق وخانہ جنگی سے کمزور ہوگیا تھا۔ ان دو اہم وجوہ سے ہندوستان نے آسانی سے حملہ آوروں کے تحکم کو تسلیم کرلیا۔ اولاً پنجاب۔ اور سندھ میں ان اسلامی فاتحین نے اشاعت مذہب کی کوشش ضرور کی مندروں کو توڑنے اور ان کی جگہ مسجدوں کو تعمیر کرنے کا کام کچھ عرصہ تک ہوتا رہا۔ اس کی وجہ ایک تو اس عہد کا عام مذہبی رجحان ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ مذہب حملہ آوروں کی زندگی کا ایک اہم عنصر تھا۔ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ جہاں کہیں بھی ان کو فتح ہوئی وہاں انھوں نے اپنے مذہب کی اشاعت کا کام کیا۔

رفتہ رفتہ جب ان کی حکومت کو استحکام ہوتا گیا تو انھوں نے محسوس کیا کہ اشاعت مذہب میں جبر وقوت سے کام لینا کسی حالت میں بھی ہندوستان میں مفید ثابت نہ ہوگا۔ خواہ ہندوؤں کے مندروں کو توڑا جائے۔ پجاریوں کو قتل کیا جائے اور ان کے سپاہیوں پر بیشمار مظالم ہوں پر بھی برہمنوں کا اثر ہندوؤں پر سے نکلنا محال ہے۔ اور صرف قوت وجبر سے یہاں کے باشندوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا ناممکن ہے۔[1]

یہی وجہ ہے کہ پنجاب اور سندھ میں جس قدر مسلمانوں کی آبادی ہے اس سے نہایت

---

[1] ٹائٹس۔ انڈین اسلام صفحہ ۱۵۰ - ۱۵۱۔

درجہ کم وسط و جنوبی ہند میں ہے۔

اگر اسلامی فاتحین کو اپنے تہذیب و تمدن، صداقتِ مذہب، پاکیزگی عقیدت اور سادگی پر فخر تھا تو ہندوؤں کو اپنے تاریخی قدامت۔ ذخیرہ علوم و فنون۔ فلسفہ مذہب اور پاکیزگی نسل پر ناز تھا۔ اس طرح ان دو قوموں کے ملاپ اور تصادم سے مستقبل کی ہزار سال کی تاریخ۔ تہذیب و تمدن معاشری و سیاسی اداروں کی اس عہد میں داغ بیل ڈالی گئی۔

شمال سے اسلامی فاتحین کے آنے سے قبل ہی ہندو ایک حد تک مسلمانوں سے واقف ہو چکے تھے جنوبی ہند۔ عربوں سے بخوبی واقف تھا۔ مختلف عرب سیاح یہاں کے راجاؤں کے مسلمانوں کے ساتھ روادارانہ طرزِ عمل کی تعریف کرتے ہیں۔ نہ صرف مسلمانوں کی حد تک بلکہ ہندوؤں کی تاریخ میں دیگر مذاہب کے ساتھ رواداری کا اُصول بالکل قدیم چیز ہے حتیٰ کہ جنوبی ہند میں ان عربوں کو اپنے مذہب کی اشاعت میں حکومت کی امداد بھی حاصل تھی۔ دسویں صدی ہی میں گجرات، سندھ اور دکن میں مسلمان اور ہندو ایک دوسرے سے واقف ہونے لگے تھے۔

اسلامی حکومت کے قیام کے وقت اگر یہاں کے باشندوں کو مسلمانوں سے نفرت تھی تو اس بنا پر کہ وہ محکوم بنائے گئے، اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ ہندوؤں نے مسلمانوں سے محض مذہب کے اختلاف کی بنا پر نفرت کی ہو۔ اگر مذہبی تعصب ان میں تھا بھی تو نہایت کم۔ پھر بھی ابتدا میں ان دو قوموں کے درمیان جس خصومت کا اظہار ہوتا ہے وہ بالکل قدرتی ہے کیونکہ فاتح قوم۔ اپنا اقتدار تسلیم کروانے پر مصر ہوتی ہے اور مفتوح قوم جواب تک آزاد رہی ہو وہ قدرتاً اپنے فاتح سے نفرت کرنے لگتی ہے اپنی محکومی اور ذلت کا احساس اُسے مخالفت پر آمادہ کرتا ہے جس کا نتیجہ مختلف بغاوتوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ قوموں کے ابتدا میں ایک دوسرے کو نہ سمجھنے کے باعث بھی ناگوار نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

دُنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو اپنی محکومی و غلامی کو خوشی سے قبول کرے۔ اسی سبب سے وہ فاتحین کو اپنا دشمن سمجھنے اور ان سے نفرت کرنے لگتی ہے لیکن رفتہ رفتہ

جب ایک قوم دوسرے سے واقف اور ایک دوسرے کے خیالات و مقاصد کو سمجھنے و جاننے کی کوشش کرتی اور سمجھنے لگتی ہے تو یہ نفرت و حقارت زائل ہوتی جاتی ہے۔ اور مغائرت دُور ہو جاتی ہے۔

شہاب الدین غوری کے بعد جب مسلمانوں کے قدم ہندوستان میں جم گئے اور ترکوں کو یہاں سلطنت و حکومت قائم کرنیکا خیال ہوا۔ تو اُس کے ساتھ ساتھ ہندو آبادی جو اَب تک ان حملہ آوروں کو محض لٹیرے سمجھتی تھی اُن کی طرف متوجہ ہوئی۔ ہندوستان کی تاریخ میں ترکوں و افغانوں کا عہد ان دو متضاد اور مخالف قوموں کے آپسی تصادم اور ملاپ کا عہد ہے۔ اِنہی اسباب سے اس عہد کی عمرانی و مذہبی تاریخ نہایت اہم ہے۔

یُوں تو ہندوستان میں اسلامی حکومت کا آغاز آٹھویں صدی یعنے سندھ پر عربوں کے قبضے سے ہوتا ہے لیکن صحیح معنوں میں اسلامی حکومت ہندوستان میں اُس وقت سے قائم ہوئی جبکہ پرتھوی راج چوہان کی شکست کے بعد شہاب الدین غوری نے قطب الدین ایبک کو مفتوحہ علاقوں کا نایب مقرر کیا۔ سندھ پر عربوں کی حکومت ایک تو قلیل عرصہ تک رہی، دوسرے اس کی حیثیت بالکل صوبہ واری تھی۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں اس اسلامی حکومت کا کوئی اثر نہ پڑا۔ پنجاب پر محمود غزنوی کے حملے کسی مستقل حکومت کے خیال کے تابع نہ تھے راجا جے پال کی روز افزون قوت کو کم کرنے کی خواہش اور ہندی دولت کے افسانے محمود غزنوی کے حملوں کے محرک نظر آتے ہیں۔ وسعت سلطنت کا خیال بھی ان حملوں کا باعث ہوسکتا ہے لیکن ان حملوں اور فتوحات کا ہندوستانی سیاسیات اور زندگی پر کوئی قابل ذکر اثر نہیں پڑا اور نہ اسلامی حکومت پورے طور پر قایم ہونے پائی۔ چونکہ محمود غزنوی کا تعلق بھی زیادہ تر ہندوستان کے شمال مغربی حصہ سے رہا، اس سبب سے ان فتوحات کو ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام سمجھنا درست نہیں ہے۔ بحیثیت مجموعی عربوں اور محمود غزنوی کے حملوں اور فتوحات کی اہمیت صرف اس قدر ہے کہ اُنھوں نے بعد کے اسلامی فاتحین

کے لئے رہبری کا کام کیا۔ اور ایشیا کے دیگر قوموں اور اسلامی سلطنتوں کو ہندوستانی سیاست سے واقف کرایا۔

قطب الدین ایبک کی صوبہ داری سے ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام کی کوشش شروع ہوئی، جس کی تکمیل علاء الدین خلجی کے عہد میں ہوئی۔ مسلمانوں میں پنجاب اور وسط ہند کو زیر کرنے کے بعد پورے ہندوستان کو زیر کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ تیرھویں صدی کے ابتداء سے چودھویں صدی کی ابتدا تک پورے ایک سو سال میں ہندوستان میں اسلامی حکومت قایم اور مستحکم ہوگئی اور تمام شمالی ہند پر ترکوں کا تسلط ہوا۔ اس ایک صدی کے دوران میں ابتدائی چالیس برس ہندوستان کی مختلف ہندو سلطنتوں کو زیر اور الحاق کرنے میں صرف ہوئے۔ اور جب سلطنت کافی وسیع ہوگئی تو اس کے استحکام کی کوشش کی گئی۔

اجمیر، دہلی، قنوج، اور بنارس کی فتح اور دو طاقتور راجپوت سلطنتوں کے الحاق کے بعد شمالی ہند کی دیگر راجپوت سلطنتیں ربع صدی کے عرصہ میں بغیر کسی قابل ذکر جد و جہد کے اسلامی حکومت کے زیر ہوگئیں۔ ان فتوحات کی تفصیل ہمعصر تاریخوں یعنے طبقات ناصری اور تاج المآثر میں ملتی ہے۔

۱۱۹۹ء میں شہر انہلواڑہ اور سلطنت گجرات پر سلطنت دہلی کا قبضہ ہوگیا۔ لیکن یہ علاقہ کامل طور پر فتح نہ ہوسکا۔ جو ایک صدی بعد علاء الدین خلجی کے زمانے میں سلطنتِ دہلی سے ملحق ہوا۔

اسلامی حکومت کے قیام سے پورا ہندوستان ایک مرکز کے تحت آگیا۔ ساتھ ہی تمام مرکز گریز قوتیں فنا ہوگئیں۔ ملک کی از سر نو شیرازہ بندی سے اندرون ملک امن قایم ہوا۔ اور بارھویں صدی کی انتشاری کیفیت و نراجیت دفع ہوگئی۔ مختلف بغاوتوں کے انسداد اور حصول ملک کی خاطر فوجی مہمات سے حکومت کو استقلال نصیب ہوا۔ تین صدیوں کی لامرکزیت کے بعد ایک آزاد و ہمہ گیر قوت تقریباً تمام ہندوستان پر حاوی ہوگئی۔ سلطنتِ دہلی

کے علاوہ دیگر علاقے یا تو سلطنت دہلی سے ملحق کر لئے گئے یا ان سلطنتوں نے دہلی کی اطاعت و برتری کو تسلیم کر لیا۔ انہی اسباب سے اسلامی حکومت کا قیام در اصل ایک طاقتور مرکزیت کے قیام کے علاوہ ایک قومی حکومت کا قیام تھا۔

لفظ اسلامی سے کسی غیر ملکی قوت کا اقتدار سمجھنا غلطی ہے کیونکہ قطب الدین ایبک کے بعد ہی سے سلطنتِ دہلی دیگر اسلامی ممالک سے بالکل آزاد ہو چکی تھی اور ترک حکمرانوں کا تمام تر دار و مدار صرف ہندوستان پر تھا۔ اسلامی ممالک سے سیاسی تعلقات منقطع ہو چکے تھے۔ اب کوئی ایسی کشش باقی نہ تھی جو ہندوستان کے ان ترک حکمرانوں کو اسلامی ممالک سے تعلقات قایم رکھنے پر مجبور کرتی۔ جہاں تک مذہب کا تعلق تھا ان کو دیگر اسلامی ممالک بالخصوص خلافت سے ہمدردی ضرور تھی۔ لیکن اس ہمدردی کا اثر ہندوستان کی سیاسیات پر کچھ زیادہ نہ تھا۔

علاء الدین خلجی کی تمام تر کوشش یہ رہی کہ غیر ملکی مسلمانوں (ترکی) کے مقابلہ میں ہندی مسلمانوں کو ترجیح دیجائے۔ اسی بنا پر اس حکمران کے اکثر عہدہ دار و سپہ سالار ہندی نژاد مسلمان تھے۔ علاء الدین کے چار مشہور سپہ سالار ظفر خاں۔ نصرت خاں۔ الپ خاں اور الغ خاں ہندی نژاد تھے، جن کی مدد سے اس نے ترکی امراء کی قوت کو کم کرنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب ہوا۔

امورِ حکومت اور معاملاتِ سلطنت کے باب میں صرف مسلمان ہونا کسی خاص رعایت کا استحقاق نہیں پیدا کرتا تھا۔ بلکہ سیاست مذہب سے علیحدہ ہو گئی تھی۔ علاء الدین نے بیس ہزار نو مسلم مغلوں کو تہ تیغ کیا۔ اس طرح باغیوں کی سزا میں اون کے مسلمان ہونے سے کوئی رعایت ملحوظ نہیں رکھی گئی۔ امورِ حکومت کے سامنے ہندو اور مسلمان دونوں کی حیثیت مساوی تھی۔ اس خاص حکمتِ عملی سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ ان حکمرانوں کا تخیل مملکت خالص دنیوی اور قومی حکومت تھا نہ کہ مذہبی راج۔ اس عہد کی حکومتیں

علماء کے اثر سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان علماء دین کا وقتاً فوقتاً حکمرانوں کو شرع کی پابندی وقرآنی احکام کی تعمیل کی طرف توجہ دلانا حکومت میں اس طبقہ کے اثر اور اہمیت کو ظاہر کرتا ہے لیکن غیاث الدین بلبن کے عہد سے جو خیال مذہب کو سیاسیات سے الگ کرنے کا پیدا ہوا تھا وہ علاء الدین خلجی کے عہد میں پورے طور پر ظاہر ہوا۔ غیاث الدین بلبن، علاء الدین خلجی اور بعد میں محمد بن تغلق شاہ کا جو تخیل مملکت رہا وہ خالص ایک دینوی اور قومی مملکت کا تخیل ہے ان حکمرانوں کے عہد کی حکومت ایک قومی حکومت تھی۔ علاء الدین خلجی اور قاضی مغیث الدین کی گفتگو سے اس حکمران کے تخیل وتصور مملکت پر روشنی پڑتی ہے۔ علاء الدین قاضی کو ایک موقع پر کہتا ہے کہ

" اگرچہ من علمے وکتابے نہ خواندہ ام۔ اما ازین چند پشت مسلمان و مسلمان زادہ ام ہر چیزے کہ در آن صلاح ملک وصلاح ایشان (عوام) باشد برخلق امر می کنم و مردمان بے التفاتی می کنند و بجائے نمی آرند۔ مرا ضرورت می شود کہ چیزہا درشت در باب ایشان حکم کنیم کہ ایشان بدان فرمانبرداری کنند۔ ونمی دانم کہ آن حکم مشروع است یا نامشروع ومن درچہ ہرچہ صلاح ملک خود می بینم ومصلحت وقت مرا در آن مشاہدہ می شود حکم می کنم ونمی دانم کہ خدا تعالیٰ فردا قیامت برمن چہ خواہد کرد" [1]

اسی قسم کے خیال کی بناء پر علماء دین علاء الدین خلجی اور محمد تغلق کی سیاسی حکمت عملی سے ناراض تھے۔ اسلامی حکومت کے قومی حکومت ہونیکا ثبوت ان حکمرانوں کی سیاسی حکمت عملی سے بھی ملتا ہے کہ انھوں نے کسی ہندو کو صرف اس کے مذہب کی بناء پر قتل کرنے یا دبانے کی کوشش نہیں کی اور نہ کسی مسلمان باغی یا دشمن سلطنت کو صرف اس کے مسلمان ہونیکی وجہ سے رعایت کا مستحق سمجھا، بلکہ بلاتفریق مذہب وعقاید ان کا مقصد استحکام سلطنت

---

[1] ضیاء برنی تاریخ فیروز شاہی۔

و امن آمان وفلاح ملک تھا۔ انہی اسباب سے ان کی حکومت کو قومی حکومت کہنا نامناسب نہ ہوگا۔
بودھ مت کے عروج و زوال۔ سیاسی حالات کی تبدیلی اور ہندوستان کی آریوی معاشرت
میں نئے عناصر کے شامل ہونے سے ہندو معاشرہ میں ایک عظیم تغیر شروع ہوا۔ غیر ہندی اقوام
مثلاً ھن، شک وغیرہ کے داخلے نے جنھوں نے خود کو ہندوستان کے معاشرہ میں جذب
کر دیا اور ہندو سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ یہاں کی عمرانی زندگی میں تبدیلی کی ضرورت
محسوس ہوئی۔ قدیم آریوی معاشرہ میں امتداد زمانہ سے کئی تبدیلیاں ہوئیں اور ہو رہی تھیں
ان حالات میں مسلمانوں کی آمد کا اثر ہند و تمدن و معاشرہ پر لابد تھا۔ چونکہ مذہب ہندی
معاشرت کا ایک اہم عنصر تھا اس کے علاوہ ان کے معاشرت و مذہب میں اس قدر گہرا
تعلق تھا کہ اُن کے اصولوں میں تمیز و تفریق مشکل ہے۔ اِس عہد کی ہندو معاشرت کے
مختلف پہلو مختلف اثرات کا نتیجہ ہیں۔ حاکم طبقہ راجپوتوں کا تھا اور اس طبقہ کا اثر ہندوؤں
کی زندگی کے ہر شعبہ پر پڑا۔ راجپوت طرز زندگی۔ اُن کے اخلاق و عادات۔ رسوم و رواج اور
مشاغل کی تصویریں اس عہد کی تصانیف میں نظر آتی ہیں۔ چاند بردی کی "پرتھی راج راسو"
اور مشہور رزمیہ نظم "الہا کہانڈ" اس نسل کے دلچسپ کارنامے اور معاشری خصوصیات
کو ظاہر کرتے ہیں۔

جیسا کہ تمہید میں اُوپر بیان ہو چکا ہے۔ مذہبی اختلافات و عدم اتحاد نے ہندو
مذہب کی وحدت کو فنا کر دیا تھا اور مختلف مذہبی تحریکیں ملک میں کام کر رہی تھیں۔ بودھ
دھرم کے زوال سے جین دھرم و برہمنیت کا زور رہا۔ گجرات اور راجپوتانہ میں جین مت فروغ
پانے لگا۔ شمال مغربی ہند میں اسلام کی اشاعت ہو رہی تھی رفتہ رفتہ ہندو مذہب میں مختلف
تحریکیں پیدا ہوئیں[1] جین مت جنوبی ہند سے خارج ہو کر وسط و مغربی ہند میں فروغ پانے لگا۔

---

[1] ڈاکٹر ہنڈاکر۔ سیویٹ اینڈ ویشنویٹ ونٹس ان انڈیا۔

حیرت کا مقام ہے کہ عقیدہ "اہنسا" کا حامی اور اشاعتی جین دھرم نے شیومت کے حامی اور جنگ وجدل کے عادی راجپوتوں کے تحت فروغ پایا۔ تمام راجپوت ریاستوں۔ سامبھر، میواڑ، مالوہ اور گجرات میں اس کی اشاعت ہونے لگی۔ گو ان علاقوں کے حکمران جنوب کے چھتری راجاؤں کی طرح کٹر سیوامت کے پیرو تھے۔ پر بھی پہلے بودھ مت اور بعد میں جین دھرم کے اہنسا کے عقیدہ کا اثر ان پر بھی ہوا اور جیسے جیسے یہ عقیدہ تسلیم کیا جانے لگا۔ ویدوں کی تعلیم قربانی فراموش ہوتی گئی۔ گجرات اور راجپوتانہ میں جین دھرم کی اشاعت بیشتر پنڈت ہیم چندر کی رہین منت ہے۔ پنڈت ہیم چندر۔ جین دھرم کا مشہور پرچارک شویتامبر فرقہ سے تھا۔ ان کی پیدائش ۱۰۸۸ء میں گجرات کے ایک جینی ویش خاندان میں ہوئی[51]۔ ابتدائی تعلیم کے بعد جب اچاریہ کا رتبہ حاصل ہوا تو وہ انہلواڑہ چلا آیا ان کا انتقال ۱۱۶۸ء میں ہوا۔ یہ پنڈت اپنی تصانیف سنسکرت و پراکرت گرامر اور "کاویہ دوساریہ" (جو کہ گجرات کے چالوکیہ راجاؤں کی تاریخ ہے) کی بدولت بہت مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی ہندو پنڈت نے طنزاً اس سے کہا کہ وہ جین ہونے کے باوجود ایک ہندو کی مصنفہ گرامر پانینی سے مستفید ہو رہا ہے اس سے متاثر ہو کر اس نے سنسکرت و پراکرت کی ایک بہترین گرامر تصنیف کی۔ اس پنڈت کا راجپوت راجاؤں پر جو اثر تھا اس کا حال اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بعض مقررہ دنوں میں جانور کشی کی ممانعت کے احکام جاری کروائے تھے اور اس کی کوشش سے ان علاقوں کے جین مشنریوں کو بعض خاص حقوق بھی مل گئے[52] گجرات میں اہنسا کے عقیدہ کو جو اہمیت و قبولیت حاصل ہے اس کی ابتدا اسی عہد سے ہوتی ہے۔

چوہانوں کے علاقہ میں دریائے ستلج تک انہیں صدیوں میں جین دھرم کی اشاعت ہوئی یہاں تک کہ مارواڑ کے پورے ویش طبقہ نے جین مت کو قبول کیا۔ اور مارواڑ کا تاجر

---

[51] ویدیہ۔ ڈون فال آف ہندو انڈیا صفحہ (۲۱۱) ۔ [52] ویدیہ۔ ڈون فال صفحہ ۲۱۴۔

طبقہ جین مت کو دور دراز علاقوں تک لے گیا۔ مالوہ اور میواڑ کے آخری راجہ جو شیومت کے سخت حامی تھے وہ بھی جین مت کی عام اشاعت اور اس کی بڑھتی ہوئی لہر کو نہ روک سکے۔ عام طور پر ان راجاؤں کا طرز عمل جین مت کی نسبت بہت اچھا رہا جس کی مثالیں۔ اس عہد کی تاریخ میں ملتی ہیں۔

شمالی ہند کے دوسرے علاقوں میں جین دھرم عوام اور راجاؤں دونوں میں مقبول نہ تھا گہاروال پال اور سین راجاؤں کی نظروں میں جین مت کی کچھ زیادہ وقعت نہ تھی۔ اسی سبب سے وسط ہند اور شمال مشرق میں اس دھرم کی زیادہ اشاعت نہ ہوسکی۔ گو ان علاقوں میں جین مت پھیلنے نہ پایا لیکن اس کا اہم عقیدہ یعنے "اہنسا" کا احساس یہاں کے باشندوں میں کچھ کم نہ تھا جین مت کے اس عقیدہ کی اشاعت ایک اور شکل میں ہونے لگی تھی۔ اور یہ شکل نئی ویشنوی تحریک تھی[۱]

بنگال میں یہ نئی ویشنوی تحریک بودھ اور جین مت کی طرح عقیدہ اہنسا کی حد درجہ حامی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ نئی ویشنوی تحریک جین مت اور سری کرشن (ویشنو) کی پرستش دونوں عقاید کے ملاپ کا نتیجہ تھا۔ تو غلط نہ ہوگا[۲] علاقہ مگدھ کے سوا اور علاقوں میں بودھ دھرم تقریباً مردہ ہوچکا تھا۔ اور عام طور پر گوتم بودھ کو وشنو کا اوتار سمجھا جانے لگا تھا۔

اس طرح اس نئی ویشنو تحریک نے جینیوں کے عقیدہ اہنسا کو اپنا بنایا۔ اور اس کی سختی سے پابندی پر زور دیا۔ ساتھ ہی ویدوں کے اصول قربانی کو بالکل ترک کر دیا۔ رسم قربانی۔ بودھ اور جین مت کے مشنریوں کا زبردست حربہ تھا جس کو انھوں نے ویدک مذہب اور برہمنیت کے خلاف استعمال کیا۔ لیکن ویشنوی تحریک نے اس حربہ کو اپنے ہاتھ میں لیکر وشنومت کو پھر سے زندہ کیا۔ اور سری کرشن جی کی پرستش کو رواج دیا۔ جو عوام میں بہت جلد پھیل گئی۔ اس تحریک نے نہ صرف ویدوں کے اصول قربانی یا جانور کشی کی ممانعت کی بلکہ گوشت خوری

---

[۱] ویدیہ۔ ڈون فال صفحہ ۴۱۳

[۲] ویدیہ ڈون فال صفحہ ۴۱۳۔

کو بھی ممنوع قرار دیا۔ دریائے سندھ سے برہم پتر تک کے علاقہ میں یہ تحریک اس صدی میں عام ہوتی گئی۔ کشمیر کی تاریخ میں راجہ اونتی ورمن نے جو وشنو مت کا معتقد تھا جانورکشی یعنے جانوروں کی قربانی کے خلاف احکام نافذ کئے[ا] مہاراجہ پرتی ہار بھوج بھی ایک پرم وشنو تھا۔ گھاڑوال راجپوت جو لکشمی یا "سری" کے پرستار تھے۔ اور جن کا سمارتھ ہونا کتبات سے ظاہر ہے۔ "مہیشور" کہلاتے تھے اس کے باوجود یہ راجپوت عطائے زمینات وغیرہ کے موقعوں پر "واسودیو" (وشنو) کی پوجا کرتے تھے۔ مشرقی بنگال کے سین راجہ ابتداء میں سیوامت کے پیرو تھے لیکن ان کا مشہور اور آخری راجہ لکشمن سین پرم وشنو بن گیا۔ اور اہنسا کی حمایت کی۔ اس راجہ پر وشنوی تحریک کا اثر اڑیسہ کے جگناتھ (پوری) سے ہوا ہوگا۔ جو ان دنوں نئے وشنو مت کا مرکز تھا۔

اس طرح بارہویں صدی کی ابتداء میں شمالی ہند کے مغربی علاقے میں جین مت اور شمال و مشرقی علاقوں میں وشنو مت عام تھا۔ جین مت اور اس نئی وشنو تحریک میں نمایاں فرق یہ تھا کہ وشنوی تحریک لذت حیات کا پیغام لیکر اٹھی۔ اور جینی دھرم کا اصول ترک خواہشات تھا۔

سری کرشن کی زندگی کی اس پیرایہ میں تاویل کی جانے لگی جو عوام کو لذتِ حیات سے آشنا کرتی تھی۔ بہت جلد ہی سری کرشن کی اس قسم کی پرستش وسط ہند اور بنگال میں زندگی سے پورے طور پر لطف و لذت اٹھانے کے خیال کو تقویت دینے کا باعث ہوئی۔ چنانچہ اس تحریک نے ایک طرف تو جینیوں کی طرح اہنسا کے اصول کی اشاعت کی اور دوسری طرف ان کے اصول ترک دنیا و سنیاس کے خلاف لذت و عیش دنیا کے خیال کو پیش کیا۔ رفتہ رفتہ جب اس تحریک کو زیادہ عروج حاصل ہوا تو اس کا نتیجہ عام عیش و عشرت کی شکل

[ا] راج ترنگینی مصنفہ کلہن ایڈیشن سٹن کنون۔

میں ظاہر ہوا۔ اس عہد کے شمال مشرقی ہند کی ویشنو آبادی سری کرشن جی اور گوپیوں کی روایت یعنی سری کرشن کے عشق و محبت کے افسانوں کو صحیح سمجھتی تھی۔ اس کا ثبوت اس عہد کے مشہور پران۔ بھاگوت پران سے ملتا ہے جو کہ ویشنویت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس میں کرشن اور گوپیوں کا قصہ تفصیل سے درج ہے۔ یہ قصہ اسی رنگ کے ساتھ درج کیا گیا ہے جیسا کہ اس عہد کے لوگ تصور کرتے تھے جس کو کہ بعد میں چلکر ویدانت کے استعارہ میں پوشیدہ کیا گیا۔ بھاگوت میں راجہ پریکشت۔ شک منی سے سوال کرتا ہے کہ "آیا ان بزرگ ہستیوں کے غیر اخلاقی افعال کی پیروی عوام کو کرنی چاہیئے یا نہیں" تو اس کے جواب میں یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ واقعات محض تمثیلی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان کا مقصد تمثیلی پیرایہ میں انسانی روح کی اعلیٰ خواہشات اور وصل بالحق ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ بلکہ شک جواب دیتا ہے کہ "بزرگون کے افعال کی نہیں بلکہ اقوال کی پیروی کرنی چاہیئے"[1] کچھ عرصہ میں اس قسم کی تعلیم و عقائد کا نتیجہ رادھا مسلک کی شکل میں ظاہر ہوا اور بنگال کے راجہ لکشمن سین کے درباری شاعر جے دیو کی تصنیف "گیت گوبند" کرشن اور رادھا کے اس قصہ کو نہایت دلچسپ پیرایہ میں بیان کرتی ہے۔ بنگال کی اس ابتدائی ویشنوی تحریک نے لذتِ دنیا کو ترک دنیا سے اہم تر ہونے کی تعلیم دی۔ جس میں کہ چودہویں صدی میں سری وبھاچاریہ اور چیتنیا آچاریہ کی تعلیم سے تبدیلی ہوئی۔ وشنومت کا یہ پہلو اہنسا کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عوام میں زیادہ مقبول ہوا اور ان علاقوں میں جین مت کی اشاعت نہ ہوسکی۔

جنوبی ہند میں بھی اس نئی ویشنوی تحریک کی ابتداء ہوئی لیکن اس میں اور شمالی ہند کے تحریک میں بہت فرق تھا۔ جنوبی ہند کا ویشنومت کرشن اور رادھا کی عاشقانہ روایت سے پاک تھا اور ایک حد تک ترک دنیا اور نفس کشی کی تعلیم کا حامی تھا۔ جنوب کی اس تحریک

---

[1] سی۔ وی ویدیہ ڈون فال صفحہ ۲۱۵۔

میں ویدوں کی تعلیم کے بہت کچھ اثرات تھے۔ اُس نے برہمن تفوق و ورن آشرم دھرم کے اُصول کی حمایت کر کے عوام کے کٹر مذہبی احساس کو زیادہ اپیل کیا۔ جنوب کے وشنومت نے شنکر آچاریہ کے ایاوادی فلسفہ کی مخالفت کی جس میں کہ قدیم بھگتی عنصر کی گنجایش نہ تھی۔ جنوب میں اس تحریک کے حامیوں نے اپنشدوں برہم سوتروں اور بھگوت گیتا کی نئی تاویل پیش کی[1] اس تحریک کی اشاعت اور اس کا فروغ بہت کچھ ایک زبردست وشنو آچاریہ کی کوششوں سے ہوا۔ علاقہ تامیل میں جو کہ قدیم سے وشنومت کا مرکز تھا ۱۰۱۶ء میں مشہور ویشنو لیڈر رامانج آچاری پیدا ہوئے۔ ویشنومت کے اس نئے مذہبی فلسفی نے شنکر آچاریہ کے فلسفہ ویدانت کی پُرزور مخالفت کی۔ رامانج آچاریہ کی ابتدائی تعلیم مقام کنچی میں ایک اَدویت گرو یادو پرکاش کے تحت ہوئی جب اُن کی تعلیم سے اطمینان نہ ہوا تو اُنھوں نے الواروں کے پربندوں کا مطالعہ شروع کیا اور بھگتی اثر سے متاثر ہوئے۔ یمنا چاریہ کے جانشین کی حیثیت سے اُنھوں نے سری رنگم میں (جو ترچناپلی کے قریب واقع ہے) ویشنومت کی تعلیم دینا شروع کی۔ اور کتب مقدسہ پر حاشیہ لکھنے لگے۔ اس عہد کے چولا حکمران شیومت کے پیرو تھے جنھوں نے آچاریہ کی مخالفت کی جس کی وجہ سے ان کو ہوشلہ راجا وشنو وردھن کے ہاں میسور میں پناہ لینی پڑی یہ راجہ جو جین مت کی طرف مائل تھا اُن کا معتقد ہو گیا۔ رامانج آچاریہ نے ویشنومت کی اشاعت کا کام صرف جنوب کی حد تک محدود رکھا۔ بعد میں چلکر چودھویں صدی عیسوی میں رامانند نے شمال میں اس تحریک کو پھیلانے کی کوشش کی۔ رامانج آچاریہ کا ویشنومت قدیم پنچ تنتر اطریقہ کا تھا۔ جس میں نارائن اور ویشنو دیوتاؤں کا زیادہ اثر ہے۔ اور خدائے مطلق کی پرستش "نارائن" کے نام سے ہوتی ہے۔ اس میں مسلک رادھا کا نام و نشان نہیں ہے۔ اُن کی تعلیم میں قدیم عقدہ بھگتی کو برہمن جامہ پہنایا گیا ہے۔ شودروں کو حصول مکتی یا موکش کے

---

[1] ڈاکٹر بھنڈارکر۔ سیوازم اینڈ وشنویٹ موومینٹس صفحہ ۵۱ و ۵۲

ناقابل سمجھا گیا۔ لیکن بعد میں رامانند نے شمالی ہند میں اس چیز کو اپنی تعلیم سے خارج کر دیا اور صرف ذات کی بناء پر مکتی کا جو خیال تھا اس کو دور کیا گیا۔ جس کا تفصیلی ذکر بھگتی تحریک کے سلسلہ میں آئیگا۔

جس وقت کہ ویشنوی تحریک مختلف شکلوں سے سیوا اور جین متوں کے خلاف چل رہی تھی جنوبی ہند کے علاقہ کرناٹک میں شیوامت ایک نئے روپ یعنی لنگایت یا ویر سیوا فرقہ کی شکل میں نمودار ہوئی۔ بسوا بانی تحریک وجین سپہ سالار سلطنت چالوکیہ کا برہمن وزیر تھا بسوا ایک مصلح مذہب و مفکر تھا۔ بسوا کے عقاید اس قدر صاف اور عجیب ہیں کہ اُسے ایک نئے فرقہ کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ بسوا پران کی رو سے بسوا نندی کا اوتار ہے جس کو کہ شیو نے اپنے پرستش کو پھر سے زندہ کرنے کے لئے دنیا میں بھیجا۔ ویرا سیوامت اپنے عقاید و اصول کی نوعیت سے اُس وقت کے دیگر فرقوں سے بہت سی باتوں میں مختلف تھا۔ اولاً بسوا نے ورن آشرم دھرم (ذات پات) کو تسلیم نہیں کیا۔ بسوا۔ کالاچوری کے جین راجہ کا وزیر تھا۔ یہ دونوں ذات پات کے مخالف تھے لیکن ان کے درمیان چند اور عقاید کی بناء پر اختلاف ہوا۔ بسوا نے خزانہ سرکاری سے ایک کثیر رقم جنگم و لنگایت سنیریوں پر صرف کی جس سے راجہ ناراض ہو گیا۔ اور بسوا کو اس علاقہ سے نکل جانا پڑا۔ اس واقعہ کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ ۱۱۶۷ء میں ایک جنگم نے راجہ وجین کالاچوری کو قتل کیا جس سے جین اور لنگایت مذہب کے ہندوؤں میں دشمنی کی ابتداء ہوئی۔ رفتہ رفتہ اس مذہب کی اشاعت علاقہ کنتلا اور جنوبی مہاراشٹر میں ہونے لگی۔ بالآخر یہ جین دھرم کو علاقہ کرناٹک سے خارج کر کے رہا۔ اس فرقہ نے اُصول اہنسا کو تسلیم کر کے عوام کی تائید حاصل کی اور ساتھ ہی ذات پات کو تسلیم نہ کر کے برہمنوں کے سوائے اور دوسری ذاتوں خاص کر ویش اور شودروں کو اپنی طرف متوجہ کیا اس نے صاف طور پر برہمن تفوق کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور ہر شخص کو بلا تفریق ذات پات مکتی کے قابل بتلایا۔ جنوب کے ویشنو ذات پات کے اُصول سے خود کو آزاد نہ کر سکتے تھے۔

لیکن ویرسیوا فرقہ نے نہایت دلیری سے ذات پات کے اُصول کی مخالفت کی اور اُسی فرقہ کی بدولت برہمن اور دیگر ذاتوں حتیٰ کہ چنڈلیوں تک کے درمیان تعلقات قایم ہوئے۔ اِس فرقہ نے سنیاس اور تپ کے اُصولوں کی بھی مخالفت کی، اِس طرح جین مت سے بھی سبقت لے گیا۔ اس نے اس پر زور دیا کہ ہر شخص محنت کر کے اپنی زندگی بسر کرے اور مذہبی گداگری کی ممانعت کی۔ اِس مصلح مذہب نے تلقین کی کہ صرف محنت (کایکہ) کیلاش تک پہونچاتی ہے۔ وہ اخلاقی زندگی کی سختی سے پابندی کے باب میں جین اور بدھ متوں سے بھی آگے بڑھ گیا۔ لنگ کے روپ میں شیو کی پرستش کے قدیم طریق کو زندہ کیا گیا۔ اس فرقہ کے پیرو برہمنوں کے مقدس دھاگہ (جنیو) کے بجائے لنگ باندھتے ہیں۔ یہ پہلا مصلح ہے۔ جس نے اپنے مذہبی کتب کو سنسکرت زبان کے بجائے کرناٹک کی کنڑی زبان میں تصنیف کیا۔ اِس فرقہ کے عقائد کی رو سے عورتیں لنگ دھارن کر سکتی اور موکش حاصل کر سکتی ہیں۔ بسوا کی تصانیف میں شٹ ستھلا وچن۔ آلا گیان وچن۔ راج یوگ وچنا۔ زیادہ مشہور ہیں۔

اِس فرقہ کا دائرہ اِس قدر وسیع تھا کہ اس میں اچھوت بھی شامل ہو سکتے تھے۔ یہ اپنے مردوں کو جلانے کے بجائے دفن کرتے ہیں اور بیواؤں کو شادی کی اجازت ہے۔ اِس فرقہ کا سب سے بڑا مستحکم جنگل ورگ علاقہ ریاست میسور میں ہے۔ بسوا کا مشہور پیرو جن بسوا تھا جس کو کہ اِس فرقہ کے پیرو وشنو کا اوتار بتلاتے ہیں۔ اِس فرقہ کے عقائد سے اِس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اصلاح مذہب میں یہ فرقہ اور فرقوں سے بہت آگے بڑھ گیا۔ اور اس کے عقائد زیادہ عام فہم تھے جس کی وجہ سے عوام اِس طرف زیادہ راغب ہوئے۔ یہانتک کہ جین مت کو کرناٹک سے خارج ہونا پڑا۔ ذات پات کے اُصول سے انحراف و دیگر لبرل عقائد سے اِس بات کا قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اِس فرقہ کے بانی پر ضرور اسلام یا اسلامی عقائد کا اثر پڑا چونکہ جنوبی ہند کی عام فضا میں اِسلامی تعلیمات کا جو اثر تھا اس سے ظاہر ہے کہ

دراصل ایسا نہیں ہے۔

~~یہ لوگ غیر دانستہ طور پر متاثر ہوئے~~ ہوں گے۔

اس طرح پٹھانوں کے عہد کے ابتدائی دور میں مغربی ہند میں جین مت جنوب میں سیوامت اور مشرق و شمال میں وشنومت پھیل رہے تھے۔ جنوبی ہند کا ایک حصہ بھی ویشنوی عقائد سے متاثر تھا۔ ان مذہبی فرقوں میں اور بھی چھوٹے فرقے پیدا ہو رہے تھے۔ ان فرقوں نے مختلف دیوی دیوتاؤں کو اپنا سب سے اعلیٰ معبود مانا۔ نہ صرف اسی حد تک بلکہ دوسرے دیوتاؤں کو اپنے اعلیٰ دیوتا سے کم تر بتلانے کی کوشش کی۔ سیوا۔ وشنو فرقوں کے ساتھ ساتھ درگا یا دیوی اور گنیش کی پوجا کی ابتدا ہوئی اور ان دیوتاؤں کے آگم (طریق پرستش) جدا جدا تھے۔ ان مختلف فرقوں کی تعلیم سے ہندوؤں کی سماجی زندگی میں تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ اور عام لوگ بجائے فلسفیانہ مسائل پر بحث کرنے کے معمولی معمولی عقائد و اصول پر کہ کونسا دیوتا برتر ہے۔ برہمنوں کی حیثیت کیا ہے۔ مذہبی منتروں کے لئے تجوید ضروری ہے یا نہیں۔ آیا عورتیں نجات کے قابل سمجھے جا سکتے ہیں یا کیا۔ غرض اس قسم کے مسائل سے ہندوؤں میں اختلافات میں اضافہ ہوتا گیا۔

ان مختلف و متضاد فرقوں۔ اور منوں میں جو عقیدہ عام تھا وہ اصول اہنسا تھا ہر ایک فرقے نے گوشت خوری کی ممانعت کی اور جانورکشی کو ممنوع قرار دیا۔ شمالی ہند اور مہاراشٹر میں شیوامت کے پیرو کثیر تعداد میں تھے۔ یہ سمارت یعنے شنکر آچاریہ کے معتقد تھے۔ جس میں ہندوؤں کے پانچوں بڑے دیوتاؤں کو بڑا رتبہ دیا گیا تھا۔ مشرقی و جنوبی ہند میں ویشنو اور شیوا فرقوں کے درمیان جنھوں نے جین مت کی جگہ لی تھی آپس کی مخاصمت کے مظاہرے ہو رہے تھے۔ ان آئے دن کی فسادوں سے تنگ آ کر چند کو ان دو فرقوں کے اتحاد پیدا کرنے کا خیال ہوا۔ وجین سین نے جو شیوامت کا پیرو تھا ایک مندر ''پردمینشور'' کی تعمیر کی پردمینشور کی مورتی شیوا اور وشنو کے اتحاد سے بنی تھی۔ بنگال کے اس اتحادی جذبہ کا اظہار مہاراشٹر میں بھی ہوا۔ پنڈھرپور کے وٹھوبا کا مندر

اسی کوشش کا نتیجہ ہے۔ مہاراشٹر اور بنگال کے اس اتحادی تحریک میں فرق یہ تھا کہ وٹھوبا کے ساتھ گوپیوں کا قصہ نہ تھا حتیٰ کہ رکمنی دیوی کے بت کا بھی بعد میں ذکر ملتا ہے۔ وٹھوبا کی مورتی میں شیو اور وشنو دونوں کی جھلک موجود ہے۔ وٹھوبا کی پوجا اور بھگتی کی تحریک تیرہویں صدی میں شروع ہوئی۔ مہاراشٹر اور بنگال کے یہ مندر۔ دویت اور ادویت کے سائل سے پاک ہیں ان میں نہ تو شیومت کی مخالفت ہے اور نہ ویدک رسوم کی۔ ذات پات کی بھی کوئی سختی سے پابندی نہیں کیجاتی۔ بلکہ ہر ذات کے شخص کو اس مندر میں داخل ہونے اور پوجا کرنیکا حق حاصل ہے۔ غرضیکہ یہ بھگوت گیتا کی بھگتی لوگ کا اثر معلوم ہوتا ہے "پر دیشور" اور "وٹھوبا" کی پوجا میں جو جذبہ کام کر رہا تھا وہ تیرہویں وچودھویں صدی میں نام دیو (۱۲۷۰ء) گیانیشور و دیگر بھگتی مصلحین کی تعلیم کی شکل میں ظاہر ہوا۔

اس زمانے کے ہندوؤں میں مکتی وموکش یعنے حصول نجات کے متعلق جو مختلف خیالات ونظریئے تھے اُن کا ذکر اُن مختلف فرقوں کی تعلیمات میں موجود تھا۔ موکش سے مراد۔ جنم اور کرم سے آزاد ہونا اور معرفت حقیقی ہے۔ البیرونی نے ان کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے "ہندوؤں میں موکش یا نجات کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض کا عقیدہ ہے کہ صرف برہمن وکشتری ہی نجات پاسکتے ہیں کیونکہ صرف انہیں ہی کو ویدون کے پڑھنے کا اختیار ہے لیکن دوسروں کا خیال ہے کہ ہر ایک کو مکتی کا حق ہے۔ جیسا کہ ویاس نے کہا ہے "پچیس[۲۵] کا علم حاصل کرو بلا تفریق مذہب وذات نجات حاصل ہوگی"[۱] پھر بھگوت گیتا کی تلقین ہے کہ "ہر ایک عورت ویش اور شودر مجھ تک پہونچ سکینگے اگر وہ میری پیروی کریں دھرم برہمنوں تک ہی محدود نہیں ہے"[۲] البیرونی کا یہ بیان دسویں صدی کے بعد ہی ہندوؤں کی مذہبی زندگی کے صحیح مطالعہ کا

---

[۱] البیرونی کتاب الہند ترجمہ ساخو جلد اول صد ۱۰۳ ۔

[۲] " " " " " " صد ۱۰۴

نتیجہ ہے اُپنشدوں کے معتقد آریاؤں کا عقیدہ تھا کہ حصول موکش کا صحیح ذریعہ ترک دُنیا اور سنیاس ہے یہی خیال بودھ اور جینیوں نے لیا۔ برہمنوں نے عورتوں اور شودروں کو سنیاس لینے اور ویدوں کے مطالعہ کی اجازت نہ دی۔ اس طرح اُن کو مکتی کے ناقابل قرار دیا لیکن بھگوت گیتا نے اُن کو ایک اور ذریعہ نجات کا بتلایا۔ وہ یہ کہ چونکہ عورتوں اور شودروں کو ویدوں کے پڑھنے کا اختیار نہیں ہے پر بھی وہ بھگتی کے ذریعہ اس رتبہ کو پہونچ سکتے ہیں۔ ویاس نے گیان پر زور دیا جو سانکھیہ کی تعلیم تھی۔ اور تلقین کی کہ خدا کو پہچانو اور نجات پاؤ۔ بارہویں اور تیرہویں صدی میں جب برہمنوں کو زور ہوا۔ تو انھوں نے برہمن اور چھتری کے سوا کسی کو وید کے پڑھنے کی اجازت نہ دی۔ گو چھتریوں کو وید پڑھنے کی اجازت تھی لیکن بعد میں انھیں بھی سنیاس کا نااہل قرار دیکر مکتی کے ناقابل بنا دیا۔ اور اس عہد میں صرف برہمن ہی موکش کے حقدار سمجھے جانے لگے۔ وشنو نظریہ نجات۔ ویدانتی نظریہ سے مختلف تھا لیکن رامانج آچاریہ نے جو کٹر مذہبی تھے۔ سنیاس ہی کو ذریعہ نجات بتلایا۔ ویراشیوا نے بتلایا کہ ہر ایک انسان کو بشمول عورت نجات یعنی کیلاش میں شیو کی خدمت کا حق حاصل ہے بودھوں نے موکش کو نروان کہا اور نروان کے لئے سنیاس کو لازمی قرار دیا ساتھ ہی عورتوں کو بھی سنیاس کا اختیار دیا۔ جینیوں میں انتہائی ترک دنیا حصول نجات کے لئے ضروری تھی۔

اِن گوناگون تبدیلیوں اور مختلف مذہبی فرقوں کے وجود میں آنے و دیگر وجوہات سے جن کا بیان ہو چکا ہے قدیم ہندو مت یعنے ویدک آریوی مت نے اپنی شکل تبدیل کر کے ہندو مت کی شکل اختیار کی۔ ویدوں کا مطالعہ صرف ایک طبقہ یعنے برہمنوں تک محدود ہو گیا جو ویدوں کو حفظ کیا کرتے تھے۔ کیونکہ ویدوں کی حفاظت انھی کا فرض سمجھا جاتا تھا۔ البیرونی کا بیان ہے کہ بہت کم لوگ (برہمن) ویدوں کے معنے و مطلب کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے اکثر تو بغیر معنی سمجھے اُسے حفظ کرتے تھے۔ بودھ دور سے پہلے ہر ایک برہمن کشتری اور ویش کے لئے ویدوں کا مطالعہ ضروری تھا۔ اور اس عہد میں برہمن چھتریوں کو ویدوں کی تعلیم

تو دیتے ہیں لیکن چھتریوں کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ وہ برہمنوں تک کو سکھائیں۔ ویش اور شودروں کو ان کے مطالعہ کی اجازت نہیں ہے[1] چونکہ ویش طبقہ کے اکثر افراد بودھ مت کے پیرو تھے اس وجہ سے ان کا ویدوں سے تعلق جاتا رہا۔

ویدوں کو تحریر میں لانے کی ممانعت تھی کیونکہ اس کا تلفظ اور قرأت بعض خاص اصول کے تحت ہوتی تھی۔ اور اس خوف سے کہ کہیں کوئی غلطی سرزد نہ ہو جائے۔ اُن کو تحریر میں لانے کی کوشش نہیں کی جاتی یہی وجہ تھی کہ ویدوں کا کچھ حصہ ضائع اور فراموش ہو چکا تھا۔ اس عہد سے کچھ عرصہ قبل کشمیر کے ایک برہمن وشواکرا نے ویدوں کو تحریر میں لانے اور اُس پر تفسیر لکھنے کی کوشش کی۔ اس کا پتہ نہیں ہے کہ یہ تصنیف اس وقت موجود ہے یا نہیں۔ لیکن قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تیرہویں صدی میں مدھواچاریہ اور رودیا رنیا نے ویدوں کی تفسیر میں اس تصنیف سے مدد لی ہوگی۔

قدیم آریوں میں ویدک قربانیوں۔ ہوم اور یگین کا خاص رواج تھا۔ لیکن موجودہ عہد میں ویدوں کا اثر بہت کم ہو گیا تھا۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کسی گھر میں بھی ویدک آگ روشن نہیں کی جاتی تھی۔ دسویں صدی عیسوی میں بعض برہمن گھرانے ایسے باقی تھے جن میں ہوم اور یگین کئے جاتے تھے اور وہ برہمن جو ایک آگ روشن کرتے "اِستھن" کہلاتے۔ اور تین آگ روشن کرنیوالوں کو اگنی ہوتری کہا جاتا تھا۔[2] لیکن رفتہ رفتہ چودھویں صدی میں ویدک یگین اور رسوم کا وجود بہت کم ہو گیا بعض خاص رسوم مثلاً دان یعنے عطائے زمین یا مذہبی رسم گیئوپویت (اپ نین) زنار بندی اور شادی بیاہ کے وقت ویدک یگن اور ہوم کئے جاتے تھے۔ اور ساتھ ساتھ پورانک دیوتا وشنو اور شیو کی پوجا کی جاتی تھی۔ راجپوت راجاؤں میں بھی یہ رسوم یعنی

---

[1] البیرونی۔ ترجمہ ساخو جلد اول صفحہ ۱۲۸۔

[2] " " " " " ۱۰۲۔

آگ میں گھی ڈالکر ویدک منتروں کو پڑھنے کا رواج خاص خاص رسوم کے وقت موجود تھا حتیٰ کہ جین مت کے پیرو بھی اِن ویدک رسوم کے بعد دان قبول کرتے تھے[1] بالعموم ہندو مذہب پر پرانوں کا انتہا درجہ اثر تھا۔ ویدک طریق عبادت یعنے ترپن۔ ہون۔ سوریو اپاستھن کے بجائے پرانک دیوتاؤں شیو وشنو۔ دیوی اور گنیش کی پوجا عام تھی۔ اور سوریا دیوتا کی اپاسنا روزمرہ کی عبادت میں شامل تھی۔ ویدک سوتروں میں مورتی پوجا کا ذکر نہیں ہے اور نہ " ویدک ہند " میں مورتی پوجا کے وجود کا ہی حال ملتا ہے۔ لیکن بودھ مت کے زوال کے وقت گوتم بدھ کی مورتی عام طور پر پوجی جانے لگی۔ اور اس عہد کے تمام مندروں میں گوتم بودھ کی مورتیاں ملتی ہیں۔ اِسی وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں میں مورتی پوجا کا رواج بودھ مت کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ اور اسی عہد سے ہر گھر میں مورتی کی پوجا ہونے لگی۔ اور ہندو مندروں کی تعمیر کا سلسلہ جاری ہوا۔ اس زمانے کے مذہبی کتابوں میں مورتی پوجا کے طریقے اور ہدایات ملتے ہیں۔ راجاؤں کے دان پتروں میں مورتی پوجا کا ذکر ہے مندروں میں سونے چاندی اور قیمتی پتھروں کی مورتیاں ستاپن کیجانے لگیں۔ گیارہویں صدی میں مورتی پوجا عام تھی۔ ملک میں ہر طرف ہندو مندریں موجود تھیں۔ ہندو راجا اور دولتمند تاجر ان مندروں کی تعمیر میں ایک دوسرے سے سبقت لیجانیکی کوشش کرتے تھے۔[2] مسلمانوں کے آمد کے وقت مورتی پوجا عام ہندوؤں میں زیادہ رائج تھی اور تعلیم یافتہ پنڈتوں میں اُن کی زیادہ اہمیت نہ تھی۔ بارہویں اور تیرہویں صدی میں مندروں اور مورتی پوجا کی اہمیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور یہ چیز ان کی زندگی کا لازمی جزو بن گئی۔ اِس عہد کے کتبات میں مختلف مندروں دیوتاؤں اور اُن کی پوجا کا حال ملتا ہے۔ جس طرح جین اور بودھ دھرم کے مشنریوں راہبوں (بھکشوؤں) اور سنیاسوں کے لئے وہار موجود تھے اس طرح اسلامی

---

[1] سی۔ وی ویدیہ ڈاون فال صفحہ ۴۳۴۔ [2] سی۔ وی ویدیہ ڈاؤن فال صفحہ ۴۳۵۔

عہد کی ابتداء اور اُس کے بعد کی صدیوں میں ہندو مٹھوں کی تعمیر ہوتی گئی یہ مٹھ ہندو سنیاسیوں اور تپسیوں کی جائے سکونت تھے۔ بودھ مت کے زوال کے بعد اُن کے مٹھ پر ہندو قابض ہوگئے یہ اکثر مندروں کے قریب یا دریا کے کنارے ہوا کرتے تھے جہاں کے اُن مذہبی فرقوں کے راہب اور سرگردہ اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ اکثر راجا اور امراء ان وہاروں اور مٹھوں کو اپنے صرفہ سے تعمیر کرکے اُن کے حوالے کرتے تھے۔ جنوبی ہند میں یہ مٹھ کثیر تعداد میں تھے اور اب بھی ہیں۔

اِن مختلف فرقوں اور ہنتوں کے لاتعداد دیوی دیوتاؤں کے پوجا کے طریقے اور اُن کے پیرون کے تپ اور سنیاس کے صدہا اصول کے تعین کی خاطر بہت سی تنتروں کی ابتداء ہوئی یہ ہندوؤں کے پانچوں دیوتاؤں کے طریق عبادت سے متعلق ہیں۔ ان پانچ دیوتاؤں کے علاوہ جو دیوتا تھے اُن کے پوجا کے طریقے بھی الگ ہیں۔ ان فرقوں میں تمیز کی خاطر اُن کی علامات بھی جدا جدا رکھی گئی تھیں۔ جو پیشانی پر تیکون کی شکل میں ظاہر کی جاتی تہیں چونکہ ویدک تپ اور سنیاس صرف برہمنوں کے حد تک تھے اس لئے عام ہندوؤں کے لئے سنیاس اور تپ طریقے آگموں میں بتلائے گئے ہیں ان آگمون اور تنتروں کی ابتداء سری شنکر آچاریہ کے قبل ہی سے ہو چکی تھی لیکن دن بدن اُن کی اہمیت میں اضافہ ہوتا گیا اور خاصکر اس عہد کے کتبات میں بھی مختلف سنیاسیوں اور تپسیوں کا ذکر ہے۔

مذہبی ادب میں اضافہ کے ساتھ ساتھ مذہبی رسوم میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور ملک کے ہر حصہ میں دھرم شاستر کا مطالعہ عام ہوگیا۔ برہمن پنڈتوں نے ان رسوم پر بہت کچھ لکھا۔ وگیانیشور کی تصنیف متاکشرا اور راجہ اپرادیتہ کی " اپارکا " کے علاوہ بنگال میں بلّل سین کی دان ساگر وغیرہ تصنیف ہوئیں[1]۔ رائے لکشمن سین کے درباری پنڈتوں کے تصانیف میں برہم کرم سموچیہ

---

[1] فرکہر۔ اوٹ لین آف ہسٹری آف ریلیجیس لیٹریچر ان انڈیا۔

مشہور تصنیف ہے۔ قنوج میں گووند چندر کی سرپرستی میں دھرم شاستر پر مضامین لکھے گئے چودھویں صدی میں پنڈت ہیادری کی ضخیم تصنیف "چتور ورگ چنتامنی" تصنیف ہوئی[1]۔ ان تصنیفات میں ویدک آریوی مت پران اور تنتریک عہدوں سے گذرتی ہوئی ہندومت کی موجودہ شکل اختیار کرنیکا حال ملتا ہے۔ نئے نئے رسوم مثلاً ورت اور رتھ یاترا وغیرہ کی ابتدا اسی عہد میں ہوئی غرضیکہ پورانک دیوی دیوتاؤں اور رسوم نے قدیم ہندومت کی جگہ لیلی۔

پورانک ادب میں مذہبی فرقوں کی پیدائش سے اور بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ان پرانوں میں پانچ ہندو دیوتا۔ شیو وشنو۔ دیوی گنیش اور سوریہ کی عظمت اور برتری بتلائی گئی ہے۔ اور ان کے مختلف مندروں اور اُن کی اہمیت کا اظہار ہے۔ اٹھارہ سمرتیوں اور اٹھارہ پرانوں کے علاوہ گیارہویں صدی کے بعد سے بہت سی چھوٹی چھوٹی سمرتیوں اور پرانوں کا وجود ہوا۔ ان پرانوں اور سمرتیوں کے مطالعہ سے اس عہد کے ہندومت کا صحیح حال معلوم ہوتا ہے۔ مذہبی رسوم ورواج کی پابندی کی سختی کا یہ حال تھا کہ ان رسوم کے انجام نہ دینے پر ذات سے خارج کیا جاتا۔ ایک مرتبہ ذات سے خارج ہونے کے بعد دوبارہ اُس میں داخل ہونا دشوار تھا۔ جب کوئی ہندو مسلمان بنایا جاتا اور بعد میں اگر وہ پھر سے ہندو بننا چاہتا تو ممکن نہ تھا اس عہد کا ہندو دھرم انتہا درجہ عدم رواداری تھا۔

ابتدائی اسلامی دور کے ہندوؤں کی مذہبی زندگی پر ایک سرسری نظر کے بعد اُن کے عمرانی زندگی کے ایک اور پہلو یعنی تنظیم ذات پات کا مطالعہ ضروری ہے کیونکہ یہہ معاشری ادارہ ہندوؤں کی معاشرت کا بنیادی ادارہ ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ پر اس ادارہ کا اثر ہے۔ موجودہ ہندوستان کے ہندوؤں کی معاشرت میں ذات پات کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے ہر ہندوستانی واقف ہے۔ یہ ادارہ مختلف دور سے گذرا۔ اور یہانکی

---

[1] فرکہر۔ آوٹ لین آف ہسٹری آف ریلیجیس لیٹریچر ان انڈیا۔

معاشرتی تاریخ کے ہر دور میں اس کا وجود تھا۔ ویدک عہد کی تنظیم ذات پات اور موجودہ عہد کی تنظیم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ابتداء (ویدک عہد) میں اس ادارہ کی نوعیت تمام تر نسلی اور معاشی تھی علم معاشیات کے اہم اُصول تقسیم عمل پر اس کا انحصار تھا۔ لیکن تیسری صدی یعنی مشہور ہندو مقنن منو کے عہد میں اس کی نوعیت بدل گئی۔ اور یہ معاشی ادارہ معاشرتی زندگی کا اہم جزو بن گیا یہانتک کہ ابتداد زمانہ سے اُس نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا۔ اس تنظیم کے اصول و قوانین میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ اور اسلامی حکومت کے قیام کے وقت اس میں وہ تمام خصوصیات داخل ہوگئیں جو موجودہ عہد میں موجود ہیں۔ ابتدا میں ذاتیں بجائے مذہبی طبقوں کے معاشرتی طبقے خیال کئے جاتے تھے لیکن رفتہ رفتہ ان پر مذہبی رنگ غالب آگیا۔ پھر ان ذاتوں کی تقسیم در تقسیم ہونے لگی۔ اور صدہا فرقے بن گئے۔ برہمن کشتری۔ ویش اور شودر کے علاوہ اور ذاتیں وجود میں آئیں اور ہر ایک ذات بہت سی فرقوں میں منقسم ہوگئی۔ ان فرقوں میں آپس میں شادیاں اور کھانا پینا ممنوع ہوگیا۔ اس طرح اسلامی عہد کے ابتدا میں ہندو قوم کا عمرانی اتحاد ان صدہا ذاتوں کے وجود سے فنا ہوگیا۔ اس تنظیم کے خلاف بدھ مت نے زبردست صدائے احتجاج بلند کی اور اس کو اپنی زندگی سے خارج کر دیا تھا لیکن جونہی بودھ مت کو زوال اور برہمنیت غالب ہوئی از سرنو یہ تنظیم نئے جوش سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے اُصولوں میں سخت گیری پیدا ہوگئی۔

دسویں صدی عیسوی میں پنجاب کی سماجی زندگی کے متعلق لکھتے ہوئے البیرونی کا بیان ہے کہ "چاروں ذاتوں کے افراد آپس میں ایک دوسرے کے پاس کھاتے اور ایک جگہ بود باش کرتے ہیں[1]" البیرونی کا یہ بیان صرف پنجاب کے ہندوؤں کی حدتک

---

[1] البیرونی ترجمہ سانحو جلد (۱) صفحہ ۹۹ تا ۱۰۱۔

صحیح تھا جہاں کہ تقریباً تمام باشندے گوشت خور تھے لیکن ہندوستان کے دوسرے حصص میں حالات مختلف تھے۔ اگر دسویں صدی میں یہ حالت تھی تو بعد کی صدیوں میں اور اسباب کے علاوہ عقیدۂ اہنسا کی اشاعت سے حالات بہت جلد بدل گئے۔ دسویں صدی تک چار ذاتیں بنیہ تقسیم در تقسیم ہوئے قایم رہیں۔ گیارہویں صدی کے بعد سے ہر ایک ذات میں متعدد ذاتیں پیدا ہوگئیں جس کا اظہار اس عہد کے کتبات سے ہوتا ہے۔ ان ذاتوں کے اس طرح پارہ پارہ ہونے کے وجوہ ایک تو غیر ملکیوں کی آمد سے نسلی پاکیزگی اور برتری کا خیال دوسرے غذا میں اختلاف تیسرے مختلف حصص ملک کے رسم و رواج میں اختلاف یہ وہ اسباب تھے جن سے ہر ایک ذات، اور فرقہ کا دائرہ محدود ہوگیا۔

اس ابتدائی عہد کے ذات پات کے مطالعے سے ہمیں بعد میں چلکر یہاں کی معاشرت پر جو اسلامی اثرات ہوئے اور اسلامی اثرات سے ہندوؤں میں جو معاشری تحریکیں پیدا ہوئیں ان کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ اسلامی عہد کے قبل دسویں صدی تک تمام ملک کے برہمن صرف ایک ہی ذات کے تھے۔ اور ان میں تمیز صرف اُن کے گوترا اور شاکہہ سے ہوتی تھی۔ گیارہویں صدی کے ابتدا تک یہی عمل ہوتا رہا۔ ۱۰۵۰ء کا ایک چندیلہ کتبہ معطی کو بھارد واج گوتر۔ تری پرورا۔ برہمن اور یجروید شاکہہ کا بتلاتا ہے ۱۱۷۰ء کے ایک کالاچوری کتبہ میں برہمنوں کے صرف گوترا و شاکہہ کا ذکر ہے[1] اس کے بعد ان برہمنوں کے جائے سکونت کا نام آتا گیا یعنے کسی برہمن کا نگر برہمن یا ٹھاکر برہمن ہونا ظاہر کیا گیا ہے۔ پھر ملک کا نام جس کا کہ وہ باشندہ ہے شامل ہوگیا (مالوہ کا کتبہ ۱۱۳۵ء)[2] جائے سکونت اور ملک کی اس قدر اہمیت ہوگئی۔ کہ بعد کے بعض کتبوں میں گوترا و پرورکے بجائے صرف ملک کا نام ہے ۱۴۵۶ء اور ۱۲۰۰ء کے کتبوں میں گوترو غیرہ کے بجائے

---

[1] اپی گرافیکا انڈیکا جلد (۲) صفحہ ۸۶۔ [2] انڈین انٹیکوری جلد (۱۴)

صرف فرقہ یا جاتی کا نام آگیا[1]۔ رفتہ رفتہ خاندانی نام کی اس قدر اہمیت ہوگئی کہ ہر برہمن کے نام کے ساتھ خاندانی موجود تھا۔ یہ نام۔ دکیشت۔ اوت۔ ٹھاکر۔ پہاٹک۔ اپادھیائے پٹوردھن۔ پنڈت۔ دروویدی اور چترویدی وغیرہ ہیں[2]۔ ان خاندانوں اور فرقوں کے نام کے ساتھ ان کی جائے سکونت، مثلاً متھرا۔ ترپور۔ ڈنڈوانہ وغیرہ کے نام بھی لگائے جانے لگے۔ ان فرقوں کے درمیان رفتہ رفتہ شادیاں بھی بند ہونے لگیں۔ منو کے عہد میں صرف ہم گوتر نہ ہونا ہی شادی کی شرط تھی لیکن تبدیلی زمانہ سے ان برہمنوں کے چھوٹے چھوٹے فرقوں کے درمیان شادی بیاہ اور کھانے پینے کے تعلقات مفقود ہوگئے تیرہویں صدی سے پنج گوڑ اور پنج دراوڑ۔ سمارت۔ سہری ویشنو اور مدہوا وغیرہ کی تفریق شروع ہوئی۔ تقریباً تمام برہمنوں میں گوشت خوری اور منشیات کا استعمال ممنوع تھا۔ اور گوتر کی اہمیت تمام فرقوں میں موجود تھی ان برہمن فرقوں اور ذاتوں کے علاوہ سیاح مارکو پولو (سنہ ۱۲۹۳ء) جنوبی ہند کے ایک اور فرقہ لاڈ برہمن کا ذکر کرتا ہے[3]۔

چھتریوں میں حکمران طبقہ "راجپوت" کے نام سے موسوم ہوگیا۔ اور ان کے دوسرے طبقے جو زراعت پیشہ تھے ان کی وقعت میں کمی ہوگئی۔ قدیم سے عام طور پر حکمران خاندان خواہ وہ کسی ذات کا کیوں نہ ہو چھتری ذات میں شمار کیا جاتا تھا اور جب پرانوں کے عہد کے خاتمہ پر راجپوت دور شروع ہوا تمام راجپوت کشتری سمجھے جانے لگے۔ عام طور پر جنوبی ہند کے حکمران خاندانوں کو خالص کشتری نسل سے سمجھا نہیں جاتا تھا۔ پھر بھی مہاراشٹر کے حکمران خالص چھتری ہونیکا دعویٰ کرتے تھے اور شمال کے راجپوت راجاؤں سے ازدواجی تعلقات

---

[1] انڈین انٹیکوری جلد (۱۱) صفحہ ۲۔

[2] اپی گرافیکا انڈیکا جلد (۹) صفحہ ۱۰۸ و ۱۲۱۔

[3] میس یول۔ انڈیکا مارکو پولو۔ جلد دوم صفحہ ۳۶۰۔

قایم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ راجپوتوں میں قبیلہ کے نام کی اس قدر اہمیت تھی کہ کتبات میں قبیلہ کو گوتر بتلایا گیا ہے مثلاً گہیل گوتر پرتی ہار اگوتر وغیرہ۔ پرتھی راج راسو میں مختلف چھتری خاندانوں کی فہرست موجود ہے۔ لیکن مہاراشٹر کے سلہار خاندان کے سوائے جنوبی ہند کے گنگا چولا۔ پانڈیا اور کیرالا خاندانوں کے نام اس فہرست میں نظر نہیں آتے۔ اس کا یہی مطلب ہوسکتا ہے کہ جنوبی ہند کے ان خاندانوں کو خالص چھتری نسل سے نہیں سمجھا جاتا تھا۔ شمال کے راجپوت راجا۔ دکن کے ان چھتری خاندانوں سے ازدواجی تعلقات قایم کرنا ہتک خیال کرتے تھے۔ اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ سنہ ۱۳۰۰ء میں گجرات کے راجہ کرن واگھیلہ نے دیوگری کے یادو راجہ کو اپنی بیٹی دیول دیوی کو دینے سے صرف اسی بنا پر انکار کیا کہ وہ خالص چھتری نسل سے نہ تھا۔ پنجاب کے مغربی حصہ کے چھتریوں میں سے اکثر محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کے عہد میں مسلمان بن گئے جو اب تک قدیم کھتری قبیلوں کے نام استعمال کرتے ہیں اور بعض ہندو رسوم برتتے ہیں۔ بچوں کی پیدایش اور شادی کے موقعوں پر برہمنوں کو بلاتے ہیں۔ اس طرح راجپوت یا چھتری ذات اس زمانے میں تین طبقوں میں منقسم تھی۔ پہلا طبقہ (۳۶) خاندانوں پر مشتمل تھا جو راجپوتانہ۔ کاٹھیاواڑ، گجرات مالوہ اور صوبہ متحدہ کے علاقوں میں آباد تھے۔ دوسرے ہمالیہ کے مغربی علاقوں میں اور تیسرا جنوبی ہند کے حکمران خاندانوں کا تھا۔ ان تین طبقوں کے درمیان شادی بیاہ و کھانے پینے کے تعلقات قایم نہ تھے۔ ان تین طبقوں کے علاوہ جو زراعت پیشہ چھتری تھے اُن کو کم تر درجہ حاصل تھا۔

ویش ذات بھی مذہبی فرقوں کے اعتبار سے تقسیم ہوگئی۔ شمالی ہند کے اکثر ویش جین مت کے تھے ہمالیہ کے علاقوں کے ویش سیو است کی پیروی کرتے تھے۔ اور جنوبی ہند میں شیو۔ رامانج اور ویرسیوا دیشوں کی آبادی تھی۔

شودر ذات میں اپنے پیشوں اور مقام سکونت کے لحاظ سے مختلف چھوٹے چھوٹے

طبقے پیدا ہوئے اور اُن کی معاشرتی زندگی بھی اُنہی طبقوں تک محدود ہو گئی۔ اِن چار ذاتوں میں جو صدہا فرقے پیدا ہوئے وہ زیادہ تر دسویں صدی سے تیرہویں صدی تک کے عرصہ میں وجود میں آئے کیونکہ البیرونی اپنے عہد میں اِن صدہا فرقوں اور اُن کے ایسی مغایرت کا ذکر نہیں کرتا۔

اِن چار ذاتوں کے علاوہ ایک اور طبقہ اچھوت کا حال بھی قدیم سے ملتا ہے جس میں اور ذاتوں کی طرح بہت سے فرقے موجود تھے۔ لیکن اُن کی نوعیت مذہبی نہ تھی بلکہ پیشہ وری تھی۔ اُن کی بود و باش گاؤں اور قصبات کے باہر یعنی آبادی سے دُور ہوا کرتی تھی۔ میدا (خاکروب) اور چنڈال (جلاد) اِسی ذات سے ہوتے تھے۔

ذات پات کی بنیاد نسلی تفریق اور پیشوں پر منحصر تھی۔ شودر اور اچھوت طبقے ڈراوڑی نسل سے تھے۔ پیشے کے لحاظ سے برہمن کے سپرد تعلیم و تعلّم اور مذہبی رسوم کی ادائیگی تھی۔ چھتریوں یا راجپوتوں کے ذمّے تحفظ و انتظام مملکت اور سپہ گری تھی۔ ویش جو بودھ دور سے قبل زراعت پیشہ تھے بعد میں تاجر بن گئے۔ اور اس وقت زراعت صنعت و دستکاری شودر اور اچھوتوں کے ہاتھوں میں تھی۔ راجپوت نظم مملکت و سپہ گری کے علاوہ دوسرے علوم و فنون میں بھی کافی مہارت رکھتے تھے۔

ہندستانی مالیات

دوسرا حصہ

از

جناب ڈاکٹر جعفر حسن صاحب پی، ایچ، ڈی، صدر شعبۂ عمرانیات جامعہ عثمانیہ سرکارعالی

"اچھی مالیات آمدنی حاصل کرنے سے زیادہ خرچ کرنے کے طریقوں پر منحصر ہے"

(گلیڈ سٹن)

اخراجات کی سرگزشت

خانگی مالیات اور سرکاری مالیات کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم نے بیان کیا تھا کہ خانگی مالیات میں آمدنی کو اخراجات پر اہمیت حاصل ہے اور سرکاری مالیات میں اخراجات آمدنی پر مقدم ہیں۔ چونکہ سرکاری آمدنی کا بہت بڑا جزو محصولوں کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور محصولوں میں اضافہ اخراجات کی شدت اہمیت کے مطابق کیا جاتا ہے لہٰذا محصولوں کا تعین کرنے کے لئے اخراجات کا معین کیا جانا ضروری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عام طور پر حکومتیں من مانے طریق کے مطابق یا استحصال نما محصولوں سے آمدنی حاصل کرکے خود غرضیوں اور تنگ نظریوں پر لٹا دیتی ہیں مگر جہاں تک نظری مالیات کا تعلق ہے اصولی اعتبار سے اخراجات کو آمدنی پر اہمیت حاصل ہے چنانچہ حقیقت میں ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ کے زمانے میں یا کسی بہت بڑے سانحے کے بعد مثلاً بھونچال کے بعد یا بڑی مصیبت مثلاً قحط کے زمانے میں فوری اخراجات کی اہمیت کے مدنظر محصولوں میں اضافہ ہوتا ہے نیز دوسرے طریقوں سے

آمدنی بڑھائی جاتی ہے۔ عوام بھی سرکاری ضرورتوں کی شدت کے مدنظر ایسے زائد بار کو خاموشی سے گوارا کر لیتے ہیں جو وہ عام حالات میں کبھی قبول نہ کرتے۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کہ سرکاری مالیات میں اخراجات کو آمدنی پر فوقیت حاصل ہے اور ہونی چاہیئے بیشمار تاریخی اور عصری مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ہر روشن خیال، ترقی پسند، ہمدرد، اور بہی خواہ حاکم کے عہد میں بیسیوں قسم کی ضرورتیں محسوس ہوتی ہیں جن کا تعلق فلاح عامہ سے ہے۔ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے آمدنی حاصل کیجاتی ہے اور کوشش ہوتی ہے کہ اس آمدنی میں اضافہ کیا جائے۔ اس کے برعکس ہر خود غرض، تنگ نظر اور بے فکرے حاکم کے عہد میں عوام کی شدید ترین ضرورتوں سے بھی غفلت برتی جاتی ہے۔

موجودہ زمانے میں بھی ایسی ترقی پذیر حکومتیں ہیں جو ہر قسم کی اصلاحی، تمدنی، تعلیمی، صنعتی، زراعتی، اور فنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے آمدنی حاصل کرنا اور بڑھانا چاہتی ہیں اور دوسری طرف ایسی بھی حکومتوں کی کمی نہیں جو قحط سالی کے زمانے میں فلاکت زدہ رعایا کے لئے پیسہ خرچ کرنے یا جبری تعلیم کے لئے پیسہ فراہم کرنے سے انجان ہو جاتی ہیں۔ موجودہ زمانے میں ایک طرف ایسی حکومتیں ہیں جن کا آئینی فرض ہے کہ وہ ساری آبادی کی خوشحالی کا اہتمام کریں اور دوسری طرف ایسی بھی حکومتیں جو ان فرائض سے بالکل لاعلم ہیں اور موقع بے موقع اعلان کرتی رہتی ہیں کہ حکومتیں کتنوں کی مدد کریں؟ حکومت کتنوں کو نوکری دے؟

روشن خیال، ترقی پسند اور فرض شناس حکومتیں بخوشی اُن لوگوں کی امداد کرتی ہیں جو نئے نئے کارخانے جاری کرنا چاہتے ہیں، یا پرانے کارخانوں کو ترقی دینا چاہتے ہیں یا جدید اور بہتر طریقے پر کاشت کرنا چاہتے ہیں یا بیمہ کمپنی کا کاروبار پھیلانا چاہتے ہیں کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ ہر صورت میں بے روزگاروں کے لئے روزگار کا مسئلہ حل ہوگا، ملک کی دولت و پیدائش دولت کی طاقت میں اضافہ ہوگا، پنپنے والے کارخانوں اور ان کے متعلقہ افراد سے حکومت کو نفع ہوگا، اور کچھ نہیں تو محصول آمدنی زیادہ حاصل ہوگا! اس کے برعکس دنیا میں جتنی حکومتیں

غفلت اور رعونت کا شکار بنی ہوئی ہیں وہ نئے نئے کارخانوں یا صنعتوں کے قائم کرنے میں مدد دینا تو بڑی بات ہے پرانے کارخانوں اور مصیبت زدہ صنعتوں کو ذرا سا سہارا دے کر یقینی بربادی سے نہیں بچاتیں وہ اس درجہ حاکمیت میں مبتلا ہیں اور اس قدر اپنے فرائض سے غافل ہیں کہ اپنے حلقہ بگوش افراد اور موروثی یا دائمی خوشامد پسندوں کو نوکریاں، بھتے خطاب اور منصب دینے کے علاوہ صناعوں، کاریگروں، تاجروں، کسانوں اور مزدوروں کی بقاء و فلاح سے قطعاً بے خبر اور لاپرواہ ہیں نہ ان کی تعلیم و تربیت کا خاطر خواہ خیال کیا جاتا ہے نہ بے روزگاروں کی پرواہ کی جاتی ہے، نہ تہذیب و شائستگی کو سنبھالنے اور ابھارنے کی فکر ہے صرف راجدھانی کی شاہراہوں اور دو چار بڑے بڑے محلوں کی آرائش کر دی جاتی ہے اور شہر کے بقیہ حصوں اور قصبوں اور گاؤں کی طرف سے بے رخی اور چشم پوشی برتی جاتی ہے اگر ترقی ہو بھی رہی ہے تو انتہائی سست رفتار پر جو دوسرے ترقی پذیر ملکوں کے مقابلہ میں ناقابلِ لحاظ ہے۔

ملک و قوم کی مجموعی ضرورتوں کا خیال کر کے عام مرفہ الحالی اور مالیات نے سرکاری آمدنی کو خرچ کرنے کے بعض اہم اصول معلوم کئے ہیں سب سے پہلے اخراجات میں حفاظت ملک کا لحاظ مقدم ہے۔ ہر حکومت کا اولین فرض یہی ہے اور رہنا چاہیئے کہ ملک کو بیرونی حملہ آوروں اور اندرونی مفسدوں سے محفوظ رکھے اور امن و امان قائم رہے اس غرض کو حاصل کرنے اور ملک و قوم کو بیرونی حملوں اور خانہ جنگیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے جو اخراجات کئے جائیں وہ سب سے زیادہ ضروری اور سب سے زیادہ مقدم ہیں یہ مانا ہوا اصول ہے مگر "ملک کی حفاظت" کی خاطر" ملک کی توسیع" کے لئے یا "سلطنت کی سطوت" کے لئے ڈراؤنی فوجوں کا اکٹھا کرنا، حرب و ضرب کے مہلک آلے پیدا کرنا، اپنی فوجی طاقت کے بیجا مظاہروں سے پڑوسی سلطنتوں کو مرعوب بلکہ مشتعل کرنا، دوسری ریاستوں کے اندرونی معاملوں میں خواہ مخواہ دخل اندازی کر کے لشکر کشی اور مردم کشی پر آمادہ ہونا، قومیت کی

آڑمیں سامراجیت ، بین اقوامیت کے بھیس میں نادرشاہی اُصول پر عمل کرنا نہ صرف ملکی مفاد کے سراسر خلاف بلکہ بین اقوامی اَمن اور ذاتی فائدے کے بالکل برعکس اور متضاد ہے ۔

اخراجات کا دوسرا اُصول "مفاد عامہ" ہے ۔ یعنے سرکاری آمدنی ایسی چیزوں پر خرچ کرنی چاہیئے جن سے عوام فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور جو بالآخر ملک کی عظیم اکثریت کے حق میں مفید ثابت ہوں ، ایسے محکموں اور اداروں کو قومی تعمیری محکمے کہا جاتا ہے اور ان سے مراد تعلیمات ، آبپاشی ، حفظ صحت ، گاؤں سدھار ، اِتحاد باہمی ، حفاظت جنگل ، بن بسائی ، تعمیرات زراعت اور صنعت و حرفت کے محکموں اور تحریکوں سے ہے ۔

سرکاری اخراجات کا تیسرا اُصول فائدہ مند یا پیدا آور غرض و غایت ہونی چاہیئے یعنے یہ کہ سرکاری اخراجات میں بھی جہاں تک ممکن ہو اس امر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ آمدنی پیدا آور اغراض پر صرف ہو مثلاً ایسی نہریں ، تالاب اور بندرگاہیں بنانا جن سے اِتنی آمدنی حاصل ہو کہ اِن نہروں ، تالابوں اور بندرگاہوں کی لاگت کا سود ملتا رہے اور رفتہ رفتہ اصل لاگت حاصل ہو جائے اور آخر کار وہ قومی سرمایہ کا جزو بنکر دائمی مرفہ الحالی کا ذریعہ ہو جائیں ۔ خود کفیل اور فائدہ بخش ریلیں ، نئے نئے کارخانے ، تالابوں ، ندیوں اور زیر اثر سمندروں میں مچھلیوں کی نفع بخش نگہداشت اور پرورش پیدا آور غرض و غایت کی دوسری مثالیں ہیں ۔

اخراجات کا چوتھا اُصول یہ ہے کہ اُن کی وجہ سے تہذیب و شائستگی میں ترقی ہو اور قوم کا عام معیار زندگی اِنسانوں کے شایان شان رتبہ سے گرنے نہ پائے ۔ گذشتہ صدیوں کے تجربے اور موجودہ حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قوم تہذیب و شائستگی میں اس وقت تک ترقی نہیں کرتی تا وقتیکہ حکومت کی طرف سے تہذیب و شائستگی کے لئے منظم کوشش نہ کی جائے ۔ اِنسانوں کی فطرت ہی کچھ ایسی ہے اور بشریت کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ وہ خود غرضیوں اور نفس پرستیوں میں آلودہ ہوتا ہے ، اسے فوری

فائدے کی ایسی ہوس ہوتی ہے کہ شاذ ونادر ہی اسے دور کا فائدہ نظر آسکتا ہے۔ بیشتر انسانوں کا مذاق اس قدر پست ہوتا ہے کہ وہ نفسانیت کو بھڑکانے والی چیزوں کے لئے دائمی مفاد اور عرصے تک قائم رہنے والی قدر و قیمت کی پرواہ نہیں کرتے!

قدرت کا یہ اٹل قانون معلوم ہوتا ہے کہ چند ہی لوگوں میں سنجیدہ مذاق، دردمند دل، دوراندیش طبیعت اور ہمدرد فطرت ودیعت کی جاتی ہے۔ ان ہی ہمدرد، روشن خیال، متبقل شناس اور بامذاق لوگوں پر عظیم اکثریت کی مخالفت اور بے تعلقی کے باوجود تہذیب و شائستگی کو خاطر خواہ معیار پر برقرار رکھنے اور ترقی دینے کا بار پڑتا ہے۔ یہی لوگ علوم، فنون لطیفہ، زبان و ادب کے حامی اور سرپرست ہوسکتے ہیں، اِن ہی کی کوششوں سے علم و ہنر کا چراغ روشن رہ سکتا ہے۔

اگر عوام کی مرضی اور قوم کی رائے شماری پر علم و ہنر کی قدردانی منحصر ہو تو چند ہی سال میں بڑی بڑی درس گاہیں اور تحقیقی ادارے، مصوری اور نقاشی کے نگارخانے ختم ہوجائیں گے، تمام بڑے بڑے فلسفی اور شاعر، ادیب اور محقق، مفکر اور ہنرداں بھوکوں مرجائیں گے اور خود "قوم" نہ صرف پست تر معیار تہذیب پر اُتر آئیگی بلکہ اُس کا معیار زندگی اور معیار آرام اتنا گھٹ جائیگا کہ زندگی دوبھر ہوجائیگی۔

کون ہے جو آرام نہیں چاہتا؟ خوشنما باغ، تفریح گاہیں، دلچسپ فلم، بے گردی سڑکیں، آرام دہ سواریاں کسے نہیں چاہئیں؟ دُکھ درد ہوتا ہے تو کون ہے جو برائے نام معاوضہ پر علاج کا متمنی نہیں ہوتا؟ کون ہے جسے اپنے ملک و قوم کی یادگار تعمیری، ادبی یا فنی کمالوں پر فخر کا احساس نہیں ہوتا؟ لوگ آرام تو چاہتے ہیں، اپنے ملک و قوم کے کمالوں پر کبھی نہ کبھی فخر تو کرتے ہیں مگر اکثر لوگ یہ جانتے ہی نہیں اور اگر جانتے بھی ہیں تو اس کا احساس نہیں کرتے کہ تہذیب و شائستگی کا سرچشمہ مادی مرفہ الحالی ہے اور خوشحالی کا ماخذ علوم و فنون ہیں!!!

سینکڑوں درس گاہوں میں لاکھوں طالب علموں کو جب تعلیم دیجاتی ہے تب ہی کوئی ایسا موجد نکلتا ہے جس کی ایجادوں سے سب کو آرام پہنچتا ہے! ہزاروں طالب علم جب تحقیق و تفتیش میں جانیں کھپاتے ہیں تب ہی چند کو ایسی کامیابی نصیب ہوتی ہے جس سے بہتیروں کا فایدہ ہوتا ہے۔

اجنٹا کی نقاشی پر ماہر اور عامی، فن دان اور سیاح سب خوش ہوتے ہیں! تاج محل مقبرہ ہونے کی حیثیت سے ایک طرح افسردگی پیدا کرنے والی مایوس گاہ ہے مگر اس کی رونق، خوبصورتی اور جاذبیت لاکھوں لوگوں کو خوش کرتی ہے! دور دور سے سیاح آتے ہیں، ہندستان کا نام اس کی وجہ سے منور ہوتا رہتا ہے! کروڑوں کو تعلیم دینے کے بعد ٹیگور، اقبال اور رامن پیدا ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وطن کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل رہی ہے!

ہر سنجیدہ ہندستانی کی یہ حسرت ہے کہ جس طرح فلسفہ و ادب، شاعری اور مصوری، صنعت و حرفت، زراعت و تجارت، فن کاری اور فن دانی میں ہندستان قدیم زمانے اور مغل بادشاہوں کے زمانے میں معراج کمال پر پہنچا ہوا تھا اسی طرح وہ پھر علم و ادب، کمال و ہنر، صنعت و حرفت زراعت و تجارت میں ترقی کرے! ہم دولت مند اور مرفہ الحال بنیں فوجی طاقت، تدبر، حکمت، سائنس، اور فنون لطیفہ اور زبان و ادب میں ترقی پذیر قوموں کے برابر ترقی کریں! یعنے ہمارا عام معیار تہذیب و شائستگی برتر اور بلند تر ہو۔

یہ سب کچھ ناممکن ہے تاوقتیکہ حکومتیں علم و ادب، ہنر و کمال کو سنبھالنے اور ترقی دینے کی مستقل اور مسلسل کوشش نہ کریں۔ جب تک حکومتیں فنی درسگاہیں، تجارتی مدرسے صنعتی تربیت گاہیں قائم نہ کرینگی اور مصوری، نقاشی اور اداکاری جیسے فنون لطیفہ کی سرپرستی نہیں کرینگی یہ ناممکن ہوگا کہ ہم ہر جہتی ترقی کرسکیں، یورپ کی تجارتی اور صنعتی ترقی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ وہ لوگ نہ صرف عمدہ چیزیں بناتے ہیں بلکہ نت نئے ڈزائن اور

سجاوٹوں کے ساتھ کارآمد چیزوں کو پبلک تک پہنچاتے ہیں اور اُنھیں دیکھکر خواہ مخواہ ان چیزوں کو حاصل کرنے کی تمنا ہوتی ہے۔ ہزاروں قسم کے رنگوں اور رنگی ملاوٹوں میں چیزیں بنا بنا کر یورپ نے ترقی کی! ایک ہی قسم کی مٹھائی کو مختلف شکلوں میں ڈھال کر اور پھول پتیوں سے سجانے کے بعد مختلف رنگین ڈبوں میں پیش کیا اور چاکلیٹ کی تجارت کو غیر معمولی فروغ دیا۔ اِسی طرح مغربی عطر کو نہ صرف مختلف طریقوں سے بنایا بلکہ بھانت بھانت کی شیشیوں میں ڈالکر نئی نئی وضعوں میں پیش کیا۔ یورپ کی صنعتیں ترقی پذیر ہیں ہماری صنعتیں جمودی حالت میں ہیں! تیس سال قبل جس طرح مٹھیاں بنتی اور سجائی جاتی تھیں اسی طرح اب بھی بنائی جاتی ہیں! عطار اَب بھی پرانی بد وضع شیشی میں اُسیطرح عطر بیچتے ہیں جس طرح اُن کے باپ دادا بلکہ پڑدادا اور سگردادا بیچا کرتے تھے!

یورپ اور امریکہ کے فلم محض اس لئے شوق سے نہیں دیکھے جاتے کیونکہ وہ حاکموں کے بنائے ہوئے فلم ہیں! ان فلموں میں اداکاری، آواز بندی اور فوٹوگرافی کا معیار اس قدر بلند ہوتا ہے کہ سنجیدہ اور شوقین لوگ ان کے یکساں دلدادہ ہوتے ہیں!

یورپ اور امریکہ کی سبق آموز، دلچسپ اور تفریحی کتابیں لوگ محض اِس لئے نہیں پڑھتے کیونکہ یہ "صاحبوں" کی لکھی ہوئی ہوتی ہیں بلکہ اِس لئے بھی کہ اُن میں کاغذ اچھا ہوتا ہے کاغذ سے بہتر لکھائی چھپائی ہوتی ہے، جابجا سادہ اور رنگین تصویریں رہتی ہیں ساتھ ہی کارآمد اور دلچسپ مضمونوں کا معیار قابل رشک ہوتا ہے! اس کے برعکس ہمارے یہاں کی کتابیں اور رسالے طباعتی غلطیوں کی وجہ سے پھیکے رد ہوتی ہیں! ان کا طباعتی معیار معمولی بلکہ اکثر گھٹیا ہوتا ہے! یہ بھی ایک وجہ ہے کہ خود ہندوستانی اپنی زبان کے تفریحی اور دلچسپ ادب کی طرف توجہ نہیں کرتے اور یورپی اور امریکی ادب کے دلدادہ ہوتے ہیں۔

یورپ کے تھیٹر، یورپ کے تصویر گھر، یورپ کے عجائب خانے، یورپ کے نگار خانے یورپ کی تفریح گاہیں، لاکھوں کے لئے معقول ذرائع معاش ہیں اور مغربی مرفہ الحالی کا

ایک اہم ذریعہ ہیں۔ ان میں سے بیشتر ہم لوگوں کے لئے قابل رشک اور قابل تقلید ہیں، ہمارے ہاں بھی تو بھانڈ اور نقال، گویئے اور اُستاد، سوانگی، اور بہروپئے ہیں؛ ہمارے ہاں بھی تو کتابیں لکھی جاتی ہیں، اخبار چھپتے ہیں، رسالے نکلتے ہیں، ہمارے ہاں بھی تو ناٹک اور سینما ہیں؛ مطالعہ گھر، اور کتب خانے ہیں، قہوہ خانے اور اور قسم کی تفریح گاہیں ہیں؛ ہمارے ہاں بھی تو گانا بجانا ناچ رنگ سب ہی کچھ ہوتا ہے؛ ہمارے ہاں بھی تو کھلونے بنائے جاتے ہیں اور میلے تہوار ہوتے ہیں؛ ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت کی نگرانی اور سرپرستی میں مختلف علوم و فنون کی ترقی ہو تاکہ دھچڑے اور گوبر کے کھلونے، چھچھور کتابیں اور بھنگم تصویریں رفتہ رفتہ مفقود ہو جائیں اور ہمارے ہاں بھی اچھے اچھے تعلیمی اور تفریحی فلموں کی نمائش کرنے والے سینما گھر، بامذاق اور تربیت بخش مگر ساتھ ہی دلچسپ اور مفید ڈراموں کو پیش کرنے والے تھیٹر، ہر قسم کی کتابوں، رسالوں اور اخباروں کو مہیا کرنے والے متعدد کتب خانے اور مطالعہ گھر، مذاق حسن اور لطف زیست کو دوبالا کرنے والے نگار خانے اور تصویر گھر قایم ہو سکیں۔ یہ سب کچھ حکومت کی منظم کوشش اور ہمدردانہ سرپرستی سے ہو سکتا ہے۔ وقتاً فوقتاً موزوں مقاموں اور موزوں اوقات پر مثلاً میلے، تہوار، عرس یا جاترا کے موقع پر نمائش کا انتظام کرکے حکومت نہ صرف قوم کی مرفہ الحالی میں ترقی کا باعث بن سکتی ہے بلکہ عوام کے مذاق حسن اور مذاقِ ادب پر عمدہ اثر ڈال سکتی ہے۔ اسی طرح مخطوطوں کی قدر کرنا، پرانی مطبوعات اور قلمی تصویریں مرکزی مقاموں پر فراہم کرنا، تصویر گھر اور عجائب خانے قائم کرنا، علمی و ادبی رسالوں کی سرپرستی کرنا، محققوں، ادیبوں، بلند پایہ مفکروں، اور شاعروں، بلند درجہ مصوروں، نقاشوں، اداکاروں کی پرورش کرنا، بے زبان مخلوق اور جنگل کے جانوروں کو ظلم اور غارت گری سے بچانا، قدرت کی حسن کاریوں اور خوشنما منظروں کو انسان کی غارت پسندی اور بربریت سے بچانا صرف حکومت ہی سے ممکن ہے؛ لہذا یہ حکومت کے فرائض میں داخل ہے اور ہونا چاہیئے کہ وہ

اِنسان کے اَنمول کارناموں اور قدرت کے بے بدل کمالوں اور حُسن کاریوں کو محفوظ رکھنے کے لئے تہذیبی اخراجات برداشت کرے! حکومتوں کی غفلت اور نادانی سے اِنسان کے بنائے ہوئے اور قدرت کے پیدا کئے ہوئے ایسے ایسے نمونے تباہ ہو گئے ہیں جن کی تلافی ناممکن ہے اور موجودہ نسل اِن نعمتوں سے کس قدر محروم ہوگئی ہے اس کا علم واحساس ہی چند لوگوں کو ہے! یہ ہر حکومت کا فرض ہے کہ کم سے کم آئندہ آنے والی نسلیں اِنسان کے بنائے ہوئے اور قدرت کے پیدا کئے ہوئے شہکاروں سے حتی المقدور محروم نہ ہوں! متمدن ہندستان کا کیسا ناقابل تلافی نقصان ہوگا اگر انسانی بربریت اور غارت پسندی کی وجہ سے اَجنٹا کے غار، تاج محل کا روضہ، مدہورا کا مندر اور دہلی کی جامع مسجد ناپید ہو جائیں! ہندستان کے علم و اَدب کا دیا جھلملانے لگیگا۔ اگر شکنتلا کے سمجھنے والے، غالب کے اِلہامی اَشعار سے لطف اَندوز ہونے والے، دانائے راز کی حکمت کے جاننے والے، تان سین کی راگ راگنیوں کو مضراب کی چھیڑ سے زندہ کرنے والے جو چند لوگ ہیں وہ بھی ہماری بدقسمتی اور شوربختی سے ناپید ہو جائیں! کیا ہی بدقسمت دن ہوگا اگر تکا رام کی روحانی نظمیں، سورداس جی کے بھجن تلسی داس جی کی لاثانی رامائن یا ان کے کچھ حصّے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناپید ہو جائیں!

کتنے سرسبز علاقے خود ہندستان میں تھے جو انسانوں کی غفلت کی وجہ سے اپنی اصلی زرخیزی کھو بیٹھے! کیسے کیسے وسیع جنگل اِنسانوں نے تباہ ہونے دیئے اور اپنے ملک کی آب وہوا اور زرخیزی کو نقصان دہ طریقے پر متاثر ہونے دیا! کیسے کیسے خوشنما اور جاذب نظر مورتیوں اور قدرتی پتھروں کو اِنسانوں نے نفع یا تنگ نظری سے برباد کیا جس کی تلافی نہیں ہوسکتی!!

غنیمت ہے کہ حاکموں کی مخالفت اور اَمیروں کی غفلت کے باوجود اب تک اتنی شہکار چیزیں اور شہ پارے محفوظ رہ گئے ہیں اور قدرت کی فیاضی کی مثالیں اب بھی بہت ہیں۔ اِن کا بچانا اور اپنی تمدنی میراث کو سنبھالنے اور ترقی دینے کے لئے اخراجات گوارا کرنا

ہر حکومت کا اہم فرض ہے۔

حفاظت، مفاد عامہ، پیدا آور غرض و غایت اور تہذیب و تمدن کی ترقی؛ ان ہی کی خاطر سرکاری اخراجات ہونے چاہیں اور ان ہی کی روشنی میں کسی ملک کے سرکاری اخراجات پر تنقید ہو سکتی ہے۔ کھلم کھلا تنقید یا اظہار خیال کا ہمیں یوں ہی بہت کم موقع حاصل تھا جنگ اور حفاظت ملک کے بہانے مخالفانہ تنقید کا امکان اور بھی کم ہو گیا ہے۔ تاہم دبی زبان میں اور اشاروں میں جہاں تک کہنا ممکن ہو گا کہا جائیگا۔ چاہے ذاتی مفاد اور مصلحت کا تقاضہ ہی اس کے متضاد ہو؛ میرا یہ راسخ عقیدہ ہے کہ تا وقیتکہ دلیری اور صاف گوئی سے کام نہیں لیا جائیگا۔ تحقیق کا حقیقی مقصد حاصل نہ ہوگا، کیونکہ حکومتوں کی ہمنوائی کرنا تحقیق کا لازمی مقصد نہیں۔

مرکزی حکومت ہند کے اخراجات

مرکزی حکومت ہند کے اخراجات جدید ترین بجٹ ۱۹۴۰-۴۱ء سے حاصل کئے گئے ہیں۔ ۱۹۴۰-۴۱ء کے بجٹ میں دیئے ہوئے اعداد تین برسوں سے متعلق ہیں ۱۹۴۰-۴۱ء کے اعداد صرف قیاسی ہیں۔ ۱۹۳۹-۴۰ء کے اعداد ترمیم شدہ موازنے کے مطابق متوقع اخراجات ہیں اور ۱۹۳۸-۳۹ء کے اعداد حقیقی ہیں بجٹ کے اعداد میں بسا اوقات بہت فرق ہوتا ہے ترمیم شدہ موازنے کے اعداد میں بھی کمی بیشی ہوتی ہے اس لئے ۱۹۳۸-۳۹ء کے حقیقی اخراجات پیش ہیں۔

۱۔ حفاظتی خدمتیں (فوج، ہوائی بیڑہ، سمندری بیڑہ)	۵۲،۰۶،۹۰،۰۰۰
۲۔ ریلیں	۲۹،۹۲،۷۷،۰۰۰
۳۔ سود	۱۴،۱۲،۲۹،۰۰۰

۴۔ سیول تنظیم (تفصیل کے لئے دوسری جدول دیکھئے)	۱۰،۸۹،۷۱،۰۰۰
۵۔ صوبائی حکومتوں کو امدادی گرانٹ	۳،۰۴،۷۲،۰۰۰
۶۔ بڑھاپا الاونس اور پنشن	۲،۸۱،۴۴،۰۰۰
۷۔ سیول کام	۲،۵۱،۷۲،۰۰۰
۸۔ کروڑگیری کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۱،۱۹،۵۵،۰۰۰
۹۔ نمک 〃 〃 〃	۱،۰۳،۸۵،۰۰۰
۱۰۔ پٹہ خانے میں لگائے ہوئے سرمایہ کا سود	۷۳،۷۴،۰۰۰
۱۱۔ محصول آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۶۶،۸۲،۰۰۰
۱۲۔ چھپائی اور اسٹیشنری	۵۳،۳۱،۰۰۰
۱۳۔ مرکزی آبکاری حاصل کرنیکا خرچ	۴۵،۷۵،۰۰۰
۱۴۔ سکہ سازی اور کرنسی	۳۵،۷۵،۰۰۰
۱۵۔ متفرق	۲۷،۳۴،۰۰۰
۱۶۔ افیون کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۲۵،۵۶،۰۰۰
۱۷۔ جنگلوں سے 〃 〃 〃	۲۲،۶۵،۰۰۰
۱۸۔ اسٹمپ کی 〃 〃 〃	۱۶،۸۱،۰۰۰
۱۹۔ آبپاشی	۹،۸۰،۰۰۰
۲۰۔ کارپوریشن ٹیکس 〃 〃	۸،۹۳،۰۰۰
۲۱۔ صوبائی آبکاری کی آمدنی 〃 〃	۶،۲۲،۰۰۰
۲۲۔ مالگزاری کی 〃 〃 〃	۴،۹۱،۰۰۰
۲۳۔ ڈاک گھروں اور تار گھروں میں لاگت	۳،۹۶،۰۰۰
۲۴۔ موٹرسواری ٹیکس کے اخراجات	۲،۳۳،۰۰۰

سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء سے مرکزی حکومت ہند کے مجموعی سالانہ اخراجات یہ تھے:۔[1]

سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء	۱،۳۶،۲۰،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء	۱،۳۳،۴۰،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء	۱،۲۳،۹۰،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء	۱،۱۹،۳۷،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء	۱،۲۱،۷۶،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۵-۳۶ء	۱،۲۱،۰۷،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء	۱،۱۹،۶۲،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۷-۳۸ء	۱،۲۲،۵۰،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء	۱،۲۱،۷۶،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء ترمیمی اندازہ	۱،۲۳،۹۶،[illegible]،۰۰۰
سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء بجٹ	۱،۳۱،۶۸،۰۰،۰۰۰

ان اعداد سے واضح ہے کہ ہندستان کی مرکزی حکومت کے سالانہ اخراجات کا اوسط تقریباً ایک ارب ۲۵ کروڑ ہے۔

---

[1] تمام اعداد مرکزی حکومت کی شائع کی ہوئی کتابوں سے لئے گئے ہیں مثلاً سنہ ۱۹۲۳-۲۴ء سے سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء تک کے اعداد Statistical Abstract کی ۱۵ ویں اشاعت (مطبوعہ دہلی سنہ ۱۹۳۹ء) کے صفحہ ۲۸۹ اور ۲۹۰ سے ماخوذ ہیں۔ جدید برسوں کے اعداد سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء کے جنرل بجٹ سے لئے گئے ہیں۔

مرکزی حکومت ہند کے خالص اخراجات

مالیات اور شماریات کی کتابیں دیکھنے والوں اور بجٹ کا بغور مطالعہ کرنے والوں نے یہ ضرور نوٹ کیا ہوگا کہ جن محکموں پر یا جن مدوں پر خرچ ہوتا ہے ان میں سے اکثر سے کچھ نہ کچھ آمدنی بھی ہوتی ہے۔ جس منطقی دلیل کے مطابق ہم نے "خالص آمدنیاں" بیان کی ہیں اسی طرح ہمیں خالص اخراجات بیان کرنے چاہیں۔ خرچ کرنے والے محکمے یا اخراجاتی محکمے (Spending Debts) جو کچھ آمدنی حاصل کرتے ہیں اسے متعلقہ محکمہ کے کل خرچ سے منہا کرنے کے بعد جو رقم خرچ ہوتی ہے وہی خالص خرچ ہے۔

اکثر محکموں کا کل خرچ اور خالص خرچ مختلف ہوتا ہے کیونکہ کل خرچ اور خالص خرچ کی رقمیں مختلف ہوسکتی اور عام طور پر ہوتی بھی ہیں۔ بعض محکمے جن پر بظاہر بہت خرچ ہوتا ہے خود بھی اتنا کما لیتے ہیں کہ ان کا خرچ اتنا اہم نہیں ہوتا اور دوسرے محکمے جن سے بظاہر بہت آمدنی ہوتی ہے دراصل اخراجاتی محکمے ہوتے ہیں یا آمدنی کے قریب قریب یا آمدنی کا تین چوتھائی خود ہی خرچ کر بیٹھتے ہیں اس لئے ان کی بہت آمدنی خرچ کی وجہ سے تھوڑی ہوجاتی ہے۔

کل خرچ اور خالص خرچ میں فرق معلوم کرنے کا خیال مجھے کئی بار ہوا تھا مگر اعداد کو یکجا کرنے اور تفریق کی جھنجھٹ سے پریشان ہوکر میں نے کبھی کوشش نہیں کی کہ خالص آمدنی اور خالص اخراجات کے گوشوارے یا جدولیں تیار کروں، اس مرتبہ جہاں اور بھی جدولیں تیار کی ہیں میں نے یہ کام بھی انجام دیدیا ہے جہاں تک مجھ سے بن پڑا بار بار حساب کرکے صحت کی امکانی کوشش کی گئی مگر تنہا اتنے مختلف حساب کرنے میں سہواً غلطیاں ہوئی ہونگی۔ اگرچہ توقع نہیں کہ ان کی اہمیت زیادہ ہو تاہم اگر کوئی صاحب ازراہ نوازش ان غلطیوں پر متوجہ کریں گے تو باعث ممنونیت ہوگا۔

اس جدول میں مرکزی حکومت ہند کے جدید ترین بجٹ (بابتہ ۴۱-۱۹۴۰ء) سے

سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء کے حقیقی اعداد لئے گئے ہیں۔ سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء کے اعداد ترمیمی بجٹ کے اعداد ہیں اور سنہ ۴۱-۱۹۴۰ء کے محض متوقع اعداد ہیں۔ لہذا سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء کے حقیقی اعداد کے مطابق حساب کیا گیا ہے اور جدول کی ترتیب اخراجات کی رقمی اہمیت کے مطابق کی گئی ہے۔

سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء میں مرکزی حکومت ہند کے خالص اخراجات

۱۔ فوج (حفاظتی خدمتیں)	۴۶،۱۸،۰۰،۰۰۰
۲۔ سود	۱۳،۳۸،۵۴،۰۰۰
۳۔ صوبائی حکومتوں کو امداد	۳،۰۴،۷۲،۰۰۰
۴۔ بڑھاپا الاؤنس اور پنشن	۲،۷۳،۴۹،۰۰۰
۵۔ سیول کام	۲،۱۹،۴۹،۰۰۰
۶۔ قبیلائی علاقے	۱،۹۹،۲۱،۰۰۰
۷۔ عام تنظیم	۱،۸۶،۵۷،۰۰۰
۸۔ تاج کے نمائندے کو ادائی	۱،۲۶،۰۴،۰۰۰
۹۔ تنقیح	۹۸،۸۹،۰۰۰
۱۰۔ علمی تحقیقی محکمے)	۶۷،۰۹،۰۰۰
۱۱۔ خارجی بیرونی معاملے	۶۳،۸۷،۰۰۰
۱۲۔ زراعت	۴۷،۸۷،۰۰۰
۱۳۔ مذہب	۳۰،۲۵،۰۰۰
۱۴۔ چھپائی اور اسٹیشنری	۲۹،۹۹،۰۰۰
۱۵۔ پولیس	۲۸،۶۴،۰۰۰
۱۶۔ [illegible]	۲۸،۳۶،[illegible]

۱۷	تعلیم	۲۱،۸۶،۰۰۰
۱۸	جیل خانے اور مجرم گاہیں	۲۱،۶۹،۰۰۰
۱۹	علاج	۱۸،۳۳،۰۰۰
۲۰	لاسلکی (براڈکاسٹنگ)	۱۳،۱۸،۰۰۰
۲۱	آبپاشی کے کاموں میں لاگت	۹،۸۰،۰۰۰
۲۲	صحت عامہ	۹،۳۸،۰۰۰
۲۳	صنعت وحرفت	۸،۲۶،۰۰۰
۲۴	عدالت	۷،۳۴،۰۰۰
۲۵	بندرگاہیں اور ناخدائی	۵،۵۰،۰۰۰
۲۶	پٹہ خانوں اور تارگھروں میں لاگت	۳،۹۶،۰۰۰
۲۷	جنگل	۲،۷۴،۰۰۰
۲۸	ہندستانی سٹور کا محکمہ	۱،۹۹،۰۰۰
۲۹	متفرق ادائیاں (صوبوں کو)	۱،۶۱،۰۰۰
۳۰	باہمی امداد	۵۷،۰۰۰
۳۱	جانوروں کا علاج	۴۴،۰۰۰
۳۲	پنشنوں کا عوض	۴۲،۰۰۰
۳۳	نمک کے کاموں میں لاگت	۱۴،۰۰۰
۳۴	قحط	۱۴،۰۰۰
۳۵	روشنی گھر اور روشن کشتیاں	۴،۰۰۰
	خالص خرچ کی میزان	۷۷،۹۸،۴۱،۰۰۰

خالص اخراجات کی جدول کا مقابلہ کل اخراجات کی جدول سے کر کے دیکھئے آپ چند باتیں ضرور نوٹ کریں گے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ہندوستان میں خرچ کی دو اہم ترین مدیں ——— غیر پیدا آور ہیں! فوج اور سود!!

خالص اخراجات کی میزان تقریباً ۸۰ کروڑ ہوتی ہے جس میں سے ۴۶ کروڑ سے زیادہ فوج پر صرف ہوتا ہے گویا ہندوستان اپنی حفاظت پر اپنی آمدنی کا ۵۷ فی صد صرف کرتا ہے!

دونوں جدولوں کا مقابلہ بغور کرنے سے بعض اور باتیں معلوم ہوتی ہیں مثلاً یہی کہ مرکزی حکومت ——— مذہب پر ۳۰ لاکھ صرف کرتی ہے اور تعلیم پر بیس لاکھ! بیسویں صدی میں تعلیم سے زیادہ مذہب کے نام سے خرچ کرنا اندھیر ہے اور جب ہم اس بات کا خیال کرتے ہیں کہ حکومت زیادہ تر ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں سے آمدنی حاصل کرتی ہے مگر مذہب کے نام سے جو تیس لاکھ سالانہ صرف ہوتا ہے اس کا تقریباً تمام حصہ پادریوں کی تنخواہوں، گرجاؤں کی نگہداشت، عیسائیت کی تبلیغ پر صرف کر دیتی ہے تو ہمیں مذہبی اخراجات کی غیر منصفانہ نوعیت پر دس گونہ حیرت ہوتی ہے۔

مذہبی اخراجات کی تفصیل بھی آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں؟ تاکہ آپ کو اور زیادہ یقین ہو جائے کہ مرکزی حکومت کے خرچ کردہ تیس لاکھ میں سے تقریباً تمام عیسائیوں کو مل رہا ہے! ایک سرکاری اشاعت ہی سے میں نے یہ تفصیل معلوم کی ہے[1]

کلیسائے انگلستان	۱۶،۴۸،۰۰۰
" روم	۳،۴۷،۰۰۰
" سکاٹ لینڈ	۲،۰۲،۰۰۰
میتھوڈسٹ، یونیائیڈ بورڈ چرچ وغیرہ	۱،۲۵،۰۰۰
مختلف کلیساؤں کے مبلغوں کی تنخواہوں وغیرہ کی میزان	۲۳،۲۲،۰۰۰

[1] ... صفحہ ۲۵۱

گرجاؤں کی تعمیر	۴،۷۰،۰۰۰
عیسائیوں کے قبرستانوں کی حفاظت	۱،۴۶،۰۰۰
تعطیل پر انگلستان گئے ہوئے یا پنشن یافتہ پادریوں کا معاوضہ	۶،۵۰،۰۰۰
	۲۵،۸۸،۰۰۰

بقیہ ۴ لاکھ ۱۲ ہزار کیونکر خرچ ہوئے اس کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی! البتہ یہ ضرور معلوم ہوا کہ مذہبی نوعیت کے سرکاری اخراجات صرف ۳۰ لاکھ سالانہ نہیں ہوتے کیونکہ فوج اور ریلوے میں بھی مذہب کے نام سے اخراجات ہوتے ہیں اُن کی مجموعی رقم ۶ لاکھ ہوتی ہے!

عیسائیت کی مقدس تعلیم ہم مفت میں نہیں حاصل کر رہے ہیں۔ ایک تہائی کروڑ سے زیادہ تو صرف مرکزی حکومت کے باضابطہ اخراجات میں داخل ہے! اس کے علاوہ مختلف ناموں اور بہانوں سے نہ جانے کتنا سرکاری روپیہ صرف ہوتا ہے! مختلف صوبے اور دیسی ریاستیں، مقامی حکومتیں اور سرکاری اقتدار سے حاصل کردہ چندوں سے جو کچھ لیا جاتا ہے اس کی میزان ایک کروڑ سالانہ سے کیا کم ہوتی ہوگی!؟

چند دن قبل ۴۲-۱۹۴۱ء کا بجٹ بھی شائع ہوا ہے۔ اس میں ۳۹-۱۹۳۸ء سے موجودہ سال تک خالص آمدنی اور خالص اخراجات دیئے ہیں نیز مالی سال کی مختصر کیفیت یعنے بچت اور خسارہ کے اعداد بھی دیئے ہیں۔ یہ بہت سبق آموز اعداد ہیں اور ان سے موجودہ مالی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مرکزی حکومت ہند کے اخراجات[1]

	خالص آمدنی	خالص اخراجات	بچت	زائد اخراجات
۳۹-۱۹۳۸ء	۸۰ کروڑ ۲۵ لاکھ	۸۰ کروڑ ۵۷ لاکھ	+	۳۲ - لاکھ

---

[1] ۴۲-۱۹۴۱ء کا بجٹ۔ دوسرا حصہ۔ عام بجٹ صفحہ ۹۵ (مطبوعہ گورنمنٹ پریس نئی دہلی ۱۹۴۱ء)

سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء	۹۱ کروڑ ۲۰ لاکھ	۹۰ کروڑ ۹۳ لاکھ	۲۷ لاکھ +
سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء	۸۰ ″ ۱۴ ″	۹۱ ″ ۶۲ ″	۱۱ کروڑ ۵۸ لاکھ
سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء	۷۷ ″ ۲۹ ″	۸۹ ″ ۰۴ ″	۱۱ ″ ۷۵ ″
سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء	۸۲ ″ ۸۴ ″	۸۱ ″ ۲۹ ″	۱ کروڑ ۵۵ لاکھ +
سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء	۷۵ ″ ۴۳ ″	۷۴ ″ ۸۰ ″	۶۳ ″ +
سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء	۸۰ ″ ۷۵ ″	۸۰ ″ ۳۹ ″	۳۶ ″ +
سنہ ۱۹۳۵-۳۶ء	۷۸ ″ ۲۹ ″	۷۸ ″ ۲۹ ″	بالکل برابر
سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء	۷۵ ″ ۷۱ ″	۷۷ ″ ۵۰ ″	۱ کروڑ ۷۹ لاکھ
سنہ ۱۹۳۷-۳۸ء	۸۱ ″ ۲۹ ″	۸۱ ″ ۱۹ ″	بالکل برابر
سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء	۷۸ ″ ۴۹ ″	۷۹ ″ ۱۳ ″	۶۴ ″
سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء	۸۸ ″ ۸۲ ″	۸۸ ″ ۸۳ ″	بالکل برابر
سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء (ترمیمی اندازہ)	۹۷ ″ ۲۳ ″	۱۰۵ ″ ۶۵ ″	۸ کروڑ ۴۲ لاکھ
سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء بجٹ	۱۰۵ ″ ۷۸ ″	۱۱۹ ″ ۶۳ ″	۱۳ ″ ۱۵ ″

سنہ ۱۹۳۹ء کی پہلی ستمبر کو دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا اور اسی کا لازمی اثر ہے کہ ہمارے موازنہ پر اخراجات کا بار پڑ رہا ہے۔ جدید ترین متوقع اخراجات متوقع آمدنی سے تقریباً ۱۴ کروڑ زیادہ ہوں گے!

مرکزی حکومت ہند کے فرائض اور اخراجات کا نوعیتی تجزیہ

مرکزی حکومت ہند کے اخراجات کو سمجھنے کے لئے ان کا نوعیتی تجزیہ بھی بہت مفید ہو سکتا ہے چنانچہ ہیں نے حکومت ہند کے موجودہ قانون (سنہ ۱۹۳۵ء) سے مرکزی حکومت کے فرائض کی تقسیم کی ہے اور ہر نوعیت کے ذیلی عنوان قائم کئے ہیں نیز سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء کے

حقیقی اعداد کے مطابق جدید ترین اخراجات دیئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کیفیت کا مطالعہ کرنے سے ہمیں نہ صرف موجودہ دستور کے مطابق مرکزی حکومت کے فرائض معلوم ہو جاتے ہیں بلکہ ان فرائض کی انجام دہی میں گورنمنٹ جو کچھ خرچ کرتی ہے اس کی مختصر کیفیت بھی معلوم ہو جاتی ہے۔

مرکزی حکومت ہند کے فرائض کو میں نے ۶ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) حفاظت اور سیاست (۲) تنظیم (۳) کاروباری محکمے (۴) علمی ادارے۔ (۵) تمدنی فرائض اور (۶) متفرق۔

ظاہر ہے کہ ہر نوعیت کے تحت جو ذیلی عنوان میں نے قائم کئے ہیں ان میں اختلاف رائے ممکن ہے۔ مثلاً تمدنی فرائض میں سے بعض کا شمار تنظیمی فرائض میں ہو سکتا ہے اور براڈکاسٹنگ یعنے نشرگاہوں کا شمار کاروباری محکموں کی بجائے تمدنی فرائض میں بھی ممکن ہے۔ تمدنی تقسیم میں اختلاف رائے کی گنجائش بہت ہوتی ہے بہرحال توقع ہے کہ مرکزی حکومت ہند کے فرائض اور اخراجات کا نوعیتی تجزیہ موجودہ دستور اور اس کی بدولت پیدا ہونے والے اخراجات کا خاکہ پیش نظر ہو جائیگا۔ اس سلسلہ میں تمام اعداد ۱۹۴۰-۴۱ء کے حالیہ بجٹ سے حاصل کئے گئے ہیں۔

حفاظت اور سیاست

صفحہ		۱۹۳۹-۴۰ء میں کل خرچ	آمدنی	خالص خرچ
۳۷۵	(۱) دفاعی خدمتیں (فوج، ہوائی بیڑہ اور سمندری بیڑہ)	۵۰،۲۶،۴۳،۰۰۰	۷۲،۵۲،۰۰۰	۴۹،۵۴،۹۱،۰۰۰
۲۵۸	(ب) سرحدی قبیلہ واری علاقے	۱،۸۸،۵۹،۰۰۰	×	۱،۸۸،۵۹،۰۰۰[۱]

[۱] اسی رقم میں سے مجلس اقوام کو ۱۰ لاکھ دیئے گئے تھے! یہ معلوم ہی نہ تھا کہ مجلس اقوام ابھی زندہ ہے اور

(پ) بیرونی معاملے	۶۹٬۵۶٬۰۰۰	×	۶۹٬۵۶٬۰۰۰
(ت) تاج کے نمایندے کو ادائیاں	۱٬۶۲٬۷۲٬۰۰۰	۲۱٬۷٬۰۰۰	۱٬۴۱٬۵۰٬۰۰۰[1]

تنظیم

(ا) مختلف تنظیمی ادارے اور محکمے ۱٬۹۴٬۰۵٬۰۰۰

[اسی رقم میں وائسرائے کی تنخواہ شامل ہے ۲٬۵۰٬۰۰۰
وائسرائے کا سکریٹریٹ ۴٬۰۶٬۰۰۰
وائسرائے کا سفرخرچ ۵٬۶۶٬۰۰۰]

(ب) تنقیح ۹۷٬۰۵٬۰۰۰

(پ) وفاقی عدالت ۲٬۴۲٬۰۰۰

کاروباری ادارے

(ا) ریلیں اخراجات سے زیادہ آمدنی ہے خصوصاً جنگ کی وجہ سے

(ب) ڈاک خانے اور تار گھر سے بھی مرکزی حکومت کو خالص نفع ہوتا ہے۔

(پ) ٹیلیفون کا سررشتہ بھی ڈاک خانے سے متعلق لہٰذا نفع بخش ہے۔

(ت)	۲۵٬۵۱٬۰۰۰	۱۰٬۴۷٬۰۰۰	۱۵٬۰۴٬۰۰۰
(ث) پرواز	۳۵٬۳۴٬۰۰۰	۱٬۶۴٬۰۰۰	۳۳٬۷۰٬۰۰۰

[بقیہ حاشیہ صفحہ (۵۵)] ہندستان سے بھی اسے ۱۰ لاکھ سالانہ ملتے ہیں۔

[1] سیاسی محکمے اور دیسی ریاستوں میں گورنر جنرل کے نمایندوں کے اخراجات اسی میں شامل ہیں

علمی اور تعلیمی ادارے

(۱) موسم کے متعلق باخبر رکھنے والا سررشتہ (موسمیاتی محکمہ)	۱۹،۶۴،۰۰۰
(۲) ہندستان کی پیمائش	۱۸،۹۱،۰۰۰
(۳) ہندستان کی ارضیاتی تفتیش (سروے)	۳،۹۶،۰۰۰
(۴) " " حیوانیاتی تفتیش	۱،۴۵،۰۰۰
(۵) " " نباتیاتی "	۵۱،۰۰۰
(۶) انجمنوں اور اداروں کی امداد اور عطیئے	۲،۴۷،۰۰۰
(۷) تعلیم (بنارس یونیورسٹی اور علیگڈھ یونیورسٹی کو سالانہ چندہ اسی گنجائش سے عطا کیا جاتا ہے کیونکہ یہ دونوں یونیورسٹیاں مرکزی حکومت کے تحت ہیں مسلم یونیورسٹی کو سالانہ ۳ لاکھ دیئے جاتے ہیں)	۲۲،۲۵،۰۰۰ (خالص خرچ)

تمدنی فرائض

(ا) قدیم یادگاروں کی حفاظت (آثار قدیمہ)	۱۰،۴۵،۰۰۰
(ب) فوجی عجائب خانہ اور دوسرے مرکزی حکومت کے عجائب خانے	۲۴،۰۰۰
(پ) روشنی گھر اور روشن کشتیاں	۵،۰۰۰

متفرق

(ا) عیسائی پادریوں کی تنخواہیں اور پنشن اور گرجاؤں کی تعمیر ۳۰،۲۲،۰۰۰
اسی میں تقریباً ۱½ لاکھ کی وہ رقم شامل ہے جو عیسائیوں کے

قبرستانوں پر مرکزی حکومت ہند کی فیاضی، دریا دلی
انصاف اور مساوات کی وجہ سے خرچ ہوتا ہے۔

مرکزی حکومت کے اخراجات کا نوعیتی تجزیہ مکمل نہیں ہے اور نہ جزوی تفصیل دیجا سکتی ہے پھر بھی اس تجزیہ سے مرکزی حکومت کے فرائض کا علم تھوڑا بہت ہوجاتا ہے۔ بنارس کی ہندو یونیورسٹی اور علیگڈھ کی مسلم یونیورسٹی، رانچی کا ذہنی شفاخانہ، امپریل لائبریری کلکتہ (شاہی کتب خانہ) فوجی عجائب گھر، قدیم تاریخی یادگاروں کی کھوج اور ان کی حفاظت، یوریپینوں کے قبرستانوں کی نگرانی اور حفاظت ان فرائض میں داخل ہیں جن کا ذکر ۱۹۳۵ء کے قانون ہند میں بطور خاص کیا گیا ہے اور انھیں مرکزی حکومت ہند کی ذمہ داریوں میں شامل کیا گیا ہے۔

صوبائی حکومتوں کے اخراجات

ہمیں معلوم ہے کہ ہندستان میں گیارہ صوبے ہیں اور قانون حکومت ہند کے مطابق صوبائی حکومتوں کے ذرائع آمدنی اور خرچ کی مدیں مقرر ہیں۔ آمدنی کے باب میں ہم نے ۳۸-۱۹۳۷ء کے اعداد و شمار دیئے تھے مگر حال ہی میں ۴۰-۱۹۳۹ء کے بھی حقیقی اعداد شائع ہوگئے ہیں۔ اس لئے ہم ایک مشترکہ جدول میں آمدنی اور اخراجات کے جدید ترین اعداد پیش کرتے ہیں۔ ترتیب میں رقمی اہمیتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

۴۰-۱۹۳۹ء میں صوبوں کی آمدنی اور اخراجات

صوبے کا نام	آمدنی	اخراجات	زائد آمدنی یا بچت +	زائد اخراجات یا خسارہ
مدراس	۱۶،۶۵،۹۰،۰۰۰	۱۶،۳۷،۳۹،۰۰۰	+۲۸،۵۱،۰۰۰	

بنگال	۱۴،۳۱،۶۷،۰۰۰	۱۳،۷۱،۲۴،۰۰۰	+۶۰،۴۳،۰۰۰
متحدہ صوبے آگرہ اور اودھ	۱۳،۵۲،۰۸،۰۰۰	۱۳،۴۴،۵۲،۰۰۰	+۷،۵۶،۰۰۰
بمبئی	۱۳،۱۴،۲۳،۰۰۰	۱۲،۸۳،۲۷،۰۰۰	+۳۰،۹۵،۰۰۰
پنجاب	۱۲،۱۱،۰۹،۰۰۰	۱۱،۹۵،۶۰،۰۰۰	+۱۵،۴۹،۰۰۰
بہار	۵،۴۷،۶۰،۰۰۰	۵،۳۵،۷۹،۰۰۰	+۱۱،۸۱،۰۰۰
متوسط صوبے	۵،۰۸،۵۰،۰۰۰	۴،۷۵،۶۰،۰۰۰	+۳۲،۹۰،۰۰۰
سندھ	۴،۲۸،۸۷،۰۰۰	۴،۰۵،۰۸،۰۰۰	+۲۳،۷۹،۰۰۰
آسام	۲،۹۳،۳۳،۰۰۰	۲،۹۲،۳۳،۰۰۰	+۱،۰۰،۰۰۰
اُڑیسہ	۱،۸۷،۸۸،۰۰۰	۱،۸۴،۰۵،۰۰۰	+۳،۸۴،۰۰۰
سرحدی صوبے	۱،۸۲،۶۱،۰۰۰	۱،۸۷،۱۱،۰۰۰	× −۴،۵۰،۰۰۰
تمام صوبونکی آمدنی	۹۱،۲۳،۷۶،۶۶۸	تمام صوبونکا خرچ ۸۹،۱۱،۹۱،۴۴	

صوبائی حکومتوں کی آمدنی اور اخراجات کی تفصیل

صوبائی حکومتوں کے موازنوں کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صوبائی ذرائع آمدنی (اہمیت کے لحاظ سے) مالگزاری، آبکاری، سٹمپ اور آبپاشی ہیں ان کے مقابلہ میں جنگل آمدنی محصول اور رجسٹریشن کم اہمیت رکھتے ہیں۔ صوبائی حکومتوں کے اخراجات کی اہم ترین مدیں عام تنظیم، تعلیم، پولیس، آبپاشی، تعمیرات اور پنشن ہیں۔ اِن کے علاوہ علاج، معالجہ، صحت عامہ، عدالت، صنعت و حرفت، جیل خانے، زراعت، قحط، جانوروں کا علاج، چھپائی اور اسٹیشنری کم اہم مدیں ہیں۔

چند ہفتے قبل تمام صوبوں کے جدید ترین حقیقی اعداد حاصل ہوئے ہیں۔ یہ اعداد ۴۰-۱۹۳۹ء

سے متعلق ہیں، آمدنی کے باب میں ہم نے ہر صوبے کی مجموعی آمدنی لکھ دی تھی وہ بھی ۳۸-۱۹۳۷ء سے متعلق تھی چونکہ ابھی حال میں دو سال بعد کے اعداد حاصل ہوئے ہیں لہٰذا ہم بعض اہم صوبوں کے ذرائع آمدنی اور خرچ کی مدیں تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

۴۰-۱۹۳۹ء میں مدارس کی صوبائی آمدنی اور اخراجات

حقیقی آمدنی (سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء)		حقیقی اخراجات (سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء)	
مالگذاری	۵،۱۶،۸۶،۹۶۲	عام تنظیم	۲،۷۵،۲۶،۳۴۵
آبکاری	۳،۳۶،۰۲،۴۷۳	تعلیم	۲،۶۳،۵۶،۹۶۹
آبپاشی	۱،۷۸،۷۹،۷۷۶	پولیس	۱،۶۳،۲۵،۴۲۶
اسٹمپ	۱،۷۴،۲۵،۹۲۵	آبپاشی	۱،۲۶،۹۵،۹۹۳
موٹر سواری قانون کی بدولت آمدنی	۸۰،۵۰،۴۶۶	سیول کام (تعمیرات)	۱،۲۲،۴۶،۲۰۳
متفرق محصول	۷۹،۲۸،۰۰۳	بڑھاپا الاونس اور پنشن	۱،۱۲،۷۲،۸۲۳
جنگل	۴۴،۸۳،۲۶۰	علاج معالجہ	۹۷،۵۲،۹۲۱
آمدنی محصول	۴۱،۸۵،۰۰۰	عدالتیں	۸۸،۴۳،۹۴۸
رجسٹریشن	۳۲،۹۵،۹۶۱	موٹر سواری قانون کے تحت آمدنی حاصل کرنے کا خرچ	۷۴،۸۷،۲۷۴
سیول کام	۳۰،۹۵،۸۷۱		
سود	۲۳،۳۵،۱۰۰	جنگل کی آمدنی حاصل کرنے کا خرچ	۳۸،۷۱،۲۰۶
صنعت و حرفت	۲۱،۶۲،۶۱۵		
عدالت	۱۷،۶۴،۶۵۰	آبکاری " " "	۳۰،۲۸،۴۶۲
متفرق	۱۴،۳۴،۴۶۱	رجسٹریشن " " "	۲۸،۷۲،۸۴۶
بجلی	۱۲،۹۸،۵۱۷	صحت عامہ	۲۷،۳۰،۰۶۵

علاج معالجہ	۱۰،۰۸،۸۳۵	صنعت وحرفت	۲۵،۹۹،۶۸۰
تعلیم	۹،۲۸،۲۸۵	جیلخانے اور مجرم گاہیں	۲۴،۷۵،۵۶۳
پولیس	۸،۱۰،۲۶۶	مالگزاری کی آمدنی حاصل کرنے کا خرچ	۲۳،۷۸،۹۴۴
متفرق محکمے	۷،۷۵،۴۶۳		
جیل خانے اور مجرم گاہیں	۶،۳۳،۳۷۵	بجلی	۲۲،۶۳،۹۴۶
چھپائی اور اسٹیشنری	۴،۲۵،۹۱۲	چھپائی اور اسٹیشنری	۲۲،۰۷،۴۲۵
باہمی امداد	۳،۸۸،۸۵۵	متفرق محکمے	۲۱،۲۰،۶۲۳
زراعت	۳،۱۹،۴۰۹	زراعت	۱۹،۸۰،۷۶۸
بڑھاپا آلاؤنس	۲،۷۲،۱۷۵	قحط	۱۷،۶۴،۶۳۵
صحت	۲،۵۹،۸۷۲	باہمی امداد	۱۴،۲۵،۱۹۲
جانوروں کا علاج	۱،۱۲،۵۹۹	جانوروں کا علاج	۱۲،۳۰،۲۱۱
مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان مختلف حسابوں کے ضمن میں وصول۔	۲۶،۶۷۶	متفرق محصول حاصل کرنے کا خرچ	۹،۰۹،۱۱۰
		متفرق	۵،۴۲،۹۵۱
		سٹمپ کی آمدنی حاصل کرنے کا خرچ	۴،۶۹،۳۳۴
		آبپاشی کے کام میں تعمیر	۱،۳۰،۰۳۹
		علمی محکمے	۹۵،۸۰۳
			۱۶،۷۶،۰۴،۷۰۴
کل آمدنی	۱۶،۶۵،۹۰،۲۶۲	زائد سود منہا طلب	۳۸،۶۵،۷۶۶
		کل خرچ	۱۶،۳۷،۳۸،۹۳۸

۱۹۳۹-۴۰ء میں صوبہ متحدہ کی آمدنی اور اخراجات

آمدنی		خرچ	
مالگزاری	۵٬۸۷٬۹۶٬۰۵۱	تعلیم	۲٬۱۲٬۴۲٬۲۵۸
آبپاشی	۱٬۹۵٬۷۴٬۱۹۱	پولیس	۱٬۷۵٬۴۸٬۴۶۱
سٹمپ	۱٬۳۰٬۱۰٬۳۰۲	عام تنظیم	۱٬۴۲٬۸۶٬۸۵۵
آبکاری	۱٬۱۵٬۷۱٬۳۱۷	آبپاشی	۱٬۱۵٬۰۸٬۹۳۵
جنگل	۵۲٬۶۵٬۲۶۶	بڑھاپا الاؤنس اور پنشن	۱٬۱۰٬۲۹٬۶۴۰
متفرق محصول	۵۰٬۹۰٬۹۵۷	مالگزاری حاصل کرنیکا خرچ	۹۸٬۰۲٬۷۹۵
آمدنی 〃	۴۱٬۸۵٬۰۰۰	عدالت	۷۰٬۵۷٬۶۸۰
مرکزی حکومت سے امداد	۲۵٬۰۰٬۰۰۰	زراعت	۶۷٬۹۱٬۷۱۷
زراعت	۲۲٬۱۱٬۲۶۲	تعمیر	۶۷٬۶۵٬۰۷۴
سیول کام (تعمیر)	۱۷٬۹۵٬۵۵۰	سود	۶۶٬۷۷٬۶۰۷
تعلیم	۱۴٬۱۰٬۰۱۸	علاج معالجہ	۳۷٬۲۴٬۱۱۵
سود	۱۳٬۱۷٬۲۶۶	جیل خانے اور مجرم گاہیں	۳۵٬۲۵٬۵۵۶
موٹرسواری قانون کی بدولت آمدنی	۱۲٬۱۶٬۱۶۱	جنگلوں سے آمدنی حاصل کرنے کا خرچ	۲۹٬۶۲٬۰۶۸
عدالت	۱۲٬۱٬۸۹۳	صحت عامہ	۲۳٬۶۴٬۹۰۷
پولیس	۹٬۲۲٬۷۹۱	صنعت وحرفت	۲۲٬۱۸٬۴۲۶
متفرق	۹٬۲۰٬۵۸۴	چھپائی اور اسٹیشنری	۱۶٬۹۳٬۱۲۳
رجسٹریشن	۸٬۹۱٬۷۶۰	موٹرسواری قانون کے تحت آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۱۱٬۵۶٬۶۵۳

چھپائی اور اسٹیشنری	۸،۱۳،۷۵۱
صنعت وحرفت	۵،۸۷،۳۰۱
جیل خانے اور مجرم گاہیں	۵،۶۰،۲۲۸
علاج معالجہ	۳،۷۷،۸۸۹
صحت عامہ	۳،۳۲،۵۴۱
باہمی امداد	۱،۹۶،۵۹۰
متفرق محکمے	۱،۵۸،۸۲۰
بڑھاپا الاونس میں امداد	۱،۳۸،۶۱۰
جانوروں کا علاج	۱،۳۱،۴۵۶
مرکزی اور صوبائی حساب	۲۰،۸۲۳
قحط فنڈ میں منتقلی	۹،۴۴۷

آبکاری کی آمدنی حاصل کرنے کا خرچ۔	۱۱،۴۲،۹۵۷
متفرق	۸،۷۷،۴۶۹
باہمی امداد	۶،۸۴،۲۷۲
جانوروں کا علاج	۵،۱۴،۷۷۵
رجسٹریشن کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۴،۴۷،۳۸۹
سٹمپ کی آمدنی حاصل کرنے کا خرچ	۲،۳۵،۰۸۷
دوسرے محصول حاصل کرنے کا خرچ	۸۲،۹۳۸
متفرق محکمے	۷۹،۲۸۷
علمی محکمے	۲۸،۵۴۹
پرداز	۱۰،۵۹۶
قحط	۹،۴۴۷
	۱۳،۴۴،۶۸،۳۶۷
Refund آبپاشی کے حساب میں واپس وصول	۱۶،۳۴۴
سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں خرچ	۱۳،۴۴،۵۲،۰۲۴

مدارس اور صوبہ متحدہ اگرہ و اودھ کے موازنوں کا مطالعہ کرنے سے ہم دیکھتے ہیں کہ صوبائی آمدنی کے اہم ترین ذریعے مالگزاری، آبکاری، آبپاشی، سٹمپ، جنگل وغیرہ ہیں اور اخراجات کی اہم ترین مدیں عام تنظیم، تعلیم، پولیس، تعمیرات، پنشن، عدالتیں ہیں

۱۹۳۵ء میں نیا قانون حکومت ہند منظور ہوا جس کا نفاذ ۱ اپریل ۱۹۳۷ء سے کیا گیا، اسی تاریخ سے برما ہندستان سے علیحدہ کر دیا گیا۔ ۱۹۳۷ء سے قبل کے اعداد وشمار میں عموماً برما کے اعداد وشمار بھی شامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہندستان کے تمام صوبوں کے اخراجات کی اس جدول میں ۱۹۳۶-۳۷ء تک برما کے اخراجات شامل ہیں۔ ۱۹۳۷-۳۸ء سے برما کے اخراجات شامل نہیں ہیں۔

گذشتہ برسوں میں ہندستان کے تمام صوبوں کے اخراجات یہ تھے۔

۱۹۲۳-۲۴ء	۷۶،۰۹،۲۸،۰۰۰
۱۹۲۴-۲۵ء	۷۸،۴۰،۶۹،۰۰۰
۱۹۲۵-۲۶ء	۸۵،۸۹،۵۲،۰۰۰
۱۹۲۶-۲۷ء	۹۰،۱۷،۲۲،۰۰۰
۱۹۲۷-۲۸ء	۹۱،۵۰،۴۲،۰۰۰
۱۹۲۸-۲۹ء	۹۲،۹۱،۳۸،۰۰۰
۱۹۲۹-۳۰ء	
۱۹۳۰-۳۱ء	۹۴،۲۰،۰۰،۰۰۰
۱۹۳۱-۳۲ء	۸۶،۲۰،۰۰،۰۰۰
۱۹۳۲-۳۳ء	۸۵،۷۰،۰۰،۰۰۰
۱۹۳۳-۳۴ء	۸۵،۸۹،۸۴،۰۰۰
۱۹۳۴-۳۵ء	۸۵،۳۷،۳۱،۰۰۰
۱۹۳۵-۳۶ء	۸۸،۶۹،۴۳،۰۰۰
۱۹۳۶-۳۷ء	۹۱،۵۵،۰۶،۰۰۰

سنہ ۱۹۳۷-۳۸ء	۸۳،۲۰،۰۰،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء	۸۶،۵۶،۸۳،۰۰۰
سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء	۹۱،۲۳،۷۶،۰۰۰

بعض دیسی ریاستوں کے اخراجات

حیدرآباد

مالی نقطۂ نظر سے ہندستان کی بعض دیسی ریاستیں ہیں جن کی اہمیت برطانوی ہند کے بعض صوبوں سے زیادہ ہے۔ اکثر ترقی پذیر دیسی ریاستوں میں آمدنی کے ذرائع اور اخراجات کی مدیں وہی ہیں جو برطانوی ہندستان کے تمام صوبوں میں ہیں اخراجات میں والئی ریاست اور شاہی خاندان کے مصارف نئی مد ہے۔ بطور مثال ہم بعض دیسی ریاستوں کے اخراجات کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ تمام اعداد متعلقہ ریاستوں کی سرکاری اشاعتوں سے حاصل کئے گئے ہیں صرف ترتیب بدل دی گئی ہے۔ اور رقمی اہمیت کے مطابق جدول مرتب کی گئی ہے۔

سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء (سنہ ۱۳۵۰ف میں) حیدرآباد ریاست کے اخراجات

تعلیم	۹۳،۹۴،۶۹۰
فوج	۸۹،۲۳،۹۲۱
تعمیرات اور راستے	۷۷،۳۶،۸۰۴
مالگزاری حاصل کرنے کا خرچ	۷۲،۶۰،۱۰۴

پولیس	۶۴،۷۲،۵۲۰
اعلیحضرت کی خدمت میں نذرانہ	۵۰،۰۰،۰۰۰
سود	۴۸،۴۵،۸۶۰
عام انتظام	۴۶،۹۴،۸۸۱
آبکاری، گانجہ اور افیون کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۳۶،۷۴،۳۸۲
علاج معالجہ	۳۰،۸۸،۵۷۴
میونسپالٹی اور صحت عامہ	۲۸،۰۵،۰۳۰
عدالتیں	۲۴،۶۶،۵۷۸
کروڑگیری کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۲۲،۳۵،۹۹۹
قرض کی ادائی	۲۰،۳۴،۰۰۰
شاہی خاندان کے ارکان، شاہی سفر خرچ وغیرہ	۱۹،۵۴،۰۵۸
سیاسی اخراجات	۱۸،۵۸،۱۸۶
پٹہ خانہ (ڈاک گھر)	۱۵،۴۷،۴۹۴
تحفظ بیمہ	۱۵،۰۰،۰۰۰
آبپاشی	۱۴،۶۴،۵۵۹
مذہبی اخراجات	۱۴،۱۰،۸۱۹
منصب	۱۴،۰۱،۴۳۳
متفرق اور ذیلی محکمے	۱۱،۸۳،۸۲۱
جنگل	۱۰،۱۴،۹۴۸
جیل خانے	۸،۷۵،۷۲۹
زراعت	۷،۶۷،۴۲۱

پٹرول محصول اور سواری محصول	۷،۲۵،۵۳۰
جانوروں کا علاج	۵،۲۸،۲۳۰
باہمی امداد	۴،۶۶،۸۹۰
متفرق خرچ	۴،۴۵،۹۷۷
صنعت و حرفت	۳،۹۱،۷۱۴
سکہ سازی، کاغذی زر اور تبادلہ	۳،۲۱،۲۰۱
رجسٹریشن کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۱،۹۴،۱۲۲
اسٹامپ " " " " "	۱،۸۰،۰۳۲
ریلیں	۱،۴۵،۴۶۵
کانوں کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۵۰،۹۶۹
چھپائی	۴۲،۳۴۳
بجلی	۲۵،۱۵۲
جنگی امداد	۲۳،۱۷۳
جان کا بیمہ	۵،۹۰۴
	۸،۹۱،۵۸،۵۱۸
قحط	۱۴،۴۴،۱۱۴
منتقلیاں (صنعتی محفوظ اور ریٹرک فنڈ)	۷،۶۳،۹۴۰
کل میزان	۹،۱۳،۶۶،۵۷۲ حالی (عثمانیہ سکہ)
	۷،۸۳،۱۴،۰۳۴ کلدار (برطانوی سکہ)

حیدرآباد کا روپیہ برطانوی ہند کے روپیہ سے قدر و قیمت میں کم ہوتا ہے اور

شرح تبادلہ بازار کے بھاؤ سے مقرر ہوتی ہے مگر حکومت نے شرح تبادلہ کی انتہائی حد اور کمترین حد مقرر کر دی ہے اور اصولی اعتبار سے شرح مبادلہ (۱۱۶-۱۰-۸) مقرر ہے یعنے برطانوی ہند کے ایک سو روپیہ (کلدار) ۱۱۶-۱۰-۸ حالی کے مساوی ہوتے ہیں۔ اس شرح کے مطابق ۶ روپیہ کلدار، ۷ روپیہ حالی کے مطابق ہوتے ہیں اور اسی حساب سے ۹،۱۳،۶۶،۵۷۲ حیدرآبادی روپیے ۷،۸۳،۱۴،۰۳۴ روپیوں کے برابر ہیں۔

جس وقت میں نے آمدنی کا بیان مکمل کیا تھا اس وقت جدید ترین اعداد ۱۳۵۰ف (۴۱-۱۹۴۰ء) کے بجٹ سے حاصل کئے گئے تھے۔ اس کے بعد ۱۳۵۱ف (۴۲-۱۹۴۱ء) کا موازنہ بھی شائع ہو گیا ہے جس میں ۱۳۴۹ف (۴۰-۱۹۳۹ء) کے حقیقی اعداد دیئے گئے ہیں۔ مرکزی حکومت ہند کے متعلق جس طرح خالص آمدنی اور خالص اخراجات کی جدولیں تیار کی گئی ہیں اسی طرح میں نے حیدرآبادی مالیات کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے خالص آمدنی اور خالص اخراجات کی جدولیں تیار کی ہیں۔

دنیا کی اکثر حکومتیں قومی فائدے کے لئے ایسے تجارتی کاروبار کرتی ہیں جس سے آمدنی اور حکومت کے اثر میں اضافہ ہو۔ مقصد چاہے آمدنی حاصل کرنا ہو یا آمدنی کے ساتھ ساتھ ملکی تنظیم اور خوش انتظامی میں حصہ لینا، تجارتی نوعیت کے سرکاری محکموں کے لئے لازمی ہونا چاہیئے کہ اُن کی بدولت سرکاری اخراجات پر بار نہ پڑے کم سے کم انہیں خودکفیل ہونا چاہیئے مگر حیدرآباد کے بعض تجارتی نوعیت کے سرکاری محکمے سہارا بننے کی بجائے بار بنے ہوئے ہیں۔ ان محکموں میں ٹپہ خانہ اور آبپاشی کا سررشتہ ہے۔

۱۳۵۱ف کے بجٹ سے واضح ہے کہ ۱۳۴۹ف (۴۰-۱۹۳۹ء) میں ٹپہ خانہ (ڈاک گھر) سے کل آمدنی ۱۳،۶۲،۰۰۰ ہوئی مگر خرچ ہوا ۱۵،۲۹،۰۰۰ اس طرح ٹپہ خانے کی بدولت ۱،۶۷،۰۰۰ کا خالص خرچ ہوا۔ مرکزی حکومت ہند کے جدید ترین اعداد سے پتہ چلتا ہے کہ ۴۰-۱۹۳۹ء ہی میں مرکزی حکومت کو ٹپہ خانوں اور تارگھروں کی وجہ سے ۱،۶۲،۵۳،۰۰۰

کی خالص آمدنی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ کل ہندستان سے جو خالص آمدنی ہوسکتی ہے وہ ایک حصۂ ملک سے کبھی نہیں ہوسکیگی مگر نوعیت اور مالی نتیجہ دونوں کا یکساں ہونا چاہیئے۔ یعنے یہ کہ وہ نفع بخش کم سے کم خود کفیل ہو۔ متحدہ امریکی ریاستوں اور انگلستان کی ریلیں اور بنک، پٹہ خانے اور تارگھر، ٹیلیفون اور ریڈیو نشریات سب خانگی ملکیت ہیں اور خانگی کاروبار نفع کی خاطر کیا جاتا ہے۔

پٹہ خانے کی طرح آبپاشی بھی حیدرآبادی مالیات پر بارگراں ہے۔ برطانوی صوبوں کے جدید ترین اعداد سے پتہ چلتا ہے کہ آبپاشی کی وجہ سے وہاں اچھی خاصی آمدنی ہوتی ہے مثلاً محکمۂ آبپاشی کا کل خرچ اور آبپاشی کے کاموں میں کارفرما سرمایہ کا سود نکالنے کے بعد بھی متحدہ صوبوں کو نصف کروڑ سے زیادہ آمدنی ہوئی تھی۔ آپ کہیں گے کہ متحدہ صوبے بہت زرخیز ہیں وہاں نہروں کا جال بچھا ہوا، آبپاشی قدرتی سہولتوں کی وجہ سے زیادہ آسان ہے مگر جب ہم متوسط صوبوں میں آبپاشی کی مالی کیفیت معلوم کرتے ہیں تب بھی یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ متوسط صوبوں کو آبپاشی کی وجہ سے خالص آمدنی ہوئی تھی سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں اخراجات ۶،۰۳،۰۰۰ ہوئے تھے مگر آمدنی ۷،۴۵،۰۰۰ ہوئی تھی گویا ۱،۴۲،۰۰۰ کا نفع ہی ہوا تھا!

ہم مزید تفصیل میں جانا نہیں چاہتے اور تبصرہ کئے بغیر جدید ترین بجٹ سے جدید ترین حقیقی اعداد کے مطابق سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء کے خالص اخراجات اور خالص آمدنی کے اعداد پیش کرتے ہیں۔ سابقہ جدولوں کی تیاری میں جس طرح احتیاط برتی گئی تھی اسی طرح اس جدول کے تیار کرنے میں امکانی احتیاط کی گئی ہے تاہم قطعی صحت کا دعوےٰ نہیں کیا جاسکتا۔

سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء (۱۳۴۹ف) کے حقیقی اعداد کے مطابق حیدرآباد ریاست کی خالص آمدنی اور خالص اخراجات

خالص آمدنی		خالص اخراجات	
مالگزاری	۲،۲۸،۳۵،۰۰۰	فوج اور جنگ[1]	۱،۳۶،۱۱،۰۰۰

[1] فوج کا خرچ ۸،۵۹،۰۰۰ تھا اور موجودہ جنگ عظیم کے سلسلہ میں ۴۸،۵۲،۰۰۰ کا پیشکش

آبکاری، گانجہ اور افیون	۱،۵۰،۸۵،۰۰۰
ریلیں	۱،۴۰،۴۸،۰۰۰
کروڑ گیری	۱،۰۴،۹۲،۰۰۰
برار	۲۷،۲۲،۰۰۰
منٹ، کاغذی سکہ اور تبادلہ	۲۴،۶۷،۰۰۰
اسٹامپ	۱۶،۶۳،۰۰۰
دیاسلائی چنگی	۱۱،۵۹،۰۰۰
کانیں	۴،۵۱،۰۰۰
شکر چنگی	۳،۶۴،۰۰۰
جنگل	۳،۵۳،۰۰۰
بجلی	۲،۰۳،۰۰۰
سگریٹ چنگی	۱،۲۳،۰۰۰
رجسٹریشن	۸۷،۰۰۰
میزان	۷،۲۰،۴۲،۰۰۰

تعلیم	۱،۰۶،۹۴،۰۰۰
عمارتیں اور سڑکیں	۷۲،۹۷،۰۰۰
پولیس	۶۵،۳۳،۰۰۰
شاہی خاندان اور نذرانہ	۶۴،۵۳،۰۰۰
عام تنظیم	۴۷،۵۱،۰۰۰
علاج معالجہ (طبی اخراجات)	۳۱،۷۲،۰۰۰
عدالتیں	۲۵،۴۳،۰۰۰
بلدیہ اور صحت عامہ	۲۳،۷۸،۰۰۰
قرض (اصل کی ادائی)	۲۲،۴۲،۰۰۰
آبپاشی	۲۰،۵۸،۰۰۰
قرض (خالص سودی ادائی)	۱۷،۶۳،۰۰۰
سیاسی اخراجات	۱۵،۳۹،۰۰۰
قحط بیمہ	۱۵،۰۰،۰۰۰
منصب	۱۴،۳۷،۰۰۰
مذہب	۱۴،۰۸،۰۰۰
متفرق اور چھوٹے محکمے	۱۲،۷۸،۰۰۰
زراعت	۸،۹۳،۰۰۰
جیل	۶،۴۵،۰۰۰
جانوروں کا علاج	۵،۶۴،۰۰۰

بسلسلہ حاشیہ صفحہ (۶۹) سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں دیا گیا تھا لہذا فوج اور جنگ کے مجموعی اخراجات ۱،۳۶،۱۱،۰۰۰ (سو کروڑ سے زیادہ) ہیں

باہمی امداد	۳،۵۵،۰۰۰
صنعتیں	۳،۰۰،۰۰۰
طباعت	۱،۷۶،۰۰۰
پٹہ خانہ	۱،۶۷،۰۰۰
متفرق	۴۵،۰۰۰
زندگی کا بیمہ	۹،۰۰۰
خالص اخراجات	۷،۳۸،۱۱،۰۰۰

خالص آمدنی	۷،۲۰،۴۲،۰۰۰

جودھپوری مالیات

جودھپور ریاست کی آمدنی کا بیان گذشتہ باب میں ہو چکا ہے جس سے ظاہر ہوا تھا کہ سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں ریاست کی آمدنی پونے دو کروڑ تھی اور زیادہ تر ریلوں، کروڑگیری، آبکاری نمک، سود، مالگزاری پر مشتمل تھی۔ سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں ریاست جودھپور میں خرچ کی اہم ترین مدین یہ تھیں:-

متفرقات	۸۴،۲۳،۰۰۰
مہاراجہ بہادر کی خدمت میں نذرانہ	۱۴،۷۴،۰۰۰
فوج	۱۲،۳۹،۰۰۰
تعمیر	۱۰،۶۰،۰۰۰
تعلیم	۹،۸۹،۰۰۰
پولیس	۹،۸۳،۰۰۰
طبی امداد	۷،۸۹،۰۰۰
بقیہ خرچ، آمدنی حاصل کرنیکے اخراجات، خراج زراعت، صنعت و حرفت، جیل خانے، عام تنظیم، وغیرہ۔	۵۲،۵۳،۰۰۰
میزان	۲،۰۵،۱۰،۰۰۰

اس سال کے اخراجات آمدنی سے بقدر ۲۹،۵۴،۰۰۰ زیادہ ہیں فی نفسہ یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس سال غیر معمولی طور پر خسارہ زیادہ ہوا ہو اور ریاستی مالیات کی یہ عام خصوصیت نہ ہو۔ سنہ ۳۸-۱۹۳۷ء اور سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء میں جودھپور کے موازنے فاضل موازنے تھے۔ مگر سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں قحط سالی کی وجہ سے ۴۳،۶۵،۰۰۰ صرف ہوئے۔ نیز جنگی امداد میں ۳،۵۰،۰۰۰ خرچ ہوئے۔ تعجب ہوتا ہے کہ موازنے میں یہ تشریح صرف ضمنی طور پر کی گئی اور اُن کا شمار "متفرقات" میں کیا گیا یہی وجہ ہے کہ سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں حقیقی اخراجات کی اہم ترین مد "متفرقات" ہے سچ پوچھئے تو ریاست جودھپور ہی پر منحصر نہیں یوں بھی یہ اصطلاح ہندستانی موازنوں میں بہت مقبول ہے اور مختلف نوعیت اور وسعت کے معنی رکھتی ہے۔

ناظرین نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ جودھپور کے موازنہ میں خراج آمدنی کا ذریعہ بھی ہے۔ اور خرچ کی مد بھی۔ یہ بظاہر متضاد باتیں ہیں مگر حقیقت میں یہ کوئی انوکھی بات نہیں، اور بھی ریاستیں ہیں جو خراج لیتی اور دیتی ہیں۔ مثلاً برودا، اصل یہ ہے کہ راجپوتانے کی بعض دیسی ریاستیں جودھپور کی باج گزار ہیں۔ ان باجگزار ریاستوں سے جودھپور کو تقریباً ۲ لاکھ ملتا ہے اور وہ خود برطانوی حکومت ہند کو خراج ادا کرتا ہے جس کی رقم تقریباً ۶۰ ہزار ہے حکومت ہند کی آمدنی کے بیان میں یہ بتایا گیا ہے کہ مرکزی حکومت کو ہندستان کی دیسی ریاستوں سے تقریباً ۶۰ لاکھ وصول ہوتا ہے۔ مرکزی حکومت کسی نہ کسی طرح ہر ریاست سے کچھ نہ کچھ بٹورتی ہے۔

جودھپور کے موازنے کی ورق گردانی سے ایک اور بات معلوم ہوتی ہے جو ریاستی مالیات کی عام خصوصیت ہے۔ والئی ریاست کی خدمت میں ۱۴ لاکھ ۴۲ ہزار کا نذرانہ دینے کے بعد بھی ریاست کے مالیہ کو ایسے بہت سے اخراجات کا بار اُٹھانا پڑا جن کا تعلق کھلے طور پر والئی ریاست اور اس کے خاندان سے ہے۔ چنانچہ سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء ہی میں یہ اخراجات ہوئے

زنانی ڈیوڑھی	۱،۳۹،۰۰۰

دربار کی اسپیشل گاڑی	۷۰،۰۰۰
مہاراجہ بہادر کا سفر	۱۲،۰۰۰
مہاراجہ بہادر کی سالگرہ	۷،۸۶۰
درباری تفریحیں	۷،۹۶۴
مہاراج کمار کی سالگرہ	۴،۱۱۹

شہر جودھپور کی میونسپلٹی کو سالانہ ڈھائی لاکھ امداد ملتی ہے۔ جودھپور میں آوارہ کتوں کے لئے ایک گھر بنایا گیا ہے جس پر سالانہ چار پانچ ہزار روپیہ صرف ہوتا ہے! ۱۲۹۶ف (۱۸۸۶-۸۷ء) کے حیدرآبادی موازنے میں بتایا گیا ہے کہ عیدالضحیٰ کی تقریب میں بکروں کی تقسیم پر ۱۴،۷۲۹ روپیہ صرف ہوئے۔ اسی بجٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ غریبوں کے موتاؤں کے لئے ۱،۳۳۵ صرف ہوئے! جنگلی جانوروں کو مارنے کے لئے ۱۱،۱۶۵ خرچ ہوئے اور بندروں کی غذا کے لئے ۲،۰۴۱ فراہم کئے گئے!!

ہندستان کے سرکاری موازنوں میں آخر وہ کونسی مد ہے جو کہیں نہ کہیں موجود نہ ہو؟!

میسور کے اخراجات

میسور کے اخراجات ۱۹۴۱-۴۲ء کے بجٹ سے حاصل کئے گئے ہیں اور ۱۹۳۹-۴۰ء کے حقیقی اعداد ہیں:-

سود اور اصل ادائی ذخیرہ	۷۲،۵۴،۲۰۷
تعلیم	۵۳،۸۸،۲۶۳
تعمیرات اور آبپاشی کے کام	۴۳،۵۶،۶۲۷
مالگزاری حاصل کرنے کا خرچ	۲۹،۲۱،۳۴۲

مہاراجہ بہادر کی خدمت میں پیشکش اور شاہی خاندان کے اخراجات	۲۶،۰۰،۹۷۳
پنشن اور بھتے	۲۵،۴۱،۸۶۹
پولیس	۲۰،۷۵،۹۲۱
برطانوی حکومت کو	۱۹،۱۱،۰۰۰
فوج	۱۷،۰۱،۸۰۶
طبی اخراجات	۱۶،۰۱،۹۰۸
عام تنظیم	۱۴،۸۶،۳۰۰
جنگل کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۱۲،۶۱،۹۹۰
عدالتیں	۱۱،۸۷،۲۹۸
مقامی خود حکومت	۱۰،۰۲،۲۸۰
متفرق	۹،۰۲،۲۷۲
زراعت	۴،۸۸،۵۰۵
آبکاری کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۳،۸۳،۸۸۶
جانوروں کا علاج	۳،۸۳،۲۸۵
چھپائی اور اسٹیشنری	۳،۲۶،۲۰۲
جیل خانے	۲،۴۳،۰۰۹
صحت عامہ	۲،۱۴،۱۰۳
کانوں کی وجہ سے خرچ	۲،۱۲،۳۹۷
صنعت وحرفت اور تجارت	۱،۹۲،۲۴۷
رجسٹریشن کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۱،۷۷،۱۵۷
باغ	۱،۷۴،۰۶۶

باہمی امداد	۱،۵۹،۸۸۴
ریشم کے کیڑوں کی پرورش	۱،۱۳،۲۸۷
علمی اور ذیلی محکمے	۱،۰۴،۸۶۰
آمدنی محصول حاصل کرنیکا خرچ	۶۷،۴۹۸
سٹمپ کی آمدنی حاصل کرنیکا خرچ	۶۷،۲۳۸
میزان	۴،۱۴،۹۷،۰۸۰

سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں میسور ریاست کی کل آمدنی ۴،۱۷،۹۸،۳۱۷ روپیہ تھی اس لحاظ سے اس سال کا موازنہ فاضل موازنہ تھا اور ۳،۰۱،۲۳۷ کی بچت ہوئی تھی۔ سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء کے بجٹ میں ۴،۸۴،۲۴،۰۰۰ کی آمدنی اور ۴،۷۴،۰۴،۰۰۰ کے اخراجات کا اندازہ کیا گیا ہے اور ۱،۲۰،۰۰۰ کی بچت کی توقع کی جاتی ہے۔

قومی تعمیری محکمے

اس مضمون کی ابتدا میں گلیڈسٹن کا جو قول دیا گیا ہے اس کے مطابق عمدہ مالیات کی پہچان یہ ہے کہ حکومت حاصل کردہ آمدنی کو کیونکر خرچ کرتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ٹیکس بھی حق بجانب ہوسکتا ہے بشرطیکہ اس کا مصرف صحیح ہو۔ جدید زمانے میں مالیاتی پالیسی کو جانچنے کے لئے یہ معیار بھی منطبق کیا جاتا ہے کہ حاصل کردہ آمدنی کا کتنا حصہ "قومی تعمیری محکموں" پر صرف کیا جاتا ہے اور قومی تعمیر سے مراد وہ ادارے اور تحریکیں ہیں جن سے قوم کی مادی مرفہ الحالی اور عام خوشحالی میں اضافہ ہو۔

توپیں اور بندوقیں، دبابے اور مشین گن، بم برسانے والے ہوائی جہاز اور جہاز

غرق کرنے والی کشتیاں، پولیس اور جیل خانے، چاہے کیسے ہی ضروری ہوں یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ اُن سے مرفہ الحالی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہہ کہہ سکتے ہیں کہ اُن کی وجہ سے موجودہ مرفہ الحالی کی حفاظت ہوتی ہے۔ موجودہ بہبودی اور خوشحالی میں اضافہ کرنے کے لئے وہ تدبیریں اختیار کرنی پڑتی ہیں جن کا نتیجہ معیار صحت کی بلندی، دولت کی فراوانی، اور تہذیب کی ترقی میں نمودار ہوتا ہو۔

بیسویں صدی کے تمام تمدنی مسئلوں میں سب سے اہم مسئلہ بے روزگاری کا مسئلہ ہے اور ہندستان میں بھی کنبہ پروری، خاندانی احساس، اور بے غرضی جس رفتار سے کم ہو رہی ہے اور آبادی میں اضافہ ہو رہا اسی کے مطابق بے روزگاری کا مسئلہ بھی اہم تر ہوتا جا رہا ہے لوگوں کو اپنے معیار آرام کے بلند کرنے کا خیال ہو رہا ہے۔ بین اقوامی سابقت کی وجہ سے کشمکش حیات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ غرض مختلف وجوہ کی بنا پر حکومتوں کا یہ فرض مان لیا گیا ہے کہ وہ ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ قابل، طاقتور اور باصحت بنانے کے لئے مقدور بھر کوشش کرے۔

وباؤں کو نیست و نابود کرنا، احتیاطی تدبیریں اختیار کرکے بیماریوں کی شدت اور کثرت کم کرنا تمام ترقی پذیر قوموں کا آئینی فرض ہے۔ اِس کوشش میں مغرب کی اکثر حکومتیں کامیاب ہوگئی ہیں اور مغربی ملکوں میں طاعون، ہیضہ اور چیچک وباؤں کی صورت میں سرے سے نمودار ہی نہیں ہوتے۔ بیماریوں کی شدت اور وسعت میں اسقدر کمی ہوگئی ہے کہ مغربی ملکوں کے باشندوں کا معیار صحت بڑھ رہا ہے اور مدت حیات میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ مغربی ملکوں میں یہ عمدہ نتیجے نمودار ہو رہے ہیں یہ منظم کوشش کا نتیجہ ہے اور منظم کوشش کرنے میں مغرب کی ترقی پذیر حکومتوں کی مالی پالیسی کا بڑا دخل ہے۔ معیار صحت اور معیار قابلیت میں اضافہ کرنے کے لئے یورپ کی حکومتوں نے بیدریغ طور پر پیسہ صرف کیا اور انتہائی دردسری گوارا کی۔ مختلف اوقات میں

صحت اور تعلیم سے متعلق قوانین نافذ کئے گئے۔ بیماریوں کو دور کرنے کے لئے زمین دوز موریاں اور بے گردی سڑکیں بنائی گئیں، دواخانوں اور شفاخانوں میں اضافہ کیا گیا، غذا پر نگرانی قائم کی گئی، بیمار جانوروں کی قربانی ممنوع قرار دی گئی اور کھانے پینے کی چیزوں کو صحت بخش ماحول میں رکھنا لازمی قرار دیا گیا، اور بھی ہزاروں جتن کئے گئے تاکہ بیماریوں کا انسداد ہو، معیار صحت میں اضافہ ہو، وبائیں نیست و نابود ہوں! ہندستان کے کتنے بڑے بڑے شہروں میں آج بھی سرراہ غلاظت اور گندگی کی جاتی ہے، مرکزی مارکٹ اور منڈی کے قریب میں بھی کتنی کھلی موریاں ہیں جن میں سڑاند پیدا ہوتی ہے، کتنی کم دوکانیں ہیں جہاں کھانے پینے کی چیزیں احتیاط اور صفائی سے رکھی جاتی ہیں!!

اس میں شک نہیں کہ قابلیت قدرت کا عطیہ ہے اور تاوقتیکہ قابلیت کا جوہر موجود نہ ہو، عاقل و قابل ہونا ممکن نہیں ہے! مگر مختلف قابلیتوں کا ظہور اسی وقت ہوتا ہے جبکہ ابتدائی عام تعلیم کے بعد، فنی تعلیم، زراعتی تعلیم، صنعتی تعلیم، پیشہ وری تعلیم حاصل کرنے کے مواقع موجود ہوں۔ یہ شکایت بجا ہے کہ ہندستانیوں کا معیار کارکردگی ادنیٰ ہے، ماہر کاریگر موجود نہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ اس شکایت کو دور کرنے کا صرف ایک ہی موثر ذریعہ ہے! اگر ہزاروں کی تعداد میں فنی، زراعتی، صنعتی، تجارتی اور کاروباری مدرسے قائم کئے جائینگے اور ساری آبادی کے لئے مفت تعلیم کا انتظام کیا جائیگا تو یقیناً مختلف قسم کی قابلیتیں ظہور میں آئیں گی اور وہی لوگ جو تعلیم و تربیت، مشق اور تجربہ سے محروم ہونے کی وجہ سے اناڑی نظر آرہے ہیں، مشاق، کارگذار اور قابل افراد بن سکیں گے۔ قابلیت کا جوہر قدرت کا عطیہ سہی مگر اس کا پتہ صرف طلسم تعلیم کے بدولت چل سکتا ہے۔

صحت اور تعلیم کے علاوہ قومی تعمیر میں وہ تمام کوششیں شامل ہیں جن سے براہ راست مادی مرفہ الحالی اور قومی خوشحالی میں اضافہ ہوتا ہے مثلاً زراعت کی ترقی یا صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے منظم کوشش، جانوروں کی نسل سدھار یا جانوروں کی بیماریوں کا علاج،

امداد باہمی، حفاظت صحت کی کارگر تدبیریں۔

عام دلچسپی کے مدنظر میں نے ایک علیحدہ جدول تیار کی ہے جس میں تمام برطانوی ہندستان اور بعض دیسی ریاستوں کے وہ اخراجات دیئے ہیں جن کا تعلق قومی تعمیری محکموں سے ہے۔

سب سے پہلے تعلیم کا خیال کیجئے۔ تمام برطانوی ہندستان میں تعلیم اور تعلیم کے نام سے سنہ ۱۹۳۹ء کے حقیقی اخراجات کے مطابق تقریباً پونے ۱۳ کروڑ خرچ ہوئے تھے جس کے مقابلے میں ایک کروڑ فیس میں وصول ہوئے گویا مرکزی حکومت نیز تمام صوبائی حکومتوں کا مجموعی تعلیمی خرچ پونے ۱۲ کروڑ ہوا۔

اُسی سال برطانوی ہندستان کی کل آمدنی ۰۰۰، ۰۰، ۱۳، ۱۷، ۲ یعنے ۱/۵ ۲ ارب ہوئی تھی اس لحاظ سے ہندستان کی آمدنی میں سے صرف ۵ فی صد سے کچھ زیادہ (یعنے ۱/۲ ۵ فی صد) تعلیم اور تعلیم کے نام سے خرچ ہوا ہے۔ اس میں سے بھی کتنی فضول خرچی ہوتی ہے، کتنا روپیہ شاہ خرچیوں اور بڑی بڑی تنخواہوں پر لٹادیا جاتا ہے، کتنا روپیہ "دفتری تنظیم" کے نام سے خرچ ہوتا ہے، کتنی رقم بیکار کتابوں کے خریدنے اور بھلتی کے رسالوں کی سرپرستی کرنے میں صرف ہوتی ہے، اس کا کوئی حساب نہیں ہوسکتا۔ تاہم یہ عام خیال ہے کہ دفتری اور تنظیمی اخراجات ضرورت سے زیادہ ہیں، نام نہاد تعلیمی اور علمی رسالوں کی سرپرستی کرنے اور "علمی یا درسی" نوعیت کی کتابوں کے خریدنے پر بہت زیادہ صرف کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ شکایت ہے کہ اعلیٰ تعلیم خاص کر جامعی تعلیم پر بہت ہی غیر متناسب رقم صرف ہوتی ہے۔ اور جامعی تعلیم میں "علوم عمرانی" اس سے بڑھکر علوم ذہنی" اور سب سے زیادہ نام نہاد علوم" پر بہت خرچ ہوتا ہے، وہی لوگ جو ایمانداری اور غیر جانب داری سے موجودہ تمدن، کی فریب کاریوں پر غور کرسکتے ہیں، وہی اندازہ کرسکتے ہیں کہ تعلیم کی آڑ میں کیسی بے دریغ فضول خرچی ہورہی ہے تالیف و تصنیف، ترجمہ اور توسیعی تقریریں فیض پرستی کا بہترین سرچشمہ ہے۔ بہتیرے موقعوں پر تعلیم کے نام سے بیکار لوگوں کی پرورش ہورہی ہے، تعلیمی اداروں کے لئے من مانے کرایوں پر

خانگی عمارتیں لی جاتی ہیں، مردار اور بیجان کتابوں کے گٹھے کے گٹھے خرید لئے جاتے ہیں، تحقیق کے بھیس میں خوشامد کی جاتی ہے، جھوٹی تعلیم اور جھوٹ موٹ کی تعلیم پر بھی کافی روپیہ برباد ہوتا ہے۔

جو حالت تعلیم کی ہے اسی سے ملتی جلتی کیفیت بقیہ تمام "قومی تعمیری" اخراجات کی ہے مگر ہم مجبور ہیں کہ کل اخراجات کو ملحوظ رکھیں۔ ہمارے پاس کوئی معیار نہیں کہ ہم ضروری اخراجات اور فضول خرچیوں میں امتیاز کرسکیں۔ اسی لئے ہم نے تمام قومی تعمیری اخراجات کی ایک جدول تیار کی ہے۔ اس جدول سے بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مختلف قومی تعمیری مدوں پر کتنا خرچ ہو رہا ہے۔

سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں ہندستان کے قومی تعمیری اخراجات

خالص خرچ

برطانوی ہندستان کے مرکزی اور تمام صوبائی حکومتوں کا تعلیم پر خرچ	۱۱،۶۹،۴۶،۸۷۸[1]
" " " " " کے طبی اخراجات	۳،۲۹،۹۹،۲۰۷
" " " " " کا زراعت پر خرچ	۱،۷۷،۹۳،۲۵۸
" " " " " صحت عامہ پر	۱،۳۰،۵۹،۰۱۵
" " " " " سائنسی محکموں "	۶۸،۰۹،۵۷۴
" " " " " باہمی امداد "	۶۷،۹۰،۷۲۰
" " " " " جانوروں کے علاج پر "	۵۴،۲۸،۹۸۰

---

[1] سرکاری اشاعت Combined Finance Revenue for 1939-40 سے حاصل کردہ اعداد کے بموجب سرکاری اشاعت میں کل آمدنی اور کل خرچ ہے۔ خالص خرچ میں نے نکالا ہے۔

برطانوی ہندستان کے مرکزی اور تمام صوبائی حکومتوں کا صنعت و حرفت پر خرچ ۱۴،۷۶،۵۴۲

تمام قومی تعمیری محکموں پر خالص خرچ	۲۰،۳۷،۰۴،۱۷۴

مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت کی آمدنی ۲،۱۷،۱۳،۴۲،۶۱۰ ہے اِس لحاظ سے برطانوی ہندستان کی تقریباً ۱۰ فی صد آمدنی قومی تعمیری محکموں پر خرچ کی جاتی ہے

حیدرآباد ریاست میں قومی تعمیری محکموں پر خرچ[1]

(سنہ ۱۳۴۹ف ۱۹۳۹-۴۰ء کے حقیقی اعداد کے مطابق)

تعلیم	۱،۰۶،۹۴،۰۰۰ حالی (حیدرآبادی روپیہ)
طبی اخراجات	۳۱،۷۲،۰۰۰
بلدیہ اور صحت عامہ	۲۲،۷۸،۰۰۰
زراعت	۸،۹۳،۰۰۰
جانوروں کا علاج	۵،۶۴،۰۰۰
باہمی امداد	۳،۵۵،۰۰۰
صنعتیں	۳،۰۰،۰۰۰

سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں کل قومی تعمیری اخراجات = ۱،۸۳،۵۶،۰۰۰ حالی = ۱،۵۷،۳۳،۰۰۰ کلدار (برطانوی روپیہ)

سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں حیدرآباد ریاست کی کل آمدنی = ۹،۵۹،۶۳،۰۰۰ حالی یعنی ۸،۲۳،۰۰،۰۰۰ کلدار۔

---

[1] موازنے میں صراحت نہیں کی گئی ہے کہ یہ رقمیں آمدنی منہا کرنے کے بعد خرچ کی گئی ہیں مگر قرائن سے یہی خیال کرنا پڑے گا کہ یہ رقمیں خالص اخراجات ہیں کیونکہ ان کی آمدنیاں نہیں بتائی گئی ہیں۔

اور اس حساب سے حیدرآباد نے قومی تعمیری محکموں پر اپنی آمدنی کا ۱۹ فی صد حصہ صرف کیا۔ یہ حیدرآبادی مالیات کا سب سے زیادہ منور پہلو ہے کہ اخراجاتی تناسب کے لحاظ سے حیدرآبادی مالیات کو برطانوی ہند کی مالیات پر قومی تعمیری نقطۂ نظر سے فوقیت حاصل ہے۔

میسور ریاست کا شمار ہندستان کی ترقی پذیر ریاستوں میں ہوتا ہے۔ وہاں قومی تعمیری محکموں پر یہ اخراجات ہوتے ہیں:-

۴۰-۱۹۳۹ء میں قومی تعمیری محکموں پر میسور کے اخراجات

تعلیم	۵۳،۸۸،۰۰۰
طبی اخراجات	۱۶،۰۲،۰۰۰
زراعت	۴،۸۸،۰۰۰
جانوروں کا علاج	۳،۸۳،۰۰۰
صحت عامہ	۲،۱۴،۰۰۰
صنعت و حرفت اور تجارت	۱،۹۲،۰۰۰
باہمی امداد	۱،۵۹،۰۰۰
ریشم کے کیڑوں اور ریشم کی صنعت	۱،۱۲،۰۰۰
کل قومی تعمیری اخراجات	۸۵،۳۹،۰۰۰

۴۰-۱۹۳۹ء میں میسور ریاست کی آمدنی ۴،۱۷،۹۸،۰۰۰ تھی اس حساب سے میسور نے قومی تعمیری محکموں پر اپنی آمدنی کا ۲۰ فی صد حصہ خرچ کیا تھا۔

پرانے زمانے کی یادگار اندھیرا اور تاریکی میں مبتلا ریاستوں میں علم کے نور اور تہذیب کی روشنی کو پھیلانے کے لئے جس دریا دلی سے روپیہ صرف کیا جا رہا ہے، اور قومی تعمیری محکموں اور تحریکوں کی جس قدر مالی سرپرستی کی جا رہی ہے اُس کی مثال بقیہ ہندستان میں نہیں ملتی، حالانکہ

وہاں دستور، جمہوریت، حقِ انتخاب اور حقِ بازپرس سبھی ہے یا نہیں ہے یا کم ہے تو در داور ہمدردی!! خوشامد اور تملق سے نہیں بلکہ سچے یقین اور خلوص دل سے میں یہ کہتا ہوں کہ جس طرح بڑودا اور میسور میں سرکاری آمدنی کا صحیح تر اور بہتر مصرف ہوتا ہے اس کی نظیر "برطانوی ہندستان" کے کسی صوبے میں نہیں ملتی۔ ممکن ہے کہ ضابطے اور قاعدے، دستور اور آئین، حقوق اور قانون کے نقطۂ نظر سے برطانوی ہندستان کی حالت بہتر ہو مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ قاعدے کے پردے میں بے قاعدگیاں، ضابطے کی آڑ میں بےضابطگیاں جتنی وہاں ہوتی ہیں اتنی ترقی پذیر اور ترقی پسند ریاستوں میں نہیں ہوتیں۔ ایک جگہ دستور اور آئین ہیں مگر رُوحِ دستور مفقود ہے دوسری جگہ تحریری آئین اور دستور موجود نہیں مگر روحِ عمل کارفرما اور روحِ آئین موجود ہے۔

نظری مالیات کی روشنی میں ہندستانی مالیات کی آمدنی اور اخراجات کی سرگذشت ختم ہوئی، آخر میں دوبارہ اُن حضرات سے جو اس مضمون کو ملاحظہ فرمانے کی زحمت گوارا کریں گذارش ہے کہ اپنے مشوروں اور تنقیدی اصلاحوں سے ممنون فرمائیں تاکہ جب کبھی "ہندستانی مالیات" کی کتاب کو ترتیب دینے کا موقع ملے مہربان علم دوستوں کی قیمتی رایوں سے استفادہ کیا جا سکے۔

فاشزم کا نظام معیشت اور اُس کے عملی پہلو

از

جناب محمد عبد القادر صاحب، لکچرار معاشیات جامعہ عثمانیہ سرکار عالی

فاشزم کا نظریہ اور اس کا معاشی مسلک اٹلی کے سیاسی اور معاشی حالات سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ پچھلی جنگ عظیم کے دوران میں اور اُس کے فوراً ہی بعد ملک میں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ اُن کی وجہ سے فاشزم نے جنم لیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بہت سارے واقعات اور تحریکات، جو بادی النظر میں سیاسی معلوم ہوتی ہیں، اُن کی تہ میں معاشی محرکات موجود ہوتے ہیں، چنانچہ پچھلی جنگ عظیم کے اسباب کا مطالعہ کرتے ہوئے، محض ایک شہزادے کے قتل کا حادثہ یا یورپ میں توازن قوت کے مسئلہ کی اہمیت کو معلوم کر لینا کافی نہیں، بلکہ اُس زمانہ کی معاشی تاریخ اور بالخصوص یورپ کے ممالک کی نو آبادیاتی پالیسی کا جاننا بیحد ضروری ہے اسی طرح فاشزم کو بخوبی ذہن نشین کرنے کے لئے اس کے معاشی پس منظر سے واقفیت اہم ہے۔

جنگ عظیم نے اٹلی کو بہت کچھ متاثر کیا۔ ابتدائی زمانہ میں یہ ملک غیر جانبدار رہا لیکن ۲۴ مئی ۱۹۱۵ء کو اتحادین کا ساتھ دینے کے لئے یہ جنگ میں کود پڑا مسولینی نے (جو اس زمانہ میں ایک اخبار کا اڈیٹر تھا) اس کی موافقت میں مضامین لکھے اور خود جنگ میں شریک ہو گیا۔ دوران جنگ میں اٹلی کے کارنامے کچھ زیادہ شاندار نہ رہے۔ اور بحیثیت مجموعی اٹلی کے لئے جنگ مفید ثابت نہ ہوئی۔ جنگ کے اختتام پر ملک میں پریشانی اور انتشار کا دور دورہ رہا۔ ملک کے مالیات پر

جنگ کا بہت کچھ بار پڑا تھا، اس کے مصارف ۱۰۰۰۰۰ ملین لیرا (Lira) ہوئے تھے بسوائے جنگی منافع کمانے والی جماعت کے ملک کے سب طبقوں میں افلاس کا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مصارف زندگی بڑھتے جا رہے تھے اور ہر طرف بے چینی کے آثار پائے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس ملک کا معاشی نظام درہم برہم ہو، وہاں کیا سکون ہو سکتا ہے۔ بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ مالیاتی تنظیم کا کام بیحد مشکل بن گیا ہو۔ اسی بے چینی کا اثر تھا کہ اشتراکی لیڈروں کے زیر اثر ملک میں ہڑتالیں ہونے لگیں، اشتراکین کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ جنگ سے پہلے انکی تعداد جو ۵۰ ہزار تھی اب یہ دو لاکھ ہوگئی۔ مزدور سبھاؤں کے ارکین ۵ لاکھ سے ۲۰ لاکھ ہوگئے مجلس وضع قوانین میں پہلے صرف ۵۰ اشتراکی ارکین تھے لیکن اب یہ بڑھکر ۱۵۰ ہوگئے۔ بہرحال حکومت کے خلاف بے چینی روز بروز بڑھتی گئی۔

ان حالات سے لوگوں کی بیزاری اور حکومت سے نا اُمیدی نے اب ایک عملی صورت اختیار کرلی۔ مسولینی نے ۱۹۱۹ء میں بطور ردعمل ایک چھوٹی سی جماعت Fascist Party قائم کی۔ یہ جماعت بدامنی اور انتشار کے زمانہ میں معرض وجود میں آئی۔ لہذا شروع میں اسکا نہ کوئی نظریہ تھا اور نہ کوئی باقاعدہ پروگرام، یہاں یہ چیز قابل ذکر ہے کہ اشتراکیت کی نوعیت اس کے بالکل برعکس تھی۔ مارکس نے ایک سائنٹفک نظریہ پیش کیا تھا۔ اس نے سرمایہ داری کے عروج و زوال سے بحث کی۔ طبقہ واری کشمکش کے راز کا انکشاف کیا۔ تاریخ کی معاشی تعبیر پیش کی۔ اور اشتراکی پروگرام کی وضاحت کی۔ ابتدائی دور میں فاستی جماعت کا مقصد بس یہ تھا کہ مزدوروں کے حالات بہتر بنائے۔ اور ملک کے لئے ایک طاقتور حکومت قائم کرے۔ لہذا اس جماعت کے رجحانات اشتراکیت کی طرف تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں کلیسا کی املاک، اور جنگی منافع کی ضبطی، کسانوں کے لئے زمین کا حاصل کرنا اور مزدوروں کو صنعتی اقتدار کا مالک بنانا، یہ سب چیزیں فاشزم کے مقاصد میں شامل تھیں، لیکن بعد میں جب کہ ہڑتالیں بکثرت ہونے لگیں اور بدامنی میں اضافہ ہوا تو مسولینی نے اشتراکیت سے قطع تعلق کرلیا۔ اس سلسلہ میں صنعت گردں

اور زمینداروں نے جو اشتراکیت کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خائف نظر آتے تھے، فاسی جماعت کی ہر طرح سے مالی امداد کی تاکہ اُن کے حقوق کی خاطر خواہ محافظت ہو سکے۔ اب کیا تھا، فاسی جماعت کی طاقت رفتہ رفتہ بڑھنے لگی اور ۱۹۲۲ء میں مسولینی نے کامل اقتدار حاصل کر لیا۔

اِس میں کلام نہیں کہ فاشزم نے ابتدائی دَور میں کوئی نظریہ پیش نہیں کیا، لیکن بعد میں چلکر جب اس کی وضاحت کی گئی تو فرد اور جماعت کے متعلق ایک ایسا فلسفہ پیش کیا گیا جس سے کہ فاشزم کے معاشی مسلک کی توجیہہ ہو سکے۔ فاشزم نے جماعت کی اہمیت جتلانے میں فرد کی آزادی اور شخصیت کا خیال نہیں رکھا ہے۔ اس کے رو سے انفرادی زندگی سے کہیں زیادہ اہم جماعتی زندگی ہے۔ اور جماعت کی معاشی اور سیاسی زندگی کے دوام کے لئے انفرادی حقوق اور مفاد کو قربان کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جماعت افراد کے لئے نہیں بلکہ افراد کو جماعت کے لئے زندہ رہنا چاہیئے۔ اِس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے افراد کے حقوق کے بجائے اُن کے فرائض پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ حکومت کی طرف سے معاشی آزادی صرف اُسی قدر دی جاتی ہے کہ جماعتی اغراض متاثر نہ ہونے پائیں۔ اِس فلسفہ کے تحت افراد کی حیثیت بہت ہی مخدوش ہو جاتی ہے۔ اور حکومت کو موقع ملتا ہے کہ افراد کو اپنا آلۂ کار بنائے۔ معاشی آزادی جو افراد کو دی جاتی ہے وہ ایک رعایت کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے جسے حکومت جب چاہے چھین لے سکتی ہے۔ الغرض اس فلسفہ سے انسان کی شخصیت باقی نہیں رہتی اور وہ حکومتوں کے اغراض کی تکمیل کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے اور ہر نار وا ظلم کو جماعتی فلاح و بہبود کے بہانے روا رکھا جاتا ہے۔ بلاشبہ افراد کی جد و جہد جماعتی فلاح و بہبود کے لئے ہونی چاہیئے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انفرادی شخصیت کو بالکل ہی ختم کر دیا جائے۔ واقعات اس کے شاہد ہیں کہ اس خطرناک نظریہ کے تحت لاکھوں انسان مملکت کے اغراض کی بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں۔

اِس اجتماعی فلسفہ کے بعد اگر سب سے زیادہ کسی چیز کو فاشزم میں اہمیت حاصل ہے تو وہ نیابت کا مسئلہ ہے۔ ہم جس نظام نیابت کے عادی ہیں وہ جغرافیائی بنیادوں پر قائم ہے

اور اس کے تحت ملک کے سارے رقبہ کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور ہر حصہ کیلئے ایک یا ایک سے زائد نمائندے ہوتے ہیں لیکن فاشزم کے تحت نیابت کی بنیادیں پیشوں پر قائم ہیں۔ سارے ملک کو مختلف پیشہ ورانہ جماعتوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس طرح یہاں ۱۳ اتحادات قائم کئے گئے ہیں جو کہ "سنڈیکیٹس" (Syndicate) کہلاتے ہیں۔ اُن میں سے ۶ مزدوروں، ٦ آجروں اور ایک آزاد پیشوں Professional man سے متعلق ہے۔ مزدوروں کے جو ۶ اتحادات ہیں وہ صنعت و حرفت، زراعت، بری نقل و حمل، بحری اور ہوائی نقل و حمل، بنک کاری و انشورنس میں کام کرنے والے مزدوروں پر مشتمل ہیں۔ اور انہیں صنعتوں کے لئے آجروں کے ۶ مماثل اتحادات ہیں۔

اس نظام نیابت کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ مزدوروں اور آجروں کے درمیان اشتراک عمل قائم کرنے کے لئے بہت سے (Corporation) "کارپوریشن" قائم ہیں۔ مثلاً حمل و نقل کے لئے جو "کارپوریشن" قائم ہے اس میں حمل و نقل میں کام کرنے والے مزدور، حمل و نقل سے متعلق مختلف کاروباروں کے آجر، چند فنی ماہرین، اور فاشتی جماعت کے نمائندے شامل ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ آجر اور مزدور کے مشترکہ مسائل کا تصفیہ کریں، مزدوروں کے جھگڑوں کو رفع کریں۔ یہ سب "کارپوریشن" کی وزارت (Ministry of corporation کے تحت ہیں اور اسے "کونسل آف کارپوریشن" سے مدد ملتی رہتی ہے۔ اس نظام مملکت کو جس میں کہ "سنڈیکیٹس" اور "کارپوریشن" کو بڑی اہمیت حاصل ہے، "کارپوریٹ اسٹیٹ" (Corporate State) کا نام دیا گیا ہے۔

یہاں ہم پیشہ ورانہ اور جغرافیائی نیابت کے فوائد و نقصانات کی بحث میں الجھے بغیر اتنا واضح کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ اُن "کارپوریشن" میں کئی نقائص پائے جاتے ہیں چنانچہ سب سے پہلے اُن کا طریقۂ انتخاب حد درجہ ناقص ہے "کارپوریشن" کے نمائندے نام نہاد طور پر منتخب کئے جاتے ہیں۔ اصل میں سارے "کارپوریشن" فاشتی جماعت کے تحت ہوتے ہیں

ہر "کارپوریشن" کے اراکین وہی ہوتے ہیں جن کا شمار فاسٹی جماعت کے وفادار اراکین میں ہوتا ہے۔ ان کے اختیارات بھی کچھ زیادہ وسیع نہیں ہوتے۔ چونکہ ان کی صدارت "منسٹر آف کارپوریشن" کرتا ہے، لہذا اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ (اجنڈے) میں کوئی ایسی بات نہ آنے پائے جس کی اجازت پارٹی یا حکومت کی طرف سے نہ دی گئی ہو۔ ان "کارپوریشن" کی حیثیت محض مشاورتی رہجاتی ہے۔ جہاں تک کہ اتحادات میں شامل ہونے والے مزدوروں کا تعلق ہے یہ غیر فاسٹی جماعتوں سے تعلق نہیں رکھ سکتے۔ جب خود نظام نیابت میں آزادی کی بہت کم گنجائش رکھی گئی ہے تو یہ توقع رکھنا بیسود ہے کہ ان فاستی اداروں کے ذریعہ مزدوروں کی خاطر خواہ نمائندگی ہوسکیگی۔ بہرکیف جملہ اداروں پر فاستی جماعت اور حکومت کا کامل تسلط ہے۔

لیکن فاشزم کا دعویٰ ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت، دونوں کا یکساں مخالف ہے۔ جہاں تک کہ دعویٰ کا دوسرا حصہ ہے یہ تو ہماری سمجھ میں آسانی سے آجاتا ہے، البتہ اسکے پہلے حصے کے ماننے میں ہمیں تامل ہوتا ہے۔ فاشزم کے تحت ایسی کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی گئی ہے جو کہ سرمایہ دارانہ نظام کو کھوکھلا کردے۔ خانگی ملکیت اور ذرائع پیدائش پر خانگی تسلط کو بحال رکھا گیا ہے۔ مسولینی کے برسر اقتدار آنے سے پہلے سرمایہ دار سپید و سیاہ کے مالک تھے اور اب بھی ان کی حیثیت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی ہے بلکہ اس نئی تحریک کی کامیابی کا انحصار، ایک بڑے درجہ تک، سرمایہ داروں کے تعاون اور اشتراک عمل پر رہا ہے نیز مسولینی نے جمہوری نظام کا خاتمہ کر کے سرمایہ داروں کے حصول مقاصد کی راہ میں آسانیاں پیدا کردی ہیں۔ بات یہ ہے کہ سیاسی جمہوریت اور معاشی سرمایہ داری ایک دوسرے کے ضد ہیں۔ اور جمہوری نظام کے تحت مزدوروں کو اپنے حقوق منوانے کا موقع رہتا ہے۔ اور سیاسی جمہوریت کے نتائج معاشی جمہوریت کی شکل میں نمودار ہونے کے ہمیشہ امکانات رہتے ہیں۔ اب اس سے بچنے کا جو بہترین طریقہ نکالا گیا وہ بس یہ تھا کہ جمہوری نظام کا یک سر خاتمہ کردیا جائے۔

فاشزم اس پر زور دیتا ہے کہ گو اُس نے انفرادی جد وجہد کو روا رکھا ہے لیکن اُس کے حدود قائم کر دیئے ہیں تاکہ یہ قومی مفاد سے ٹکرانے نہ پائے۔ نظری اعتبار سے تو یہ دعویٰ بہت ہی دل خوش کن ہے لیکن واقعات اس کے بالکل برعکس ہیں۔ جہاں تک کہ مزدور سبھاؤں کا تعلق ہے اُن کے قیام کی اجازت ضرور دی گئی ہے لیکن اُن پر جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں وہ اُنہیں مخدوش بنا دیتی ہیں۔ مزدوروں کے لئے ۱۹۲۶ء میں ایک منشور (Charter of Labour) عطا کیا گیا۔ اسکی بہت کچھ تعریف کی گئی اور یہ کہا گیا کہ اس کی وہی حیثیت ہے جو کہ فرانسیسی انقلاب کے زمانہ میں "حقوق انسانی" (Rights of man) نامی دستاویز کی تھی۔ اس "منشور مزدوران" کی رُو سے محنت کے معاشرتی پہلو پر زور دیا گیا ہے۔ مزدوروں کو چند سہولتیں دی گئی ہیں مثلاً کئی ہزار کلب اور انجمنیں قائم ہیں جہاں کہ مزدور اپنے اوقاتِ فرصت میں تفریح اور تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اس کے علاوہ زچہ اور بچہ کے فلاح وبہبود کے ادارے قائم ہیں جہاں کہ مزدور عورتوں کے لئے زچگی سے پہلے اور اُس کے بعد نیز شیر خوار بچوں کے لئے بھی طبّی امداد کا انتظام کیا جاتا ہے۔ یہ چیزیں بیشک قابل تعریف ہیں لیکن محنت کو معاشرتی حیثیت قرار دینے کے دوسرے پہلو بھی ہیں چنانچہ اُس کی رو سے مزدوروں کا کام یہ ہے کہ بغیر چون وچرا آجر کے احکام مانیں۔ مزدوروں سے ہڑتال کا قانونی حق چھین لیا گیا ہے اور یہاں (اٹلی) کے مزدوروں کا حال وہی کر دیا گیا ہے جو ایک صدی سے زائد پہلے انگلستان کے مزدوروں کا تھا۔ ہڑتال کے بجائے "محنت کے اجتماعی معاہدوں" (Collective Labour Agreement) کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

آجر اور مزدور کے درمیان جھگڑے کی صورت میں "کارپوریشنس" کے ذریعہ تصفیہ ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اگر سمجھوتہ کروانے میں انہیں ناکامی ہو تو یہ مسئلہ صنعتی عدالتوں (Labour Tribunal Confidential Courts) کے تفویض کر دیا جاتا ہے۔ ان کی طرف سے جو اوقاتِ کار اور اجرتیں مقرر کی جاتی ہیں اُنہیں پر مزدوروں کو کام کرنا پڑتا ہے۔ ان عدالتوں کیا

حکومت کے نمائندے ہوتے ہیں اور بالعموم تصفیہ فاستی جماعت کے سیاسی اغراض کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی بازاروں میں اٹلی کے اشیاء کو دوسرے ممالک کے اشیاء کا مقابلہ کرنے کے قابل بنانے کے لئے یہاں کے مصارف پیدائش کم کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اور تخفیف اُجرت کی پالیسی کی حمایت کی جاتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء تا ۱۹۳۲ء مصارف زندگی میں اوسطاً ۵ فیصد تخفیف ہوئی لیکن اُجرتوں میں ۴۰ تا ۵۰ فیصد تخفیف ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اُجرتوں کی اہمیت مصارف زندگی کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ اور جب مصارف زندگی میں ناقابل ذکر تخفیف ہو لیکن اُجرتوں میں بہت کچھ تخفیف ہوجائے تو مزدور کی اُجرت صحیحہ بری طرح متاثر ہوتی ہے (زرعی مزدوروں کی اُجرت صحیحہ میں بھی تخفیف ہوئی بات یہ ہے کہ فاشزم کے تحت ترک وطن پر قیود عائد کئے گئے تھے اور اضلاع میں زائد آبادی کا بار زمین پر پڑ رہا تھا، اور نتیجۃً اُجرتوں کی سطح میں تخفیف ہو رہی تھی۔)

ایک اور اہم سوال جو پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے آیا فاشزم کے تحت مزدور کی معاشی حالت بہتر ہوئی ہے یا نہیں۔ اس کا جواب دینے کے لئے ہمیں بے روزگاری کے مسئلہ پر توجہ کرنی ہوگی۔ ۱۹۳۲ء میں تقریباً ایک ملین بے روزگار تھے۔ لیکن ۱۹۳۵ء میں بے روزگاروں کی تعداد میں حیرت انگیز تخفیف ہوئی، ان کی کھپت یا تو جنگ حبش یا فوجی خدمات یا مختلف صنعتوں میں ہوئی۔ نیز مزدوروں اور آجروں کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوگیا تھا کہ فی ہفتہ ۴۰ گھنٹہ کام ہوگا اس لحاظ سے بھی بہت سارے مزدوروں کی کھپت ہوگئی۔ لیکن یہاں یہ اَمر قابل ذکر ہے کہ وہ ملک جو اپنی بے روزگاری کے مسئلہ کے حل کے لئے جنگ کا محتاج ہو، کچھ زیادہ سائنٹفک معاشی پالیسی کا حامل نہیں کہا جا سکتا۔

لیکن روزگار کے حاصل کرنے میں بھی مزدوروں کو دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے چنانچہ آجروں کے لئے بطور خاص یہ ہدایت دی جاتی ہے کہ ملازمت کے وقت وہ فاستی جماعت اور فاستی مزدور سبھاؤں کے اراکین کو ترجیح دیں۔ ہر مزدور کے پاس ایک "پاس"

ہوتا ہے جس میں اس کے سیاسی اعتقادات اور فوجی خدمات کی تفصیل ہوتی ہے۔ اور ملازمت کے وقت ان تمام چیزوں کو دیکھا جاتا ہے۔ مخالف پارٹی سے تعلق رکھنے والوں کو نہ صرف ملازمت سے محروم رکھا جاتا ہے بلکہ ہمیں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ اشتراکیں اور مزدور سبھا کے لیڈروں کو جلا وطن یا قتل کر دیا گیا۔

فاشزم کا مزدوروں سے جو سلوک رہا ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی قابل تحقیق ہے کہ اس نے مسئلہ آبادی کے متعلق کیا پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ مسئلہ آبادی کی اہمیت کو اٹلی میں سبھی نے تسلیم کر لیا ہے۔ چنانچہ فاستی مجلس اعلیٰ (Fascist Grand Council) میں اسکو سب مسئلوں سے بڑا اور قومی زندگی کے نقطۂ نظر سے اہم بتلایا گیا۔ نیز ۲۶ مئی ۱۹۲۵ء کو اٹلی کے چیمبر کے روبرو مسولینی نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ ۱۹۵۰ تک اٹلی کی آبادی ۶۰ ملین ہونی چاہیئے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر اٹلی جیسے ایک چھوٹے سے قطعہ میں چالیس ملین انسان آباد ہیں تو دوسری طرف اٹلی کے اطراف ایسے علاقہ ہیں جن کا رقبہ تو اٹلی سے دگنا ہے لیکن جہاں کی آبادی اٹلی سے بہت کم ہے۔ لہٰذا اٹلی کی توسیع (Expansion) کا مسئلہ درحقیقت اُس کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اِس سلسلہ میں جو طرز استدلال اختیار کیا گیا ہے وہ نہایت دلچسپ ہے یہ کہا جاتا ہے کہ اٹلی میں جو متزائد آبادی ہے اُس کی کھپت دوسرے ممالک میں توطن خارجی کے ذریعہ ہوا کرتی تھی لیکن آج کل جب ہر ملک وطن گیری پر قیود عائد کر رہا ہے یہ چیز غیر ممکن ہو جاتی ہے لہٰذا خود اپنے مملکت کے حدود میں متزائد آبادی کے لئے جگہ نکالنی چاہیئے اور اسی غرض سے اپنے علاقوں کو بڑھانا چاہیئے۔

محض اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ آبادی میں اضافہ کرنے پر بھی زور دیا گیا۔ اضافہ آبادی کے جواز میں دو اہم دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔ پہلی تو سیاسی دلیل ہے یعنی طاقتور اطالوی قوم کی تعمیر کے لئے کثیر التعداد آبادی نہایت ہی ضروری ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ گرتی ہوئی شرح پیدائش کو روکنے اور اس کے برے اثرات سے ملک کو بچانے کے لئے بھی اضافہ آبادی ضروری ہے

اٹلی نے گرتی ہوئی شرح پیدائش کے رجحانات کو روکنے کے لئے کئی طریقے اختیار کئے ہیں ناکتخدائی کو پسند نہیں کیا جاتا اور مجرد اشخاص پر ٹیکس بڑھا دیا جاتا ہے۔ شادی کے لئے مختلف سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں مثلاً اس کے لئے قرضے دئے جاتے ہیں اور جیسے جیسے بچے پیدا ہوتے جاتے ہیں ادا شدنی رقم میں کمی کر دی جاتی ہے اور بالآخر چوتھے بچے کی پیدائش پر قرضہ معاف کر دیا جاتا ہے ایسے مزدور جن کے ۸ بچے ہوں ان کے ٹیکس میں تخفیف کی جاتی ہے۔ ملازمتوں میں شادی شدہ اشخاص کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ضبط تولید اور استقاط حمل کے خلاف قوانین وضع کئے گئے ہیں۔ کثیرالاولادوں کو اعزازی تحفے دئے جاتے ہیں۔

ایک اور طریقہ جو اضافہ آبادی کے لئے اختیار کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ باشندوں کے دیہات چھوڑ کر شہروں کی طرف جانے پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ شہروں کی آبادی کے بڑھنے سے شرح اموات میں اضافہ کے جو امکانات ہوتے ہیں اُنہیں روکا جائے انہیں پابندیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شہر میں آنے کے بعد کچھ عرصہ تک بیروزگار رہے تو اُسے دیہات واپس کر دیا جاتا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ شہروں کی طرف منتقلی کو بالکلیہ بند کر دیا گیا ہے۔ اٹلی میں ایک ایسا محکمہ قائم ہے جو لوگوں کو البتہ ترقی یافتہ صنعتی علاقوں میں جانے میں مدد دیتا ہے علاوہ ازیں اس محکمہ کی طرف سے لوگوں کے لئے افریقی نو آبادیات میں جانے کی سہولتیں بھی مہیا کی جاتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اٹلی کے باشندوں کو ایسے علاقوں میں جانے سے روکا جاتا ہے جو کہ اس ملک کے سیاسی حدود سے باہر ہوں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان تمام طریقوں کا نتیجہ کیا ہوا ہے۔ اور آبادی کے متعلق اٹلی کی پالیسی کہاں تک کامیاب رہی ہے۔ شادیوں اور شرح پیدائش میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں خالص اضافہ کی شرح ۸ء۷ فی ہزار رہی گویا گرتی ہوئی شرح پیدائش میں پچھلے سالوں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہونے پایا ہے۔ لیکن اس کے باوجود

اٹلی اپنی آبادی کے بڑہانے کی پالیسی پر ثابت قدم رہا نئے نئے علاقوں کا مطالبہ بڑہتا گیا اور منجملہ اور اسباب کے یہ واقعہ بھی جنگ کے پیدا کرنے میں ممد و معاون رہا۔

اٹلی کی معاشی پالیسی کا ایک اور اہم جزیہ ہے کہ ملک کے لئے معاشی خود اکتفائی حاصل کی جائے۔ معاشی خود اکتفائی کی آسان تشریح یہ ہے کہ ہر ملک کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے اپنے معاشی ضروریات کے لئے دوسروں کا محتاج نہ رہے۔ بلکہ خود اپنے طور پر ضروری اشیاء اور بالخصوص اشیاء خورد و نوش پیدا کرلے۔ اس پالیسی کی تائید مختلف اسباب کی بنا پر کی جاتی ہے لیکن یہاں اس کے صرف ایک پہلو کو واضح کر دینا کافی ہوگا یعنی وہ جو جنگی مصلحتوں سے متعلق ہے یہ کہا جاتا ہے کہ پچھلی جنگ میں جرمنی کی شکست اس لئے ہوئی کہ وہ ملک خود اپنے ضروریات کی تکمیل نہیں کرسکتا تھا اور دوسروں کا محتاج تھا۔ ناکہ بندی کی وجہ سے درآمد جب روکی گئی تو اس کی مصیبتوں میں مزید اضافہ ہوا۔ لہذا اب یہ سوچا گیا کہ بیرونی مال پر انحصار نہ ہو بلکہ خود ملک میں اس کا انتظام ہو۔ ۱۸ ؍ نومبر ۱۹۳۵ء کو جب اٹلی کے خلاف تحریرات Economic sanctions نافذ کئے گئے تو مسولینی نے اعلان کیا کہ اس وقت سے اٹلی کی تاریخ کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے کیونکہ اقل ترین مدت میں زیادہ سے زیادہ معاشی آزادی حاصل کرنے کا محرک درحقیقت یہی واقعہ تھا۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک قلیل مدت میں کوئی ملک اپنے جملہ ضروریات اپنے ہی حدود میں پیدا نہیں کرسکتا تو اس کا کیا رویہ ہونا چاہیئے۔ اس مشکل کا حل اس طرح پر کیا جاتا ہے کہ دوسرے ممالک سے مختلف اشیاء حاصل کرنیکا انتظام کیا ہے۔ اس مقصد کے لئے پہلے تو چھوٹے ممالک اپنے طاقتور پڑوسی کی مدد پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں اور ان کی سیاسی و معاشی آزادی سلب کی جاتی ہے نیز مقبوضہ ممالک (Occupied Territory) کو بھی بطور آلۂ کار استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں جب کہ خاص خاص اشیاء خود اپنے ملک میں پیدا نہ ہوسکیں تو ان کے بدل ڈھونڈھے جاتے ہیں۔ مثلاً جرمنی میں اون کے بجائے "Zellwoole"

کا استعمال۔

اس خود اکتفائی پالیسی کے تحت اٹلی نے اپنے حدود میں گیہوں کی پیداوار بڑھانا شروع کیا۔ حال حال تک یہ بیرونی گیہوں درآمد کرتا تھا لیکن بیرونی رسد سے آزاد بننے کی خاطر ملکی پیداوار بڑھانے کی کوششیں ہونے لگیں۔ اس سلسلہ میں تحقیقی طریقوں، زرعی مشنری اور زرعی تعلیم سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا گیا۔ نیز بیکار زمینوں کو استعمال کے قابل بنایا جانے لگا۔ چنانچہ Land Reclamation کی پالیسی کے تحت کئی ہزار مربع میل زمین جو پہلے بیکار تھی اب کاشت کے قابل بنائی جارہی ہے بیرونی گیہوں پر اعلیٰ محصول درآمد عائد کئے گئے۔ اس میں کلام نہیں کہ اس پالیسی کے نتائج تشفی بخش رہے اور اٹلی بیرونی گیہوں کا محتاج نہ رہا۔ لیکن اس مسئلہ کے دوسرے پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا صارف کے لئے اعلیٰ قیمتیں ادا کرنی پڑیں۔ چنانچہ بیرونی قیمتوں کے مقابلہ میں اٹلی کے صارفین کو ۳۰ فیصد زائد قیمت دینی پڑتی ہے۔ نیز اس پالیسی سے بین الاقوامی رقابتوں میں اضافہ ہونے لگا۔ اٹلی نے دوسرے ممالک پر تجارتی پابندیاں عائد کرنی شروع کیں۔ درآمد پر محاصل (quotas) اور درآمد کے لئے اجازت نامہ (License) کے طریقے اختیار کئے گئے ان قیود کی وجہ سے دوسرے ممالک کو بھی اٹلی کا مال خریدنے میں تامل ہونے لگا، اور اٹلی کی تجارت برآمد بری طرح متاثر ہوئی۔ لہذا اٹلی نے محسوس کیا کہ معاشی خود اکتفائی کی پالیسی میں ترمیم کی ضرورت ہے چنانچہ اسے بہت سارے بیرونی اشیاء، مثلاً گوشت، کوئلہ، خام روئی وغیرہ پر محاصل درآمد میں تخفیف کرنی پڑی۔

اٹلی کے محاصل درآمد اس کے نظام مالیات کے محض ایک جز ہیں۔ اٹلی کے مالیات کا اندازہ لگانے میں ہمیں سب سے بڑی مشکل جو ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں حساب کتاب، اور موازنہ مرتب کرنے کے طریقے بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی تو قومی موازنہ میں اسٹیٹ ریلوے۔ ڈاک تار ٹیلیفون سے جو آمدنی ہوتی ہے اسے شامل کرلیا جاتا ہے اور کبھی اس کو خارج کردیا جاتا ہے۔ اس طرح سال بسال قومی موازنوں میں یکسانیت باقی نہیں رہتی اور جب تک کہ ہر موازنہ کے مدات کا

تفصیلی امتحان نہ کر لیا جائے، محض مجموعی اعداد کی بنا پر مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں کے موازنہ کی دو تین خصوصیتیں قابل ذکر ہیں۔ محصول بالواسطہ میں برابر ترقی ہو رہی ہے۔ روئی، کافی، شکر وغیرہ پر محصول عائد کیا جاتا ہے اور اس کا بار غریب طبقہ پر زیادہ پڑتا ہے۔ دوسری چیز جو قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ صلح کے زمانہ میں بھی تعلیم اور دیگر معاشرتی خدمات کے مصارف کے لئے بہت کم گنجائش رکھی جاتی ہے۔ موازنہ کا بڑا حصہ فوج اور پولیس کے مصارف پر مشتمل ہوتا ہے نیز نوآبادیات پر ایک کثیر رقم صرف ہوئی ہے۔ ایک اندازہ کی رو سے نوآبادیات پر ۷۰۰ ملین لیرا (Live) صرف ہوتا تھا۔ چونکہ اٹلی کے نوآبادیات معاشی لحاظ سے فائدہ مند نہیں ہیں، لہذا جو رقم کہ ان پر صرف ہوتی ہے اس کو غیر پیدا آور قرار دیا جا سکتا ہے۔ محض اپنی سطوت قائم کرنے اور رومی شہنشاہی کی جانشینی کی خواہش نے اٹلی کو اس قدر مصارف برداشت کرنے پر آمادہ کیا ہے۔

اب ذرا جنگ حبش کے مالیاتی پہلو کو لیجئے۔ ایک اندازہ کی رو سے ۱۹۳۶ء تک اس پر کل مصارف ۱۲۱۱۱ ملین لیرا رہے۔ اور دو سال یعنی ۳۴-۱۹۳۳ء تا ۳۶-۱۹۳۵ء کے لئے موازنہ میں ۱۶۷۴ ملین لیرا کا خسارہ رہا۔ یہ مصارف زیادہ تر اندرونی قرضوں اور اعلیٰ محاصل کے ذریعہ پورے کئے گئے۔ نیز املاک پر بھی محصول عائد کیا گیا۔ علاوہ ازیں اس جنگ کے اور اسلحہ کے مصارف پورے کرنے کے لئے مشترک سرمایہ دار کمپنیوں کے اداشدہ اصل پر ۱۰ فیصد کے حساب سے محصول عائد کیا گیا۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ محصول کا بار، محصول ادا کرنے والوں کے لئے گراں ثابت ہو رہا ہے۔ خود مسولینی نے اٹلی کے چیمبر کے سامنے اپنی ایک تقریر کے دوران میں اس کا اعتراف کیا اور محصول کا بار ہلکا کرنیکا ارادہ ظاہر کیا۔

مضمون کے اختتام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فاشزم کے نمایاں کارنامے کیا رہے ہیں۔ فاشزم نے دل خوش کن وعدے تو کئے تھے یعنی اس کے ذریعہ ملک کو سیاسی امن اور معاشی خوشحالی حاصل ہوگی۔ مزدور کے لئے روزگار، دوکاندار کے لئے خریدار، کسان کیلئے

زمین، اور سرمایہ دار کے لئے منافع، فراہم کیا جائے گا۔ ملک کو طاقتور بنانے کے لئے اٹلی نے اضافۂ آبادی اور معاشی خود اکتفائی کے طریقے اختیار کئے لیکن یہ پالیسی کچھ زیادہ کامیاب نہ رہی نو آبادیات اور بالخصوص حبش حاصل کرنے اور اسلحہ بڑہانے کے سلسلہ میں جو مالیاتی بار ملک پر پڑا وہ بہت ہی گراں ثابت ہو رہا ہے۔ اور باشندوں کا معیار زندگی گھٹتا جا رہا ہے "کارپوریٹ" نظام کے تحت مزدوروں کی تحریک پر ضرب کاری لگی ہے اور جو مزدور سبھائیں مخالفت کی جرأت کرتی ہیں وہ مٹا دی جاتی ہیں۔ الغرض اس نظام کے تحت جو ادارے کہ قائم کئے گئے ہیں وہ اٹلی کے باشندوں کی معاشی خود مختاری کے لئے نہیں، بلکہ فاستی مملکت کے اغراض کے لئے ہیں۔

جاپان کی صنعتی ترقی

از
جناب محمد ناصر علی صاحب ام۔ اے (عثمانیہ) لکچرار شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ سرکار عالی

تاریخی پس منظر۔ جاپان کی صنعتی ترقی کے حالات بیان کرنے سے پہلے جاپانی تاریخ کے اہم ارتقائی مدارج کی مختصر تشریح ضروری ہے۔ کیونکہ اس کی بدولت جاپان کے دور جدید یا اس کے نشاۃ ثانیہ کے سمجھنے میں مدد ملیگی۔ چین کی طرح جاپان بھی ایک قدیم سلطنت ہے۔ سنہ ۶۶۰ ق۔م میں اس کی بنیاد ڈالی گئی۔ جیمو[1] یہاں کا سب سے پہلا شہنشاہ گزرا ہے اور یہی اس سلطنت کا بانی بھی تھا۔ جیمو کی وفات کے بعد سے ساتویں صدی سنہ عیسوی تک اُس کے جانشین پورے اختیارات کے ساتھ ملک پر حکومت کرتے رہے لیکن ساتویں صدی کی ابتداء میں فوجی وارا[2] نامی ایک ذی اثر درباری خاندان کو قوت حاصل ہوگی۔ ملک کے عاملانہ اختیارات اس خاندان کے ہاتھ میں منتقل ہوگئے اور شہنشاہ کا وجود برائے نام رہ گیا۔ قوت اور اقتدار کے گھمنڈ میں جب اِس خاندان کے اراکین عیش و عشرت کا شکار ہوگئے تو نویں صدی میں ٹائرا[3] فوجی خاندان نے اور دسویں صدی میں میناموٹو[4] فوجی خاندان نے اثر پیدا کر لیا۔ جنوب اور مغرب میں ٹائرا خاندان کا اثر تھا اور شمال اور مشرق کے علاقے میناموٹو خاندان کے زیر اثر تھے۔ بارھویں صدی کے وسط تک اِن دونوں خاندانوں نے اتنی قوت حاصل کرلی کہ فوجی وارا خاندان کو پورے طور پر زوال ہوگیا۔

---

۱ Jimmu ۲ Fujwara ۳ Taira ۴ Minamalo

اس خاندان کے زوال کے ساتھ ہی اقتدار کلی حاصل کرنے کے لئے ٹائرا خاندان اور میناموٹو خاندان میں کشمکش شروع ہوئی۔ میناموٹو خاندان کے مقابل ٹائرا خاندان کو ابتداً فتح حاصل ہوئی اور کچھ عرصے تک اس کی حکمرانی رہی لیکن ٹائرا خاندان نے میناموٹو خاندان کو شکست دینے کے بعد سب سے اہم غلطی یہ کی کہ شکست خوردہ میناموٹو سردار کے دو لڑکوں (یوری ٹومو[1] اور یوشی تسون[2]) کو زندہ چھوڑ دیا۔ بعد ازاں انہی لڑکوں نے اثر اور قوت حاصل کر کے وسط بارہویں صدی (۱۱۵۵ء) میں ٹائرا خاندان کو شکست فاش دی اور اس کا خاتمہ کر دیا۔ نتیجتاً جاپان کی حکومت میناموٹو خاندان کے ہاتھ میں آگئی۔ یہیں سے شوگنی[3] دور حکومت کی ابتدا ہوتی ہے۔ شوگن[4] وہ اعلیٰ ترین خطاب ہے جو شہنشاہ کی جانب سے فوج کے سپہ سالار کو عطا کیا جاتا تھا۔ چونکہ فوج کے سپہ سالاروں نے غیر آئینی طور پر شہنشاہ کی قوت کو معطل کر کے عملاً خود حکمرانی شروع کر دی تھی اس لئے اُن کا عہد حکومت عام طور پر شوگنی دور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وسط بارہویں صدی تا وسط انیسویں صدی کا زمانہ شوگنی دور میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس دور میں مختلف فوجی خاندانوں نے حالات اور موقعوں کا لحاظ کرتے ہوئے باری باری سے حکومت کی۔ یوری ٹومو اور آئی یاسو[5] اہم شوگن گزرے ہیں۔ یوری ٹومو نے شوگنی نظام حکومت کی بنیاد ڈالی اور آئی یاسو نے اُسے درجہ کمال پر پہنچایا۔ اس دور کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جاگیرداری نظام کو بہت تقویت پہنچی اور اس نظام کی ترقی کے ساتھ ملک میں وہ تمام خرابیاں پیدا ہو گئیں جو عام طور پر اس نظام میں پائی جاتی ہیں۔ شوگنوں کی قوت اور اقتدار اس قدر بڑھ گیا تھا کہ تخت و تاج کے حقیقی مالک یعنی شہنشاہ کی حیثیت ایک گوشہ نشین سے زیادہ نہ تھی۔ شوگن سفید و سیاہ کے مالک تھے حکومت کی باگ جس طرف چاہتے موڑ لیتے۔

لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔ ہر عروجے را زوالے ـــــ بالآخر شوگنوں کی قوت ٹوٹنے کے

---

[1] Yoretomo [2] Yoshitsime [3] ـــ

[4] Shogan [5] Iyeyasac

سامان مہیا ہونے لگے۔ ابتدائے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں علی الترتیب دو اہم کتابیں شایع ہوئیں۔ ان میں سے ایک کا نام ہسٹری آف گریٹ جاپان[1] یعنی جاپان عظمیٰ کی تاریخ تھا اور دوسری کا نام اکسٹرنل ہسٹری آف جاپان[2] یعنی جاپان کی خارجی تاریخ تھا پہلی کتاب میں جیمو کی تخت نشینی کے بعد سے ۱۴۱۲ء تک کے حالات بیان کئے گئے تھے اور دوسری میں شوگنی دورِ حکومت کی ابتدا (وسط بارہویں صدی) سے لیکر آئی یاسو کی تخت نشینی (کے زمانہ) تک کے حالات کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ ان دونوں کا اہم مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ملک کا حقیقی حکمران شہنشاہ (جس کا رشتہ جیمو سے ملتا ہے) ہے اور شوگن غیر آئینی حکمران ہیں جنھوں نے تلوار کے زور سے ملک کی حکومت پر غاصبانہ قبضہ کرلیا تھا لوگوں نے ان کتابوں کو شوق سے پڑھا حقیقتِ حال سے واقفیت کے بعد ان کے دلوں میں شوگنوں کے خلاف احساسات پیدا ہو گئے۔ لیکن شوگنوں کی قوت کو توڑنے میں ان کتابوں کی اشاعت سے کہیں زیادہ اہم حصہ ایک اور واقعہ کا ہے: سولہویں صدی کے نصف آخر اور سترہویں صدی کے پہلے ربع میں یورپی تاجروں کو جاپان میں آنے اور تجارت کرنے کی عام اجازت تھی چنانچہ پرتگالی، ولندیزی اور انگریز جاپان کے ساتھ تجارت کرتے تھے۔ لیکن رومن کیتھولک چرچ[3] کے مشنریوں[4] نے ساتھ ہی ساتھ تبلیغ کا کام بھی شروع کر دیا۔ ان کی اس جد و جہد کی وجہ سے ایک صدی کے اندر دس لاکھ سے زائد جاپانی عیسائی مذہب قبول کر لیے۔ اس واقعہ سے ملکی افراد میں یورپیوں کے خلاف بدظنی پھیل گئی۔ عیسائیت اور یورپیوں کے خلاف حکومت کی پالیسی بھی بدل گئی۔ ملک سے انہیں نکالا جانے لگا اور اکثر مبلغ قتل کر دیئے گئے۔ سوائے ڈچوں کے یورپ کی دوسری قوموں کو جاپانی ساحلوں پر آنے اور تجارت کرنے سے روک دیا گیا۔ اس کے بعد دو سو سال سے کچھ زیادہ عرصے تک جاپان کے تجارتی تعلقات بیرونی دنیا سے منقطع رہے۔ لیکن وسط انیسویں صدی میں یورپی قومیں دوبارہ جاپانی سمندروں پر

---

[1] History of Great Japan
[2] External History of Japan
[3] Roman Catholic Church
[4] Missionaries

نمودار ہوئیں۔ امریکہ نے بھی اس امر پر زور دیا کہ جاپانی بندرگاہیں بیرونی تاجروں کے لئے کھول دیجائیں مگر جاپانیوں کا عام خیال یہ تھا کہ بیرونی قوموں سے تجارتی معاہدات نہ کئے جائیں اور جاپانی بندرگاہیں حسب سابق بند رکھی جائیں۔ شوگن وقت نے حالات کی نزاکت کا لحاظ کئے بغیر رائے عامہ کو ٹھکراتے ہوئے اور شہنشاہ کی نام نہاد منظوری کی پرواہ نہ کر کے بیرونی اقوام سے تجارتی معاہدے طے کر لیئے اس واقعہ نے شوگن کے خلاف ملک میں ہر طرف شورشیں عام کر دیئے۔ شہنشاہ کے موافقین کو شوگن کی علی اعلان مخالفت کے لئے اچھا موقعہ ہاتھ آیا۔ ہر طرف سے یہ آوازیں شروع ہوئیں کہ "شوگن غدار، غاصب اور غیر آئینی حکمران ہے۔ اُسے نکال باہر کیا جائے" شہنشاہ کے طرفداروں کو اس مقصد میں کامیابی ہوئی اور شوگنی حکومت کو زوال ہوا۔ ۹ ؍ نومبر ۱۸۶۷ء کو آخری شوگن یوشونیبو[۱] نے اپنا استعفاء شہنشاہ وقت مٹ سوہیٹو[۲] کے پاس روانہ کیا۔ اس طرح ملک کی حکومت دوبارہ اس کے اصلی حکمران کے ہاتھ میں آگئی۔ شہنشاہ مٹ سوہی ٹو (جیمو کی نسل کا ایک سو اکیسواں[۱۲۱] شہنشاہ) نے اپنا لقب می جی[۳] (می جی کے معنیٰ این لائینڈ[۴] گورنمنٹ یا بیدار مغز حکومت کے ہیں) اختیار کیا۔ اسی لئے اس کا دور حکومت می جی عہد کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۴ ؍ مارچ ۱۸۶۸ء کو شہنشاہ نے اپنے درباریوں کو جمع کیا اور ملک کی ہر جہتی ترقی سے متعلق ایک قسم کھائی جسے چارٹر اوتھ[۵] کہا جاتا ہے اس قسم کے پانچ اجزا حسب ذیل ہیں:-

(i) عام جلسوں کے انعقاد کی اجازت ہوگی۔ قومی امور کا انتظام قومی مفاد کے تحت کیا جائے گا۔

(ii) حاکم اور محکوم متفقہ طور پر خود کو ملک کی فلاح اور بہبود کے لئے وقف کر دیں گے۔

(iii) تمام دیوانی یا فوجی عہدہ دار ہر ملکی صنعت کی سرپرستی کریں گے اور افراد کو ان کی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق جدوجہد کرنے میں مدد دینگے۔

---

[۱] Yoshinobu [۲] Mulsu Hito [۳] Meiji

[۴] Enlightened Government [۵] Charter Oath

(۱۷) قوم کے اخلاقی اور سماجی نقائص کی اِصلاح کی جائیگی۔

(۷) بیرونی دنیا میں جو مفید تعلیم جاری ہے اس کا ملک میں اِنتظام کیا جائیگا اور اِس طرح سلطنت کی بنیادوں کو مضبوط بنایا جائیگا۔

مذکورۂ بالا قسم کے اجزاء کو تفصیل کے ساتھ اِس لئے بیان کیا گیا کہ یہی درحقیقت جاپان کے اِصلاحی پروگرام کی روح ہے۔ اگر ہم جدید جاپان کی اِصلاح کے نظام العمل کا مطالعہ کریں تو وہ ہمیں متذکرہ پانچ اجزاء پر مشتمل نظر آئیگا۔ ۱۸۶۸ء کا سنہ جاپان کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہیں سے جاپان کے دورِ جدید یا اس کے نشات ثانیہ کی ابتداء ہوتی ہے۔ جاپانی مدبروں نے سیاست، معیشت اور معاشرت کی اصلاح کی طرف ایک ساتھ توجہ کی اور ان کے نقائص پر ہر طرف سے چھاپا مارا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی عشروں میں جاپان نے سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی میں حیرت انگیز ترقی کرلی۔ یہاں پر ہم معاشی ترقی کے صرف ایک جزو ــــ یعنی صنعتی ترقی پر بحث کرینگے۔

دورِ جدید اور صنعتی ترقی

میی جی عہد کی ابتدا (۱۸۶۸ء) کے وقت جاپان کی صنعتی حیثیت بہت ہی پست تھی۔ جدید طرز کا صرف ایک کارخانہ موجود تھا، عام طور پر دستکاریوں کا رواج تھا۔ ملکی صنعتیں پارچہ بافی، ظروف سازی اور دوسری معمولی ضروریات کی چیزوں تک محدود تھیں۔ جو مصنوعات تیار کی جاتیں اُن سے زیادہ تر مقامی ضروریات پوری کی جاتی تھیں۔ برآمد کا بڑا جزو خام اشیاء پر اور درآمد کا بیشتر حصہ مصنوعات پر مشتمل ہوتا تھا۔ لیکن میی جی دور کی ابتداء کے ساتھ ہی مختلف صنعتوں کو تیزی کے ساتھ وسعت دینے کی کوشش کی جانے لگی۔ صنعتی تنظیم کی ادنیٰ حالت اور بیرونی مقابلہ کی شدت کے پیش نظر ملک کے سرمایہ دار صنعتی کاروبار میں کثیر رقومات صرف کرنے کو پرخطر سمجھتے تھے (یہ حالت ایک حد تک اب بھی ہندوستان میں پائی جاتی ہے) اس دِقت کو رفع کرنے کے لئے خود حکومت نے اپنی طرف سے مختلف کاروبار براہِ راست جاری کرنا شروع کیا۔ مزید برآں جاگیرداروں اور اُمیروں کی

توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی گئی کہ وہ ذاتی طور پر کارخانے قائم کریں اور صنعت وحرفت کی ترقی میں حصہ لیں۔ چنانچہ ایک سے زاید جاگیرداروں اور امیروں نے کثیر رقومات صنعتی کاروبار میں لگانا شروع کیا۔ دو تین عشروں تک رفتار ترقی مقابلتاً سُست رہی۔ ۱۸۹۴ء میں جب جنگ چین وجاپان کا آغاز ہوا تو مصنوعات کی طلب بڑھ گئی۔ حکومت اور امیروں کے کارخانوں کی کامیابی سے متاثر ہو کر دوسرے خانگی افراد بھی اس طرف مائل ہونے لگے۔ حکومت کی یہ پالیسی ہوتی کہ ابتداً کارخانہ اپنی طرف سے قائم کرے اور جب وہ کامیابی کے ساتھ چلنے لگے تو بتدریج اس سے علٰحدگی اختیار کرے۔ اِس حکمت عملی کا اثر یہ ہوا کہ چند عشروں کے اندر اندر حکومت کی براہ راست صنعتی جد وجہد محدود ہوگئی اور بکثرت خانگی افراد کے کاروبار نظر آنے لگے۔ اُنیسویں صدی کے اِختتام اور بیسویں صدی کی ابتدا تک جاپان کی صنعتی سرگرمی نُمایاں طور پر بڑھ چکی تھی۔ جنگ روس وجاپان ۱۹۰۴ء نے جاپانی صنعتوں کے لئے ترقی کا ایک اور موقعہ بہم پہنچایا۔ ضروریات جنگ کے لئے مختلف قسم کی چھوٹی بڑی مصنوعات بمقداً کثیر طلب کی جانے لگیں۔ صنعتی گرم بازاری اور منافعوں کی بڑھتی ہوئی شرح نے سرمایہ کاروں کی ہمتیں بہت بلند کر دیں۔ کارخانوں اور مزدوروں کی تعداد میں سُرعت کے ساتھ اضافہ ہونے لگا۔ اندرونِ ملک مصنوعات کی مقدار پیدائش میں اضافہ کی وجہ سے برآمدی اشیاء میں خام پیداواروں کا حصہ گھٹنے اور مصنوعات کا حصہ بڑھنے لگا۔ برعکس اِس کے درآمدی اشیاء میں مصنوعات کا حصہ گھٹنے اور خام پیداواروں کا حصہ بڑھنے لگا۔ ۱۹۱۳ء تک یہ عمل برآمد بہت نمایاں ہوگیا۔ گزشتہ جنگ عظیم نے جاپان کی صنعتوں کی ترقی کے لئے زرین ترین موقعہ فراہم کیا۔ دنیا کے ترقی یافتہ صنعتی ممالک چونکہ جنگ میں مشغول تھے اس لئے مختلف ایشیائی ممالک میں ان کی مصنوعات کی درآمد یا تو موقوف ہوگئی یا بہت گھٹ گئی۔ خود جاپان میں ان ممالک کی مصنوعات کی درآمد موقوف ہوجانے یا گھٹ جانے کی وجہ سے مقامی صنعتیں بیرونی شدید مقابلہ سے بہت بڑی حد تک آزاد ہوگئیں۔ اعلیٰ قیمتوں نے گراں مصارف پیدائش کے

مسئلہ کو بھی حل کر دیا۔ دوران جنگ جاپان کی بعض مصنوعات محض اس وجہ سے ترقی کر سکیں اور اُن کی مقدار پیدائش صرف اس بنا پر بڑھ سکی کہ بیرونی ممالک سے اُن کی درآمد موقوف ہو چکی تھی یا ناقابل لحاظ تھی۔ جاپان نے اِس موقعہ سے خوب فایدہ اُٹھایا۔ مقدار پیدایش میں بہت اضافہ کر دیا گیا۔ مقامی ضروریات کو پورا کرنے کے علاوہ امریکہ اور اس کے رفیق دوسرے جنگ آزما ممالک کو مختلف قسم کی مصنوعات کثیر مقداروں میں روانہ کی گئیں۔ مقابلہ کی عدم موجودگی یا اس کی خفیف حیثیت کی وجہ سے بہ آسانی اور بہ سرعت مختلف ایشیائی ممالک کی مارکٹوں پر قبضہ جمایا گیا۔ جنگ عظیم کے اختتام تک جاپان نے صنعت و حرفت میں اتنی ترقی کر لی کے معدودے چند اشیاء کے سوا ضروریات، آسائشات اور تعیشات کی معمولی چیزوں سے لیکر بھاری ترین اور نازک ترین چیزیں اندرون ملک تیار ہونے لگیں۔ بعض صنعتوں میں اس کی ترقی کا یہ عالم رہا کہ خود ترقی یافتہ قدیم صنعتی ممالک کے لئے یہ امر دقت طلب ہو گیا کہ بین الاقوامی بازاروں میں جاپانی مصنوعات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کریں۔ میجی عہد کی ابتداء کے ساتھ اِس میں شک نہیں کہ مختلف قسم کی صنعتیں تیزی کے ساتھ ترقی کرنا شروع کیں اور جنگ عظیم کے ختم تک ترقی کے اتم نقطہ پر یا اس کے بہت قریب تک پہنچ چکی تھیں تاہم ۱۹۱۳ء تک بھی جاپان کے آگے بھاری مشنری کی پیدایش کا مسئلہ بہت اہم رہا دوران جنگ بھاری مشنری کی پیدایش کی طرف ممکنہ توجہ کی گئی اور ختم جنگ تک اِس میں نمایاں کامیابی حاصل کی گئی۔ اہم مشینوں اور آلات و اوزار کی پیدائش کی طرف جاپان کی توجہ جنگ کے بعد بھی مبذول رہی۔ اب جاپان تقریباً ہر قسم کی بھاری مشنری تیار کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ جاپان کی موجودہ جنگی جد و جہد سے بھی ہم اس کی صنعتی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں جاپانی صنعتوں کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا ہے۔ سہولت کی خاطر ہم انہیں چند حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں: (۱*) بنائی کی صنعتیں (۲) معدنیاتی صنعتیں۔

---

* ۱ۂ Weaving Industries
۲ۂ Mining Industries

(۳) میکانی صنعتیں (۴) کیمیائی صنعتیں (۵) سرامک صنعتیں (۶) غذائی صنعتیں (۷) متفرق صنعتیں۔ اب ان میں سے ہر ایک صنعت میں ایک سے زاید صنعتیں شامل ہیں۔ ذیل کے نقشے میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ مذکورہ سات مدات کے تحت کونسی صنعتیں شامل ہیں

جاپانی صنعتیں

(۱) بنائی کی صنعتیں	(۲) معدنیاتی صنعتیں	(۳) میکانی صنعتیں	(۴) کیمیائی صنعتیں	(۵) سرامک صنعتیں	(۶) غذائی صنعتیں	(۷) متفرق صنعتیں
(۱) روئی	(۱) لوہا اور فولاد	(۱) جہاز	(۱) بھاری کیمیائی اشیاء	(۱) شیشہ	(۱) آٹا	(۱) ربر
(۲) ریشم	(۲) کوئلہ	(۲) سواری	(۲) ادویات	(۲) سمنٹ	(۲) چائے	(۲) کاغذ
(۳) اُون	(۳) تانبہ	(۳) برقی انجنیرنگ	(۳) رنگ	(۳) مٹی کے برتن	(۳) شکر	(۳) تمباکو
(۴) سوتی اُونی ململ	(۴) معدنیاتی تیل	(۴) متفرق	(۴) مصنوعی کھاد			
(۵) مصنوعی ریشم						
(۶) ہمپ اور فلاکس						

مندرجہ بالا نقشہ کی مناسبت سے ہم ہر صنعت کی ترقی کے مختصر حالات معلوم کریں گے جس کے ذریعہ بحیثیت مجموعی جاپان کی صنعتی ترقی کا اندازہ ہو سکیگا۔

بنائی کی صنعتیں

(۱) روئی کی صنعت — جاپان میں روئی کی صنعت قدیم زمانے سے جاری ہے البتہ ابتداءً اس کی حیثیت بہت محدود تھی۔ جدید اصولوں پر اس صنعت کی ترقی کا آغاز میجی دور کی ابتداء سے چند سال پہلے ہوا۔ ۱۸۶۲ء میں روئی کی

Mechanical Industries Chemical Industries
Ceramic Industries

سب سے پہلی گرنی قائم کی گئی۔ ۱۸۶۸ء تا ۱۸۸۵ء روئی کی صنعت کی یہ خصوصیت رہی کہ کارخانے یا تو حکومت کی طرف سے یا سابقہ جاگیرداروں کی جانب سے قائم کئے جاتے رہے۔ بعض دوسرے خانگی افراد نے بھی حکومت کی امداد سے کچھ کارخانے قائم کئے۔ لیکن کاروبار کا پیمانہ محدود تھا اور بیرونی پارچہ کا مقابلہ کرنے میں بہت دقت ہوتی تھی۔ اس صنعت کی حالت اس قدر پست تھی کہ کارخانہ دار ہندوستانی پارچہ کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے۔ لیکن جدید مشنری کے استعمال، اعلیٰ صنعتی تنظیم اور ارزان محنت کے ذریعہ قوت مقابلہ کو بتدریج مستحکم کیا جانے لگا۔ ۱۸۸۵ء تک کتائی اور بنائی کی گرنیوں کی تعداد ۲۰ ہوگئی۔ ۱۸۸۶ء تا ۱۸۹۳ء کا زمانہ اس صنعت کے لئے بحیثیت مجموعی مفید رہا۔ ۱۸۸۵ء کے مقابل ۱۸۹۳ء میں گرنیوں کی تعداد دوگنی یعنی ۴۰ ہوگئی ۱۸۹۴ء اور ۱۹۱۳ء کے درمیان دو جنگوں یعنی جنگ چین و جاپان اور جنگ روس و جاپان نے اس صنعت کو بہت فایدہ پہنچایا۔ ۱۹۱۳ء میں گرنیوں کی تعداد ۱۵۲ تک پہنچ گئی۔ گرنیوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ تکلے[1]، کرگھوں[2] اور مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور پیدائش کی مقدار بھی بہت بڑھ گئی۔ گزشتہ جنگ عظیم کا زمانہ بھی اس کی ترقی کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ بڑھتی ہوئی طلب کے پیش نظر بہت سی نئی گرنیاں قائم ہوئیں لیکن جنگ کے ختم کے ساتھ ہی جب طلب میں کمی ہوئی اور قیمتوں میں تخفیف ہونا شروع ہوئی تو نئی گرنیوں کی حالت بہت ابتر ہوگئی۔ ان کے لئے کاروبار جاری رکھنے کا مسئلہ بہت دقت طلب ہوگیا۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۲ء کے درمیان تنظیم جدید، انضمام، تخفیف تعداد اور تخفیف پیدائش کی پالسی اختیار کی گئی۔ روئی کی صنعت کی گرتی ہوئی حالت کو سنبھالنے میں قدیم نو بڑی کمپنیوں نے (جو دی بگ نائین[3] کے نام سے مشہور تھیں) بہت مدد دی۔ ستمبر ۱۹۲۳ء میں جاپان میں ایک اہم زلزلہ ہوا۔ اس زلزلہ کی وجہ سے ضلع کوانٹو[4] میں روئی کی صنعت کو سخت نقصان پہنچا۔ یہ صنعت ابھی

---

[1] Spindle [2] Looms

[3] The Big Nine [4] Kwanto

ناموافق حالات سے دوچار ہی ہوئی تھی کہ ۳۰-۱۹۲۹ء کی عالمی کساد بازاری شروع ہوگئی۔ دوسری صنعتوں کی طرح یہ صنعت بھی اِس کے مضر اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ طلب و رسد کے حالات میں مطابقت پیدا کرنے اور قیمتوں کو معاشی سطح پر برقرار رکھنے کے لئے مقدارِ پیدائش میں کمی کرنا پڑا اور برآمد کی مقدار میں بھی کمی ہوگئی۔ اِن تمام مخالف اثرات کے باوجود مجموعی حیثیت سے اِس صنعت کی ترقی برابر جاری رہی۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء تک گرنیوں کی تعداد ۲۷۵ ہوگئی۔ سوت کی مقدارِ پیدائش تقریباً ۳۵ لاکھ گٹھے اور کپڑے کی پیداوار ڈیڑھ ارب گز سے بھی زیادہ رہی۔ حالانکہ ۱۹۰۸ء میں گرنیوں کی تعداد صرف ۵۱، سوت کی مقدارِ پیدایش ۸ لاکھ گٹھوں سے زائد اور پارچہ کی پیداوار تقریباً ۱۵ کروڑ گز تھی۔ ۱۹۱۰ء میں مزدوروں کی تعداد ۹۴۵۸۵ تھی لیکن ۱۹۳۳ء تک بڑھ کر ۲۵ ۲۱۶۳ ہوگئی حسبِ ذیل اعداد سے روئی کی صنعت کی ترقی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

سال	کتان (روئی) بنانے کی گرنیوں کی تعداد	تکلوں کی تعداد (۱۰۰۰)	کرگھوں کی تعداد (۱۰۰۰)	سوت کی پیدائش (گٹھوں میں)	کپڑے کی پیدائش (۱۰۰۰ گزوں میں)
۱۸۸۵	۲۰	۶۵۴	-	-	-
۱۹۰۸	۵۱	۱۳۸۱	۱۱	۱۵۱۷۹۸۲	۱۴۷۴۴۳
۱۹۱۳	۱۵۲	۲۴۱۴	۲۶	۲۱۷۱۱۵۳	۴۱۶۷۲۵
۱۹۲۳	۲۴۱	۴۴۳۶	۶۱	۲۵۲۵۰۰۰	۱۰۰۰۰۷۹
۱۹۳۰	۲۶۳	۷۲۱۴	۷۹	۲۸۰۷۰۰۰	۱۳۸۸۴۲۵
۱۹۳۴	۲۷۵	۹۵۳۰	۹۱	۳۴۷۲۰۰۰	۱۷۹۳۸۴۵

مندرجہ بالا نقشہ میں اگر ہم ۱۸۸۵ء اور ۱۹۳۴ء کے اعداد کا مقابلہ کریں تو ترقی کی نوعیت ٹھیک طور پر واضح ہو جائیگی۔

جنگ عظیم سے پہلے جاپان سوت زیادہ مقدار میں برآمد کرتا تھا اور پارچہ کی مقدار برآمد مقابلتاً بہت کم تھی۔ جنگ کی وجہ سے جب اندرون ملک پارچہ کی پیدائش بڑھ گئی تو سوت کی برآمد میں کمی ہو گئی کیونکہ اس کی کھپت زیادہ تر اندرون ملک میں ہونے لگی۔ ۱۹۱۳ء میں ۰۰۰،۰۰۰،۱۲۳ ین[1] (ین جاپانی نقروی سکہ ہے اور یہ دو شلنگ ½ پنس کے مساوی ہوتا ہے) کا سوت اور ۰۰۰،۰۵۰،۳۲ ین کا کپڑا برآمد کیا گیا تھا۔ لیکن ۱۹۳۴ء تک سوت کی برآمد ۰۰۰،۲۳۴۸۴ ین رہ گئی اور پارچہ کی برآمد بڑھ کر ۰۰۰،۴۹۲۳۵۱ ین ہو گئی۔

۱۹۲۸ء میں جاپان کی روئی کی مصنوعات کے اہم خریدار چین، برطانوی ہند، ندرلینڈز شرق الہند، ہانگ کانگ اور مصر تھے۔ ۱۹۳۷ء میں زیادہ اہمیت ہندستان، ندرلینڈز اور مانچوکو کو حاصل رہی۔

جاپان کی تمام صنعتوں میں سب سے زیادہ اہمیت روئی کی صنعت کو حاصل ہے۔ کیونکہ ۱۹۳۴ء کے اعداد کے مطابق جملہ برآمد کا ۲۳٫۴ فی صد روئی کی مصنوعات پر مشتمل تھا۔ ۱۹۳۷ء میں گو کہ یہ فی صد گھٹ کر ۱۹٫۷ رہ گیا تاہم برآمدی اشیاء میں پہلا درجہ روئی کی مصنوعات ہی کو حاصل رہا۔

انگلستان کے مقابل جاپان نے کوئی سو سال بعد روئی کی صنعت میں ترقی کرنا شروع کی لیکن اس کی رفتار اس قدر تیز رہی کہ وہ نصف صدی سے کچھ ہی زیادہ مدت میں انگلستان سے بھی بڑھ گیا۔ جنگ عظیم سے قبل برطانیہ سالانہ اوسطاً ۶۵۰۰ ملین گز اور جاپان صرف ۲۵۰ ملین گز کپڑا برآمد کرتا تھا۔ ۱۹۳۷ء تک برطانیہ ۲۲۰۰ ملین گز اور جاپان ۲۷۵۰ ملین گز کپڑا برآمد کرنے لگا۔ ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے جاپانی روئی کی صنعت کی ترقی کی وجہ سے برطانوی روئی کی صنعت کو سخت نقصان پہنچا۔

---

[1] Yen

جدید طرز پر ہندوستان میں روئی کی سب سے پہلی گرنی بمقام کلکتہ ۱۸۱۸ء میں قائم ہوئی بمبئی میں پہلی گرنی کا قیام ۱۸۵۵ء میں ہوا۔ لیکن جاپان میں ۱۸۶۱ء تک بھی اُس کے قیام کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ۱۸۷۷ء میں ہندوستان میں روئی کی گرنیوں کی تعداد ۵۱ تھی لیکن ۱۸۸۷ء میں جاپان کے پاس صرف ۲۰ گرنیاں تھیں۔ اس فرق کے باوجود جاپان نے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتدا سے جنگ عظیم کے اختتام تک اس صنعت میں اس قدر تیز ترقی کی کہ ہندوستان تو کجا خود قدیم ترقی یافتہ صنعتی ممالک کے لئے جاپانی ارزاں سوتی پارچہ کا مقابلہ کرنا مشکل ہوگیا۔

حیرت اس امر کی ہے کہ خود جاپان[1] خاص میں خام روئی کی پیداوار نہیں ہوتی۔ البتہ چوزن[2] میں اس کی قلیل مقدار حاصل ہوجاتی ہے۔ لیکن طلب کی بھاری مقداروں کی مناسبت سے یہ ناقابل لحاظ ہے۔ جاپان کو جتنی خام روئی مطلوب ہوتی ہے اس کی تمام مقدار باہر سے درآمد کی جاتی ہے۔ ابتداً جاپان سب سے زیادہ روئی ہندوستان سے خریدتا تھا۔ ہندوستان کے بعد امریکہ کا درجہ تھا۔ لیکن ۱۹۳۲ء تک پہلا درجہ امریکہ کا اور دوسرا ہندوستان کا ہوگیا ۱۹۳۲ء میں جاپان نے جملہ مطلوبہ روئی کا ۹ء۴۷ فی صد امریکہ سے، ۷ء۴۲ فی صد ہندوستان سے اور باقی ۴ء۹ فی صد مصر، چین اور دوسرے حصوں سے خریدا۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جاپان میں روئی کی خام پیداوار نہ ہونے کے باوجود وہ کونسے اسباب تھے جن کی بنا پر وہ اس صنعت میں اس قدر ترقی کرگیا کہ روئی پیدا کرنے والے صنعتی ممالک بھی خاص خاص پارچوں کی حد تک اس کے مقابلے سے قاصر رہنے لگے؟ ان اسباب میں اہم حصہ قومی اسپرٹ، حکومتی امداد، ماحول کی مناسبت، ترقی یافتہ مشنری، اعلیٰ صنعتی تنظیم، ارزان محنت، زائد اوقات کار اور فروخت پیداوار کے اعلیٰ انتظامات کا ہے۔

(۲) ریشم کی صنعت ——— روئی کی طرح ریشم کی صنعت بھی جاپان میں بہت قدیم

[1] Japan Proper [2] Chosen

زمانے سے جاری رہی ہے۔ مختلف تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ ۴۸۰ ق۔م میں بھی اِس کا وجود پایا جاتا تھا۔ لیکن یہ بتانا کہ تجارتی نقطہ نظر سے اس وقت اس کو کیا اہمیت حاصل تھی بہت وقت طلب ہے۔ البتہ قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ اس کی نوعیت محدود اور مقامی ہوگی دورِ جدید میں اس کی ترقی اس وقت سے شروع ہوئی جب کہ ۱۸۵۹ء میں یوکوہاما[ا] کی بندرگاہ بیرونی تاجروں کے لئے کھولدی گئی۔ موجودہ زمانہ میں یہ صنعت اس قدر ترقی کرگئی ہے کہ بہت سی ذیلی صنعتیں اس سے متعلق ہوگئی ہیں۔ سہولت کی خاطر ہم اس صنعت کو دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں (i) خام ریشم کی صنعت (ii) ریشمی پارچہ کی صنعت۔

(i) خام ریشم کی صنعت ——— خام ریشم کی پیدائش کے تین مدارج ہیں، شہتوت کے درختوں کی کاشت، ریشم کے کیڑوں کی پرورش اور کویئے[ب] (ریشم کے کیڑے کا خول جس میں سے ریشم نکالا جاتا ہے) کی پیدائش، کویے سے خام ریشم کی علیحدگی۔ جاپان کی زراعت میں شہتوت کے درختوں کی کاشت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ۱۹۱۵ء ۱۶۷۰۰۰ کاشتکار خاندان کویے کی پیدائش کے کام میں مشغول تھے۔ ۱۹۲۹ء تک یہ تعداد بڑھ کر ۲۲۱۷۰۰۰ ہوگئی جو جاپانی کاشتکار خاندانوں کی مجموعی تعداد کا ۴۰ فی صد ہے۔ شہتوت کی کاشت کرنے والے خاندانوں کی تعداد میں اضافہ کی وجہ سے رقبہ کاشت میں بھی زیادتی ہوگئی۔ ۱۹۱۵ء میں زیر کاشت رقبہ ۴۵۴۰۰۰ چو[ج]۔ (زمین ناپنے کا پیمانہ۔ ایک چو = ۲٫۴۵ ایکر) تھا۔ ۱۹۳۰ء تک بڑھ کر ۷۱۴۰۰۰ چو ہوگیا۔ رقبہ کاشت میں اضافہ کی وجہ سے کویے کی مقدار پیدائش کا بڑھنا بھی لازمی تھا۔ ۱۸۹۰ء تا ۱۸۹۴ء کویے کی سالانہ اوسط پیداوار ۶۰۰۰ ۵۴۳ کوان[د] (وزن کی اکائی۔ ایک کوان = ۸٫۲۸ پونڈ) تھی ۱۹۳۰ء تک یہ ۱۰۶۴۶۴۰۰۰ کوان ہوگئی۔

کویے کی مقدار میں جوں جوں اضافہ ہونے لگا تو کویے سے خام ریشم نکالنے کے پرانے طریقوں میں تجدید کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اواخر انیسویں صدی میں فرانس اور اٹلی سے

Kwan Kan ‎د‎ Cho ‎ج‎ Cocoon ‎ب‎ Yokohama ‎ا‎

کوییے سے ریشم علیحدہ کرنے کی مشینیں درآمد کی گئیں۔ اس کے بعد مشینوں کے استعمال میں دن بدن اضافہ ہونے لگا۔ موجودہ زمانے میں جاپان میں کوییے سے ریشم نکالنے کے تین طریقے جاری ہیں: ہاتھ کے ذریعہ، پاؤں کے ذریعہ اور مشینوں کے ذریعہ۔ شہتوت کے رقبہ کاشت میں اضافے، کیڑوں کے فن پرورش میں ترقی اور ریشم نکالنے کے جدید طریقوں کی بدولت خام ریشم کی مقدار پیدائش میں بھی بہت زیادتی ہوگئی۔ ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان خام ریشم کی پیدائش کا سالانہ اوسط ۳۵۴۶۰۰۰ کوان تھا۔ ۱۹۳۴ء تک اس کی پیداوار ۱۲۰۶۵۰۰۰ کوان رہنے لگی۔ گویا مقدار پیدائش میں تین گنے سے بھی زیادہ اضافہ ہوا۔

شہتوت کے درختوں کی کاشت اور ریشم کے کیڑوں کی پرورش کے لئے جاپان کی آب وہوا بہت موزوں ہے جسکی وجہ سے خام ریشم کی پیدائش کے لئے جاپان کو دنیا کے تمام ممالک میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ ۱۹۳۴ء میں دنیا میں جتنا خام ریشم پیدا کیا گیا اس کا ۸۲٫۳ فی صد جاپان اپنے پاس پیدا کیا۔ چین اور اٹلی کا حصہ علی الترتیب ۱۱٫۰ اور ۴٫۹ فی صد تھا۔ باقی ۱٫۸ فی صد میں دوسرے ممالک شامل تھے۔ تخمینہ کیا گیا ہے کہ جاپان اپنے پاس کی جملہ مقدار پیدائش کا ۷۰ فی صد خام ریشم برآمد کرتا ہے اور ۳۰ فی صد صنعتی اغراض کے لئے اندرون ملک رکھ لیا جاتا ہے۔ ۱۹۳۷ء کے اعداد کے مطابق جملہ برآمد میں روئی کی مصنوعات کے بعد خام ریشم کا حصہ تھا۔ روئی کی مصنوعات کا حصہ ۱۹٫۷ فی صد اور خام ریشم کا حصہ ۱۲٫۸ فی صد تھا ان اعداد سے جاپان میں خام ریشم کی صنعت کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں خام ریشم کی جملہ برآمد کا ۸۴٫۴ فی صد امریکہ نے خریدا، ۱۱٫۵ فی صد یورپی ممالک نے اور ۴٫۱ فی صد میں مختلف ممالک کی خریداری شامل ہے۔

(ii) ریشمی پارچہ کی صنعت —— اس میں شک نہیں کہ ریشمی پارچہ کی صنعت بھی جاپان میں صدیوں سے جاری رہی ہے لیکن می جی دور کی ابتدا سے پہلے اس کی پیدائش کا پیمانہ بہت محدود تھا۔ وسط انیسویں صدی سے جب کہ مختلف صنعتوں میں نئی روح پڑنے لگی تو

اس صنعت کو بھی ترقی ہونے لگی۔ ۱۸۸۴ء سے اس کی رفتار ترقی تقابلتاً تیز ہوگئی ۱۸۸۶ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان سالانہ اوسطاً ۴۲۵۰۰۰ین کا ریشمی پارچہ تیار کیا جانے لگا۔ ۱۸۹۰ء تک مقدار پیدائش کی قیمت ۴۷۱۴۸۰۰۰ین رہنے لگی۔ ۱۹۱۳ء میں ۲۰۳۲۶۰۰۰ین کا پارچہ تیار کیا گیا اور ۱۹۳۲ء تک ۳۶۵۵۰۶۰۰۰ کا مال تیار کیا جانے لگا۔ اِس طرح ۱۸۸۶ء تا ۱۸۹۰ء کے مقابل ۱۹۳۲ء میں پیداوار کا اضافہ بہت زیادہ رہا۔

مقدار پیدائش میں اضافہ کے ساتھ ساتھ مقدار برآمد میں بھی زیادتی ہوتی گئی ۱۸۸۶ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان سالانہ اوسطاً ۲۱۴۲۰۰۰ین کا مال برآمد کیا جاتا تھا۔ ۱۸۹۰ء تک اس کی مقدار بڑھ کر ۳۹۸۰۴۰۰۰ین ہوگئی ۱۹۱۳ء میں برآمد کی مقدار کسی قدر کم رہی لیکن ۱۹۳۲ء میں ۷۷۴۸۸۰۰۰ین رہی ۱۹۳۲ء میں جملہ برآمد کا کوئی ۲ر۳ فی صد ریشمی مصنوعات پر مشتمل تھا۔ اس کے اہم خریدار ہندوستان، برطانیہ اور امریکہ تھے۔

(۳) اونی صنعت —— روئی اور ریشم کی صنعتوں کے برعکس اون کی صنعت جاپان کے لئے جدید ہے۔ اس کی ابتدا یوں تو میجی عہد کے شروع ہونے سے کچھ عرصہ قبل ہی ہوچکی تھی لیکن اس وقت اُسے کچھ زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی۔ نئے دور کی ابتدا کے ساتھ جب طرز رہائش اور طریقہ بود و باش میں تبدیلی ہوئی تو اونی کپڑے کی طلب بھی بڑھنے لگی۔ بالخصوص فوجی اغراض کے لئے اس کی مانگ زیادہ ہوگئی۔ ۱۸۷۶ء میں اون کی سب سے پہلی گرنی حکومت کے زیر نگرانی اس غرض سے قائم ہوئی کہ اس کے ذریعہ فوجی ضروریات کے لئے اونی مصنوعات فراہم کی جائیں۔ اِس گرنی کے قیام کے دو سال بعد یعنی ۱۸۷۸ء میں ایک اور خانگی کمپنی بھی قائم ہوئی لیکن آئندہ دس سالوں تک یہ صنعت کچھ زیادہ ترقی نہ کرسکی جس کے اہم اسباب یہ تھے کہ یہ صنعت نوخیز ہونے کی وجہ سے بیرونی ارزان کپڑے کا مقابلہ ہمت شکن تھا۔ سرمایہ دار اس میں روپیہ لگانے سے گریز کرتے تھے۔ مزید برآں ملک میں اچھے فن داں بھی موجود نہ تھے۔ حکومت تا ہین اور دیگر قسم کی سرپرستی کے ذریعہ اس کی حالت بہتر بنانے کی

کوشش کر رہی تھی پھر بھی نتائج زیادہ اُمید افزا نہ تھے۔ ۱۸۸۰ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیان مزید پانچ کمپنیاں قائم ہوئیں۔ ۱۹۰۴ء میں جب جنگ روس و جاپان کا آغاز ہوا تو فوجی ضروریات کے لئے حکومت کی طرف سے اُونی کارخانوں کو کثیر فرمائشات ملنے لگیں۔ ایک طرف تو طلب میں اضافہ ہوگیا تھا اور دوسری طرف قیمتیں بھی بڑھ گئی تھیں۔ یہ دونوں اُمور کارخانہ داروں کے حق میں بہت مفید ثابت ہوئے۔ لیکن جب جنگ ختم ہوئی تو طلب میں کمی کے ساتھ قیمتوں میں بھی تخفیف ہوگئی۔ لہٰذا کارخانہ داروں کے لئے پھر مصیبت کا زمانہ آگیا۔ تقریباً تمام کمپنیوں کو بھاری نقصان اُٹھانا پڑا۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں جب جنگ عظیم کی ابتداء ہوئی تو اس کے لئے دوبارہ منافع کمانے اور ترقی کرنے کے مواقع نکل آئے۔ جب قدیم ترقی یافتہ صنعتی ممالک جنگ میں شریک ہوگئے تو اندرون ملک بیرونی ارزاں اور اچھے پارچے کے شدید مقابلے کا مسئلہ خود بخود حل ہوگیا۔ نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرونی ممالک کی مارکٹوں میں بھی مقابلہ کی نوعیت بہت کچھ گھٹ گئی۔ طلب کی زیادتی اور قیمتوں کی گرانی نے کارخانہ داروں کی ہمتیں بلند کردیئے اس موقعہ سے فایدہ اُٹھاکر قدیم کمپنیوں نے اپنے کاروبار کو وسعت دی اور سرمایہ زیر استعمال کی مقدار میں اضافہ کیا گیا۔ پرانی کمپنیوں کی حالت کو بہتر پاکر نئی کمپنیاں بھی قائم ہونا شروع ہوئیں

جنگ کے اختتام پر اس صنعت کی حالت پھر تنزل کی طرف مائل ہوگئی۔ طلب میں کمی ہوچکی تھی اور قیمتیں بھی گر رہی تھیں۔ دوران جنگ مانگ کی زیادتی اور قیمتوں کی گرانی کے پیش نظر بہت سامال تیار کرلیا گیا تھا۔ مگر جب طلب گھٹ گئی تو مال کی نکاسی میں دقتیں ہونے لگیں۔ بعض کمپنیوں کے دیوالے نکل گئے۔ اکثر کمپنیوں کا انضمام عمل میں لایا گیا۔ مقدار پیداوار اور قیمتوں کو قابو میں رکھنے کی وجہ سے ۱۹۲۲ء تک حالات پھر معمولی حیثیت اختیار کرسکے۔ جدید مشینوں کے استعمال، اعلیٰ فن دانوں کے تقرر اور پیدائش کے طریقوں کی اصلاح کی بدولت یہ صنعت دوبارہ ترقی کرنے لگی۔ ۱۹۲۸ء تک کارخانوں کی تعداد ۸۵۲ ہوچکی تھی۔ آئندہ سالوں میں بھی کارخانوں کی تعداد میں اضافے کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۳۳ء تک ان کی تعداد ۱۱۰۷ ہوگئی

اندرون ملک اس صنعت کی ترقی کی وجہ سے تین تبدیلیاں ہوئیں: ایک یہ کہ باہر سے درآمد ہونے والے مال میں غیر معمولی کمی ہوگئی اور اندرون ملک بہت بڑی حد تک ملکی مال اِستعمال ہونے لگا۔ ۱۹۲۴ء میں جاپان نے ۶۳۵۹۶۰۰۰ ین کی اُونی مصنوعات درآمد کیا تھا لیکن اِسکے بعد درآمد کی مقدار بحیثیت مجموعی گھٹتے گھٹتے ۱۹۳۴ء تک صرف ۵۰۸۱۰۰۰ ین رہ گئی۔ دوسرے یہ کہ مقامی ضروریات پورا کرنے کے بعد باہر جانے والے مال کی مقدار بہت بڑھ گئی۔ ۱۹۲۴ء میں جاپان نے ۶۱۶۸۰۰۰ ین کی اونی مصنوعات برآمد کی تھیں لیکن ۱۹۳۴ء تک وہ ۲۹۸۴۸۰۰۰ ین کی مصنوعات برآمد کرنے لگا۔ تیسرے یہ کہ خام اون کی درآمد میں بہت زیادتی ہوگئی۔ کیونکہ خود جاپان میں خام اون کی پیدائش ناقابل لحاظ ہے۔ ۱۹۲۳ء میں جملہ ۵۱۷۸۲۶۰۰۰ کِن[1] (وزن کی اکائی۔ ایک کِن = ۱٫۳۲۲۸ پونڈ) اون درآمد کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۴ء تک اس کی مقدار بڑھکر ۱۳۷،۲۸۶۰۰۰ کِن ہوگئی ۱۹۳۶ء میں جو اشیاء جاپان نے مختلف ممالک سے اپنے پاس درآمد کیں اُن میں بلحاظ اہمیت دوسرا درجہ خام اُون کو حاصل رہا۔ پہلا درجہ خام روئی کا تھا۔ مذکورہ سنہ میں جملہ اشیاء درآمد کا کوئی ۲۱ فی صد خام روئی پر اور ۷ء۳ فی صد خام اون پر مشتمل تھا۔ جاپان میں اون کی سب سے زیادہ درآمد آسٹریلیا سے ہوتی ہے۔ ۱۹۳۴ء میں جاپان نے جسقدر اون خریدا اسکا ۹۰ فی صد آسٹریلیا نے فراہم کیا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں جاپان کی اونی مصنوعات کا سب سے اہم خریدار کوانٹنگ[2] تھا۔

(۴) سوتی اونی ململ[3] ——— جاپانی آب وہوا، موسم اور مذاق کا لحاظ کرتے ہوئے اونی سوتی ململ بہت موزوں ثابت ہوا ہے۔ اس کپڑے کا اِستعمال اواخر انیسویں صدی سے بہت بڑھ گیا جب کہ مغربی ممالک سے اس کی درآمد کی جانے لگی۔ ۱۸۶۸ء میں اس کی درآمد ۴۴۷۰۰۰ گز تھی لیکن صرف پانچ سال کے اندر یعنی ۱۸۷۳ء تک درآمد کی مقدار میں تقریباً پندرہ گنا اضافہ ہوا۔ آخر الذکر سنہ میں درآمد کی مقدار ۵۰۵۴۰۰۰ گز رہی۔ اس کے بعد بھی

---

[1] Kin [2] Kwantung [3] Mousseline de Laine

درآمد کی مقدار میں سال بہ سال اضافہ ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ ۱۸۹۶ء میں یہ ۳،۶۳۵،۰۰۰ گز تک پہنچ گئی۔ درآمد میں اس قدر کثیر اضافہ کے باوجود ملکی سرمایہ داروں کی توجہ اس پارچہ کی پیدائش کی طرف نہیں مبذول ہوئی تھی۔ اس کی اہم وجہ یہ تھی جاپانی اس کی تیاری کا طریقہ نہیں جانتے تھے۔ جنگ چین و جاپان کے اختتام کے بعد دو کمپنیاں خاص طور پر اس کپڑے کی پیدائش کے لئے قائم ہوئیں ۱۸۹۷ء میں مزید دو کمپنیاں قائم کی گئیں۔ بیرونی پارچہ کے شدید مقابلہ کی وجہ سے ابتداً اُن کمپنیوں کو بہت مایوسی رہی اور ایک طویل مدت تک مقسوم کا اعلان نہیں کیا جا سکا جنگ روس و جاپان کی وجہ سے اس صنعت کو بہت فایدہ پہنچا۔ طلب کی زیادتی اور قیمتوں کی گرانی کی وجہ سے یہ کمپنیاں معقول منافع کمانے کے قابل ہوگئیں۔ بالخصوص ۱۹۰۶ء تا ۱۹۰۸ء کا زمانہ بہت خوشحالی کا رہا۔ گنجایش کی مناسبت سے قدیم کمپنیوں نے کاروبار کو وسعت دی۔ علیحدہ جدید کمپنیاں بھی قائم ہوئیں اور بعض ایسے کارخانوں نے جو ابتداً صرف اونی مصنوعات تیار کرتے تھے اس پارچہ کی پیدایش میں بھی حصہ لینا شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندرون ملک اُونی سوتی ململ کی پیدایش بہت بڑھ گئی۔ ۱۸۹۵ء میں یا تو پیداوار مطلق نہ تھی یا یہ کہ ۱۹۰۵ء تک ۱۶،۹۶۰۰۰ گز اور ۱۹۱۲ء تک ۵۴،۵۶۰۰۰ گز کپڑا تیار کیا جانے لگا۔ ۱۹۰۵ء میں جاپان مُلکی ضروریات کو پورا کرنے کے علاوہ دیگر ممالک کو بھی برآمد کرنے کے قابل ہوگیا۔ اس کے بعد برآمد کی مقدار مسلسل بڑھنے اور درآمد کی مقدار لگاتار گھٹنے لگی حتیٰ کہ ۱۹۲۰ء تک درآمد کی مقدار قطعی طور پر موقوف ہوگئی۔ آئندہ صفحے کی جدول میں درآمد و برآمد کے جو اعداد دیئے گئے ہیں ان کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

اُونی سوتی پارچہ کی درآمد اور برآمد

سال	درآمد (۱۰۰۰ گزوں میں)	برآمد (۱۰۰۰ گزوں میں)
۱۸۹۹ - ۱۹۰۳ (اوسط)	۱۶۴۲۱	×

۱۹۰۵	۱۱۳۶۳	۹۷
۱۹۱۰	۳۳۶۵	۶۶۸
۱۹۱۵	۱۲۳	۴۶۰۷
۱۹۲۰	×	۲۱۲۱
۱۹۳۲	×	۱۵۱۶
۱۹۳۴	×	۴۱۰۲

مندرجہ بالا اعداد سے واضح ہے کہ ۱۸۹۹ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان سوتی اونی پارچہ کی درآمد بہت بڑھی ہوئی تھی اور برآمد صفر تھی لیکن ۱۹۲۰ء تک یہ صنعت اتنی ترقی کرگئی کہ درآمد صفر ہوگئی اور ۱۴ لاکھ گز سے زاید پارچہ برآمد کیا گیا۔ ۱۹۱۵ء میں اسکی برآمد ۶۴ لاکھ گز سے بھی زیادہ تھی۔ ۱۹۳۲ء میں برآمد کی کمی عالمی کساد بازاری کا نتیجہ تھی۔ لیکن ۱۹۳۴ء تک پھر مقدار برآمد بڑھ کر ۱۴ لاکھ گز سے زیادہ رہی۔ اِس صنعت کی ترقی کا اندازہ پیدایش کی مقدار سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں جملہ مقدار پیدائش ۱۶۷۹۶۰۰۰ گز تھی۔ ۱۹۱۳ء تک ۶۹۵۸۵۰۰۰ گز ہوگئی۔ ۱۹۳۰ء میں پیدائش کی مقدار اس قدر بڑھ گئی جو اس کے بعد آئندہ چار سالوں میں کبھی بھی اتنی نہیں رہی۔ مذکورہ سنہ میں پیدائش کی مقدار ۱۶۵۸۵۸۰۰۰ گز تھی۔ اور ۱۹۳۴ء میں ۱۲۰۹۴۵۰۰۰ گز رہی۔ سوتی اونی پارچہ کی صنعت جاپان کی اُن صنعتوں میں سے ایک ہے جو بہت قلیل عرصے میں نمایاں ترقی کرگئیں۔

(۵) مصنوعی ریشم کی صنعت ــــ دنیا کے اکثر و بیشتر حصوں میں مصنوعی ریشم کی اشیاء کا استعمال بہت عام ہوچکا ہے اور ہوتا جارہا ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر مختلف ترقی یافتہ صنعتی ممالک نے جاپان سے بہت عرصہ پہلے اپنی توجہ اس صنعت کی ترقی کی طرف مبذول کی

؎ Rayon Artificial-Silk

اس میں شک نہیں کہ جاپان میں بہت سی صنعتوں کی ترقی کا آغاز وسط انیسویں صدی سے ہو چکا تھا لیکن بیسویں صدی کے پہلے عشرے کے اختتام تک بھی یہ صنعت جاپان میں جاری نہ ہو سکی تھی۔ مشرقی صنعتی کمپنی[1] کے نام سے مصنوعی ریشم کی سب سے پہلی کمپنی جاپان میں ۱۹۱۴ء میں قائم ہوئی۔ یہ ایسا زمانہ تھا جب کہ جنگ عظیم کا ابھی ابھی آغاز ہوا تھا۔ طلب میں زیادتی ہوگئی تھی اور بیرونی ممالک سے مال لانے میں دقتیں ہو رہی تھیں۔ لہٰذا اس نوخیز صنعت کیلئے یہ ترقی کا بہترین موقعہ تھا جاپانی باشندوں نے اس سے پورا پورا استفادہ کیا۔ مصنوعی ریشم کے کارخانے تیزی کے ساتھ قائم ہونے شروع ہوئے لیکن جنگ کے ختم پر جب طلب گھٹ گئی اور قیمتیں گرنا شروع ہوئیں تو ان کارخانوں کی حالت بہت بری ہوگئی کیونکہ انہیں قائم ہو کر ابھی قلیل عرصہ ہوا تھا اور یہ پورے طور پر مستحکم نہیں ہو سکے تھے۔ نتیجہ یہ کہ شاہی مصنوعی سلک کمپنی[2] کے سوا بہت سی کمپنیاں بند ہوگئیں۔ مابعد جنگ کے زمانے میں سب سے زیادہ اہمیت شاہی مصنوعی سلک کمپنی ہی کو حاصل رہی کیونکہ جملہ مقدار پیدائش کا تخمیناً ۹۰ فی صد حصہ اسی کمپنی سے متعلق ہوتا تھا۔ ۱۹۲۲ء تک ۲۳۸۰۰۰۰ پونڈ وزن کی مصنوعات تیار کی جانے لگیں۔ صرف ایک سال بعد یعنی ۱۹۲۳ء میں مقدار پیدائش دو گنے سے بھی زاید یعنی ۵۸۰۰۰۰۰ پونڈ ہوگئی لیکن یہ مقدار مقامی صرف کے ۴۰ فی صد سے زاید نہ تھی۔ گویا مقدار پیدائش میں اس قدر اضافے کے باوجود جاپان کو اپنی ضروریات کا ۶۰ فی صد حصہ باہر سے منگوانا پڑتا تھا۔ بیرونی ممالک کی مصنوعات کی درآمد کو روکنے کے لئے حکومت جاپان نے ۱۹۰۷ء میں محصول درآمدی سوکن پر عاید کر رکھا تھا۔ لیکن ملکی پیداوار سے ملکی طلب پوری نہ ہو سکنے کی وجہ سے اس قدر گراں محصول عاید کرنے کے باوجود بیرونی مصنوعات کی درآمد بڑھتی ہوئی مقداروں میں جاری رہی پیدائش کی گنجائش کے پیش نظر مصنوعی سلک کی مزید کمپنیاں قائم ہونے لگیں۔ بالخصوص ۱۹۲۴ء

---

[1] The Eastern Industail Co.

[2] Industrial Artificial Silks Company

اور ۱۹۲۶ء کے درمیان متعدد کمپنیاں قائم ہوئیں۔ روئی کی اکثر بڑی کمپنیوں نے بھی مصنوعی ریشمی اشیا کی پیدائش کو ذیلی کاروبار کی حیثیت سے انجام دینا شروع کر دیا۔ کمپنیوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ مقدار پیدائش میں بھی زیادتی کا ہونا لازمی امر تھا۔ عالمی کساد بازاری کے زمانے میں اس صنعت کی نمایاں خصوصیت یہ رہی کہ ملک کی دوسری صنعتوں کے کاروبار میں سرد بازاری کی صورت نمودار ہو گئی تھی تو اس نے ۱۰ اور ۱۳ فی صد کے درمیان مقسوم ادا کیا۔ اس صنعت کے لئے یہ بات اس لئے ممکن ہو سکی کہ اندرون ملک ایک طرف تو پیدائش کی سہولتیں تھیں اور دوسری طرف وسیع مارکٹ بھی موجود تھا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد بھی کمپنیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور قدیم کمپنیوں نے اپنے کاروبار کو حسب گنجائش وسعت دی چنانچہ ۱۹۳۳ء میں مقدار پیدائش ۸۹۰۰۰۰۰۰ پونڈ ہو گئی اور ۱۹۳۴ء میں ۱۴۸۰۰۰۰۰۰ پونڈ تک بڑھ گئی۔ واضح رہے کہ ۱۹۲۲ء میں پیدائش کی مقدار صرف ۲۳۸۰۰۰ پونڈ تھی ۱۹۲۲ء کے مقابل ۱۹۳۴ء میں ترقی کی یہ رفتار بہت حیرت ناک ہے۔ تخمینہ کیا گیا ہے کہ اس صنعت میں ترقی کے اس معیار پر پہنچنے کے لئے یورپ کے صنعتی ممالک کے لئے نصف صدی سے زاید عرصہ لگا لیکن جاپان نے ۱۹۱۴ء میں اس صنعت کا آغاز کر کے ۱۹۳۲ء تک اس میں ایسی ترقی کر لی کہ فرانس کو پیچھے چھوڑتے ہوئے انگلستان، اٹلی اور جرمنی کے بعد کا درجہ حاصل کر لیا۔ لیکن ایک ہی سال میں یعنی ۱۹۳۳ء تک اس نے انگلستان، جرمنی اور اٹلی سے بھی سبقت لے گیا۔ ۱۹۳۳ء میں اس صنعت کی حد تک امریکہ کے بعد جاپان ہی کا درجہ تھا۔

مصنوعی ریشم کی بین الاقوامی پیدائش کے حسب ذیل اعداد کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔

مصنوعی ریشم کی بین الاقوامی پیدائش کے اعداد ۱۹۲۴ء

(۱۰۰۰ پونڈوں میں)

ملکوں کے نام	مقدار پیدائش
(۱) ریاستہائے متحدہ امریکہ	۲۱۰۰۰

(۲)	جاپان	۱۴۸۰۰۰
(۳)	اٹلی	۱۰۱۰۰۰
(۴)	برطانیہ عظمیٰ	۹۲۰۰۰
(۵)	جرمنی	۹۰۰۰۰
(۶)	فرانس	۷۳۰۰۰

سنہ ۱۹۳۴ئہ میں دنیا میں مصنوعی ریشم کی جملہ مقدار پیدائش (جس میں متذکرہ بالا ممالک کے علاوہ دوسرے ملک بھی شامل ہیں) ۷۹۱۰۰۰۰۰ پونڈ تھی۔ اِس میں امریکہ کا حصہ تقریباً ۲۷ فی صد اور جاپان کا تقریباً ۱۹ فی صد رہا۔ جاپان کی اشیائے برآمد میں مصنوعی ریشم کی مصنوعات کو تیسرا درجہ حاصل رہا (۱۹۳۷ئہ کے اعداد کے مطابق) پہلا درجہ روئی کی مصنوعات کا تھا، دوسرا خام ریشم کا اور تیسرا مصنوعی ریشم کی اشیاء کا۔ اشیائے برآمد کی مجموعی قیمت کے تناسب سے مصنوعی ریشم کی مصنوعات کی قیمت کا فی صد ۹ر۴ تھا۔ ۱۹۳۷ئہ میں اُسکے اہم خریدار ہندوستان، ←——→ آسٹریلیا اور ندرلینڈز تھے۔

(۶) ہمپ[1] اور فلاکس کی صنعت —— ہمپ اور فلاکس ریشہ دار پودے ہیں جن کے ریشوں سے مختلف قسم کی مصنوعات تیار کی جاتی ہیں۔ اُن کی پیدائش کے لئے جاپان کی آب و ہوا، موسم اور زمینات بہت موزوں ثابت ہوئی ہیں۔ تجربہ کے طور پر فلاکس کی کاشت سب سے پہلے ۱۸۸۹ئہ میں کی گئی یہ اِس قدر کامیاب ہوئی کہ ۱۸۸۹ئہ کے مقابل ۱۹۱۹ئہ میں رقبہ کاشت ۲۵ چو سے بڑھ کر ۳۷۹۲۹ چو ہو گیا۔ اسی مناسبت سے مقدار پیدائش میں بھی اِضافہ ہوا۔ روئی اور اون، ریشم اور ہمپ کی صنعتوں کی یہ خصوصیت ہے کہ اوّلذکر دو کے لئے تقریباً تمام خام پیداوار دوسرے ملکوں سے درآمد کی جاتی ہے لیکن آخری دو کی

---

[1] The Hemp and Flax Industry

یہ خصوصیت ہے کہ اُن کے لئے جملہ خام پیداوار اندرون ملک ہی دستیاب ہوتی ہے۔ منجملہ اور اسباب کے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمپ اور فلاکس کی صنعت بہت تیزی کے ساتھ ترقی کر سکی۔ ذیل میں جو اعداد دیئے گئے ہیں ان سے ہمپ کے رقبہ کاشت اور مقدار پیداوار کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہمپ کا رقبۂ کاشت اور مقدار پیداوار

سال	رقبۂ کاشت (چو)	مقدار پیداوار (کوان)
۱۹۰۳-۰۷ (اوسط)	۵۵۰۳	۳۶۶۰۰۰
۱۹۰۸-۱۲ (")	۵۱۳۲	۳۵۵۰۰۰
۱۹۳۰	۱۰۰۱۰	۴۷۵۹۰۰۰
۱۹۳۳	۱۲۹۰۰	۶۲۳۲۰۰۰

روئی اور ریشم کی طرح ہمپ اور فلاکس کی صنعت جاپان میں قدیم زمانے سے جاری ہے لیکن اُنیسویں صدی کے آٹھویں دہے تک بھی اِس کی حیثیت محدود تھی۔ اومی ہمپ یارن کمپنی[1] کے نام سے سب سے پہلی کمپنی ۱۸۸۶ء میں قائم کی گئی۔ اس کے دوسرے سال ایک اور کمپنی قائم ہوئی لیکن ابتداءً اِن کمپنیوں کے کاروبار کو کچھ زیادہ کامیابی نہ ہو سکی۔ ۱۸۹۴ء میں جب جنگ چین و جاپان کی اِبتدا ہوئی تو جنگی اغراض کے لئے ہمپ اور فلاکس کی مصنوعات کی طلب میں نمایاں اضافہ ہو گیا جس کی وجہ سے عارضی طور پر اِن کمپنیوں کی دقتیں حل ہو گئیں۔ ہر کمپنی نے اپنے کاروبار کو وسعت دی اور نئی کمپنیاں بھی قائم ہوئیں۔ بڑھتی ہوئی طلب کے پیش نظر تمام کمپنیوں نے کثرت سے مال تیار کرنا شروع کر دیا۔ اور ہر ایک کی یہ کوشش ہونے لگی کہ

---

[1] The Omi Hemp Yarn Company

زیادہ سے زیادہ مال فروخت کرکے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرے۔ اس رجحان نے گلو تراش[1] مقابلے کی صورت پیدا کردی۔ جنگ کے ختم پر ہر کمپنی کے پاس اسٹاک کی مقدار زیادہ تھی لیکن طلب کم ہوچکی تھی قیمتیں گر رہی تھیں اور باہر کا مقابلہ بھی شدید تھا۔ اندرونی مقابلہ نے حالات میں مزید ابتری پیدا کردی۔ اکثر کمپنیاں دیوالیہ کی حد کو پہنچ گئیں لہذا حالات کو بہتر بنانے کیلئے تین بڑی کمپنیوں نے باہمی سمجھوتے سے ایک اتحاد[2] قائم کیا۔ سنہ ۱۹۰۲ء سے اس پر عمل ہونے لگا اس اتحاد کا اصل مقصد ارکان کے لئے مالی سہولتیں بہم پہنچانا، ہر ایک کی قوت پیداآوری کا لحاظ کرتے ہوئے مقدار پیداوار مقرر کرنا اور ایک مقررہ قیمت پر پیداوار کی فروخت کا انتظام کرنا تھا۔ اس اتحاد کی بدولت ارکان اتحاد کو بہت فایدہ پہنچا۔ مزید برآں مقابلے کے گھٹ جانے سے صنعت کی عام حالت بھی بہتر ہوگئی۔ جنگ روس وجاپان نے اس صنعت کے لئے ترقی کا ایک اور موقعہ فراہم کیا۔ طلب کی زیادتی اور قیمتوں کی گرانی کی بدولت معقول منافع ملنے لگا۔ لیکن ختم جنگ کے ساتھ ہی پھر سرد بازاری کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ گرتی ہوئی قیمتوں کے مضر اثرات سے بچنے کے لئے سابقہ تین کمپنیوں کے اتحاد نے باقی ماندہ ایک اور کمپنی کو بھی اپنے ساتھ شریک کرلیا۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں اس نئے اتحاد کا نام امپیریل ہمپ[3] مینوفیکچرنگ کمپنی رکھا گیا۔

جنگ عظیم سے پہلے مزید دو کمپنیاں قائم ہوئیں لہذا امپیریل ہمپ مینوفیکچرنگ کمپنی اوران کے مابین پھر مقابلہ شروع ہوگیا۔ مقابلہ کے اثرات زیادہ مضرت رساں اس لئے نہیں ثابت ہوئے کہ جنگ عظیم کی ابتدا کے ساتھ ہی کاروباری سرگرمی شروع ہوگئی اور پیدائش کے لئے وسیع مواقع نکل آئے۔ دوران جنگ ان کمپنیوں نے خوب منافع کمایا

---

[1] Cut-throat Competition

[2] Combine

[3] Imperial Hemp Manufacturing Company

اب ان کی حالت اتنی مستحکم ہو چکی تھی کہ مقامی ضروریات کے لئے اشیاء کی فراہمی کے علاوہ بیرونی ممالک کو مال روانہ کیا جانے لگا۔ اور بعض ایسے ممالک کے بازاروں پر بھی قبضہ کیا گیا جو پہلے جاپانی مصنوعات کے خریدار نہیں تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب کہ روس میں فلاکس کی کاشت بہت خراب ہو گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس، بلجیم، جرمنی اور انگلستان کے ایسے کارخانے جو روس سے فلاکس حاصل کرتے تھے بری طرح متاثر ہوئے۔ اس واقعہ سے بھی جاپان میں ہمپ اور فلاکس کی صنعت کو بہت فایدہ پہنچا۔ جنگ عظیم کی ابتدا سے قبل اس صنعت کے لئے بیرونی مقابلے کا مسئلہ بہت اہم تھا لیکن جنگ کے مواقعوں سے فایدہ اٹھا کر اس نے مقامی بازاروں پر پورے طور سے قبضہ کر لیا اور برآمد کی مقدار مسلسل بڑھتی گئی۔

(باقی)

لہ Imperial Hemp Manufacturing Company

رفتارِ عالم

جنگ اِسٹالن گراڈ کی لڑائی نے اَب نہایت نازک اور فیصلہ کن صورت اِختیار کرلی ہے۔ اِس لڑائی میں روسیوں نے جس اِستقلال، بہادری اور اخلاقی اوصاف کے جوہر دکھائے ہیں وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ اِس لڑائی میں جرمنوں نے لاکھوں فوج اور کروڑوں کا سامان جنگ جھونک دیا لیکن پھر بھی اُنھیں جیسی کامیابی کی توقع تھی وہ حاصل نہ ہوئی۔ اَب صورت حال یہ ہے کہ جرمن فوجیں شہر کے شمالی صنعتی علاقہ میں گھس آئی ہیں۔ دوسرے حصوں میں ایک ایک مکان اور ایک ایک گلی کے لئے لڑائی ہو رہی ہے۔ روسیوں نے شہر کے جنوبی حصے پر سخت حملے کرکے دشمن کا ناطقہ بند کر دیا ہے۔ اب اگر اسٹالن گراڈ پر جرمنوں کا قبضہ ہو بھی جائے تو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ اس شہر کی مدافعت سے ہٹلر کے سب منصوبے خاک میں مل گئے۔ جرمنوں کی کوشش ہے کہ والگا پر تصرف حاصل ہو جائے تاکہ دریائی آمد و رفت اور رسل و رسائل بالکل منقطع ہو جائے۔

قفقاز میں بھی جرمنوں کا اقدام رکا ہوا ہے۔ مزدک سے آگے ابھی جرمن فوجیں نہیں بڑھ سکیں جو گروزنی کے تیل کے چشموں سے پچاس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ جنرل ٹیموشنکو نے روس کے وسطی موریچوں پر اور اسٹالن گراڈ کے شمال مغرب میں جرمنوں پر سخت حملے شروع کر دیئے ہیں اور متعدد شہروں کو جرمنوں سے واپس حاصل کر لیا ہے۔ ٹیموشنکو کا طریق عمل یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدافعت کی بہترین صورت یہی ہے کہ اقدامی حملے کئے جائیں۔ چنانچہ اس وقت تک اسٹالن گراڈ

کو فتح کرنے میں جرمنوں کو جو ناکامی ہوئی ہے وہ دراصل اسی طریق عمل کا نتیجہ ہے۔ غرضکہ روسیوں نے لینن گراڈ سے لیکر قفقاز تک اس جارحانہ مدافعت کے مسلک پر عمل کیا ہے اور اس کی خاطر ایسی بیش بہا قربانیاں کی ہیں کہ جن کی نظیر جدید تاریخ میں نہیں ملتی۔ روسیوں نے اِس امر کا ثبوت دیدیا کہ نئے نظام حیات سے جو ان کے ملک میں گزشتہ ۲۵ برس سے جاری ہوا ہے، اُن کی ذہنیت میں کسقدر زبردست اِنقلاب پیدا کر دیا ہے اور ان کی اخلاقی قوت کو زار کے زمانہ کے مقابلہ میں کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے۔

اگرچہ اب تک اِتحادیوں کے لیے یہ ممکن نہ ہوسکا کہ وہ اپنے حلیف روس کی خاطر اور خود اپنی خاطر بھی مغربی یورپ میں جرمنوں کے خلاف محاذ قایم کریں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اُن کے طیاروں نے رہائن لینڈ کے صنعتی مرکزوں اور فرانس کے ساحلی فوجی مرکزوں پر ہزاروں ٹن گولے برسائے جن سے دشمن کو سخت نقصان پہونچا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ گولہ باری قطعی نتائج نہیں پیدا کرسکتی جیسا کہ جرمنوں کی گولہ باری سے ثابت ہوگیا تھا جو انھوں نے اِنگلستان کے مختلف شہروں پر کی تھی۔

جزائر سلیمان اور نیو گنی میں ابھی جنگ کا سلسلہ جاری ہے۔ کوئی فیصلہ کن صورت اَب تک نہیں پیدا ہوئی۔ نتیجہ کا دارومدار زیادہ تر سامان رسد کی فراہمی پر ہوگا۔ جو فریق زیادہ کارکردگی کے ساتھ موثر طور پر اپنی سپاہ کو جنگ کا اعلیٰ قسم کا ضروری ساز و سامان پہونچانے میں کامیاب ہوگا وہ یقیناً آخر میں پالا مارے گا۔ جزائر سلیمان میں بعض چھوٹے چھوٹے جزیروں پر پچھلے دنوں اِقتدار و تصرف ادلتا بدلتا رہا۔ کبھی آسٹریلیا اور امریکہ والے قابض ہوگئے اور کبھی جاپانی۔ جنگ کا رنگ کچھ ایسا ہے کہ اندیشہ ہے کہ شاید ابھی کچھ عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہے اور کوئی فریق دوسرے کو پوری طرح سے زِچ نہ کر پائے۔ آخر میں نتیجہ چاہے کچھ بھی نکلے لیکن فوری طور پر اِس فوجی اقدام سے اتحادیوں کو یقیناً فائدہ ہوا ہے اور جاپانیوں کے لیے بحرالکاہل میں سخت دشواریاں پیدا ہوگئی ہیں۔ غالباً جزائر سلیمان کی جنگ کی بدولت جاپانی ابھی اس قابل نہ ہوسکیں گے

کہ کچھ عرصہ تک ہندوستان کے شرقی ساحل پر بحری مہم کا منصوبہ باندھیں یا خشکی سے ہندوستان پر کسی بڑے حملہ کا ڈول ڈالیں چھوٹے موٹے ہوائی حملے ہوں گے لیکن ان سے کوئی دور رس نتیجہ نہیں نکلے گا۔ اب اگر اتحادیوں نے وسیع پیمانے پر برما پر حملہ شروع کر دیا تو ممکن ہے جاپان کو اپنی چین کی مہم کو بھی اُدھورا چھوڑ کر اس جانب متوجہ ہونا پڑے۔ اگر ایسا ہوا تو جاپان سخت مشکل میں پھنس جائے گا اور اس کو ایک ایک کر کے سب نوالے اُگلنے پڑیں گے جو اس نے ہڑپ کئے ہیں۔

ہندوستان۔ کانگریسی لیڈروں کی گرفتاری کے بعد پچھلے دو ماہ میں ملک کے طول و عرض میں کافی انتشار پیدا ہو گیا لیکن حکومت نے اب صورتِ حال پر پوری طرح قابو حاصل کر لیا ہے۔ اگرچہ اب بھی کہیں کہیں ایسی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں جن سے نظم و نسق کو برہم کرنا مقصود ہوتا ہے لیکن اس قسم کی کوششیں بے نتیجہ رہیں گی اس واسطے کہ ان کے سامنے کوئی واضح اور اعلیٰ مقصد نہیں ہے۔ اور اعلیٰ مقصد وہی ہو سکتا ہے جو قومی نوعیت رکھتا ہو۔ اگر کسی ایک سیاسی پارٹی کو مقتدر بنانے کے لئے ملک میں دہشت انگیزی شروع کر دی جائے تو اسے کسی طرح بھی قومی مقصد سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ کانگریس کے باہر ملک میں جو دوسری سیاسی جماعتیں اور مفاد ہیں وہ موجودہ انتشاری تحریک میں ملک کے مفاد عامہ کے لئے سخت خطرہ محسوس کر رہی ہیں اور بعض دیانتدار کانگریسی بھی اسی خیال کے ہیں چنانچہ مسٹر راجگوپال چاری نے ابھی حال میں ان تمام انتشاری رجحانات کی سخت مذمت کی ہے جو بعض کانگریسی لیڈروں کے اشارہ پر ملک میں پیدا کئے گئے ہیں چنانچہ مسٹر راجگوپال چاری کے خیال کے مطابق گاندھی جی اور کانگریس کے دوسرے ذمہ دار لیڈروں کا منشا ہرگز یہ نہ تھا۔ ہم اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ آیا کانگریسی لیڈروں کا منشا یہ تھا یا نہ تھا کیونکہ اس میں تو مطلق شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ کانگریس یہ تہیہ کر چکی تھی کہ برطانوی حکومت کو سول نافرمانی کی تحریک کے ذریعہ اس دفعہ ایسا زچ کر دے کہ وہ اس کے مطالبات تسلیم کرنے پر بالکل مجبور ہو جائے۔ ان مطالبات کی تہ میں یہ نیت کارفرما ہے کہ سارے ملک کا اقتدار ملنے کے بعد من مانے طور پر اقلیتوں اور دوسرے مفادات سے اپنے شرائط تسلیم کرائے جائیں۔ اگر یہ

نیت نہیں تو سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے سے پہلے مسلم لیگ سے مفاہمت کیوں نہیں کی گئی جس کے بغیر کانگریس کے تمام اقدامات کبھی بھی قومی رنگ نہیں اختیار کر سکتے۔

اب انگلستان کے ارباب اقتدار کا کہنا یہ ہے کہ ہندوستان کی طرف سے کوئی اقدام ہونا چاہیئے تاکہ وہ مسئلہ ہند پر از سر نو غور کریں۔ اس اقدام کی صورت کیا ہوگی کسی کو معلوم نہیں۔ کیا مسٹر راجگوپال چاری انگلستان جا کر صلح وصفائی کی کوشش کریں گے؟ اور کیا ان کی یہ مساعی بار آور ہوں گی یا نہیں اس کی نسبت کوئی رائے فی الوقت نہیں دی جا سکتی۔ سنا ہے کہ سر تیج بہادر سپرو عنقریب وائسرائے اور مسٹر جناح سے مل کر کوئی ایسی تجویز پیش کرنے والے ہیں جس سے حکومت اور کانگریس میں کوئی مفاہمت ممکن ہو۔ لیکن اس مفاہمت سے کوئی فائدہ نہیں جب تک کانگریس اپنے اس دعویٰ سے دستبردار نہ ہو کہ صرف وہی پوری ہندوستانی قوم کی نمائندہ جماعت ہے! ہندوستانی قوم ہے کہاں؟ پہلے اسے تخلیق کرنا ہے اس کے بعد کسی جماعت کو حق ہوگا کہ وہ اس کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکے۔ ہندوستانی قوم کی تخلیق اس وقت تک نہ ہوگی جب تک ہمارے نام نہاد قومی لیڈر تنگ نظری اور خیال پرستی کو چھوڑ کر وسعت فکر اور حقائق پسندی اختیار نہ کریں گے ہمیں ایمانداری کے ساتھ اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیئے۔ جب تک ہم دلی نہ ہو اس وقت تک ہم وطنی کا جذبہ کبھی پنپ نہیں سکتا۔

دوسرے رسائل

بابتہ جولائی ۱۹۴۲ء The Indian Journal of Economics

"گذشتہ دس سال میں ٹراونکور کی مالیات" از آر۔ این۔ پوڈول

ہندوستان کی ممتاز اور ترقی یافتہ دیسی ریاستوں کی مالیات کا مطالعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے خصوصاً اسلئے بھی کہ آجکل صوبہ واری خود مختاری کے تحت قومی تعمیر کے کاموں پر مصارف بیحد ضروری سمجھے جاتے ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ چند دیسی ریاستوں نے بعض تعمیری کاموں پر روپیہ صرف کرنا پہلے ہی سے شروع کر دیا تھا اس مقالہ میں مسٹر پوڈول نے تفصیلی اعداد و شمار کی مدد سے ٹراونکور کی مالیات پر تنقیدی بحث کی ہے اور یہ امر واضح کیا ہے کہ پچھلے چند سالوں میں حکومت ٹراونکور کی معاشی پالیسی میں بنیادی تبدیلی واقع ہوئی ہے حکومت کا خاص خاص تجارتی کاروبار کو خود اپنے ہاتھوں میں لینا اور معاشرتی خدمات پر فیاضی سے روپیہ صرف کرنا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ حکومت کو عوام کی معاشی فلاح و بہبود کا بہت زیادہ خیال ہے۔ عالمگیر کساد بازاری کے اثرات سے ٹراونکور کو حقیقی معنوں میں ۱۹۳۶ء۔ ۱۹۳۷ء میں نجات ملی کساد بازاری کی وجہ سے مالگزاری، انکم ٹیکس، کروڑ گیری، جنگلات، اسٹامپ اور رجسٹریشن کے ذریعہ جو آمدنی ملا کرتی تھی اس میں خاصی تخفیف ہوئی لیکن حکومت نے بہت ہی جلد مختلف ذرائع اور بالخصوص تخفیف مصارف کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے مالیہ میں توازن پیدا کر دیا۔ اس کے بعد ملک کی آمدنی میں اضافہ ہونے لگا۔ ۱۹۳۶ء۔ ۱۹۳۷ء کے بعد سے جو چیز قابل ذکر ہے وہ یہ کہ مختلف طریقوں سے حکومت نے تعمیری کاموں پر روپیہ صرف کرنا شروع کیا ہے۔ زرعی ترقی کیلئے جدید طریقوں کا استعمال کیا جانے لگا ہے۔ زرعی اور صنعتی قرضوں میں سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے ایک بنک کا قیام ہوا ہے طبی امداد اور صحت عامہ کی خاطر دیہی رقبوں میں بیروزگار ڈاکٹروں کو دواخانے قائم کرنیکی ترغیب دیگئی ہے اور ان کے لئے ادویہ کے ذخیرے فراہم کئے گئے ہیں سر سی، پی، راماسوامی ایر کے تدبر کا نتیجہ ہے۔

کہ پلیواسل (Pallivasal) جل برقی اسکیم نے عملی حیثیت اختیار کی۔ کنڈارا میں سفال گری کی صنعت (Ceramic industry) کا قیام اور سرکاری طور پر نقل و حمل کا انتظام کیا گیا۔ ان تمام کاروباروں کے ذریعہ آمدنی میں اضافہ کے بہت کچھ توقعات وابستہ ہیں اور اسطرح محصول ادا کرنیوالوں پر مزید محصول کا بار عائد کئے بغیر ان کی ترقی کا سامان مہیا ہو سکتا ہے۔

ع۔ ق

تنقید و تبصرہ

Indian Trade (ہندوستانی تجارت) از بی۔ وی۔ نارایناسوامی نائیڈو صدر شعبہ معاشیات جامعہ انا ملے صفحات ۲۷۰ کپڑے کی جلد قیمت دو روپیہ ۱۹۴۲ء ملنے کا پتہ: انڈیا یونیورسٹی

از جناب ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی۔ صدر شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ

پروفیسر نائیڈو کی یہ کتاب نہایت بروقت شائع ہوئی ہے۔ موجودہ جنگ نے ہندوستان کی تجارت کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے۔ پرانے بازار اور تعلقات درہم برہم ہوگئے ہیں بعض لوگ اسے جنگی تبدیلی سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ جنگ کے ختم ہوتے ہی پھر وہی پرانا سلسلہ شروع ہو جائیگا اس خیال کے لوگ موجودہ اثرات کو عارضی سمجھکر اس کی طرف چنداں توجہ نہیں کرتے لیکن ملک کے کئی سمجھدار لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ جنگ کا نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو دنیا پرانی ڈگر پر پھر واپس نہ آئیگی جو گذر گیا سو گذر گیا۔ موجودہ عارضی تبدیلیاں رنگ لائے بغیر نہ رہینگی۔ ان حالات میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی تجارت کے مسایل کا عمیق مطالعہ کریں۔ پروفیسر نائیڈو نے دس ابواب میں ہندوستان کے لئے تجارت کی اہمیت سے لیکر اسے مختلف دوروں کا تجزیہ اور ان پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے مختلف مراحل سے گذار کر ہمیں ایک ایسی منزل پر پہنچا دیا ہے جہاں سے ہم حالات و واقعات سے کما حقہٗ واقف ہو کر آیندہ کے لئے کوئی مناسب راہ ڈہونڈ سکتے ہیں۔ یہ کتاب غالباً طلبائ کے لئے لکھی گئی ہے لیکن عوام بھی اس کے مطالعہ سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ کتاب کا نواں باب مجھے بہت مفید اور اہم معلوم ہوتا ہے۔ اس میں فاضل پروفیسر نے ان تمام معاہدات کا

تذکرہ کیا ہے جو گذشتہ دس برس میں ہندوستان نے مختلف ممالک کے ساتھ کئے ہیں۔ اِن معاہدات کے متعلق مواد عام درسی کتابوں میں آسانی سے نہیں ملتا۔ کتاب کا سب سے کمزور حصہ کتاب کا آخری باب ہے جس میں نتائج بیان کئے گئے ہیں یہ باب نہایت مختصر ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلدی کے عالم میں لکھا گیا ہے۔ نتائج نہایت سطحی اور سرسری معلوم ہوتے ہیں۔ کتاب کا تمام اُسلوب بیان اکثر علمی متانت اور سنجیدگی سے گریز کر رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فاضل پروفیسر نے پہلے سب نتائج اپنے ذہن میں محفوظ کر لئے تھے اور پھر واقعات بیان کر کے اُن کے نیچے وہ نتائج جڑ دیئے۔ کتاب کا طرز بیان وہی ہے جس کا سودا آجکل تمام ہندوستانیوں کے سروں پر چھایا ہوا ہے یعنی نیشنل۔ مجھے باوجود کوشش کرنے کے آجتک یہ سمجھ میں نہ آیا کہ معاشیات میں اور بالخصوص بین الاقوامی تجارت میں یہ نیشنل کیا بلا ہے۔ اور کسی ملک میں نیشنل مفاد سے کیا مراد ہے؟

مجھ سے کئی مرتبہ بہت بلند مرتبہ لوگوں نے اکثر پوچھا ہے کہ آیا ہندوستان کے لئے شرح تبادلہ ایک شلنگ چھ پنس مفید ہے یا ایک شلنگ چار پنس میں نے اس سوال کے کئی پہلو بتلانے کی کوشش کی ہے لیکن ہمیشہ مجھے یہی کہا گیا ہے کہ تم صرف اتنا بتاؤ کہ ان دونوں میں سے کونسی شرح مفید ہے اِس قسم کا ایک طرفہ جواب سیاست دان تو شاید دے سکتے ہیں لیکن ایک ایماندار معاشی کے لئے یہ کام چنداں آسان نہیں ہے میں تو ہمیشہ یہ سمجھتا ہوں کہ ہر ملک کا مفاد اس کے مختلف طبقوں کا مفاد ہے اور یہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو چیز ایک طبقہ کے لئے مفید ہو وہ دوسرے طبقے کے لئے قطعی طور پر نقصان دہ ہو۔ انگلستان میں آزاد تجارت کی پالیسی پر عمل رہا اس سے کارخانہ داروں اور مزدور پیشہ طبقہ کو بہت فائدہ پہنچا کیونکہ اشیائے خورد و نوش اور اجناس خام ملک میں سستے داموں میسر آتی تھیں لیکن اِس حکمتِ عملی پر کاربند رہنے سے انگلستان کے زراعت پیشہ طبقہ کو سخت نقصان پہنچا۔ انگلستان میں تو یہ نقصان قابل لحاظ سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ وہاں تو دس فیصد سے بھی کم آبادی کا انحصار زراعت پر ہے لیکن ہندوستان ایسا ملک جس کی آبادی کا ۷۰ فیصد حصہ زراعت پر بسر کرتا ہے اس کے لئے ایسی حکمتِ عملی پر بغیر سوچے سمجھے کاربند ہونا قرین دانش نہیں ہے۔ علمی

کتابوں میں تجارت وغیرہ کے متعلق یک طرفہ اسلوب بیان مناسب نہیں ہے۔ ایک پروفیسر کی لکھی ہوئی کتاب میں عام خوش کن سستے جملے زیب نہیں دیتے۔ مثلاً ہندوستان کی بیرونی تجارت کا ذکر کرتے سب سے پہلے پروفیسر نائیڈو اپنے ناظرین سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ پانچ چار اہم باتیں اپنے پیش نظر رکھیں ان اہم باتوں میں پہلی بات یہ ہے۔

"ہندوستان سے جو مال انگلستان کو بھیجا جاتا ہے اُس کا زیادہ حصہ خام مال ہے اور خام پیداوار کی دنیا کے ہر ملک کو ضرورت ہے"

جس وقت ہم کالج میں پڑھا کرتے تھے اس وقت کے پروفیسر صاحبان اور مصنفین ہمیں یہ بتایا کرتے تھے کہ تجارتی لحاظ سے ہندوستان کی حیثیت بہت مضبوط ہے۔ ہم زیادہ تر خام مال اور خوردنی اجناس باہر بھیجتے ہیں جن کی ہر ملک کو ضرورت ہے۔ چنانچہ انہیں پروفیسروں اور مصنفین کے مشوروں پر حکومت ہند بھی بہت مدت تک عمل پیرا رہی اور یہاں سے جو مال باہر بھیجا جاتا تھا اس میں سے کئی ایک چیزوں کی برآمد پر بھی محصول عاید کیا جاتا تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہماری حیثیت اجارہ دار کی سی ہے اس لئے ہمیں کوئی پرواہ نہیں۔ یورپ کو چائے کے لئے ہمیشہ ہمارا دست نگر رہنا پڑتا ہے۔ لنکا شائر کی گرنیاں ہماری کپاس کے بل بوتے پر ہی چل رہی ہیں اور بعض لوگ تو اپنی ناسمجھی کے عالم میں یہاں تک کہہ گئے کہ اگر ہم انگلستان کو اجناس خوردنی نہ بھیجیں تو وہاں کے لوگ بھوکے مرجائیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان بیانوں میں کہاں تک حقیقت ہے بیرونی تجارت کے سلسلہ میں ہماری حقیقی حالت کیا ہے! جہاں تک اجناس خورد و نوش کی برآمد کا تعلق ہے ہندوستان کی حیثیت صفر کے برابر ہے بلکہ اب تو برما کی علیحدگی کے بعد سے ہماری حیثیت صفر سے بھی کہیں کم ہوگئی ہے۔ ۱۹۱۴ء سے پہلے ہم کافی گندم کی برآمد کرتے تھے۔ ۱۹۳۴ء تک ہماری اپنی آبادی اور ضروریات میں اضافہ ہونیکی وجہ سے ہماری خالص برآمد نہ صرف غایب ہوگئی بلکہ اکثر سالوں میں ہمیں اپنی ضروریات کے لئے دوسرے ممالک کا دست نگر ہونا پڑا۔ چاول کی حد تک ہم اپنی ضروریات کا دس سے پندرہ فی صد حصہ باہر سے منگواتے ہیں۔ یہ تو وہی اجناس

خوردنی کی حالت اور ہمارا یورپی ممالک کو بھوکے مارنے کا زعم اب جنگ نے ہمیں بتادیا ہے کہ خوردنی اجناس کی حد تک ہماری حالت کسقدر کمزور ہے اور خود ملک کے اندر ملک کی ضروریات کے لئے کافی غلہ موجود نہیں صوبجاتی حکومتیں اب ہر ممکن ذرائع سے "زیادہ غلہ اگاؤ" کی مہم کی نشر واشاعت کر رہی ہیں. خام مال کی حد تک بھی ہماری حیثیت اتنی شاندار نہیں جتنی کے ہم سمجھتے ہیں بلکہ اگر زیادہ عمیق مطالعہ کیا جائے تو ہماری حالت چنداں تشفی بخش نہیں۔

لنکا شایر کی گرنیوں کو بند کرنا تو کیا خود اچھے درجے کا کپڑا بنانے کے لئے ہمیں روئی دوسرے ممالک سے منگوانی پڑتی ہے۔ ہماری تو صورت حال یہ ہے کہ

پہونچی ہیں بے کمالیاں اپنے کمال کو

ہم ہر قسم کے گھٹیا پن میں آگے آگے ہیں ہماری روئی اتنی گھٹیا قسم کی ہے کہ بس جاپان کے علاوہ اس کی فروخت کے لئے آسانی سے بازار مہیا نہیں ہو سکتے۔ اس کے برعکس دنیا میں روئی پیدا کرنیوالوں میں دو اہم ملک ہیں۔ امریکہ اور مصر ان دونوں ملکوں کی روئی نہایت اعلیٰ قسم کی ہوتی ہے لیکن یہ دونوں ملک حیران وپریشان ہیں کہ وہ اپنی روئی کہاں فروخت کریں ان ممالک میں اکثر و بیشتر سالوں میں یہ کوششیں ہوتی رہی ہیں کہ روئی کے زیر کاشت رقبہ کو کم کیا جائے۔ امریکہ میں تو یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ چند مرتبہ کھڑی روئی کے کھیتوں میں ہل چلا دیئے گئے اور فصلیں تباہ کردی گئیں تاکہ روئی کی زیادہ مقدار بازار میں پہلے سے کم قیمتوں کو اور زیادہ کم نہ کردے۔ یہ تو رہی روئی کی حالت۔ اسلئے اب ذرا ان اجناس کو بھی دیکھیں جن کا ہمیں اجارہ حاصل ہے انہیں سب سے اہم سن ہے۔ دنیا کے سن کا بہترین حصہ ہندوستان ہی میں پیدا ہوتا ہے اور ہم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اگر ہم ذرا اکڑ جائیں تو دنیا سے من مانی قیمت وصول کرلیں۔

معاشیات کے ابتدائی اصولوں سے واقفیت رکھنے والے طلبا یہ جانتے ہیں کہ اجارہ دار کو دو میں سے صرف ایک چیز پر اختیار حاصل ہے یعنی یا تو وہ قیمت مقرر کر سکتا ہے یا مقدار فروخت۔ اگر وہ قیمت مقرر کردے تو مقدار فروخت صارفین کی شرمندہ احسان رہتی ہے اور اگر وہ مقدار فروخت

مقرر کردے تو پوری قیمت پر اختیار نہیں ہوتا قیمت عام اجناس کی طرح طلب و رسد کی قوتوں کے توازن سے قایم ہوتی ہے اجارہ دار ایک ہی وقت میں یہ نہیں کر سکتا کہ وہ قیمت بھی من مانی مقرر کردے اور مقدار پیدایش بھی حسب مرضی فروخت کرے۔ دوسرے ہمیں یہ جان لینا چاہیئے کہ اجارہ بڑی حد تک قیمت کے تابع ہے۔ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی بدل ضرور ہوتا ہے۔ اجارہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس قیمت پر آسانی سے کوئی دوسرا بدل دستیاب نہیں ہوسکتا۔ سن کی بھی یہی حالت ہے، سامان بھرنے کے لئے سن کی بوریاں اور تھیلے سب سے سستی چیز ہیں سامان کو بھرنے کے لئے اگر کوئی دوسری چیز استعمال کی جائے تو اس کا خرچ سن کے تھیلوں کے مقابلہ میں زیادہ آتا ہے یہی وجہ ہے کہ سن کے تھیلوں کو ہی ترجیح دی جاتی ہے اگر سن کے تھیلوں کے مقابلہ میں کسی دوسری چیز کے تھیلے یا سامان بھرنے کا کوئی دوسرا طریقہ ایجاد ہو جائے تو ہمارا اسن دھرا کی دھرا رہجائیگا۔ چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ معاشی خود اکتفائی کا سودا اکثر ملکوں کے سروں پر اس بری طرح سوار ہوا ہے کہ وہ ہر ممکن طریق سے اپنی ضروریات اپنے ملک کے اندر سے ہی پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں توازن ہائے ادائیگی میں گڑبڑ ہونیکی وجہ سے یہ جنون اور بھی تیز ہو رہا ہے چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ کنیڈا اور آسٹریلیا میں گندم کو بغیر تھیلوں کے ہی جمع کرنے اور جہازوں میں بھرنے کا طریقہ کافی رائج ہو چکا ہے۔

امریکہ میں روئی اس قدر کثرت سے پیدا ہو رہی ہے اور اس کی مانگ اتنی کم ہوتی ہے کہ باوجود زیادہ مہنگے ہونے کے امریکہ میں کپڑے کے تھیلے بننے لگے ہیں۔ کینڈا میں کاغذ کے تھیلوں کا رواج ہو رہا ہے اور ہماری حالت یہ ہے کہ

یاران تیز گام نے محمل کو جالیا
ہم محو نالۂ جرس کاررواں رہے

اسی طرح چائے کے بازار میں ہمارا ہمسایہ لنکا ہمارا زبردست حریف ہے ادھر جاوا سماٹرا وغیرہ میں اس کی پیدایش بڑھ رہی ہے۔ روغنی تخموں کی حد تک ہمیں ارجنٹائین سے سخت مقابلہ کرنا

پڑ رہا ہے وہ ملک منظم ہو کر بیرونی بازاروں پر چھا جانے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہم سمجھ رہے ہیں کہ دنیا ہماری اجناس کے بغیر قایم ہی نہیں رہ سکتی۔

اگر گذشتہ ۲۰ برس کی دنیا کی تجارت کا عمیق مطالعہ کیا جائے۔ تو ہمیں یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ بازار حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ میں خام اور خوردنی اجناس پیدا کرنے والوں نے بہت زیادہ سرگرمی دکھائی ہے۔ اور انہی لوگوں کو بڑھتی ہوئی دقتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ خام مال اور زرعی اجناس کی قیمتیں ساختہ اشیار کی قیمتوں کے مقابلے میں بہت پیچھے رہی ہیں۔ سنہ ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۹ء جو امریکہ میں انتہائی خوشحالی کا زمانہ گنا جاتا ہے۔ اِس گرم بازاری کے دور میں بھی خام اور خوردنی اجناس کی قیمتیں بہت پست رہیں۔ ان قیمتوں کے تفاوت کو درست کرنے کے لئے روز ویلٹ نے سنہ ۱۹۳۴ء میں اپنی "اے۔ اے۔ اے" کی مہم شروع کی "اے۔ اے۔ اے" سے مراد اگریکلچرل اڈجسٹمنٹ ایکٹ لیا جاتا ہے ۔ اِس قانون کے پاس کرنے کا مقصد یہ تھا کہ زرعی اجناس کی جو قیمتیں پست ہو رہی تھی۔ ان کو استوار کیا جائے۔ اور زرعی اور صنعتی اجناس کی قیمتوں کے درمیان جو خلیج بڑھ رہی تھی اس کو کم کیا جائے۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں اوٹاوہ کے مقام پر جو شاہی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس میں برطانیہ سے کہیں بڑھ چڑھ کر نوآبادیات اور مملکتوں کے نمائندوں نے سرگرمی دکھائی۔ برطانوی مملکتوں میں زیادہ تر خام مال اور زرعی اجناس پیدا کی جاتی ہیں۔ اور انہی ملکوں کے نمائندے اِس بات کے لئے کوشاں تھے کہ برطانیہ کو ان کی پیدا کردہ اجناس خریدنے پر مجبور کیا جائے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں جب انگلستان نے معیار طلا ترک کیا۔ تو یورپ کے وہ ممالک جو برطانیہ کے ساتھ تجارت کرتے تھے اپنی تجارت کے تحفظ کے لئے انہیں بھی اِس معیار کو خیرباد کہنا پڑا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ڈنمارک جو برطانیہ کے بازاروں میں نیوزی لینڈ کے مکھن اور دیگر اشیائے خوردنی کے لئے نیوزی لینڈ کا حریف ہے۔ اس نے اِس خیرباد کی رسم میں سب سے سبقت لے لی۔

زرعی اجناس اور خام مال پیدا کرنے والے ممالک کی حکومتیں ہمیشہ اسی تگ و دو میں رہتی ہیں کہ کسی طرح وہ اپنے ممالک کا مال دوسرے ملکوں میں زیادہ سے زیادہ مقدار میں بھیجنے میں کامیابی

حاصل کرلیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے رنگا رنگ کی کوششیں کی گئی ہیں۔ ملک کا بہتر سے بہتر مال باہر بھیجا جاتا ہے۔ اس کی درجہ بندی کے متعلق کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔ اور اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے کہ اس معیار میں ہمیشہ ہموار پن اور یکسانیت رہے۔ مال کی درجہ بندی پر زور دیا جاتا ہے۔ حکومت کی طرف سے اس مال کی جانچ پڑتال کرنے کے لئے افسر مقرر کئے جاتے ہیں مثال کے طور پر آسٹریلیا کو لے لیجئے۔ آسٹریلیا میں مکھن کی برآمد پر اسی قسم کی پابندیاں عائد کی گئیں برآمد کا انتظام ایک برآمدی ادارے کے ہاتھ میں ہے۔ جو "بٹر کنٹرول بورڈ" کے نام سے موسوم ہے۔ جو مکھن آسٹریلیا سے باہر بھیجا کرتا ہے۔ یہ ادارہ اس کی نگرانی کرتا ہے۔ آسٹریلیا سے جو مکھن باہر بھیجا جاتا ہے۔ اس پر "کنگرو" کا نشان لگایا جاتا ہے۔ اور اس کو "کنگرو چھاپ" مکھن کہتے ہیں۔ یہ آسٹریلیا کا بہترین مکھن ہوتا ہے۔ جو بہترین قسم کی تازہ کریم سے بنایا جاتا ہے۔ مکھن باہر بھیجے جانے سے پہلے حکومت کے مقرر کردہ انسپکٹر باہر جانے والے مال میں سے چار یا پانچ فی صد مال کا امتحان کرتے ہیں۔ اور پتہ چلاتے ہیں کہ یہ مکھن مقررہ فواید کے مطابق تیار کیا گیا ہے یا نہیں اگر کوئی کنستر مقررہ معیار سے گرا ہوا ہو تو تمام کا تمام مال روک لیا جاتا ہے۔ آسٹریلیا کی حکومت کی کوششیں صرف یہاں ہی ختم نہیں ہوتیں۔ بلکہ آسٹریلیا کی حکومت نے محسوس کیا کہ انگلستان کے بازاروں میں آسٹریلوی مکھن کی بجائے ڈنمارک کا مکھن کہیں زیادہ آسانی سے فروخت ہوتا ہے۔ اہل انگلستان کو آسٹریلیا کے مکھن کی خوبیوں سے آگاہ کرنے کے لئے آسٹریلیا کی حکومت نے کئی لاکھ روپئے اشتہارات پر صرف کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آسٹریلیا کے مکھن کی مقدارِ فروخت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی۔

ادھر ہم ہیں کہ ہندوستان کا مال جو باہر بھیجا جاتا ہے۔ وہ اپنے گھٹیا پن کے لئے دنیا کے بازاروں میں بہت خاص شہرت رکھتا ہے۔ ایک تو پہلے ہی ہمارا مال گھٹیا ہوتا ہے۔ دوسرے برآمدی مال پر کسی قسم کی معیاری نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے گھٹیا تجارتی ہتھکنڈے بے روک ٹوک استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً ہماری روئی کو لے لیجئے۔ ہندوستان کی روئی پہلے تو ویسے ہی مصر اور امریکہ

کی روئی سے گھٹیا ہوتی ہے۔ رہی سہی کسر روئی میں ریت اور نمی کی آمیزش سے پوری کردی جاتی ہے۔ ہندوستان اگر بیرونی تجارت میں ترقی کرنا چاہتا ہے۔ تو اس کو اپنی گذشتہ تمام پالیسی پر نظرثانی کرنا پڑیگی۔ اور یہ بے بنیاد سوداِ دل سے نکالنا پڑیگا۔ کہ دنیا ہمارے مال کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔ معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ اور اگر ہندوستان کی طرف سے باضابطہ منظم کوششیں نہ کی گئیں تو بہت جلد ہماری حالت بد سے بدتر ہوجائے گی۔

یہ چند معترضہ جملے کتاب زیر تبصرہ کی وقعت کو کم نہیں کرتے۔ یہ کتاب نہایت محنت سے لکھی گئی ہے۔ اور طلباء کے لئے بہت مفید معلوم ہوتی ہے۔ اِس کتاب کے پڑھنے سے جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ کارکنان اناملہ یونیورسٹی کی کاروباری کارکردگی ہے۔ کتاب اگست ۱۹۴۲ء میں مجھے ملی۔ پروفیسر نائیڈو نے اس کتاب پر جو دیباچہ لکھا ہے۔ وہ جون ۱۹۴۲ء کا لکھا ہوا ہے۔ اِس کتاب پر پیش لفظ "سر شینکم چیٹی" نے لکھا ہے۔ جو چند ماہ پیشتر تک امریکہ میں ہندوستان کے تجارتی نمائندے تھے۔ حال ہی میں واپس تشریف لائے ہیں۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کتاب چند ماہ میں ہی چھپکر تیار ہوئی ہے۔ کتاب کی جلد عمدہ کپڑے کی ہے اس کا سرورق نہایت خوشنما ہے۔ کتاب کا کاغذ نہایت دبیز اور عمدہ ہے۔ صفحات کی تعداد جیسا کہ اُوپر ذکر کیا جاچکا ہے (۲۷۰) ہے لیکن اِن تمام خوبیوں کے باوجود کتاب کی قیمت محض ۲ روپئے ہے۔ گذشتہ تین برس کے عرصہ میں اناملہ یونیورسٹی نے معاشیات کے متعلق تقریباً دس کتابیں پروفیسر نائیڈو کی ادارت میں شائع کی ہیں۔ یہ کتابیں اپنی نوعیت اور موضوعوں کے لحاظ سے نہایت ہی اہم ہیں۔ مثلاً ۱۹۳۷ء میں حکومت مدراس نے مقروضین کی امداد کے لئے جو ایکٹ پاس کیا تھا اس کے متعلق ایک کتاب ۱۹۳۸ء میں شائع کی۔ اسی سال میں جب کانگریس نے ترک مسکرات کی پالیسی پر عمل شروع کیا۔ اور سیلم کے ضلع میں کلیتاً مسکرات کی فروخت کو ممنوع قرار دیا۔ تو تمام ہندوستان کے باخبر حلقے یہ جاننا چاہتے تھے کہ اس پالیسی کا کیا اثر ہوا۔ چنانچہ اس قانون کے ۶ ماہ تک عمل پذیر رہنے کے بعد اس کا اندازہ کرنے کے لئے اناملہ یونیورسٹی نے اپنے محققین کو بھیجکر صورت حالات کی جانچ پڑتال کروائی۔ اور اس کے نتائج ایک کتاب کی صورت میں

شائع کیے۔ اسی طرح انٹرمیڈیٹ کے طلبا کے لئے تامل زبان میں ایک کتاب تالیف کی گئی۔ تین برس کے عرصہ میں تقریباً دس کتابیں شائع کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے اور وہ بھی اناملہ جیسے نئے خانگی ادارے کے لئے جس کی مالی حالت کچھ ایسی زیادہ عمدہ نہیں ہے۔ اس پر خوبی یہ ہے کہ اس کتاب کی قیمت بالکل واجبی رکھی گئی ہے۔ اور اکثر و بیشتر کتابیں علمی اداروں اور ذی علم ارباب کو مفت نذر کی جاتی ہیں۔ تاکہ علم کی زیادہ سے زیادہ ترویج و اشاعت ہو۔

اس کے برعکس ہماری یونیورسٹی ہے جہاں بفضل تعالیٰ سلطنت آصفیہ کی علم پروری اور فیاضی کی وجہ سے مالی تنگ دامانی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ علمی خدمت کے متعلق بالخصوص اُردو کے ذریعہ ہمارے دعوے بہت بلند ہیں۔ لیکن جہاں تک علمی کام کا تعلق ہے ہماری کوششیں ہمارے اخراجات کے مقابلے میں بہت ہی حقیر معلوم ہوتی ہیں۔ معاشیات اس یونیورسٹی میں گذشتہ ۲۰ برس سے اردو زبان میں پڑھائی جاتی ہے۔ جامعہ کی طرف سے معاشیات کی حدتک اس وقت تک معاشیات کی کوئی تحقیقی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ تراجم کی حدتک صرف ایک درجن کتابوں کا ترجمہ اب تک شائع ہوا ہے۔ حال ہی میں مجھے پنجاب کوآپریٹیو یونین لاہور نے اپنے تراجم تصانیف و تالیفات کا ایک پورا سلسلہ تحفتاً بھیجا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر انتہائی حیرانی ہوئی۔ کہ ایک نامعلوم گمنام سے صوبجاتی ادارے نے اس وقت تک معاشیات کی دس مستند کتابوں کا ترجمہ اُردو میں شائع کیا ہے۔ ایک یونیورسٹی جو اُردو میں تعلیم کا دعویٰ کرتی ہے۔ جہاں معاشیات کی ایم۔ اے تک تو کیا پی۔ ایچ۔ ڈی تک اُردو میں تعلیم ہوتی ہے۔ وہاں بیس برس کے طویل عرصہ میں صرف ایک درجن معاشیات کی کتابوں کا ترجمہ ہوتا ہے۔ جس پر بلاشبہ کئی لاکھ روپے صرف ہوئے ہونگے۔ لیکن ایک مختصر سا گمنام صوبجاتی ادارہ دس۔ بارہ برس کے عرصے میں دس مستند کتابوں کا ترجمہ شائع کرتا ہے۔ ہمارے یہاں اگر ایک کتاب کا ترجمہ دو برس میں ہوتا ہے تو دوسروں کے یہاں وہی ترجمہ چار۔ چھ ماہ میں ہو جاتا ہے۔ ہمارے یہاں جو کتاب دو برس میں چھپتی ہے باوجود اس کے کہ ہمارے یہاں اپنا مطبع موجود ہے۔ دوسروں کے یہاں وہی کتاب

باوجود اپنا مطبع نہ ہونے کے تین چار ماہ میں شائع ہوجاتی ہے۔ ہمارے یہاں جس کتاب کی قیمت آٹھ۔ دس۔ روپے سے کم نہیں رکھی جاتی۔ دوسروں کے یہاں وہی کتاب دو۔ ڈہائی روپے میں ملجاتی ہے ہمارے یہاں یہ کہاجاتا ہے کہ اس بات کی کوشش کی جاتی ہے۔ کہ کسی اُردو ترجمہ کی قیمت اصل انگریزی کتاب سے بڑھنے نہ پائے۔ محدود کاروباری نقطۂ نگاہ سے یہ پالیسی مفید ہوتو ہو۔ لیکن علمی لحاظ سے اور بالخصوص ادبی خدمت کی حدتک یہ پالیسی بالکل بے معنی ہے۔ کیونکہ اُردو دان طبقہ انگریزی داں طبقہ سے متقابلتاً کہیں زیادہ غریب ہے۔ اور وہ اِتنی قیمت ادا نہیں کرسکتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ جامعہ عثمانیہ کی پالیسی کے بالکل برعکس پنجاب کوآپریٹیو یونین نے انگریزی کتابوں کی قیمت کے مقابلے میں اُردو ترجموں کی قیمت برائے نام رکھی ہے۔ ذیل میں ہم ایک فہرست درج کرتے ہیں جس سے اِس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہاں یہ بیان کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ جتنی کتابیں ہیں سب کی سب سنہری مجلد ہیں:۔

نام کتاب	نام مصنف	حجم	انگریزی قیمت	اُردو قیمت
۱۔ داستان دہقان	ڈارلنگ	۳۵۰ صفحات	دس روپے	دو روپیے
۲۔ دیہاتی زندگی	؍؍	۴۴۸ ؍؍	آٹھ ؍؍	ڈہائی ؍؍
۳۔ مناظر اِمداد باہمی	؍؍	۳۰۳ ؍؍	چار ؍؍	دو ؍؍
۴۔ امداد باہمی اور ہندوستان	مکرجی	۶۴۴ ؍؍	پانچ ؍؍	تین روپے
۵۔ مالیات دیہات	ہیرک	۵۹۶ ؍؍	آٹھ ؍؍	تین ؍؍
۶۔ آئینۂ پنجاب	کیلورٹ	۴۳۰ ؍؍	پانچ ؍؍	بارہ آنے
۷۔ جمہوریت، اِمداد باہمی	ہو	۱۹۲ ؍؍	پانچ ؍؍	چار آنے
۸۔ اِمداد باہمی اور برہما	برٹیو	۱۷۳ ؍؍	چار روپے	؍؍
۹۔ معاشیات دیہات	کارور	۴۴۸ ؍؍	آٹھ ؍؍	بارہ آنے
۱۰۔ بنک ہائے عوام	وولف	۵۶۰ ؍؍	آٹھ روپے	تین روپے

۱۱۔ حیاتِ دیہات	سید ظہور حسین شاہ	۱۷۶	تالیف	آٹھ آنے
		۶	۶۵ روپے	۱۸ روپے

اِس جدول سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اِن گیارہ کتابوں کی مجموعی انگریزی قیمت ۶۵ روپے ہے اور اُردو تراجم کی صرف (۱۸) روپے ہے۔ اَب ذرا جامعہ عثمانیہ کی شائع شدہ تصانیف پر بھی نظر ڈالیئے۔

نام کتاب	نام مصنف	حجم	انگریزی قیمت	اُردو قیمت کلدار
معاشیات ہند	بیرجی		تین روپے آٹھ آنے	تین روپے آٹھ آنے
معاشی تاریخ ہند جلد اول	ادیش چند دت	۴۸۸	چھ روپے چار آنے	چھ روپے چار آنے
″ ″	دوم ″	۶۸۱	سات روپے ″	سات روپے ″
معاشیاتِ ہند	الیاس برنی	۸۲۶	تالیف	پانچ روپے ″
اُصول معاشیات	″	۶۱۹	″	″ بارہ آنے
تاریخ ″	انگرم		چار روپے بارہ آنے	چار ″ ″
مقدمہ ″	مور نیڈ		تین روپے	تین روپے
اُصول ″	ٹائنگ جلد اول	۸۱۴		
″ ″	″ ″ دوم			
مبادت	توڈ		چار روپے	چار روپے دو آنے
مفہوم زر	وورز		″	″

دونوں جدولوں کے مقابلے سے ہماری علم پروری کا پتہ چلتا ہے۔ بہ نفسہٖ اِن دونوں جدولوں کے مقابلے سے حقیقی صورت حال کا پتہ نہیں چلتا۔ حقیقی صورتِ حال کا پتہ اُس وقت چلتا ہے جب یہ پوچھا جائے کہ اِس قدر گراں قیمت رکھنے پر جامعہ عثمانیہ کی تصانیف کی فروخت سے کیا رقم حاصل ہوئی۔ اور پنجاب کو آپریٹو یونین کو اِن کتابوں کی فروخت سے کیا رقم حاصل ہوئی۔ ہماری کتابوں کے انبار کے انبار دارالترجمہ کی الماریوں میں مقفل رہتے ہیں۔ اِس لئے کہ اکثر حضرات اِس گراں قیمت پر یہ تصانیف خرید نہیں سکتے۔ اگر یہ کتابیں

طلباء کے فائدے کے لئے لکھی گئی ہیں۔ تو اُن کے لئے بھی اُن کی خریداری ممکن نہیں ہے۔ بالخصوص عثمانیہ کے طلباء کے لئے جو تعلیمی فیس تک ادا نہیں کرسکتے۔ یہ کتابیں علم دوست حضرات تک آسانی سے نہیں پہنچتیں۔ یہ بھی ہماری تجارت کا ایک پہلو ہے جو ہمدردانہ غور و فکر کا محتاج ہے۔

The Strategy of Freedom از ہیرلڈ جے لاسکی (صفحات ۱۲۳ قیمت ۵ شلنگ شائع کردہ جارج ایلن اینڈ اَن وِن لمیٹڈ۔ لندن)

اِس میں لاسکی نے نوجوانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ موجودہ جنگ میں برطانیہ کو کامیاب بنانے اور ہٹلر اور اسکے فلسفۂ حیات کو دنیا سے مٹانے کے لئے اپنی توانائیوں کو وقف کردیں۔ خاص طور پر امریکہ کے نوجوانوں سے خطاب کیا گیا ہے اور اُن کے جذبات عالیہ نیز ذاتی مفاد سے اپیل کی گئی ہے کہ بغیر برطانیہ کی کامیابی کے اُن کا مستقبل خطرہ میں پڑ جائے گا اور اُن کے ساتھ موجودہ تہذیب و تمدن کا مستقبل بھی۔

پروفیسر لاسکی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ جنگ گذشتہ جنگ عظیم کی طرح شہنشاہی مفاد کے لئے نہیں لڑی جارہی ہے بلکہ انسانی مقاصد کے لئے۔ اگرچہ پروفیسر موصوف کو اس کا اعتراف ہے کہ ہندوستان کے ساتھ جو برتاؤ روا رکھا گیا ہے وہ کسی طرح بھی حق بجانب نہیں لیکن اگر ہندوستان میں برطانوی حکومت نہ رہے اور جاپان کو غلبہ و استیلاء حاصل ہوجائے تو آئندہ سو سال تک وہاں کوئی شخص آزادی یا حقوق کا نام اپنی زبان پر نہ لاسکے گا۔ پروفیسر لاسکی کا خیال ہے کہ اگر اس جنگ میں برطانیہ کو کامیابی حاصل ہوئی تو ان انسانی مقاصد کو بروئے کار لانا زیادہ آسان ہوگا جو انسانیت کو عزیز ہیں بہ مقابلہ اس حالت کے جب کہ ہٹلر اور اس کے ساتھیوں کو کامیابی حاصل ہو۔

امریکہ کے نوجوانوں میں خاص طور پر موجودہ جنگ کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں اُن کو پروفیسر لاسکی نے رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ انداز بیان دلنشین اور کہیں کہیں خطیبانہ ہے۔ موصوف کی دوسری تحریروں کی طرح یہ کتاب بھی اس لائق ہے کہ ہر سیاست سے دلچسپی رکھنے والا شخص اس کو پڑھے۔

ہمارے بچے | از پروفیسر جگدیش سنگھ۔ پریت لڑی پبلشرز۔ پریت نگر (پنجاب) قیمت عہ

صفحات ۱۵۶۔

اِس کتاب میں سائنٹفک طریقہ پر ان اصول کو بتلایا گیا ہے جو ہندوستانی گھروں میں بچے کے پیدا ہونے کے وقت سے لے کر اس کے اسکول جانے تک والدین کے پیش نظر رہنے چاہئیں۔ اِس ضمن میں ہندوستانیوں کی معاشی خرابیوں کی طرف مصنف نے اِشارہ کئے ہیں جن کی اِصلاح ترقی پسند تمدنی زندگی کے لئے ازبس ضروری ہے۔ چھوٹے بچوں کی عادتوں کھلونوں کے اِنتخاب، بچے پر والدین کی زندگی کا اثر اور بچے کے عام ماحول کے متعلق دلچسپ اور مفید معلومات درج ہیں۔ تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کے علاوہ عام پبلک بھی اِس کتاب سے اِستفادہ کر سکتی ہے۔

نرخ نامہ اجرت اشتہارات

رسالۂ سیاست

	ایک بار کے لئے	چار بار کے لئے
پورا صفحہ	لے ر	عـــہ ر
آدھا صفحہ	سے ر	عـہ ر
چوتھائی صفحہ	عہ ۱۲ ر	صہ ۸ ر
ٹائیٹل کا صفحہ	ہے ر	سـہ ر
" آدھا صفحہ	صہ ر	ہہ عـہ ر

جو اشتہارات چار بار سے کم چھپوائے جائیں اُن کی اجرت پیشگی وصول ہونی چاہیے۔ البتہ جو اشتہار چار بار یا اس سے زیادہ بار چھپوایا جائے گا اس کے لئے خاص یہ رعایت ہوگی کہ اشتہار کی نصف اُجرت پیشگی وصول کی جائے گی۔

المشتہر

مینجر سید عبد القادر اینڈ سنس چار مینار حیدرآباد

(دکن)

روح اقبال

از

جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب

اس کتاب میں جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے بڑی دقیقہ سنجی اور کاوش سے علامہ اقبال مرحوم کی شاعری اور فلسفہ کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ نہایت دقیق مضامین کے بیان کرنے میں بھی لطف زبان اور ادبیت کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یہ کتاب کئی سال کی محنت، فکر اور تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اس میں فکر اقبال کے مختلف پہلو جیسے آرٹ، فلسفہ، تمدن، مذہبی تصورات وغیرہ سب ہی کچھ آگیا ہے۔ بلا مبالغہ یہ پہلی کتاب ہے جو شاعر مشرق کے شایان شان کہی جاسکتی ہے اور جس کی بدولت اُردو ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہوا ہے۔

صفحات، ۳۹۲	قیمت ۱۲/ سکہ حیدرآباد
تقطیع ۱۷×۲۷/۸	۸/ سکہ انگریزی

ناشر

عبد القادر اینڈ سنس۔ چارمینار۔

حیدرآباد (دکن)

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد دکن